پاکستان کی سیاسی تاریخ 1

پاکستان کیسے بنا؟

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ
جلد 1

زاہد چودھری

تکمیل وترتیب:
حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

فہرست

جزو دوم: برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے داخلی محرکات

جزوسوم: وزارتی مِشن منصوبہ: برصغیر کو متحد رکھنے کی آخری کوشش

باب 12: مشن منصوبہ۔ مسلم لیگ کی منظوری، عبوری حکومت۔ کانگرس کی منظوری 407

باب 13: مشن منصوبہ کانگرس نے منظور کیا یا نامنظور 437

باب 14: ایک اہم موڑ 479

دیباچہ ایڈیشن سوم

پاکستان کے مسائل جوں جوں پیچیدہ تر اور شدید تر ہوتے جا رہے ہیں، اس سوال پر بحث بڑھتی جا رہی ہے کہ پاکستان کیسے بنا تھا؟۔ اس کا بننا درست تھا یا غلط؟۔ ''نظریہ پاکستان'' اور ''نفاذ اسلام'' کے علمبرداروں کی پیدا کردہ مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی نے اس سوال کو مزید اُلجھا دیا ہے۔ ادھر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے چھوٹے صوبوں کے خلاف معاندانہ کارروائیوں کے ردعمل کے نتیجے میں علیحدگی پسندی کے رجحانات تیزی سے جڑ پکڑ رہے ہیں جن کو امریکی سامراج اور علاقائی توسیع پسندوں کی جانب سے بھی حوصلہ افزائی اور اعانت حاصل ہے۔ اور ریاست متزلزل ہو رہی ہے۔ ان حالات میں پاکستان کے Genesis کو سمجھنا پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔

گزشتہ تین عشروں میں اس موضوع پر چند دیگر مصنفین کی کتابیں انگریزی زبان میں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں اسٹینلے والپرٹ، عائشہ جلال، ہرمز جی مانک جی سیروائی اور جسونت سنگھ قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں نے بھی اس تجزیہ کی تائید کی ہے جسے زیرنظر کتاب میں زیادہ تفصیل اور گہرائی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر تواتر کے ساتھ کتابوں کا لکھا جانا اس بات کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کی درسی کتابوں میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے وہ ناکافی بلکہ گمراہ کن ہے۔ زیرنظر کتاب اس گمراہی کو دور کرنے کی ایک بھرپور اور سنجیدہ کاوش ہے۔

اس موضوع پر دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن (2011ء) ہاتھوں ہاتھ بک گیا اور اب ہم اس کا تیسرا ایڈیشن پیش کر رہے ہیں۔ اس میں پچھلے ایڈیشن کی پروف کی غلطیوں کو درست کر دیا گیا ہے۔ نیز طباعت کا معیار بہتر اور قیمت کو کم کر دیا گیا ہے۔ ادارہ مطالعہ تاریخ اپنے قارئین کے تعاون کا بے حد ممنون ہے۔

حسن جعفر زیدی

10/اکتوبر، 2012ء

دیباچہ ایڈیشن دوم

پاکستان کیسے بنا؟ یہ سوال آج سے 20 سال قبل جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی تب جتنا اہم تھا آج اس سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کیونکہ اس کے جواب میں پاکستانی اسٹیبلشمنٹ اور حکمران طبقوں نے ایسی تشریحات کی ہیں جن کی بدولت آج اس ملک میں خون کی ندیاں بہائی جا رہی ہیں۔ یہ تشریحات کچھ یوں ہیں۔

''پاکستاان اسلام کے نام پر بنا اس لیے یہاں اسلامی نظام نافذ ہونا چاہیے۔''

''پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اس کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت اس کی جغرافیائی سرحدوں سے زیادہ ضروری ہے۔''

اور پھر اسلام اور نظریۂ پاکستان کے نام پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے ایسی سیاسی اور مذہبی قوتوں کو فروغ دیا جنھوں نے فوجی آمریتوں کو پروان چڑھایا۔ طالبان پیدا کئے، دہشت گرد اور خود کش بمبار پیدا کئے جن کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے معصوم شہریوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اسٹیبلشمنٹ اور اینگلو امریکی سامراج دونوں کو اس نظریہ سازی کی شدید ضرورت پڑ گئی تھی۔ امریکی صدر ٹرومین نے کمیونسٹ بلاک کی حصار بندی کے لیے مذہب کو استعمال کرنے کا نظریہ Truman Doctrine پیش کیا تھا ۔ امریکی سامراجیوں نے پاکستان کو بوجوہ جغرافیائی پوزیشن کہ یہ روس اور چین دونوں کے قریب واقع تھا، اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کمیونسٹ مخالف حصار بندی میں اہم حیثیت دے دی تھی۔ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو اس نظریہ سازی کی اس لیے ضرورت پڑی کہ پاکستان میں شامل ہونے والی جن قومیتوں کی اسٹیبلشمنٹ میں نمائندگی نہ ہونے

کے برابر تھی، یعنی بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھا جا سکے۔ وہ جب اپنے حقوق کی آواز بلند کریں تو انہیں ''نظریہ پاکستان'' کا مخالف قرار دے کر ان کی آواز کو دبا دیا جائے۔ اسی طرح محنت کش طبقے جب اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں یا عوام الناس اپنے معاشی ،معاشرتی اور جمہوری حقوق کا مطالبہ کریں تو انہیں بھی اسلام اور نظریہ پاکستان کے نام پر دبا دیا جائے۔

نظریہ پاکستان کے نام پر ایک مخصوص ''نظریہ'' گھڑنے کے لیے قیام پاکستان کی ایک ایسی تاریخ تشکیل دی گئی جس میں اصل تاریخ بالکل مسخ ہو کر رہ گئی۔ کہا گیا کہ مسلمانوں کو ایک ایسے خطہ کی ضرورت تھی جہاں اسلامی نظام کا تجربہ کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے 1906ء میں مسلم لیگ کے قیام سے لے کر 1947ء تک کے واقعات کے بارے میں بہت سے صریح جھوٹ بولے گئے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر سیاق وسباق سے ہٹا کر بیان کیا گیا۔ نہ تو بین الاقوامی تناظر بتایا گیا اور نہ ہی برصغیر میں موجود اپنے اپنے مفاد کے لیے برسرِ پیکار قوتوں کی جدلیات کو بیان کیا گیا۔ ان کے نزدیک برصغیر کی تقسیم محض مسلمانوں کے لیے ایک نظریاتی ریاست کے قیام کے لیے ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر میں تین بڑی قوتوں کے مابین جدل چل رہا تھا۔ انگریز، ہندو اور مسلمان۔ ہر ایک اپنے مفاد اور بقا کی جدوجہد کر رہا تھا۔ انگریزوں کو اپنا سامراجی مفاد عزیز تھا جسے وہ برصغیر سے رخصتی کے نتیجے میں کھونا نہیں چاہتا تھا، ہندو جلد از جلد انگریز کی بنائی ہوئی مضبوط مرکزی حکومت پر قبضہ کر کے پورے ہندوستان پر غلبہ چاہتے تھے جس میں مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھ رہے تھے اور ان کے ایسا سمجھنے میں ہندو اکثریت کی نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت کا تنگ نظر رویہ بھی شامل حال تھا۔ ان حالات میں مسلمان متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے سیاسی، معاشی ومعاشرتی حقوق کا تحفظ چاہتے تھے بالخصوص برصغیر کے مغرب اور مشرق میں جہاں وہ اکثریت میں تھے وہ اپنی بالادستی چاہتے تھے۔ اور اس مقصد کے لیے مسلم لیگ نے 1946ء میں متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے وزارتی مشن منصوبہ منظور کیا اور 1947ء کے اوائل تک اس پر عملدرآمد کے لیے کوشش کرتی رہی۔ جس طرح برصغیر کی تقسم کی گئی کہ جس میں بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا گیا، مسلم لیگ کی قیادت کو کبھی بھی قابل قبول نہیں رہا تھا۔ قائداعظم اس پاکستان کو کٹا پھٹا، کرم خوردہ اور ناقابل عمل قرار دیتے تھے۔ ان کی اولین ترجیح متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے حقوق کے

تحفظ کا، حصول تھا جبکہ پاکستان ان کی دوسری ترجیح تھی اور وہ بھی ایسا پاکستان کہ جس میں بنگال و پنجاب منقسم نہیں تھے اور اس پاکستان میں کم از کم چالیس فیصد غیر مسلم آبادی شامل تھی۔ اس پاکستان پر یقینا کسی مخصوص مذہبی یا تھیوکریٹک ریاست کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

زیر نظر کتاب کسی مخصوص نظریہ کو وضع کر کے اس کے موافق شواہد جمع کرنے کا کام نہیں ہے بلکہ اس عہد کے مقامی اور بین الاقوامی تناظر میں برصغیر میں نبرد آزما تینوں بڑی قوتوں، انگریز، ہندو اور مسلمان کی جدلیات کی مثلث سے وابستہ تمام حقائق و شواہد کو جمع کیا گیا ہے۔ اور پھر جو نتیجہ خود بخود منطقی طور پر نکل کر سامنے آتا ہے اسے معروضی طور پر پیش کر دیا گیا ہے اور وہ یقیناً ایک نظریاتی ریاست کا قیام نہیں ہے کہ جس کو بنیاد بنا کر اس ملک میں مذہبی انتہا پسندی، جنونیت اور فرقہ وارانہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں خالد محبوب صاحب کی محنت و کاوش کے علاوہ زاہد امروز اور رضا زیدی نے بھی اشاریہ کی تیاری میں معاونت کی۔ ادارہ نگارشات کے آصف جاوید صاحب نے پورے خلوص کے ساتھ اس کی طباعت اور تقسیم کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ حسب سابق ادارہ مطالعہ تاریخ کے سرپرستوں ڈاکٹر مبشر حسن، جسٹس (ر) دلاور محمود، ڈاکٹر مہدی حسن، حسین نقی، قمر عباس اور سمیع اللہ ظفر کا تعاون حسب حال رہا جس کے بغیر یہ تحقیقی منصوبہ کامیابی کی منزل نہیں پا سکتا تھا۔

حسن جعفر زیدی
10 / مارچ 2011ء لاہور
hjzaidi@gmail.com

دیباچہ ایڈیشن اوّل

پاکستان کیسے بنا؟ یہ سوال پاکستان کی سیاسی تاریخ کے اوائل میں اتنا اہم نہیں تھا جتنا بعد میں اہم ہوتا چلا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ مختلف مفادات سے وابستہ گروہوں کے مابین جوں جوں تضادات شدید ہوتے گئے، ہر گروہ نے بڑھ چڑھ کر قیامِ پاکستان کی ایسی توجیہات بیان کیں، جن سے اس کا مفاد پورا ہوتا تھا۔ اس جھگڑے میں تاریخ کے اصل حقائق گُم ہو گئے۔ ان کی جگہ غیر حقیقی تصوّرات ونظریات کو فروغ دیا گیا اور انہیں تاریخ کا نام دے دیا گیا۔

ان میں دو متحارب تصورات قابلِ ذکر ہیں۔

1۔ ''برصغیر کے مسلمانوں کو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ایک خطہ چاہیے تھا، چنانچہ پاکستان دراصل اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا ہے۔ یہ ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کی نظریاتی سرحدیں ہیں جنہیں جغرافیائی سرحدوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔''

اس تصور کو نظریہ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ تصور ان مراعات یافتہ طبقات نے اختیار کیا جو محکوم طبقوں اور قومیتوں پر اپنی سیاسی ومعاشی بالادستی قائم کرنے کے لیے اسلام کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اس تصور کی نقیب سیاسی جماعتیں جو ''نفاذ اسلام'' کے نعرے کو متذکرہ طبقات کی بالادستی اور کٹھ ملائیت کو مسلط کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں، تحریک پاکستان کے دوران قیامِ پاکستان کی شدید مخالف رہی ہیں۔

2۔ ''برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تضاد نہیں تھا۔ انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو، کی پالیسی اختیار کر کے ان کے مابین صدیوں سے قائم بھائی چارے کو ختم کیا اور پھر سازش کے ذریعے ملک کو تقسیم کر کے چلے گئے تاکہ برطانوی سامراج کے مفادات

پُورے ہوتے رہیں۔دراصل پاکستان انگریزوں کا حرامی بچہ ہے۔“

اس تصور کو نام نہاد ترقی پسندانہ نظریہ قرار دیا جاتا ہے۔ اس تصور کے حامل سیاسی گروہ اور جماعتیں خود کو ترقی پسند، لبرل اور انقلابی کہلاتی ہیں، تاہم وہ عوام الناس میں بہت محدود اثر رکھتی ہیں، ان گروہوں اور جماعتوں کے رہنما اعلانیہ طور پر پاکستان توڑنے اور تاریخ کی غلطی کو درست کر کے بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کی باتیں کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی وفاداریاں اور مفادات سرحد پار ہیں۔ وہ قیامِ پاکستان کے وقت یا تو انڈین نیشنل کانگرس میں شامل تھے یا بالواسطہ اس کی حمایت کر رہے تھے۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں نظریات لغو اور باطل تصورات ہیں جن کا ان حالات و واقعات سے دور کا بھی تعلق نہیں جن کے نتیجے میں برصغیر تقسیم ہوا اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

حُسن اتفاق ہے کہ اس وقت جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں، مذکورہ بالا دونوں تصورات کی علمبردار جماعتیں حصول اقتدار کی خاطر باہم اتحاد کیے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ان کے نظریات کے کھوکھلے پن کا ثبوت ہے۔

مطالعہ تاریخ دراصل ایک سائنس ہے۔ اس میں ذاتی پسند یا ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تاریخ کوئی عقیدہ نہیں ہے، اس کا مطالعہ عقاید کی بنیاد پر نہیں بلکہ معروضیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ عقاید خواہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے...... عقیدہ پرستی کے شکنجے میں پھنس کر نہ تو ماضی کی اصل حقیقت سے آگاہی حاصل ہوسکتی ہے، نہ حال کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں کوئی درست پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں تصورات کے حامل عناصر دائیں یا بائیں بازو کی عقیدہ پرستی کا شکار ہیں۔ یہ عقیدہ پرستی دراصل مخصوص مفادات کی خدمت انجام دے رہی ہے۔

اول الذکر نظریے کے علمبرداروں نے جن میں سے بیشتر کا تعلق بڑے صوبے کے ساتھ تھا، پُورے ملک پر اپنی بالادستی کو قائم اور مستحکم کرنے کی خاطر بدترین قسم کے آمرانہ اور فسطائی طور طریقے اختیار کیے، اس سے چھوٹے صوبوں اور ان میں آباد قومیتوں کے اندر احساس محرومی و محکومی کا شدید ردِعمل ناگزیر طور پر پیدا ہوا۔ بالخصوص یہاں کے پڑھے لکھے بیروزگار درمیانے طبقے میں یہ احساس اس قدر شدید ہوا کہ بھارت نواز نام نہاد ترقی پسند سیاسی طالع آزماؤں کے پراپیگنڈے نے ان کو متاثر کرنا

شروع کر دیا۔انہوں نے یہ تاثر لیا کہ جس ملک میں ان کے ساتھ ظلم، زیادتی اور ناانصافی ہوئی ہے، وہ بنا ہی غلط تھا۔ یہ درست ہے کہ ان کے ساتھ نا انصافی ہوئی ہے، ان کا معاشی و سیاسی قتل کیا گیا ہے ، زبردست عدم توازن پیدا ہوا ہے جس نے عدمِ استحکام کی اس فضا کو جنم دیا ہے اور اگر قومیتی اور طبقاتی تضادات کو منصفانہ طور پر جلد حل نہ کیا گیا تو ملک انتشار، بدامنی اور طوائف الملوکی کا شکار ہو کر زوال سے بھی دوچار ہوسکتا ہے۔لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ملک بنا ہی غلط تھا......اس قسم کے قومیتی اور طبقاتی تضادات سے بھارت سمیت دنیا کے کم و بیش سب ہی ممالک دوچار ہیں، کیا یہ سب ملک غلط بنے ہیں؟......اگر کوئی انسان بڑا ہو کر غلط کاریوں میں پڑ جائے تو یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پیدا ہی غلط ہوا تھا...... یہ کہنا فکری دیوالیہ پن کی علامت ہوگا۔

تاریخ عالم ملکوں اور سلطنتوں کے عروج و زوال سے عبارت ہے۔مختلف قبیلوں، گروہوں، قوموں، نسلوں، طبقوں اور فرقوں کے باہمی ٹکراؤ یا جدل کے نتیجے میں نئے ملک اور سلطنتیں وجود میں آئیں اور پھر ٹکراؤ اور جدل کے اسی عمل نے ان کا شیرازہ بکھیر دیا اور نئے ملک یا سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔ملکوں یا سلطنتوں کی سرحدوں کو کبھی دوام حاصل نہیں ہوا۔کسی ملک یا سلطنت کی عمر کا انحصار اس کی داخلی و خارجی قوتوں کے مابین تضادات کی حل پذیری پر رہا ہے۔اگر تضادات حل پذیر ہوتے رہیں تو عمر لمبی ہو جاتی ہے ورنہ مختصر......اس وقت دنیا کا جو نقشہ ہے اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔دوسری عالمی جنگ سے پہلے یہ نقشہ کچھ اور تھا۔بعد میں اس نے یہ صورت اختیار کی، مگر پھر بھی یہ بدستور تغیر کے عمل سے گزر رہا ہے۔ع:

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سیاسی، معاشی و معاشرتی عدم مساوات، عدم توازن اور ثقافتی بعد نے جو عدم استحکام پیدا کر دیا تھا، وہ برصغیر کی تقسیم کا سبب بنا۔ پاکستان کا قیام نہ تو کسی نظریے کے نفاذ کی تجربہ گاہ کے طور پر عمل میں لایا گیا اور نہ اسے کسی سامراجی سازش نے جنم دیا۔ جب 1971ء میں یہ ٹوٹا تو یہ بھی کوئی سازش نہیں تھی اور نہ ہی کوئی نظریہ اسے بچانے میں کامیاب ہوسکا تھا۔جس طرح 1947ء میں مسلمانوں کے احساس محرومی و محکومی نے انہیں علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا اور ہندو بورژوا کا انڈین نیشنلزم کا منافقانہ نعرہ انہیں متحدہ ہند میں رکھنے کے بجائے منقسم کرنے کا ذمہ دار بنا تھا، اسی طرح 1971ء میں بنگالیوں کے احساس محرومی و محکومی نے انہیں علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا اور ''نظریہ پاکستان'' کا نعرہ انہیں متحد رکھنے کے بجائے علیحدہ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرا تھا۔ 1947ء کی تقسیم بائیں بازو

کے نام نہاد ترقی پسندوں کی عقیدہ پرستی کے مطابق درست نہیں تھی، جب کہ 1971ء کی تقسیم دائیں بازو کے رجعت پسندوں کی عقیدہ پرستی کے تحت غلط ہوئی تھی۔ تاریخ کسی کے عقیدے یا خواہش کا احترام نہیں کرتی، ٹھوس معروضی حالات اپنا راستہ خود بناتے ہیں، کسی سے پوچھ کر نہیں چلتے۔

تاریخ کے اس نازک موڑ پر جہاں اس وقت پاکستان کھڑا ہے، پاکستان کی سیاسی تاریخ کو منظر عام پر لایا جا رہا ہے تاکہ نہ صرف ریکارڈ درست کیا جا سکے اور نام نہاد ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں دونوں کی عقیدہ پرستی کا پردہ چاک کیا جا سکے بلکہ تاریخ کے سنجیدہ طالب علموں، دانشوروں، صحافیوں اور مخلص سیاسی کارکنوں کو عقیدہ پرستی سے نجات دلا کر اپنے ماضی، حال اور مستقبل کی لائن درست کرنے میں ان کی مدد کی جا سکے، اس کاوش کا مطمع نظر ان داخلی و خارجی تضادات کی تاریخ بیان کرنا ہے جو قیام پاکستان اور اس کے بعد رونما ہونے والے بے شمار مسائل و خطرات کے ذمہ دار بنے اور ابھی تک بنے ہوئے ہیں۔ یہ تمام تر عرق ریزی اس شوق و جذبے کے ساتھ کی گئی ہے کہ عوام الناس اور وہ محب وطن قوتیں اس سے استفادہ کر سکیں جو پاکستان کے غریب، مفلوک الحال اور پسماندہ عوام کی خوشحالی، کمزور اور محکوم قومیتوں کے احساس محرومی کے ازالے، انسانی حقوق کی بحالی، فرد کی آزادی اور وطن عزیز کے استحکام و سلامتی کے لیے کوشاں ہیں یا اس کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔

اس کاوش کا آغاز زاہد چودھری نے 1976ء میں ڈاکٹر مبشر حسن کے ایما پر کیا تھا۔ میں ایک سال بعد چودھری صاحب کے ساتھ اس محنت شاقہ میں شریک ہوا۔ شروع میں ہم نے قیامِ پاکستان اور پاکستان کے ابتدائی چار برس 1947ء تا 1951ء یعنی قائداعظم اور لیاقت علی خان کے دورِ حکومت تک اس کام کو محدود کیا اور ملک کو درپیش تمام داخلی اور خارجی تضادات کے بارے میں الگ الگ جلدیں تحریر کیں، حکمرانوں نے ان تضادات کو حل کرنے کے لیے کیا تدابیر اختیار کیں، اس کے بعد ان کا احاطہ کیا گیا.................شروع میں چودھری صاحب نے میرے شوق جستجو، تحقیق اور تحریر کے جذبے کو منظم کرنے کی تربیت کی، اور جب میں ان کے معیار پر پُورا اتر گیا تو پھر ہم نے موضوعات بانٹ لیے اور 1981ء میں کام کا یہ پہلا مرحلہ مکمل کر دیا۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ آیا پاکستان کی سیاسی تاریخ کے تسلسل کو جاری رکھا جائے یا پوری مسلم دنیا کی سیاسی تاریخ کو سائنسی نقطہ نگاہ سے ضبط تحریر میں لایا جائے جس میں پاکستان کی بقیہ تاریخ کا بھی احاطہ ہو جائے، چنانچہ فیصلہ دوسری تجویز کے حق میں ہوا۔ ہم نے پھر سے علاقے تقسیم کر لیے اور بعثت اسلام سے مسلمانوں کی سیاسی تاریخ پر کام شروع کر دیا۔ یہ کام ان

گنت جلدوں پر پھیلتا جارہا تھا کہ اپریل 1984ء میں ایک بہت بڑا سانحہ رونما ہو گیا۔ چودھری صاحب کی بینائی نے لکھنے پڑھنے سے مکمل جواب دے دیا۔ مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا کام جہاں تک ہوا تھا، اسے وہیں روک دیا گیا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کی پہلی جلد جو قیامِ پاکستان سے متعلق تھی، 1976ء میں لکھی گئی تھی۔ اس وقت حکومت برطانیہ کی جانب سے 1946ء تا 1947ء کا ہندوستان سے متعلق تمام ریکارڈ شائع تو ہونا شروع ہو چکا تھا مگر یہاں پوری طرح دستیاب نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے ماخذ بھی اُس وقت مہیا نہیں ہو سکے تھے۔ یہ طے تھا کہ جب اشاعت کا سلسلہ قیامِ پاکستان کے موضوع سے کیا جائے گا تو اس حصے کو نئے سرے سے لکھا جائے گا۔ چنانچہ اب جب چودھری صاحب لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تو اور موضوعات کو آگے پھیلانے کے بجائے جو کام ہو چکا تھا، اس کی اشاعت کا ارادہ کیا گیا تو ان تمام ماخذوں کے ساتھ، جو اب مہیا تھے، قیام پاکستان کا موضوع دوبارہ لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ 1984ء میں چودھری صاحب کی ہدایت پر میں نے بارہ ضخیم جلدوں پر مبنی ٹرانسفر آف پاور 47-1946ء کے ریکارڈ اور دوسرے ماخذوں کی مدد سے اس موضوع کو از سرِ نو لکھنا شروع کیا۔ سرکاری ریکارڈ سے اس قدر زیادہ مواد حاصل ہوا کہ یہ موضوع پھیلتا چلا گیا۔ میں اس کو سنبھالنے اور سمیٹنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے زندگی کا غالباً سب سے بڑا صدمہ درپیش ہوا۔ 8 رجولائی 1985ء کو چودھری صاحب انتقال کر گئے۔ اس صدمے کو برداشت کرنے اور نامکمل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی صبر آزما جدوجہد سے چار سال تک دو چار رہنے کے بعد میں اب اس محنت و کاوش کو منصۂ شہود پر لانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ پہلی دو جلدیں حاضر ہیں جو قیام پاکستان کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد ابتدائی برسوں میں ملک کو درپیش خارجی و داخلی تضادات سے متعلقہ جلدیں بھی تیار ہیں اور کتابت کے مراحل سے گزر رہی ہیں، ان کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

ڈاکٹر مبشر حسن جو اس کام کے محرک تھے، چودھری صاحب کی زندگی میں ان کا دستِ تعاون اور بعد میں مجھ پر ان کا دستِ شفقت مختلف صورتوں میں ہمہ وقت دراز رہا۔ انہوں نے مسودات کی ٹائپنگ کا بندوبست کیا اور کئی نایاب ماخذ باہر سے منگوا کر دیے۔ علاوہ ازیں مسودے پڑھ کر اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازا۔

خالد محبوب...... یہ چودھری صاحب کی زندگی میں مختلف وقفوں میں بطورِ معاون اس کام کے

ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ چودھری صاحب کے آخری ایام اور اس کے بعد اب تک انہوں نے رفاقت اور معاونت کا دامن کبھی نہیں چھوڑا، وہ میرے شانہ بشانہ نہ چل رہے ہوتے تو شاید ابھی بھی اس کام کی تکمیل نہ ہو پاتی۔ شہر میں موجود لائبریریوں سے تحقیقی مواد جمع کرنے کے علاوہ اس سلسلے میں اُن کو کئی بار کراچی اور اسلام آباد کا سفر بھی اختیار کرنا پڑا۔ پروف ریڈنگ کے علاوہ ہر دو جلدوں کے آخر میں دیا گیا اشاریہ اور ضمیمہ ''ب'' خالصتاً ان کا مرہون منت ہے۔

سمیع اللہ کی رفاقت بھی بہت کام آئی۔ انہوں نے کتاب کی اشاعت کا مرحلہ منظم کرنے میں پیش رفت کی اور ایک مشکل مرحلہ انجام پایا۔ چودھری صاحب کے جن دوستوں کی شفقت، محبت اور حوصلہ افزائی ہر لمحے میرے شامل حال رہی اور جن کی بدولت میں اس کام کو منزل تک پہنچانے میں کامیاب ہوا، ان میں صدیق درانی صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، دلاور محمود صاحب اورنگزیب صاحب، حسین نقی صاحب، خورشید عالم صاحب اور محمد اکرم بٹ صاحب شامل ہیں۔ نقی صاحب اور خورشید صاحب نے مسودات بھی پڑھے اور کارآمد مشوروں سے بھی نوازا۔

جن لائبریریوں اور اداروں سے استفادہ کیا گیا اور جن کے عملے نے بھرپور تعاون کیا، ان میں برٹش کونسل لائبریری لاہور، امریکن سنٹر لاہور، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن، نیشنل آرکائیوز، نظامت تحفظ قومی دستاویزات اسلام آباد، ہمدرد لائبریری کراچی، ریسرچ سوسائٹی پنجاب یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی لائبریری، پنجاب اسمبلی لائبریری، قومی اسمبلی لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری لندن شامل ہیں۔

اقتباسات کے تراجم بڑی احتیاط کے ساتھ کیے گئے ہیں اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کے بجائے لفظی ترجمے کو ترجیح دی گئی ہے تاکہ ماخذ کی اصلیت برقرار رہے۔ ممکن ہے بعض قارئین اول الذکر صورت کو ترجیح دینا پسند کرتے ہوں لیکن تحقیقی اور بعض متنازعہ امور کے زیر بحث ہونے کی وجہ سے موخر الذکر راہ اختیار کی گئی ہے۔

ترتیب وتدوین، ترجمے اور پروف ریڈنگ کو غلطی سے مبرا بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ تاہم پھر بھی کوئی غلطی رہ گئی ہے، تو اس کی تمام تر ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔

حسن جعفر زیدی

لاہور 8 / جولائی 1989ء

تعارف جلد۔ 1

یہ جلد اگست 1945ء سے اگست 1946ء کا احاطہ کرتی ہے۔ جب تک یہ اندازہ نہ ہو جائے کہ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر دنیا میں سامراجی قوتوں اور ان کے خلاف برسرِ پیکار قوتوں کے مابین توازن کی صورت کیا تھی، برصغیر کی آزادی کے خارجی محرکات کو درست طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ اس جلد کے ابتدائی تین ابواب پر مشتمل جزو اول میں اس صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے ایک تو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت سامراجی قوتوں کا تقاضہ برصغیر کو تقسیم کرنے کے بجائے متحد رکھنا تھا۔ دوسرے یہ کہ برطانوی سامراج زوال پذیر ہو کر معاشی اعتبار سے اس قدر دیوالیہ ہو چکا تھا کہ اب وہ برصغیر کے بوجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، تیسرے یہ کہ مشرقِ بعید سے لے کر یورپ و افریقہ تک عوام الناس کی سامراج دشمن مسلح یا غیر مسلح انقلابی تحریکیں اپنے عروج پر تھیں اور سامراج کی ٹوٹی ہوئی کمر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کامیابیاں و کامرانیاں حاصل کر رہی تھیں۔ ان حالات میں برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آ گئی تھی جو برصغیر کی اعتدال پسند جماعتوں یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کو اپنا اقتدار سونپ کر جلد از جلد یہاں کی ذمہ داری سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔ سامراج اپنا پُرانا طریقہ واردات چھوڑ کر جدید نو آبادیاتی نظام کے دور میں داخل ہو رہا تھا۔

جزو دوم میں برصغیر کے داخلی تضادات اور روز افزوں بگڑتی ہوئی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 46ء۔ 45ء کے انتخابات میں ہندو مسلم تضاد کُھل کر سامنے آ گیا تھا اور اس کی حقیقت سے اب کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ادھر عوام الناس کا سامراج دشمن جذبہ بھی اپنے عُروج پر تھا۔ آزاد ہند فوج سے تعلق رکھنے والوں پر مقدمے کے خلاف زبردست لہر اٹھی، فضائیہ اور بحریہ کے عملے نے ہڑتال کر دی، اس کے علاوہ ٹریڈ یونینوں کی طرف سے مُلک گیر ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ جاری تھا جن میں کمیونسٹ سرگرم عمل تھے۔ اندیشہ تھا کہ کہیں ہندو مسلم تضاد نے شدید ہو کر خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی تو کمیونسٹ اور

روس اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور برصغیر ہمیشہ کے لیے سامراجی حلقۂ اثر سے نکل جائے گا۔ اس لیے یہ کوشش کی جارہی تھی کہ کانگرس اور لیگ کے رہنماؤں کو متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے کسی ایسے آئینی فارمولے پر متفق کرلیا جائے جس سے ہندو مسلم تضاد حل پذیر ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے برطانوی حکومت نے اپنے تین وزیروں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا۔

جز وسوم میں وزارتی مشن نے ہندوستان میں اپنے تین ماہ سے زائد عرصہ کے قیام کے دوران مذکورہ بالا مقصد کے حصول کے لیے جو کوششیں اور جوڑ توڑ کیا اس کا بالتفصیل احاطہ کیا گیا۔ اس کے دو ارکان یعنی سٹیفورڈ کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی، پٹیل اور نہرو کے ساتھ مل کر جناح اور ویول کو جس طرح دھوکہ دیا، اس کی تفصیل اس سے پہلے شاید ہی کسی تصنیف میں بیان کی گئی ہے۔ جناح اس مشن کے مجوزہ گروپنگ کے فارمولے کے مطابق متحدہ ہند کے دائرے میں رہنے پر آمادہ تھے، لیگ کونسل نے اس کی منظوری بھی دی لیکن مشن کے مذکورہ ارکان کی منافقت اور کانگرسی رہنماؤں کی ہٹ دھرمی کی بدولت یہ سکیم ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ مسلم لیگ کو ڈائریکٹ ایکشن کی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ جلد یہاں آکر ختم ہوجاتی ہے۔

ابھی تک ہندو مسلم تضاد کو حل کرنے کی تمام تر کوششیں آئینی اور قانونی دائرے میں پرامن انداز میں ہوتی رہی تھیں۔ ان کی ناکامی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات اور پرتشدد انداز نے جگہ لے لی۔ جدل کے اس اگلے مرحلے سے جلد دوم شروع ہوتی ہے۔

جلد اول کے ماخذوں میں جز واول کے بڑے ماخذ ''نیویارک ٹائمز'' اور ''دی ٹائمز لندن'' کی فائلیں ہیں۔ علاوہ ازیں امریکی خارجہ پالیسی کی سرکاری طور پر شائع شدہ اہم دستاویزات اور ڈی۔ ایف۔ فلیمنگ اہم ماخذ ہیں۔ جز ودوم اور سوم کا سب سے بڑا ماخذ وہ خفیہ سرکاری دستاویزات ہیں جنہیں برطانوی حکومت نے ٹرانسفر آف پاور 47-1942ء کے نام سے بارہ ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔ چونکہ تقریباً یہ سب ہی دستاویزات خفیہ تھیں اس لیے ان کا حوالہ دیتے ہوئے بار بار ان کے ''خفیہ'' ہونے کی تکرار نہیں کی گئی۔ دیگر اہم ماخذوں میں وائسرائے ویول کا روزنامچہ (JOURNAL)، وی۔ پی مینن، ابوالکلام آزاد، پیارے لال، پینڈرل مون، ڈاکٹر تاراچند، آر۔ سی۔ موجمدار، چودھری محمد علی، اشتیاق حسین قریشی، خشونت سنگھ اور بہت سے دوسرے شامل ہیں۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے اجلاسوں اور قراردادوں کے لیے زیادہ تر ان پارٹیوں کی سرکاری طور پر شائع شدہ دستاویزات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

جزو اوّل

برصغیر کی آزادی کا بین الاقوامی پس منظر

باب: 1

دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ
اور طاقت کا نیا توازن

ایٹم بم کا بلا جواز استعمال اور امریکہ سوویت سُپر پاور مخاصمت کا آغاز

یہ 6/اگست 1945ء کی بات ہے۔ صبح کے پونے نو بجے تھے۔ جاپان کے شہر ہیروشیما کی مخلوق خدا اپنے روزمرہ کے کام کاج میں مصروف تھی کہ فضا میں ایک امریکی ہوائی جہاز نمودار ہوا اور اس نے دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے عین وسط میں ایک غیر معمولی نوعیت کا بم گرا دیا۔ یہ پہلا تباہ کن ایٹم بم تھا۔ پورے شہر میں قیامت برپا ہوگئی۔ آن کی آن میں 62 ہزار عمارتوں کے پرخچے اڑ گئے اور شہر کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر ہوگیا۔ تقریباً 80 ہزار افراد لقمۂ اجل ہو گئے اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ اس کے دس گھنٹے بعد امریکی صدر ٹرومین نے بڑے فخر کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں اعلان کیا کہ ''دنیا کا پہلا ایٹم بم ایک امریکی ہوائی جہاز نے ہیروشیما پر گرایا ہے۔ اس کی طاقت بیس ہزار ٹن ٹی این ٹی سے زیادہ تھی اور دھماکہ خیزی کی قوت اب تک استعمال میں آنے والے سب سے بڑے بم کے مقابلے میں دو ہزار گنا زیادہ تھی۔''

یہ خبر نشر ہوتے ہی برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے لندن سے ایک بیان جاری کیا جس میں فخریہ طور پر بتایا گیا تھا کہ ایٹم بم کی تیاری کے منصوبے میں برطانیہ نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ یہ طویل بیان 26/جولائی کو برطانوی حکومت کی تبدیلی سے پہلے ہی اس وقت کے وزیراعظم چرچل نے اس موقع کے لیے تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ نئے وزیراعظم ایٹلی نے چرچل کا حوالہ

دے کر یہ پورا بیان جاری کر دیا جس میں 1939ء سے 1945ء تک ایٹم بم کے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے برطانوی حکومت اور امریکی حکومت کے مابین تعاون کی تفصیل اور اس میں برطانوی سائنس دانوں اور تکنیکی ماہرین کی کاوشوں کی تفصیل بھی بیان کی گئی تھی۔ گویا امریکیوں کے اس ''کارنامے'' میں اپنی حصہ داری جتا کر زوال پذیر برطانوی سامراج، عالمی طاقت کی حیثیت سے اپنی زوال پذیری پر پردہ ڈالنے کی احمقانہ کوشش کر رہا تھا۔

اس لرزہ خیز واقعہ کے دو دن بعد یعنی 8/اگست کو سوویت یونین نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر کے شمالی چین میں جاپانیوں کے مقبوضہ علاقوں پر حملہ کر دیا۔ ماسکو نے یہ کاروائی فروری 1945ء میں منعقدہ یالٹا کانفرنس کے دوران اتحادیوں کے ساتھ کیے گئے خفیہ وعدے کے عین مطابق کی تھی۔ وعدہ یہ تھا کہ سوویت یونین جرمنی کی شکست کے تین ماہ بعد جاپان کے خلاف جنگ میں شریک ہوگا۔ چنانچہ روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے جاپان کے خلاف اعلانِ جنگ کرتے ہوئے کہا کہ ''اتحادیوں نے روس سے جاپان کے خلاف جنگ میں شریک ہونے کے لیے درخواست کی تھی جسے قبول کر لیا گیا تھا۔''

اسی روز وزیراعظم ایٹلی نے سوویت حملے کو خوش آمدید کہا اور صدر ٹرومین نے اس پر مسرت کا اظہار کیا۔ امریکی وزیر خارجہ بائرنز نے خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ سوویت حکومت کے اس اقدام کے نتیجے میں جنگ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ لیکن سوویت حملے کے اگلے دن یعنی 9/اگست کو ایک اور امریکی ہوائی جہاز جاپان پر حملہ آور ہوا اور اس نے ناگاساکی پر ایٹم بم پھینک کر تقریباً ایسی ہی تباہی مچائی جیسی کہ تین دن پہلے ہیروشیما میں مچائی گئی تھی۔ 10/اگست کو جاپان نے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کر دی۔ 14/اگست کو شرائط طے ہوئیں اور پھر 2/ستمبر کو رسمی طور پر شکست نامے پر دستخط ہوئے تو دوسری عالمگیر جنگ اختتام پذیر ہوئی۔

تاہم ساری دنیا کے امن پسند عوام نے خوشی کا کوئی مظاہرہ نہ کیا۔ ہر جگہ یہ سوال پوچھا جا رہا تھا کہ امریکیوں نے جاپان کے دو شہروں کے بے گناہ عوام کے خلاف اتنا مہلک ہتھیار کیوں استعمال کیا حالانکہ ایشیا میں فسطائیت کی شکست اس بناء پر یقینی ہو چکی تھی کہ 8/مئی 1945ء کو جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے بعد جاپان کی ہوائی اور بحری فوج بالکل تباہ ہوگئی تھی اور اس کی بری فوج بھی ہر محاذ سے پسپا ہو رہی تھی۔ امریکی صدر ٹرومین نے اس سوال کا یہ جواب

دیا کہ جاپان پر ایٹم بم دو لاکھ امریکی سپاہیوں اور دو لاکھ سے لے کر چار لاکھ دشمن کے سپاہیوں کی جانیں بچانے کے لیے گرایا گیا تھا۔ اس نے برملا اعلان کیا کہ وہ آئندہ بھی ''قوم کی فلاح'' اور ''جمہوریت'' کے تحفظ کے لیے ایٹم بم کے استعمال کا حکم دینے میں تامل نہیں کرے گا۔ لیکن صدر ٹرومین کا یہ بیان کسی کو مطمئن نہ کر سکا کیونکہ اس کی بنیاد سراسر جھوٹ پر تھی اور یہ سامراجی ذہنیت کا آئینہ دار تھا۔

صدر ٹرومین کے اس جھوٹ کی قلعی امریکی ہوائی فوج کے کمانڈر انچیف ہینری آرنلڈ کے اس بیان سے بھی کھل گئی کہ ایٹم بم کا استعمال جنگی مقاصد کے لیے ضروری نہیں تھا کیونکہ جاپانیوں کا فضا میں کنٹرول ختم ہو چکا تھا اور اس وجہ سے وہ زیادہ دیر تک مزاحمت جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ امریکی بحریہ کے کمانڈر انچیف ولیم ہیلے نے کہا کہ ایٹم بم کا استعمال غیر ضروری تھا۔ یہ غلطی تھی۔ دنیا کے سامنے اس قسم کے ہتھیار کا انکشاف کیوں کیا گیا جب کہ ایسا کرنا بالکل غیر ضروری تھا اور امریکی وزیر خارجہ جیمز برنز نے اس مؤقف سے اتفاق کیا کہ جنگ کا اختتام ایٹم بم سے نہیں ہوا تھا۔ جب بم گرایا گیا تھا، اس سے پہلے جاپان کی شکست ہو چکی تھی اور وہ امن و آشتی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

ایک قیاس آرائی کے مطابق اعلیٰ سطح کے بعض امریکی حکام نے ایٹم بم کی خبر کا اعلان کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ اس کا نفسیاتی اثر جاپان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرے گا۔ لیکن بعض امریکی حکام کی رائے اس سے مختلف تھی جس کا اظہار پہلا ایٹم بم گرائے جانے والے دن ہی ایک امریکی ترجمان نے ان الفاظ میں کیا۔ ''ایک ایسے دشمن کے خلاف نفسیاتی جنگ کی کیا ضرورت ہے جو پہلے ہی شکست کھا چکا ہے اور جسے اپنی مکمل تباہی سے نجات پانے کا خود ہی احساس نہیں ہے۔''

اس سے پیشتر جاپان نے روس سے ثالثی کی درخواست بھی کی تھی اگرچہ وہ اس وقت بے معنی ہو گئی تھی جب 26 ؍ جولائی کو پوٹسڈم میں اتحادی سربراہوں کی جاپان سے ہتھیار ڈالنے کی درخواست جاپان کی طرف سے مسترد کر دی گئی تھی۔ تاہم ثالثی کی مذکورہ درخواست اکانومسٹ لندن کے مطابق جاپان کی کمزوری کی بہت بڑی علامت تھی اور یہ بم کے دھماکے سے پہلے کی گئی تھی۔

ٹرومین کی اس بہیمانہ کاروائی کے جواز کا راز دراصل امریکہ کے حکمران طبقے کے سامراجی عزائم میں مضمر تھا۔ جنگ عظیم کے دوران امریکہ کے سیاسی لیڈروں، علم سیاسیات کے ماہروں، مؤرخوں، اخبار نویسوں اور دوسرے دانشوروں کی اس امید میں پختگی آ گئی تھی کہ جرمنی اور جاپان کی فسطائی سیاست اور معیشت کی تباہی کے بعد ساری دنیا میں ''امریکی صدی'' کا آغاز ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت تک عالمی سامراجیت کے پرانے علمبرداروں یعنی برطانیہ اور فرانس کا سیاسی اور معاشی طور پر دیوالہ نکل چکا ہوگا اور روس بے مثال تباہی و بربادی کے باعث بہت دیر تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ چار دانگ عالم میں امریکہ کا ڈنکا بجے گا اور کوئی طاقت اس کی بالا دستی کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گی۔ ان کے ان سامراجی عزائم کی مادی بنیاد یہ تھی کہ جنگ کے دوران امریکہ کی صنعتی پیداوار میں اڑھائی گنا اضافہ ہوا تھا۔ 1945ء میں سرمایہ دار دنیا کی صنعتی پیداوار میں امریکہ کی صنعتی پیداوار کا تناسب 60 فیصد سے زیادہ تھا اور اس کی برآمدی تجارت کا تناسب 33 فیصد تھا۔ سرمایہ دار دنیا کے تجارتی بحری جہازوں میں امریکہ کی تجارتی بحریہ کا تناسب 50 فیصد سے زائد تھا اور اس کے پاس سونے کے ذخائر ساری سرمایہ دار دنیا کے سونے کے ذخائر سے تین گنا زیادہ تھے۔

لیکن جب 8 مئی 1945ء کو جرمن کمانڈر کیٹل نے برلن میں سوویت کمانڈر زوکوف کے سامنے ہتھیار ڈالے تو یورپ کا نقشہ وہ نہیں تھا جو امریکی سامراج نے اپنے ذہن میں کھینچ رکھا تھا۔ اگرچہ جنگ کے دوران روس میں بے مثال تباہی و بربادی ہوئی تھی۔ تقریباً ستر لاکھ لوگ مارے گئے تھے، ستر ہزار قصبات و دیہات ملیا میٹ ہو گئے تھے۔ ساٹھ لاکھ مکانات اور عمارتوں کا نام ونشان نہیں رہا تھا۔ نوے ہزار اجتماعی فارمز تباہ ہو گئے تھے اور مجموعی طور پر تقریباً 33 فیصد پیداواری صلاحیت ختم ہوگئی تھی۔ تاہم اس کے باوجود مئی 1945ء کا سوویت یونین سیاسی طور پر جنگ سے پہلے کے سوویت یونین سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ جب ہٹلر نے 1939ء میں عالمگیر جنگ کا آغاز کیا تھا تو صرف سوویت یونین اور منگولیا میں اشتراکیت کا غلبہ تھا لیکن مئی 1945ء میں یورپ کے سات ممالک یعنی پولینڈ، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ اور البانیہ اشتراکی نظام کے زیر تسلط تھے اور جرمنی کا بہت سا مشرقی علاقہ اشتراکیت کے قبضے میں تھا۔ مغربی یورپ کے عوام الناس بھی جنگ کے دوران سوویت عوام

کے مزاحمتی کارناموں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سرزمینِ یورپ کی کوئی سرمایہ دار طاقت فسطائیت کے حملے کی تاب نہیں لاسکی تھی اور اس کے برعکس سوویت یونین نے جرمنی کے فقید المثال حملے کی بے نظیر مزاحمت کر کے اشتراکی نظام کی برتری کا لوہا منوالیا تھا۔ بالخصوص فرانس اور اٹلی کے عوام پر جنگ کے اس نتیجے کے بہت گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ مزید برآں سارے ایشیا میں تحاریک آزادی کامیابی کے آخری مرحلے میں پہنچ گئی تھیں اور چین کی کمیونسٹ پارٹی کا دس کروڑ کی آبادی کے علاقے پر کنٹرول قائم ہو چکا تھا۔ امریکی سامراجیوں نے جب اس بین الاقوامی صورت حال پر نظر ڈالی تو بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کے لیے ایٹم بم بنانے کی کوشش تیز تر کردی اور جب کامیاب ہوگئے تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔

9/اگست 1945ء کو امریکی صدر ٹرومین نے ریڈیو پر نشری تقریر میں اعلان کیا کہ ہم اس جنگ میں دنیا کی سب سے طاقتور قوم بلکہ شاید تاریخ کی سب سے طاقتور قوم کی حیثیت سے ابھرے ہیں۔ اس نے ایٹم بم پر اپنی سامراجی اجارہ داری کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ایٹم بم اتنا زیادہ خطرناک ہے کہ اسے لاقانونیت کی دنیا میں کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ چنانچہ امریکہ اور برطانیہ، جن کے پاس اس کی تیاری کا راز موجود ہے، اس وقت تک اس راز کو فاش نہیں کریں گے جب تک بم کو کنٹرول کرنے کے ذرائع دریافت نہیں کر لیے جاتے تاکہ ہم خود کو اور دنیا کو مکمل تباہی کے خطرے سے بچا سکیں۔ جاپان پر روس کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ پوٹسڈم میں روس، امریکہ اور برطانیہ کے مابین جو خفیہ فیصلے ہوئے تھے ان میں سے ایک کا اظہار اس حملہ کی صورت میں ہوا ہے۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ نئے ہتھیار یعنی ایٹم بم کے بارے میں ابھی روس کو اطلاع نہیں ملی تھی کہ وہ بحرالکاہل کی جنگ میں شرکت پر آمادہ ہو گیا تھا۔[1] یعنی پوٹسڈم کانفرنس میں ایٹم بم کے استعمال کے بارے میں کئے گئے فیصلے میں روس کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

اس کا کھلا اعتراف اور بہت سی دوسری باتوں کا انکشاف چرچل نے برطانوی پارلیمنٹ میں اپنے ایک طویل بیان میں کیا۔ 16/اگست کو چرچل نے پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ”آج کی سہ پہر ایوان کا فرض ہے کہ وہ حکومت عظمیٰ کو اس امر پر مبارکباد پیش کرے کہ

جاپان پر مکمل فتح پا لینے اور پوری دنیا میں امن کے قائم ہو جانے کے نتیجے میں اندرونِ ملک ہماری امیدوں میں بہتری کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ ابھی ایک مہینہ پہلے کی بات ہے جب مشرقِ بعید میں ایک طویل اور خونریز جنگ کی تیاریوں کو پوری رفتار کے ساتھ جاری رکھنا کتنا ازحد ضروری تھا۔ گزشتہ تین ماہ کے دوران دوغلے پن کے عنصر نے پالیسی اور انتظامیہ کے ہر معاملہ کو الجھا کر رکھ دیا تھا ہم امن اور جنگ دونوں کی منصوبہ بندی کرنے پر مجبور تھے۔ اس سے ایسے پریشان کن اور تکلیف دہ مسائل نے جنم لیا کہ شاید ہی اتنی طویل زندگی میں مجھے کبھی سامنا کرنا پڑا ہوگا۔'' اُس نے ایٹم بم کے استعمال کے امکان کا ذکر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ ''ایک ماہ قبل میں نے انتہائی بے چینی کے عالم میں اس امکان کا جائزہ لیا تھا۔ تب سے میرا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بوجھ جو اب بھی بھاری محسوس ہوتا ہے بہت حد تک اتر گیا۔'' اس نے کہا کہ ''17 رجولائی کو ہمیں پوٹسڈم میں وہ خبر موصول ہوئی جس کا ہمیں شدت سے انتظار تھا۔ صحرائے میکسیکو میں ایٹم بم کی آزمائش کامیاب ہوگئی تھی۔ ہمارے امریکی اتحادی کی یہ وہ عظیم الشان کامیابی تھی جو خواب و خیال سے بالاتر تھی۔ صحرائے میکسیکو کے تجربے کی تفصیلات جو چند روز بعد ہمیں بذریعہ طیارہ موصول ہوئیں، جاننے کے بعد ہمارے ذہنوں میں کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ اب ہمیں انسانی معاملات طے کرنے کے لیے ایک نیا عامل حاصل ہو گیا ہے اور ہم ایسی قوتوں کے مالک بن گئے ہیں جو ناقابل مزاحمت ہیں۔ ایٹم بم کو استعمال کرنے کا فیصلہ پوٹسڈم میں صدر ٹرومین اور میں نے کیا تھا اور ہم نے ان فوجی منصوبوں کی بھی منظوری دی تھی جو خوف سے محبوس قوتوں کی رہائی کے لیے طے کئے گئے ہیں۔ اس وقت سے مستقبل کے متعلق ہمارے نظریے میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ صدر ٹرومین نے مارشل اسٹالن کو اطلاع دی کہ ہم نے جاپان کے خلاف ایک لاثانی قوت کا حامل دھماکہ خیز ہتھیار استعمال کرنے کا ارادہ کیا ہے اور پھر جو کچھ ہوا اس سے اب ہم سب واقف ہیں۔ دوسرے عوامل کی بہ نسبت یہ ایٹم بم ہی ہے جسے ہم جاپان کے خلاف جنگ کے اچانک اور جلد خاتمے کا ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں۔'' آگے چل کر وہ اس بہیمانہ اقدام کے جواز میں مزید دلائل دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ''سوائے ایٹم بم کے استعمال کے اور جو کچھ بھی انسان کے بس میں تھا کر ڈالا گیا تھا تاکہ جاپان کی شہری آبادی محفوظ رہے۔ تاہم پھر بھی بہت سی آوازیں اُٹھ رہی ہیں

کہ بم کا استعمال ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں خود کو ایسے خیالات کے ساتھ وابستہ نہیں کر سکتا۔(چیئرز) جنگ کے پورے چھ برسوں نے بیشتر لوگوں کو قائل کر دیا ہے کہ اگر جرمنوں یا جاپانیوں نے یہ ہتھیار ایجاد کر لیا ہوتا تو انہوں نے فوری طور پر اسے ہماری مکمل تباہی کے لیے لازماً استعمال کر ڈالنا تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ بہت محترم قوم بلکہ ایسی قوم کہ جس نے بیشتر مواقع پر جاپانی سرحدوں کی جانب پیش قدمی کا ارادہ بھی نہیں کیا؟ (قہقہہ اور چیئرز) ایسا مؤقف اختیار کرے گی کہ بم پھینکنے کے بجائے دس لاکھ امریکی اور ڈھائی لاکھ برطانوی جانوں کو جاپان کے حملے کے دوران قتل عام اور اندھا دُھند لڑائیوں میں قربان کر دینا چاہیے تھا۔ ان سنگین فیصلوں کی جانچ آنے والی نسلیں کریں گی اور اگر وہ پرمسرت دنیا میں زندہ ہوں گی جہاں جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہوگا اور آزادی کا دور دورہ ہوگا تو وہ کبھی ان لوگوں کی مذمت نہ کریں گی جنہوں نے اس پُرآشوب دور کے خطرات و مشکلات کے درمیان ان کے فائدے کے لیے کوشش کی''۔ اس کے بعد اس نے ایٹم بم بنانے کی فنی مہارت کے حصول اور اس کے راز افشانہ کرنے کے بارے میں امریکی صدر ٹرومین کے بیان کی تعریف کی اور کہا کہ ''اس بناء پر امریکہ اس وقت دنیا کی چوٹی پر بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ایسا ہی ہے۔ امریکیوں کو چاہیے کہ وہ اپنی طاقت اور ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہوں، صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ سب ملکوں کے سب لوگوں کی خاطر اور پھر انسانی تاریخ میں ایک تابناک دن نمودار ہوگا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے امریکہ کی اس ٹھوس ترقی کے برابر تک پہنچنے میں کم از کم تین یا شاید چار سال کا عرصہ درکار ہو گا۔'' اس نے 8 راگست کو روس کی جانب سے جاپان کے خلاف حملہ کی توضیح کرتے ہوئے کہا کہ'' یہ کہنا غلط ہوگا کہ جاپان کے خلاف روسیوں کا اعلانِ جنگ ایٹم بم کے استعمال کے نتیجے میں جلدی میں عمل میں آیا ہے۔ میرے اور مارشل اسٹالن کے مابین یہ طے پایا تھا کہ جرمن افواج کے ہتھیار ڈالنے کے تین ماہ بعد روس جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ جرمن افواج نے 8 رمئی کو ہتھیار ڈالے اور روس نے 8 راگست کو جاپان پر حملہ کیا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا بلکہ یہ تو مارشل اسٹالن اور اس کی جری افواج کی دیانتداری اور انضباطِ اوقات کی ایک مثال ہے جو وہ ہمیشہ اپنی فوجی کاروائیوں میں ملحوظ رکھتے ہیں۔[2]

لیکن اسٹالن اور اس کی افواج کی دیانت کے اس اعتراف کے باوصف چرچل کا یہ

بیان اینگلوامریکی سامراج کی بددیانتی، مکاری اورعیاری کا بھی کھلا اعتراف ہے۔ پوٹسڈم میں جب 17رجولائی کوٹرومین اور چرچل کو ایٹمی دھماکہ کے کامیاب تجربہ کی اطلاع ملی اور انہوں نے اس کے استعمال کے بارے میں فیصلہ کیا تو اس وقت ''دیانت دار'' مارشل اسٹالن بھی پوٹسڈم میں موجود تھا لیکن اسے اس بارے میں کچھ نہ بتایا گیا۔ صرف سرسری طور پر ''ایک لاثانی قوت کے حامل دھماکہ خیز ہتھیار'' کو جاپان کے خلاف استعمال کرنے کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ نہ ہی یہ بتایا گیا کہ ایسا کب اور کہاں کیا جائے گا۔ سوویت اتحادی کو اسی تاثر میں رکھا کہ وہ اپنی ''دیانت داری اور انضباط اوقات'' کا مظاہرہ کرتے ہوئے 8راگست کو جاپان پر حملہ کرے اور خود 6راگست کو ایٹم بم گرانے کا فیصلہ کرلیا اور پھر جب سوویت یونین نے اس کثیر ہلاکت خیزی کی مذمت کی تو نہایت عیاری کے ساتھ اس پر طنز کیا کہ چونکہ اس نے کبھی جاپان کی سرحدوں پر چڑھائی نہیں کی اس لیے اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ جاپان کے خلاف لڑنے والے امریکی اور برطانوی فوجیوں کی ہلاکت کا سلسلہ جاری رکھنے کی تجویز دے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سوویت افواج جنھوں نے یورپ میں نازی جرمنی کو منہ توڑ شکست دے کر اتحادی فوجیوں کی ہلاکت کا سلسلہ موقوف کروادیا تھا، اب جب وہ یورپی سرحد کی طرف سے مطمئن ہوکر پوری قوت سے جاپان پر حملہ آور ہورہی تھیں اور جاپان پہلے ہی گھٹنے ٹیکے دے رہا تھا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ روسی فوجوں کے نرغے میں آیا ہوا ادھ موا جاپان دس لاکھ امریکی اور ڈھائی لاکھ برطانوی فوجیوں کی جانوں کو تلف کر دیتا؟ انتہائی ہولناک تباہی و بربادی لانے والے ایٹم بم کے استعمال کے جواز میں اس قسم کی دلیل نہایت ہی بھونڈی اور عیارانہ تھی جسے تاریخ کے کسی سنجیدہ طالب علم نے تسلیم نہیں کیا۔ ان امریکی فوجیوں کے والدین نے کہ جن کی جانیں بقول چرچل ایٹم بم کی وجہ سے بچی تھیں، افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہماری مسلح افواج کے بحرالکاہل میں شاندار ریکارڈ کو آخر میں اس خوف ناک ہتھیار کے ذریعے وسیع پیانے پر قتل عام کر کے خراب کر دیا گیا ہے۔ بہت سے امریکیوں نے بہت سے یورپیوں کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ امریکہ دنیا کی اخلاقی قیادت کھو بیٹھا ہے۔[2A]

کئی دیانت دار بورژوا مؤرخین نے اینگلوامریکی سامراج کے حقیقی عزائم کا پردہ چاک کیا ہے۔ برطانوی رکن پارلیمنٹ ولیم وار بے کے بیان کے مطابق ''جاپان میں ایٹم بم کی

ہلاکت خیزی کا تجربہ کرنے کا فیصلہ جولائی کے آخری ہفتے میں پوٹسڈم کانفرنس کے دوران کیا گیا تھا۔اس کانفرنس میں جوزف اسٹالن موجود تھالیکن اسے نئے ہتھیار کے متعلق سرسری اطلاع دی گئی تھی اور اسے ایٹم بم کی نوعیت سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا اور اسے یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ اس کا استعمال کس وقت اور کہاں کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ٹرومین نے کیا تھا اور اس سلسلے میں چرچل سے مشورہ خفیہ میٹنگ میں کیا گیا تھا۔ چرچل نے اس میٹنگ میں ٹرومین کو قائل کر لیا تھا کہ جرمنی کی فوجی طاقت کی مکمل تباہی کے بعد یورپ کو اشتراکی انقلاب کا فوری خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ایٹم بم یورپ میں استعمال نہیں ہونا چاہیے بلکہ سوویت یونین کو اس تباہ کن بم کی موجودگی سے مرعوب کرنے کے لیے اسے کسی ایسی جگہ استعمال ہونا چاہیے جہاں یورپیوں اور امریکیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے جاپان کا انتخاب کیا گیا۔''[3]

امریکی مورخ ڈی۔ ایف۔ فلیمنگ لکھتا ہے کہ ''جاپان میں ایٹم بم کے بظاہر غیر ضروری استعمال کا ایک مقصد یہ تھا کہ مشرق بعید میں روس کی کامیابیاں محدود کی جائیں۔ اگر امریکہ کوئی کاروائی نہ کرتا اور اس دوران روسی فوجیں منچوریا اور شمالی چین کے دوسرے علاقوں پر چڑھائی کر دیتیں تو ساری دنیا میں امریکہ کے وقار کو سخت صدمہ پہنچتا۔ پھر یہ تاثر پختہ ہو جاتا کہ پوری جنگ عظیم میں اتحادیوں کی فتح کے لیے روسیوں نے زمین ہموار کی تھی اور یہ کہ روسی افواج ناقابل شکست ہیں۔ علاوہ بریں امریکیوں نے جاپان سے چار سالہ جنگ کے دوران بحرالکاہل کے علاقوں میں جو حیرت انگیز جنگی کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کی چمک دمک بالکل ماند پڑ جاتی۔'' [4]

16 راگست 1945ء کو سوویت حکومت کے اخبار ازویستیا میں ایک روسی مبصر نے لکھا کہ بعض امریکی اخبارات جاپان کے خلاف جنگ میں سوویت یونین کی معاونت کو کم کر کے بیان کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نے ''نیویارک ڈیلی نیوز'' کا حوالہ دیا جس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ ''جنگ تو ایٹم بم کے ذریعے بھی جیتی جا سکتی تھی'' اور یہ بھی کہا تھا کہ ''تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔'' روسی مبصر نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''جنگ کا خاتمہ کسی معجزے سے نہیں ہوا۔ بلکہ سب اتحادیوں کی طاقتور مشترکہ کوششوں سے ہوا ہے۔'' روسی مبصر نے مزید کہا کہ "جنگ کا جلد از جلد خاتمہ کرنا سوویت یونین کا ایک واضح نصب العین تھا۔ جاپانی سامراج کے زوال میں عظیم سوویت معاونت کو تمام امن پسند اقوام تسلیم کرتی ہیں۔''[5]

لیکن ادھر اینگلو امریکی سامراج کو یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جنگ کے اختتام پر سوویت یونین کو یورپ میں بالخصوص اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں بالعموم ایک ناقابل تسخیر قوت کی حیثیت سے جو پذیرائی حاصل ہوئی تھی اس کا توڑ کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ ایک طرف تو سوویت افواج کی کارکردگی گھٹا کر پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف ایٹم بم کی دہشت پھیلا رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سوویت یونین کو جابر اور ظالم قرار دے کر اس کے خلاف پراپیگنڈہ بھی شروع کر دیا تھا۔ مشرقی یورپ میں روس کے زیر اثر قائم ہونے والی اشتراکی حکومتوں پر بھی نکتہ چینی کا آغاز ہو گیا تھا۔ 20؍اگست 1945ء کو برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے دارالعوام میں بیان دیتے ہوئے اعلان کیا کہ ''ہم بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری میں قائم شدہ نئی حکومتوں کو تسلیم نہیں کرتے کیوں کہ ہمارے خیال میں یہ وہاں کی اکثریت کی نمائندہ نہیں ہیں۔ حال کے چند واقعات نے ظاہر کر دیا ہے کہ وہاں پر ایک طرح کے جبر کی جگہ ایک دوسری طرح کا جبر لے رہا ہے۔'' اس کے علاوہ اس نے جنگ میں امریکہ اور روس دونوں کے کردار کو سراہا مگر ساتھ ہی کہا ''لیکن برطانیہ عظمیٰ کے جزائر جن کو ایک مرتبہ چرچل نے بڑی فصاحت کے ساتھ آزادی کا برج قرار دیا تھا، انہیں تاریخ ایک بار پھر سب سے عالی شان مقام دلا سکتی ہے۔''[6] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سی۔ ایل۔ سلز برگر نے 23؍اگست کو ''نیویارک ٹائمز'' میں لکھا کہ "پوٹسڈم کانفرنس کے اختتام اور جاپان کی مکمل شکست کے بعد سے یورپ میں سیاسی توازن میں اب ایک تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی ہے۔ یہاں کے بعض تجربہ کار سفارت کاروں کا خیال ہے کہ معرکہ سٹالن گراڈ کے بعد سے یہ پہلا موقع ہے کہ مغربی جمہورتیوں کو سوویت روس کے مقابلے میں عروج حاصل ہونا شروع ہوا ہے۔ اسے ان تین بنیادی واقعات کے ساتھ منسوب کیا جا رہا ہے جو گزشتہ موسم سرما کے بعد رونما ہوئے ہیں۔ پہلا تو فرینکلن ڈی روزویلٹ کے انتقال کی وجہ سے امریکی حکومت کی تبدیلی اور برطانوی انتخابات میں سوشلسٹوں کی کامیابی کا واقعہ ہے۔ دوسرا واقعہ اینگلو امریکی گروہ کی طرف سے ایٹم بم کی تیاری کا ہے جس سے کم از کم وقتی طور پر ہی سہی، مگر یہ کہ فوجی برتری کی حقیقت آشکارا ہو گئی ہے۔ تیسرا واقعہ جاپان کی جنگ میں روس کی شمولیت ہے جس سے سوویت یونین کی قوت کا بیشتر حصہ ایشیا میں مصروف ہو گیا ہے اور اس کے نتیجے میں یورپ پر روس کے دباؤ میں کمی وقوع پذیر ہو گئی ہے۔'' اس نے مزید لکھا

کہ ''اس حقیقی پس منظر میں جس کی زبانی وضاحت 9/اگست اور 20/اگست کے صدر ٹرومین اور برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کے علی الترتیب بیانات سے ہوتی ہے، جن میں انگریزی بولنے والی جمہوریتوں کی اہم پالیسی کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اب اینگلو امریکی ڈپلومیسی زیادہ پائیدار حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس پر عمل درآمد عیاں اور نہاں دونوں طریقوں سے ہو رہا ہے۔''[7]

نیویارک ٹائمز کے اس تبصرے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ روس کو جاپان کے خلاف جنگ میں ملوث کرنے کے پس پردہ امریکی اور برطانوی عزائم کیا تھے۔ روس کو ایٹم بم کے استعمال کے بارے میں بے خبر رکھا گیا اور ''دیانت دار'' اور ''انضباط اوقات کے پابند'' مارشل اسٹالن کے ساتھ طے کیا گیا کہ روسی افواج 8/اگست کو جاپان کے محاذ پر چڑھائی کر دیں گی۔ چنانچہ روسی افواج کا ایک بڑا حصہ یورپ کے محاذ سے جاپانی محاذ پر منتقل ہو گیا۔ ادھر وہ حسب وعدہ جاپان کے خلاف پیش قدمی میں مصروف ہوا، ادھر امریکہ نے جاپانی شہروں پر ایٹم بم گرادیئے۔ جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب یورپ میں روسی افواج کا وہ دباؤ نہیں رہ گیا تھا جو 8/مئی کو جرمنی کے ہتھیار ڈالنے کے موقع پر موجود تھا۔ اینگلو امریکی سامراجیوں نے یورپ میں روسی اثر و نفوذ کے خلاف تحریک کا آغاز کر دیا ہوا تھا۔ 20/اگست کو ارنسٹ بیون نے جو بیان دیا تھا اس کو دہراتے ہوئے وزیراعظم ایٹلی نے اپنے دورۂ ڈنمارک کے دوران 29/اگست کو کہا کہ ''یورپ سے استبداد کے بھیانک خواب کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لیکن اب اتنا ہی ضروری یہ امر بھی ہے کہ اس کی جگہ کوئی خلا پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ کوئی اس کی جگہ لے لے۔ کہیں سات شیطان ہمارے پلے پڑ جائیں جو پہلے والے ایک شیطان سے بھی برے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سیاسی اور سماجی آزادی، جس کے برطانیہ اور ڈنمارک دونوں علمبردار ہیں، ایک ایسا نصب العین ہے جو ہمیں یورپ کے عوام کے سامنے رکھنا چاہیے۔''[8] اینگلو امریکی سامراجیوں کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف اس مہم کا مطمع نظر خود اس خلا کو پر کرنا تھا جس کا ایٹلی نے ذکر کیا تھا۔

سوویت یونین کو، جس نے یورپ میں فسطائیت کو نیست و نابود کرنے کا اعزاز حاصل کیا تھا، یورپ کے عوام میں بڑی قدر کے ساتھ دیکھا جا رہا تھا۔ سوویت یونین کو اپنی فقید المثال

قوت سے فائدہ اٹھانے سے باز رکھنے کے لیے اینگلو امریکی سامراج کے ہاتھ میں ایٹم بم آ گیا تھا۔ مگر روسی ابھی اسے خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ روسی جریدے ''نیو ٹائمز'' کی ستمبر 1945ء کے پہلے ہفتے کی اشاعت میں امریکی پریس کے اس تاثر کو رد کیا گیا کہ امریکہ نے ایٹم بم کے استعمال کی دھمکی سے پوری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ جریدے نے انتباہ کیا کہ بہت جلد دوسری اقوام بھی اتنی ہی قوت کا ہتھیار ایجاد کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ ایک مضمون کی صورت میں ایم۔ روبن سٹین کا تحریر کردہ یہ پہلا تفصیلی جائزہ تھا جو ایٹم بم کے بارے میں روس کے پریس میں شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ '' درست سوچ کے حامل افراد پر یہ اچھی طرح واضح ہے کہ اس ایجاد سے نہ تو کوئی بین الاقوامی سیاسی مسئلہ اور نہ ہی انفرادی طور پر ممالک کا کوئی اندرونی مسئلہ حل ہو سکے گا۔ جو لوگ بھی اس کے بارے میں کسی فریب کو جگہ دیئے ہوئے ہیں وہ لازماً مایوسی کا شکار ہوں گے۔'' مزید کہا گیا کہ ''ان فاش سامراجیوں نے تاریخ کے اسباق کو فراموش کر دیا ہے۔ انہیں ہٹلر کے دنیا پر تسلط قائم کرنے کے منصوبوں کی ناکامی بھول گئی ہے جن کی بنیاد بھی تکنیکی ترقی کی عارضی برتری کو بروئے کار لانے پر رکھی گئی تھی۔'' مضمون میں یہ بھی کہا گیا کہ دوسرے ملکوں کے سائنسدانوں نے بھی ایٹم توڑنے کے بارے میں تحقیق کی ہے اور وہ اپنی دُگنی توانائیاں صرف کر کے ایسا ہی یا اس سے بھی بہتر ہتھیار ایجاد کر لیں گے۔ مضمون میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی تھی کہ '' ایٹمی توانائی پر کنٹرول کے اختیارات کسی بین الاقوامی ادارے کو تفویض کر دیئے جائیں کیوں کہ اب جب بنیادی اصولوں کا سب کو بخوبی علم ہو چکا ہے تو اس کے بعد سوال یہ ہی رہ گیا ہے کہ کوئی ملک ایٹمی ہتھیار بنانے میں کتنا وقت لے گا۔''[9] اس دوران 6 ر ستمبر کو نیو یارک ٹائمز میں یہ خبر بھی چھپی کہ سوویت سائنسدان یورینیم کی توانائی کو بروئے کار لانے کے مسئلے پر تحقیق کر رہے ہیں۔ ان حالات میں 11 ر ستمبر کو لندن میں پانچ بڑی طاقتوں یعنی امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور چین کے وزرائے خارجہ کا اجلاس شروع ہوا۔ نو مفتوحہ علاقوں کا مستقبل زیر بحث تھا۔ روس سے اپنی باتیں منوانے کے لیے اینگلو امریکی یہ سمجھتے تھے کہ ایٹم بم کا ہوّا مؤثر ثابت ہوگا لیکن ایسا نہ ہو سکا اور یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

امریکی انتظامیہ کے بعض ارکان ایسے بھی تھے جو روس کے ساتھ سودے بازی میں ایٹم بم کے خوف کو براہ راست بروئے کار لانے کے حق میں نہیں تھے۔ چنانچہ جس روز لندن

کانفرنس کا آغاز ہوا، یعنی 11 ستمبر 1945ء کو امریکی وزیر جنگ سٹمسن نے صدر ٹرومین کے نام ایک ذاتی یادداشت بھیجی جس سے جاپان پر ایٹم بم گرائے جانے کے پس پردہ امریکی سامراجیوں کے حقیقی عزائم کا پردہ بھی چاک ہو جاتا ہے۔ سٹمسن نے کابینہ سے ریٹائر ہونے سے ایک ہفتہ قبل یہ یادداشت ٹرومین کو بھیجی جس سے یہ بھی عیاں ہو گیا کہ پوٹسڈم میں روس کو ایٹم بم کے بارے میں لاعلم کیوں رکھا گیا تھا اور یہ بھی کہ اس خونی ڈرامہ رچانے کا اصل مقصد کیا تھا۔ وہ یادداشت کے ساتھ منسلک تعارفی خط میں لکھتا ہے۔ ''آج جب میں آپ کو ایٹم بم کے حوالے سے اپنے اور روس کے تعلقات کے بارے میں یادداشت ارسال کر رہا ہوں تو مجھے وہ گفتگو بھی یاد ہے جو میں نے پوٹسڈم میں اس مسئلے کے بارے میں آپ کے ساتھ کی تھی کہ آیا ہم روس کو ایٹم بم کے معاملے میں اپنے ساتھ شریک کر کے محفوظ رہیں گے کیونکہ وہ اب بھی ایک ''پولیس ریاست'' ہے اور ابھی اس نے ان شرائط پر عمل نہیں کیا ہے جن کے ذریعہ سے شہری فرد کو شخصی آزادی کے حقوق حاصل ہوں گے۔ میں اب بھی اس مشکل کو تسلیم کرتا ہوں اور انفرادی آزادی کے بارے میں روسی رویے میں تبدیلی کی بالآخر اہمیت کا پوری طرح قائل ہوں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ تبدیلی پیدا کرنے کی خاطر ہمارے قبضہ میں موجود ایٹم بم کا براہ راست لیور کے طور پر استعمال کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ میں پوری طرح قائل ہوں کہ ہماری طرف سے روس میں اندرونی تبدیلی کا مطالبہ اگر ایٹمی ہتھیار میں اسے شریک کرنے کی شرط کے طور پر پیش کیا گیا تو وہ اس قدر ناراض ہوگا کہ جو مقصد ہمارے پیش نظر ہے اسے بروئے کار لانا ممکن نہ ہو سکے گا......'' گویا اصل مقصد روس کے اندر موجود معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام کو تبدیل کرانا تھا جس کی خاطر ایٹم بم کا ہوا دکھا کر سودے بازی کرنا اور اشتراکی روس کو بلیک میل کر کے اس سے اپنی شرطیں منوانا تھا۔ سٹمسن کو مقاصد سے تو اتفاق تھا لیکن طریق کار پر اسے امریکی انتظامیہ کے دوسرے ارکان سے اختلاف تھا۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وہ یادداشت میں یوں رقم طراز ہے: ''ایٹم بم کے ظہور سے تمام مہذب دنیا میں بہت زیادہ فوجی اور اس سے بھی زیادہ سیاسی دلچسپی کو تحریک ملی ہے۔ ایسے عالمی ماحول میں جو پہلے ہی طاقت کے معاملے میں بے حد حساس ہے، اس ہتھیار کی آمد نے کُرۂ ارض کے تمام گروہوں کی سیاسی مصلحتوں کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ بہت سے حلقوں میں سمجھا جا رہا ہے کہ یہ یورپ پر روس

کے غلبے کا حقیقی شاخسانہ ہے۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سوویت حکومت کو اس رجحان کا اندازہ ہو گیا ہوا ہے اور سوویت سیاسی اور فوجی رہنماؤں کی یہ شدید تمنا ہو گی کہ وہ کم سے کم ممکن وقت میں اس ہتھیار کو حاصل کر لیں۔ درحقیقت برطانیہ تو پہلے ہی سے اس ہتھیار کی تیاری میں ہمارا شریک کار ہے، اس طرح سے اگر سوویت یونین کو بھی اس میں تعاون اور اعتماد کی بنیاد پر شریک کرنے کے لیے ہماری جانب سے رضا کارانہ طور پر دعوت نہیں دی جاتی تو پھر اس ہتھیار پر قابض ہونے کے ناطے سے ہم اینگلوسیکسن بلاک کو سوویت یونین کے مدمقابل لا کھڑا کریں گے۔ یہ صورت حال سوویت یونین میں اس بم کی تیاری کے لیے ہیجان آمیز سرگرمی کو ابھارنے کا سبب بنے گی جو درحقیقت خفیہ طور پر اسلحہ کی مجنونانہ دوڑ کا روپ دھار لے گی۔ ایسی شہادت موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی سرگرمی کا پہلے ہی آغاز ہو چکا ہوا ہے۔ اگر ہم محسوس کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ضرور محسوس کرنا چاہیے کہ تہذیب کے تقاضے کے تحت ہم ایک نہ ایک روز اس نئی قوت کو کنٹرول کرنے کے لیے کسی معاہدے پر متفق ہو جائیں گے۔ تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ امن کونسل کے فوری مقاصد کے حصول کی امید میں کتنی دیر تک ہم اس وقتی برتری کا لطف اٹھاتے رہیں گے۔ دنیا اور تہذیب کے لیے یہ بات اتنی اہم نہیں ہے کہ آیا روس کو اس کی تیاری کے اہم راز حاصل کرنے میں کم از کم چار سال یا زیادہ سے زیادہ بیس سال لگیں گے جتنا یہ اطمینان حاصل کرنا اہم ہے کہ جب وہ اس کو حاصل کر لے گا تو آیا وہ دنیا کی امن پسند اقوام کے ساتھ خوشی اور تعاون کے ساتھ رہنا پسند کرے گا! یہ درست ہے کہ اگر ابھی اس کے ساتھ رابطہ قائم کیا جائے، جیسا کہ میری تجویز ہے، تو ہم اس کی نیک نیتی کی بنیاد پر ایک جوا لگائیں گے اور یہ خطرہ مول لیں گے کہ وہ بم کو اس وقت سے کچھ پہلے تیار کر لے گا جتنے وقت میں کہ وہ بصورت دیگر کر لیتا۔

''مسئلہ کو مختصر بیان کیا جائے تو میری رائے میں روس کے ساتھ ہمارے تسلی بخش تعلقات کا مسئلہ ایٹم بم کے مسئلہ کے ساتھ محض وابستہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے زیر نگیں ہے۔ ہمارے باہمی تعلقات اگرچہ بے حد اہمیت کے حامل ہیں لیکن ابھی سوائے اس بم کے کنٹرول کے مسئلے کے ان تعلقات میں کسی فوری اہمیت کا عنصر موجود نہیں ہے۔ اس کے اور ہمارے مابین باہمی اعتماد کی بنیاد پر تعلقات کی استواری وقت کی سست رفتاری کے ساتھ بھی آگے بڑھ سکتی

تھی۔لیکن بم کی ایجاد سے ان تعلقات کی ہنگامی بنیادوں پر اشد ضرورت پڑ گئی ہے۔روس کے ساتھ بم کے مسئلہ کو حل کرنے کے بارے میں ہم نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کے نتیجے میں ہمارے تعلقات نا قابل اصلاح حد تک تلخ ہو سکتے ہیں۔کیونکہ اگر ہم فوری طور پر روسیوں کے ساتھ تعلق استوار نہ کر پائے اور اس نئے ہتھیار کو بطور نمود و نمائش پیٹھ پر اٹھا کر ان کے ساتھ محض سودا بازی میں مصروف رہے تو ہمارے مقاصد اور ارادوں کے متعلق ان کے شکوک وشبہات اور بے اعتمادی میں اضافہ ہوگا اس طرح ان میں اس مسئلے کو پوری طرح حل کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرنے کا ولولہ پیدا ہوگا......اگر اسی جذبے سے مسئلہ حل کرنا ہے تو پھر زیادہ امکان یہی ہے کہ جس قسم کا عہد و پیمان مستقبل میں ہماری اشد ضرورت کے لیے درکار ہوگا، شاید ہی ہمارے درمیان استوار ہو سکے گا۔میری رائے میں یہ خطرہ اس دوسرے خطرے سے زیادہ بڑا ہے۔کیونکہ جہاں تک ہمارا مقصد ہے تو ہم بہر طور ایک بہترین قسم کے بین الاقوامی سمجھوتہ کے حصول کے خواہاں ہوں گے جس میں تہذیب کو بچانے اور برقرار رکھنے کا امکان صرف پانچ یا بیس سال کے بجائے ہمیشہ کے لیے موجود ہوگا۔میں نے اپنی طویل زندگی میں جو سب سے بڑا سبق حاصل کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی شخص کو بااعتماد بنانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے اور کسی شخص کو بے اعتماد بنانے کا یقینی طریقہ یہ ہے کہ اس پر اعتماد نہ کیا جائے اور بے اعتمادی کا مظاہرہ کیا جائے...... چونکہ مسئلے کا مرکز روس ہے اس لیے اس ہتھیار کو کنٹرول کرنے کے لیے جو بھی طریقہ وضع کیا جائے اس کا رخ بنیادی طور پر روس کی جانب ہونا چاہیے۔میری اپنی رائے یہ ہے کہ سوویت یونین اس مسئلہ پر امریکہ کی جانب سے اختیار کئے گئے براہ راست اور کھلے طریق کار کا خلوص سے جواب دینے پر مائل ہوگا بہ نسبت اس کے کہ اس طریق کار کو ایک عمومی بین الاقوامی سکیم کا حصہ بنا کر پیش کیا جائے یا یہ امن مذاکرات میں کئی بار کی براہ راست یا بالواسطہ دھمکیوں یا دھمکی آمیز جملوں کے تبادلے کے بعد کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ سوویت یونین کے ساتھ استواری کا طریق کار یہی ہے کہ برطانیہ سے بات چیت کرنے کے بعد ایک براہ راست تجویز پیش کی جائے کہ ہم روسیوں کے ساتھ ایک ایسے بندوبست میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں جس کا عمومی مقصد ایٹم بم کے جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کو کنٹرول اور محدود کرنا ہوگا اور جس حد تک بھی ممکن ہوا ایٹمی طاقت کے پرامن اور انسان

دوست مقاصد کے لیے استعمال کی ہدایت اور حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ پیش کش پھر زیادہ واضح طور پر اس تجویز میں بھی ڈھل سکتی ہے کہ ہم اس بم کی بطور فوجی ہتھیار مزید اصلاح اور پیداوار کو روک دیں گے بشرطیکہ برطانیہ اور روس بھی ایسا ہی کرنے پر رضامند ہوں۔ اس میں یہ بھی شامل کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں اس وقت جتنے بھی بم موجود ہیں ان کو ضبط کر لیا جائے گا بشرطیکہ روس اور برطانیہ بھی اس بات سے متفق ہوں کہ کسی بھی موقع پر وہ یا ہم اس بم کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال نہیں کریں گے تا آنکہ تینوں حکومتیں اس کے استعمال پر اتفاق نہ رکھتی ہوں۔ جوں ہی ہماری سیاسی مصلحتوں کے تحت مناسب ہوا، میں اس راستے کو اختیار کروں گا۔ علاوہ دوسری باتوں کے میں اس پر زور دوں گا کہ روس کے ساتھ یہ معاملہ امریکہ کی جانب سے تجویز کے طور پر اٹھایا جانا چاہیے جسے برطانیہ عظمیٰ کی حمایت حاصل ہو۔ لیکن یہ ہو خصوصی طور پر امریکہ کی تجویز...... دنیا نے اس بم کے استعمال کو امریکہ کی پیش عملی اور پیداواری صلاحیت کا نتیجہ قرار دیا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ پہلو سوویت یونین سے اپنی تجویز منوانے کے لیے ہمارے پاس ایک مؤثر لیور ہے لیکن مجھے شک ہے کہ بین الاقوامی مناظرہ سے کوئی ٹھوس نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''[10]

سٹمسن، جسے امریکہ، سوویت تعلقات میں صلح جو کی حیثیت سے جانا جاتا ہے، اس کے اس تاریخی طویل بیان سے ظاہر ہے کہ ایٹم بم کے ساتھ وابستہ سامراجی عزائم کا جہاں تک تعلق تھا، سٹمسن کو بھی ان سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ بھی ایٹم بم کو اشتراکی روس کے ساتھ سودے بازی میں بطور لیور استعمال کرنے کا خواہاں تھا۔ تاہم وہ صرف طریق کار کے معاملہ میں مختلف نقطۂ نظر کا حامل تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایٹم بم کو کھلے عام بلیک میل کے طور پر استعمال کرنے کے بجائے روس کو اعتماد میں لیا جائے اور ایٹمی ٹیکنالوجی میں اسے اپنے ساتھ شریک کر کے اس کے داخلی نظام اور خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جائے۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح امریکہ کی عالمی برتری کو منوانا آسان ہو گا۔ اس نے امریکی کابینہ سے رخصت ہوتے وقت 19 ستمبر کو اپنی الوداعی تقریر میں کہا کہ ''امریکہ اب نہ صرف اپنی فوجی قوت کے لحاظ سے عروج کی انتہا پر پہنچ گیا ہے بلکہ اسے ساری قوموں پر جو غلبہ اور قیادت حاصل ہوئی ہے اس کی پہلے کوئی مثال موجود نہیں ہے اب جب ہمیں یہ مقام حاصل ہو گیا ہے تو ہمیں یہ اطمینان کرنا چاہیے

کہ ہم اپنی اس حیثیت کو دنیا بھر میں امن وانصاف کے قیام کے لیے بروئے کار لائیں۔"[12]
لیکن سوویت یونین امریکہ کی بالادستی قبول کرنے کے بجائے خود اپنے عالمی وقار پر نازاں تھا جو اس نے بجاطور پر فسطائیت کو شکست فاش دے کر حاصل کیا تھا۔ بے تحاشہ جانی و مالی نقصان اٹھانے کے باوجود وہ جنگ کی بھٹی سے کندن بن کر نکلا تھا اور اس کا سب کو اعتراف تھا۔ اسٹالن نے کہا تھا کہ "اب سب تسلیم کرتے ہیں کہ سوویت عوام نے اپنی قربانیاں دے کر یورپ میں تہذیب کو فسطائی حملہ آوروں سے محفوظ کیا ہے" اور ستمبر 1945ء کے تیسرے ہفتے کی اشاعت میں سوویت جریدے "نیو ٹائمز" نے لکھا کہ سوویت یونین نے عظیم ابتلاء کے حالیہ برسوں میں کہ اس سے پہلے کبھی انسانیت کو اتنا بڑا خطرہ درپیش نہیں ہوا تھا، جو فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے اس کی بدولت فطری طور پر ہمارے ملک کا جو مقام بنتا ہے اسے اختیار کرنے کا اب بعد از جنگ صورتحال میں ہمیں پورا حق حاصل ہے۔"[13] چنانچہ سوویت یونین نے عالمی برتری کے امریکی دعوے کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور اپنے قومی اور بین الاقوامی مفادات کو درپیش نئے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ثابت قدم ہو گیا۔ اس طرح دنیا دو سپر طاقتوں کے مابین کشمکش کے نئے دور میں داخل ہو گئی۔

برطانیہ کا بطور عالمی طاقت زوال اور نئی عالمی طاقت سوویت یونین کا خوف

ان حالات میں زوال پذیر برطانوی سامراج جس کی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوا کرتا تھا اب اسے اپنے تمام مقبوضات میں شام پڑتی نظر آ رہی تھی ایک تو جنگ نے اس کی سامراجی معیشت کو بالکل دیوالیہ کر دیا ہوا تھا۔ دوسرے یہ کہ دنیا میں طاقت کا پرانا توازن بالکل تباہ ہو گیا ہوا تھا اور جن دو طاقتوں کے مابین نئے توازن کے لیے کشمکش ہو رہی تھی ان کے مقابلے میں برطانیہ کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سب کو معلوم تھا اور اس کا برملا اظہار بھی کیا جا رہا تھا کہ اگلے چار پانچ برسوں میں روس کے پاس بھی ایٹم بم موجود ہو گا۔ زوال پذیر برطانوی سامراج جس نے گزشتہ ایک سو برس کے دوران پہلے تو زارِ روس کی توسیع کے خلاف اور پھر اشتراکی روس کے انقلابی اثرات کی راہ روکنے کی خاطر اپنے مقبوضات کے ذریعے نہ معلوم کتنے جتن کیے تھے اب امریکہ کا طفیلی بننے پر مجبور ہو گیا تھا۔ برطانوی سامراجی اس کی

ایٹمی اور فوجی طاقت کو سوویت یونین کا واحد توڑ سمجھتے تھے اور اسی کی طاقت کے بل بوتے پر اپنا عالمی قوت کا سا بھرم برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ جس روز سبکدوش ہونے والے امریکی وزیر جنگ سٹمسن نے اپنی الوداعی تقریر میں امریکہ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت قرار دیا اس سے اگلے روز یعنی 20 ستمبر 1945ء کو واشنگٹن میں برطانیہ کے چیف آف جائنٹ سٹاف مشن، فیلڈ مارشل سر ہنری میٹ لینڈ ولسن نے "بالٹی مورسن" کے نمائندے کو انٹرویو دیا جو بعد میں شمالی امریکی اخباروں کے اتحاد کی جانب سے "نیویارک ٹائمز" اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوا۔ اس میں اس نے کہا کہ سوویت روس اگلے پانچ برس میں ایٹم بم بنالے گا۔ یہ کامیابی سوویت یونین کو بلا مقابلہ دنیا کی سب سے طاقتور قوم بنا دے گی۔ اس نے کہا کہ "اس وقت بھی دنیا کی دو ہی عظیم فوجی طاقتیں ہیں۔ امریکہ اور روس...... یہ برابری اس صورت میں برقرار نہیں رہے گی اگر امریکہ میں اپنی فوج میں تخفیف کا موجودہ رجحان برقرار رہا۔" اس پر اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ "بھاری پیمانے پر قابض افواج کی واپسی اور مستقبل کے لیے ان کی تعداد کو حد درجہ محدود کرنے سے امریکہ روس کے لیے میدان کھلا چھوڑ رہا ہے۔"

فیلڈ مارشل نے مزید خیال ظاہر کیا کہ ایٹمی فارمولا روس کے ہاتھ میں آجانے کے بعد ان قوموں کے درمیان جنگ کا امکان ختم ہو جائے گا جن کے پاس یہ راز موجود ہوگا۔ یا کم از کم وہ جنگ نہیں ہوگی جس میں ایٹم بم استعمال ہوتا ہوگا۔ تاہم اس کو استعمال کئے بغیر ایک بہت بڑی جنگ ہونے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے یہ بھی تشویش ظاہر کی کہ جوں ہی دنیا کا نقشہ بدلنے لگے گا روس درمیانی جگہ کے علاقوں پر قبضہ کر لے گا۔ اس نے کہا کہ "یورپ میں امریکہ کی اپنے غلبہ میں کمی لانے کے رویہ کو دیکھ کر میں بلقان کی ریاستوں کے بارے میں فکر مند ہو گیا ہوں۔ روس کو اس علاقے کا مالک بننے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔" اس نے کہا کہ روس کی طرف سے ایسی کوئی شہادت نہیں مل رہی ہے کہ وہ بھی اپنی افواج میں کمی کرنے کا کوئی رجحان رکھتا ہے جیسا کہ امریکہ میں یہ رجحان پایا جاتا ہے۔ اس نے مزید کہا "اسٹالن نے کہا ہے کہ وہ طاقت کا احترام کرتا ہے اور وہ واقعی ایسا کرتا ہے۔ خود کو کمزور کر کے امریکہ روس کا احترام حاصل نہ کر سکے گا۔ سٹالن کا جہاں جی چاہے گا قبضہ کر لے گا۔"[14]

یعنی زوال پذیر برطانوی سامراجیوں پر روس کا بے حد خوف طاری ہو گیا ہوا تھا۔ امریکیوں کے ایٹم بم سے بھی ان کو تسلی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ روس بھی چار پانچ برس میں ایٹم بم بنالے گا۔ روس کے دبدبے کا یہ عالم تھا کہ فیلڈ مارشل میٹ لینڈ ولسن کے مذکورہ انٹرویو کے منظر عام پر آتے ہی امریکی اور برطانوی حکومتوں نے صفائیاں پیش کرنی شروع کر دیں۔ امریکہ کے سرکاری حلقوں کا کہنا تھا کہ فیلڈ مارشل ولسن نے روس کا نام نہیں لیا بلکہ عمومی طور پر ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی بھی اگلے پانچ برسوں میں ایٹم بم تیار کرسکتی ہے اوراس بات پر زور دیا تھا کہ اقوام متحدہ میں سے کسی کو بھی اپنی فوجی قوت میں اس حد تک کمی نہیں کر دینی چاہیے کہ وہ اپنے عہد (Commitment) کو پورا کرنے کے قابل نہ رہ سکے۔ اسی روز برطانوی وزارت خارجہ کے دفتر نے یہ بیان جاری کیا کہ ''اگرچہ فیلڈ مارشل ہنری میٹ لینڈ کے مذکورہ انٹرویو کا مکمل متن ابھی موصول نہیں ہوا ہے۔لیکن اس دوران یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ فیلڈ مارشل نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بلاشبہ خالصتاً اس کے اپنے ذاتی خیالات ہیں اور حکومت برطانیہ کی ترجمانی نہیں کرتے۔''[15] برطانوی حکومت کی اس خفت آمیز وضاحت کا مقصد یہ بھرم رکھنا تھا کہ برطانیہ اب بھی ایک ایسی مضبوط عالمی طاقت ہے جو روس سے خائف نہیں ہے اور نہ ہی وہ امریکہ کے طفیلی کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن یہ بھرم رکھا نہ جا سکا۔ وہ روس کی یورپ میں حاصل کردہ فاتحانہ قوت سے پہلے ہی خائف تھے اب اس کے ایٹمی طاقت بن جانے کے امکان نے ان کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ برطانوی فیلڈ مارشل کے مذکورہ بیان کے تیسرے روز یعنی 23 ستمبر کو برطانوی حکومت کے بورڈ آف ٹریڈ کے صدر سر سٹیفورڈ کرپس نے نیوکاسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوچنا بالکل لغو ہو گا کہ ایٹم بم کے راز کو خفیہ رکھا جا سکتا ہے۔ یا یہ کہ اس کو تیار کرنا اتنا مشکل یا مہنگا ہو گا کہ کوئی بڑا ملک اس کے استعمال کی راہ اختیار کرنے سے گریز کرے گا۔ اس نے مزید کہا کہ ''اگر آئندہ دس برس یا اس کے بعد مزید کوئی جنگ لڑی گئی تو یہ یقینی ہے کہ متحارب گروہوں کے پاس اس سے بھی زیادہ تباہ کن ایٹم بم موجود ہوں گے جس کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر کوئی اور جنگ ہوئی تو ہماری تہذیب کے بالکل پرخچے اڑ جائیں گے۔''[16]

ان حالات میں جب کہ برطانوی سامراجیوں کی طرف سے یہ واویلا مچایا جارہا تھا کہ روس کے ایٹمی طاقت بن جانے کے بعد ساری تہذیب تباہ و برباد ہوجائے گی اور یا یہ کہ روس ساری دنیا پر چھا جائے گا، 26 ستمبر کو سوویت حکومت کے اخبار ''ازویستیا'' نے اپنے تبصرے میں برطانوی فیلڈ مارشل سر ہنری میٹ لینڈ کے مذکورہ بالا انٹرویو پر کڑی تنقید کی اور اسے احمقانہ قرار دیا۔ تبصرے میں کہا گیا کہ ''یہ رجعت پسندوں اور سیاسی طور پر دیوالیہ شدہ لوگوں کی طرف سے شور و غل مچانے اور بور کر دینے والے آرکسٹرا کی سارنگی سے نکلی ایک تھکی ماندی تال ہے جو وہ سوویت یونین کے خلاف ہٹلر کے سروں میں بجا رہے ہیں۔'' تبصرہ نگار نے فیلڈ مارشل کے بیان کو دوسرے بلکہ تیسرے درجہ پر ساتھ دینے والی تال قرار دیا۔ اس نے مزید کہا کہ ''یہ ان لوگوں کی سوچ کی عکاسی ہے جن کو یہ خوف ہے کہ سوویت یونین جنگ عظیم دوم میں سے فروتر فوجی اور معاشی قوت کے ساتھ ابھرا ہے۔''[17] یہ تو حقیقت تھی کہ سوویت یونین جنگ میں سرخروئی حاصل کرنے کی بدولت پہلے سے زیادہ طاقت ور حیثیت کا مالک بن گیا تھا لیکن زمانۂ جنگ کی اپنی فوج میں تخفیف کرنے کا اس کا بھی پروگرام تھا۔ جنگ کی شدید تباہ کاری کا مقابلہ کرنے کے بعد اب سوویت یونین کو اپنی افرادی قوت کو ملکی تعمیر نو کے مختلف منصوبوں میں لگانے کی بھی ضرورت تھی چنانچہ انہی دنوں ایک امریکی سینیٹر کلاڈ پیپر کے ساتھ ملاقات کے دوران سوویت یونین کے سربراہ جوزف اسٹالن نے انکشاف کیا کہ روس نے چھ ماہ ہوئے امریکہ سے چھ ارب ڈالر کا قرضہ مانگا تھا۔ ملنے کی صورت میں اسے فوجی مقاصد کے لیے نہیں بلکہ ملکی تعمیر نو پر خرچ کیا جائے گا۔ اسٹالن نے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ہم نے اپنی افواج میں تیس سے چالیس لاکھ افراد کی تخفیف پہلے ہی کر دی ہوئی ہے اور تخفیف کا یہ عمل اسی طرح جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ سرخ فوج اپنے ایک تہائی کے برابر پہنچ جائے گی۔ اسٹالن نے اس امریکی سینیٹر سے یہ بھی کہا کہ اب جب کہ ہم نے اپنی مشترکہ کوششوں سے اپنے مشترکہ دشمنوں کو شکست دے دی ہے تو اب ہمارے اور تمہارے ملک کو زمانہ امن میں باہمی تعاون کی نئی مشترکہ بنیاد دریافت کرنی چاہیے۔''[18] لیکن یہ مشترکہ بنیاد دریافت نہ ہوسکی۔ دونوں سپر طاقتوں کے مابین تضاد شدید ہوتا چلا گیا۔ دریں اثنا سوویت یونین کے ایک کمانڈر مارشل زوکوف کا دورۂ امریکہ جو 5 راکتوبر سے شروع ہونے والا تھا، 2 راکتوبر کو اس کی منسوخی کا اعلان کر دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ مارشل موصوف علیل ہو گئے ہیں۔ مارشل زوکوف اور امریکی کمانڈر آئزن ہاور نے برلن کے محاذ پر اکٹھے کام کیا تھا۔ آئزن ہاور سوویت یونین کا دورہ کر چکا تھا اور اب اس کے جواب میں زوکوف نے امریکہ کا دورہ کرنا تھا جو منسوخ کر دیا گیا۔

مغربی بلاک اور سوویت یونین کے مابین نئے توازن کے لیے مصالحانہ کوششوں کی ناکامی

اس دوران لندن میں ہونے والی پانچ بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس بھی ناکام ہو گئی۔ درحقیقت جب 11 ستمبر کو اس کانفرنس کا آغاز ہوا تو اس سے پیشتر ہی اس کی ناکامی کا سامان تیار ہو چکا ہوا تھا۔ جولائی میں پوٹسڈم برلن میں منعقدہ تین بڑی طاقتوں یعنی امریکہ، روس اور برطانیہ کے سربراہی اجلاس کے فیصلے کے مطابق وزرائے خارجہ کی یہ کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ پوٹسڈم کانفرنس کے انعقاد کے وقت روس کو دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت تسلیم کیا جا رہا تھا۔ اب لندن کی مذکورہ کانفرنس کے انعقاد تک یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ اب امریکہ کے ہاتھ میں ایٹم بم تھا اور مغربی سامراجی اس کے زعم میں روس کی قوت کو محدود کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے ہوئے تھے۔ ان کے مابین نئے نئے اتحاد وجود میں آ رہے تھے اور سیاسی قوت کے مظاہرے کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔

روسی خطرہ کے مقابلے کے لیے مغربی یورپ کو متحد کرنے کی جانب اقدام کے طور پر سب سے پہلے برطانیہ اور فرانس نے باہمی اتحاد کے معاہدہ کا منصوبہ بنایا۔ لندن کانفرنس کے آغاز سے ایک روز قبل یعنی 10 ستمبر کو فرانس کے جنرل ڈیگال نے ''ٹائمز۔لندن'' کے خصوصی نمائندے کے ساتھ ایک تفصیلی انٹرویو میں اس معاہدہ کی اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس نے فرانس اور برطانیہ کے مابین بہت سی مشترکہ خصوصیات گنوائیں جو اس اتحاد کی مشترکہ بنیاد بن سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک ڈیگال نے یہ بھی گنوائی کہ ''برطانیہ اور فرانس دونوں مغربی یورپ کی طاقتیں ہیں اور دونوں ہی سامراجی ہیں (کہ اور کوئی موزوں لفظ نہیں ہے) اور دونوں جمہوری ہیں۔ اس طرح کہ دونوں کی تہذیب اور اداروں کی بنیاد انسانی شخصیت کے احترام پر رکھی گئی ہے۔'' اس نے جرمنی کے روہر اور رائن لینڈ کے علاقے کے کوئلے اور لوہے کے عظیم

ذخائر کو نہ صرف اینگلو فرانسیسی اتحاد بلکہ مغربی یورپ کے تمام ملکوں کے اتحاد کی معاشی بنیاد قرار دیا کہ اس پر ان کی صنعتی ترقی اور معاشی طاقت کا انحصار تھا۔‘‘[19] ڈیگال کی اس تجویز پر سوویت یونین کے ردعمل کا اظہار ریڈ آرمی کے اخبار ریڈ سٹار کے کالم نویس کانسٹنٹائن گاف مین نے اس کی 14 ستمبر کی اشاعت میں کیا۔ اس نے الزام لگایا کہ مغربی ممالک کے بعض حلقوں کی جانب سے کرائمیا اور پوٹسڈم میں کئے گئے یورپ کی جمہوری تنظیم نو کے بارے میں فیصلوں پر نظرثانی کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس نے برطانیہ اور فرانس کے مابین اتحاد کے مجوزہ معاہدہ پر کڑی تنقید کرتے ہوئے اسے اقوام متحدہ کے اغراض ومقاصد کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا۔ اس نے کہا کہ مغربی بلاک بنانے کی یہ تجویز مغربی ممالک کے لیے سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک کو شجر ممنوعہ بنا دے گی۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ فرانس کا سابقہ سوشلسٹ وزیراعظم لیون بلوم (Leon Blum) مغربی طاقتوں کے سوویت یونین کے خلاف بلاک بنانے کے تصور کو فروغ دے رہا تھا اور اس نے اس کے 24 اگست کے ایک بیان کا حوالہ بھی دیا کہ روس جمہوریت پسندوں کی توقعات پر پورا نہیں اترا اور یورپی جمہوریت کی وہ سمت نہیں ہے جو سوویت یونین کی ہے۔ گاف مین نے توقع ظاہر کی کہ اگر مخالف اثرات کو جگہ نہ دی جائے تو مستقل بین الاقوامی امن کے قیام کے امکانات اب اس سے کہیں زیادہ ہیں جتنے کہ جنگ عظیم اول کے اختتام پر تھے۔ اس وقت اتحاد بھی نہیں تھا اور دو بڑی طاقتوں یعنی روس اور امریکہ نے بعد از جنگ تنظیم نو میں بھی حصہ نہیں لیا تھا اور وہ تنظیم نو اینگلو فرانسیسی یورپی تعاون کی متزلزل بنیادوں پر استوار ہوئی تھی۔‘‘[20]

’’ریڈ سٹار‘‘ کے اس ردعمل پر فرانس کے حلقوں کی جانب سے 16 ستمبر کو ردعمل کا اظہار کیا گیا۔ ان حلقوں کا کہنا تھا کہ جنرل ڈیگال کے بیان میں اس قسم کی کوئی بات نہیں کی گئی تھی کہ جس کا مطلب یہ لیا جاتا کہ مغربی ممالک کا کوئی بلاک روس کے خلاف تشکیل کیا جا رہا ہے۔ سابق فرانسیسی وزیراعظم لیون بلوم نے ’’لی پاپولر‘‘ (Le Populaire) میں ایک مضمون لکھ کر اپنی صفائی پیش کی جو عذر گناہ بدتر از گناہ کے مترادف تھی۔ اس کو صرف ’مغربی بلاک‘‘ کی اصطلاح سے اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ’’اس قسم کی گروپنگ کو ’’مغربی گھرانا‘‘ قرار دیا جانا چاہیے۔ ایک گھرانے کے ارکان کے مابین قریبی تعلقات کسی طور پر بھی سوویت دشمن نوعیت

کے حامل نہیں ہو سکتے۔"[21]

ان حالات میں جب کہ روس اور فرانس کے مابین یہ بحث چل نکلی ہوئی تھی، لندن میں وزرائے خارجہ کی کانفرنس شدید اختلافات کا شکار ہو گئی۔ پہلا اختلاف اٹلی کی نو آبادیوں کے کنٹرول کے بارے میں پیدا ہوا۔ ان میں ''تریپولی تانیہ'' کی ٹرسٹی شپ کے مسئلے پر سوویت یونین کا مؤقف یہ تھا کہ یہ علاقہ اس کی ٹرسٹی شپ میں دے دیا جائے جب کہ امریکہ چاہتا تھا کہ اس پر مشترکہ ٹرسٹی شپ قائم کی جائے۔ 18 ستمبر کو ایک پریس کانفرنس میں روسی وزیر خارجہ مولوٹوف نے اپنے مؤقف کی وضاحت میں کہا کہ اس سے پہلے کئی ملکوں کی طرف سے انفرادی سطح پر مختلف علاقوں پر ٹرسٹی شپ یا مینڈیٹ کے قیام کا تجربہ موجود ہے۔ جب کہ مشترکہ طور پر کئی ملکوں کا مل کر کسی علاقے پر ٹرسٹی شپ قائم کرنے کا کوئی تجربہ موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں مولوٹوف کی طرف سے یہ عندیہ بھی ملا کہ سوویت یونین بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع اری ٹیریا کے علاقے میں بھی دلچسپی رکھتا ہے۔

کانفرنس میں دوسرا اہم اختلاف بلقان کی ریاستوں کے ساتھ امن کے معاہدے طے کرنے کے مسئلے پر پیدا ہوا۔ جنگ میں مشرقی یورپ کی فاشسٹ حکومتوں نے نازی جرمنی کے ساتھ مل کر روس پر حملہ کیا تھا۔ اب ان ریاستوں میں سوویت یونین کی حامی حکومتیں قائم ہو چکی ہوئی تھیں اور سوویت یونین چاہتا تھا کہ اتحادی طاقتیں ان ریاستوں کی حکومتوں کو تسلیم کر لیں اور انہیں ان کے ساتھ امن معاہدے کر لینے چاہئیں۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ جو کہ جنگ بندی کے معاہدے پر دستخط کرنے والی تین بڑی طاقتوں میں سے تھے بلغاریہ اور رومانیہ کی حکومتوں کو غیر نمائندہ قرار دے رہے تھے اور ان کے ساتھ امن معاہدہ طے کرنے پر تیار نہ تھے۔ فرانس اور چین بھی اس معاملے میں ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ اس پر مالوٹوف نے ان طاقتوں کو الزام دیا کہ وہ اس علاقے میں روس مخالف حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ہنگری، رومانیہ اور بلغاریہ میں جمہوری اور نمائندہ حکومتیں قائم ہیں اور عنقریب منعقد ہونے والے انتخابات کے بعد ان کی جمہوری حیثیت میں مزید اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن اگر ضرورت ہے تو وہ یہ ہے کہ جلد از جلد یونان میں انتخابات منعقد کرائے جائیں اور وہاں نمائندہ حکومت قائم کی جائے۔ یاد رہے کہ یونان برطانیہ کے زیر اثر تھا چنانچہ اس سے اینگلو امریکی حلقۂ اثر اور

سوویت حلقۂ اثر کے مابین تضاد کی شدت کا اظہار ہوا۔ اسی طرح جاپان کے بارے میں سوویت یونین کا مؤقف یہ تھا کہ وہاں اسی طرح اتحادی کنٹرول کمیشن مقرر کیا جائے جیسا کہ جرمنی کے لیے مقرر کیا گیا ہے تا کہ زیادہ مؤثر کنٹرول قائم کیا جا سکے۔ جب کہ مغربی ممالک اسے محض سودے بازی کا نکتہ قرار دے رہے تھے۔

علاوہ ازیں ایران سے روسی اور برطانوی افواج کے انخلاء کی تاریخ کے بارے میں بھی روسی وزیر خارجہ مالوٹوف اور برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کے مابین اختلاف پیدا ہوا۔ روس، برطانیہ اور ایران کے مابین طے شدہ معاہدہ کے مطابق ایران سے روسی اور برطانوی افواج کی واپسی کا عمل جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے چھ ماہ بعد شروع ہونا تھا۔ اس کے مطابق یہ تاریخ 2/مارچ 1946ء تھی۔ لیکن اب برطانیہ اصرار کر رہا تھا کہ افواج کا انخلاء دسمبر 1945ء کے وسط میں شروع ہوجانا چاہیے۔ لیکن مالوٹوف نے اس تجویز کو سختی سے رد کر دیا اور کہا کہ معاہدہ کے طے شدہ نظام اوقات کی پابندی کی جائے گی۔ اسی طرح اور بھی کئی چھوٹے موٹے مسائل پر روس اور اینگلو امریکی بلاک کے مابین اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ [22]

فرانس اور چین (نیشنلسٹ) جو نہ تو پوٹسڈم کانفرنس میں شامل کیے گئے تھے اور نہ ہی جنگ بندی کے معاہدے میں فریق بنے تھے، لندن کی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں شریک کر لیے گئے تھے کہ وہ اپنی دلچسپی کے موضوعات میں حصہ لے سکیں۔ لیکن انہوں نے بعض غیر متعلقہ معاملات میں بھی ٹانگ اڑائی اور سوویت یونین کا گھیراؤ کرنے میں امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ بلقان کی ریاستوں اور اطالوی نو آبادیوں کی ٹرسٹی شپ وغیرہ ایسے مسائل تھے جو پوٹسڈم کانفرنس کے مطابق صرف روس امریکہ اور برطانیہ کے مابین ہی طے پانے تھے۔ مگر فرانس اور چین ان میں بھی فریق بن گئے۔ جب کہ یورپ کے امن معاہدوں سے چین کا کوئی واسطہ نہ تھا اور فرانس کے جنرل ڈیگال نے برطانیہ کے ساتھ مل کر مغربی بلاک بنانے کی تحریک شروع کر دی تھی۔ اب کانفرنس میں ان چاروں نے مل کر سوویت وفد کو زچ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ 21/ستمبر کو مالوٹوف نے کہا کہ ''آپ سمجھتے ہیں کہ میں کوئی مجرم ہوں جسے مقدمے کے لیے لایا گیا ہے۔'' [23] چنانچہ ان حالات میں سوویت یونین نے 22/ستمبر کو کانفرنس میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ 11/ستمبر کے اس فیصلے کو منسوخ کیا جائے جس کے

مطابق فرانس اور چین کو شریکِ کانفرنس کیا گیا تھا تاہم ان سے متعلقہ مسائل پر بحث میں ان کو حصہ لینے اور ان سے متعلقہ معاہدوں پر دستخط کرنے کے لئے ان کو شریک کیا جا سکتا تھا۔ امریکی وزیر خارجہ نے مخالفت کرتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ارکان کی یورپ کے امن معاہدوں میں شرکت کو محدود کرنا غیر مناسب ہوگا۔ اس نے زیادہ دلچسپی رکھنے والے تمام ممالک کی ایک بڑی کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کردی۔ سوویت وفد کے ارکان نے یہ کہہ دیا کہ اس بارے میں اپنی حکومت سے براہِ راست مشورہ کئے بغیر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہاں آ کر کانفرنس تعطل کا شکار ہوگئی۔

مغربی ذرائع ابلاغ نے معطلی کی تمام تر ذمہ داری سوویت یونین پر ڈالنی شروع کر دی۔ اصل بات یہ تھی کہ نئے اور پرانے سامراجی ممالک مل کر کوشش کررہے تھے کہ عالمی جنگ جیتنے والی حقیقی قوت یعنی سوویت یونین کو جس قدر محدود اور محروم کیا جا سکے کیا جائے جبکہ سوویت یونین تاریخ میں مغرب کی طرف سے کئی مرتبہ یلغار کا سامنا کرنے کے بعد اب اپنے دفاع کا بندوبست بحیرہ روم تک کرنا چاہتا تھا۔ 23 ستمبر کو پراودا نے بحیرہ روم میں سوویت مفادات کے مستقبل کے حوالے سے لکھا کہ ”دنیا میں جغرافیہ کی کسی کتاب یا مینوول (Manual) میں یہ کہیں نہیں لکھا ہوا کہ بحیرہ روم ایک برطانوی سمندر ہے اور اٹلی کی نو آبادیاں برطانوی علاقے ہیں۔“ اسی طرح یکم اکتوبر کے ازویستیا نے لکھا کہ ”بعض برطانوی اخبارات کی جانب سے رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری کی جمہوری حکومتوں کے خلاف چلائی گئی مہم کا مقصد بلاشبہ اور کچھ نہیں کہ یونان جیسے ملکوں کی جانب سے توجہ ہٹائی جائے جہاں لوگوں کی واضح اکثریت جبر کا شکار ہے۔ نہ کہ عوام دشمن اقلیت۔“ یاد رہے کہ یونان برطانیہ کے زیر اثر تھا اور وہاں غیر نمائندہ حکومت قائم تھی۔ مغربی ذرائع ابلاغ اس کو ہدف تنقید بنانے کے بجائے رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری کے خلاف پراپیگنڈہ کررہے تھے کہ وہاں اقلیتوں کے حقوق سلب کیے جارہے ہیں اور یہ کہ جمہوریت کی حقیقی آزمائش اقلیتوں کے حقوق ہی میں مضمر ہے۔ اس دوران جب کانفرنس 22 ستمبر کو تعطل کا شکار ہوگئی تو برطانوی وزیر اعظم ایٹلی اور امریکی وزیر خارجہ بائرنز نے سوویت وزیر اعظم اسٹالن کو ذاتی خطوط ارسال کئے کہ مشرقی یورپ کے سابق فاشسٹ ممالک کے ساتھ مذاکرات سے فرانس کو خارج کرنے پر زور نہ دیں۔ لیکن اسٹالن کی طرف سے فوری جواب

موصول ہو گیا جو صاف انکار پر مبنی تھا۔[24]

تاہم 2 / اکتوبر کو سوویت وفد کی جانب سے ایک کوشش کی گئی تاکہ طریقِ کار کا مسئلہ جسے کانفرنس کی ناکامی کا سبب قرار دیا جا رہا تھا، دور ہو جائے۔ سوویت وفد نے تجویز پیش کی کہ کانفرنس میں ہونے والے فیصلوں کے مسودوں پر اس طور سے دستخط ہونے چاہئیں کہ:

1۔ امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور چین کے وزیر وزارتی کونسل کے ان فیصلوں کے مسودے پر دستخط کریں گے جنہیں پانچوں ارکان کی منظوری حاصل ہو گی۔

2۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے وزیر وزارتی کونسل کے ان فیصلوں کے مسودے پر دستخط کریں گے جو اٹلی کے ساتھ معاہدۂ امن سے متعلق ہوں گے۔

3۔ امریکہ، برطانیہ اور روس کے وزیر وزارتی کونسل کے ان فیصلوں کے مسودے پر دستخط کریں گے جن کا تعلق رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری کے ساتھ معاہدۂ امن کے ساتھ ہو گا۔

4۔ برطانیہ اور روس کے وزیر وزارتی کونسل کے ان فیصلوں کے مسودے پر دستخط کریں گے جو فن لینڈ کے ساتھ معاہدۂ امن کے ساتھ متعلق ہوں گے۔

لیکن سوویت وفد کی ان تجاویز کو قبول نہ کیا گیا اور اس طرح دوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے کے بعد ہونے والی بڑی طاقتوں کی یہ پہلی امن کانفرنس 2 / اکتوبر کو کسی فیصلے پر پہنچے بغیر اپنے ناکام انجام کو پہنچ گئی۔

اس کی ناکامی کی وجوہات کا تذکرہ کرتے ہوئے سوویت حکومت کے سرکاری اخبار ازویستیا نے لکھا کہ کامریڈ مالوٹوف نے اس کا اصل سبب یہ بتایا ہے کہ معاہدۂ برلن (پوٹسڈم) کے بارے میں مختلف نقطۂ نظر اختیار کر لیا گیا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے وفود کا کردار لندن میں وہ نہیں رہا جو دو ماہ پیشتر برلن میں تھا۔ برلن میں صدر ٹرومین اور وزیر اعظم ایٹلی نے جو کچھ تسلیم کیا تھا اور جس پر دستخط کئے تھے اب لندن میں بائرنز اور بیون نے اس پر شک و شبہ کے بادل چڑھا دیئے ہیں۔ سوویت وفد نے لندن میں بار بار یہ مطالبہ دہرایا کہ تین طاقتوں کے مابین ہونے والے معاہدۂ برلن کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی پوری طرح پابندی ہونی چاہیے۔ اخبار نے مزید لکھا کہ جو کچھ لندن میں ہوا ہے اس کی نزاکت کا پوری طرح اندازہ ہونا چاہیے۔ اگر امریکی اور برطانوی حکومتوں نے آئندہ پھر کبھی اسی قسم کے

رویے پر زور دیا جو پہلے سے کئے گئے سہ فریقی معاہدوں سے بالکل ہم آہنگ نہ ہوا، تو پھر تینوں طاقتوں کے مابین تعاون کی بنیادیں ہل کر رہ جائیں گی۔ ادھر فرانس کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کانفرنس کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جب کبھی روسی دوبارہ مذاکرات پر آمادہ ہوئے تو وہ پھر سے ''تین بڑوں'' کے انداز کو اختیار کریں گے۔ ترجمان نے مزید کہا کہ اگر روسیوں کو یہ اندیشہ تھا کہ کانفرنس میں امریکہ کی پشت پناہی سے ایک مغربی بلاک ابھر رہا ہے تو روسیوں کی طرف سے فرانس کو نکال باہر کرنے کی کوشش نے فرانسیسیوں کے اس خیال کو تقویت دی ہے کہ مغربی یورپ کی اقوام کے مابین قریبی تعلق ہونا چاہیے۔ ادھر ''پراودا'' کا تبصرہ یہ تھا کہ اگر معاہدۂ امن میں شامل ممالک کا دائرہ وسیع کرنے کی واقعی ضرورت تھی تو پھر اس میں یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کو بھی شامل کیا جانا ضروری تھا کیونکہ مشرقی یورپ کی فسطائی حکومتوں کے خلاف انہوں نے بھی بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ روسی جریدے ''نیوٹائمز'' کا کہنا تھا کہ بلغاریہ، رومانیہ، یوگوسلاویہ اور ہنگری کی جمہوریتوں کی عوامی پالیسیوں کا یونان کے ملوکیت اور فسطائیت کے علمبردار حکمران دھڑے کی عوام دشمن داخلی و خارجی پالیسی کے ساتھ موازنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ کہاں نمائندہ اور کہاں غیر نمائندہ حکومتیں قائم ہیں۔ [25]

اس طرح لندن کانفرنس کی ناکامی کے بعد مغربی بلاک اور مشرقی بلاک کے تضاد نے شدت اختیار کر لی اور مذکورہ بلاکوں نے آہستہ آہستہ واضح شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ دنیا میں طاقت کا نیا توازن قائم ہو رہا تھا۔ مغربی یورپ کی زوال پذیر سامراجی طاقتیں اپنی رہی سہی ساکھ اور مفادات بچانے کی فکر میں تھیں اور اپنے لیے سوویت یونین کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتی تھیں۔ جنگ میں معاشی طور پر دیوالیہ ہو جانے کے بعد وہ امریکہ کا دست نگر بننے پر مجبور تھیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھرم بھی رکھنا چاہتی تھیں کہ وہ امریکہ کی طفیلی نہیں ہیں۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے کے دوران برطانیہ کے ایک جریدے ''دی نیو سٹیٹسمین اینڈ نیشن' نے لکھا کہ ''مغربی بلاک کا بڑا مقصد امریکی سرمایہ داری کے خلاف اپنے معاشی تحفظ کا حصول ہے کیونکہ امریکہ، انگلینڈ کو اپنے ایک طفیلی کی حیثیت تک محدود کر دینے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے 11 راکتوبر کو ''ازویستیا'' نے لکھا کہ ''خواہ مغربی بلاک امریکہ کے خلاف قائم ہو رہا

ہے۔ یا سوویت یونین کے خلاف ہر دو صورتوں میں اس کا منفی کردار برقرار رہتا ہے کہ اس کا مقصد امن پسند اقوام کے درمیان پھوٹ ڈالنا اور لڑائی کا بیج بونا ہے۔"[26] گویا ابھی سوویت یونین بھی برطانیہ کو اپنے لیے ایک بڑا خطرہ تصور کرتا تھا اور اس امر کا پوری طرح ادراک نہیں کر پایا تھا کہ برطانیہ عالمی طاقت کی حیثیت سے بالکل دیوالیہ ہو چکا ہوا ہے۔ اسی لیے سوویت یونین میں برطانیہ کے خلاف امریکہ کے ساتھ کچھ رعایت برتے جانے کا رویہ بھی موجود تھا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ برطانیہ اب اپنی نجات امریکہ کی ایٹمی اور فوجی طاقت کی چھتری کے سائے میں تلاش کر رہا تھا اور مغربی بلاک کی تشکیل بھی اسی کا شاخسانہ تھا۔

سوویت یونین کے خلاف زوال پذیر برطانیہ اور نئے ابھرتے امریکی سامراج کا مشترکہ محاذ

دنیا میں ہر طرف یہ تاثر دیا جانے لگا کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت امریکہ ہے۔ اس کی اس حیثیت کا راز اس حقیقت میں سمجھا جا رہا تھا کہ ایٹم بم پر اس کی اجارہ داری قائم ہے۔ 18/اکتوبر کو صدر ٹرومین نے اعلان کیا کہ "ہم ایٹم بم بنانے کی ٹیکنالوجی کسی دوسرے ملک کو نہیں دیں گے۔ محض اس کے علم سے آگاہی ہونا کسی ملک کے لیے بھی سودمند نہ ہوگا کیونکہ صرف امریکہ ہی وہ واحد ملک ہے جس کے پاس بم بنانے کے لیے ضروری صنعتی استعداد اور وسائل موجود ہیں۔" اس نے یہ بھی کہا کہ "اگرچہ ہم نے اس مؤقف کو اختیار کرنے کے بارے میں برطانیہ اور کینیڈا کے ساتھ جو کہ ایٹم بم کی تیاری میں ہمارے حصہ دار ہیں، مشورہ نہیں کیا ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ ان کا مؤقف بھی وہی ہوگا جو امریکہ کا ہے۔"[27] اس سے دو روز پیشتر امریکی وزیر خارجہ کے ایک مشیر جان فاسٹر ڈلس نے لندن کانفرنس کی ناکامی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اعلان کیا تھا کہ " ہم دنیا کی وہ واحد عظیم قوم ہیں جس کے عوام جسمانی اور روحانی اعتبار سے کھوکھلے نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم قانون کو رہنما اصول کے طور پر بحال کروانے کی قیادت کریں کہ جنگ کے دوران قانون اور اخلاق پسِ پشت ڈالے جا چکے ہیں۔"[28] گویا اب دنیا میں قانون اور اخلاق کی ٹھیکہ داری کے علمبردار وہ بن گئے تھے جنہوں نے بلا جواز ہیروشیما اور ناگاساکی کے لاکھوں نہتے عوام کو چشم زدن میں بھون

کر رکھ دیا تھا۔ درحقیقت وہ اپنی تباہ کن قوت کا مظاہرہ کر کے ساری دنیا پر اپنا سامراجی تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ جنگ عظیم میں یورپ کی زوال پذیر سامراجی طاقتوں کی بالکل کمر ٹوٹ گئی تھی اس لیے ان کی طرف سے میدان صاف تھا۔ رہا سوویت یونین تو ابھی اس کے پاس ایٹم بم نہیں تھا اور اس کی تیاری میں اسے کچھ وقت درکار تھا۔ چنانچہ ایسا وقت آنے سے پہلے امریکہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی فوجی قوت کا دائرۂ کار اس قدر وسیع کر لے کہ نہ صرف سوویت یونین کی طاقت کا مقابلہ کر سکے بلکہ دنیا بھر میں اٹھنے والی انقلابی تحریکوں کو کچل سکے۔

9/اکتوبر کو امریکہ کے چیف آف سٹاف جنرل جارج۔سی۔مارشل نے اپنی حکومت کو ایک رپورٹ پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر اس مرتبہ بھی امریکی قوم نے جنگ کے خاتمے کے بعد ہتھیار اٹھا کر رکھ دیئے اور اپنی افرادی قوت اور ذہنی قوت کے وسائل کو برقرار نہ رکھا تو وہ ایک ایسی تباہ کاری کو دعوت دے گی جس کے سامنے جنگ عظیم دوم ماند پڑ جائے گی۔ اس نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کوئی قوم اپنا مؤثر دفاع اسی صورت میں برقرار رکھ سکتی ہے کہ اس نے اپنی جارحانہ قوت برقرار رکھی ہو۔ اس نے اپیل کی کہ "فوجی تربیت کا ایک ایسا عالمگیر نظام قائم کیا جائے جس کے ذریعے امریکہ کسی بین الاقوامی بحران کے پیدا ہونے کی صورت میں ایک سال کے اندر چالیس لاکھ کی فوج تیار کر سکے۔"[29] گویا ایٹمی قوت کے ساتھ ساتھ روایتی فوجی قوت میں اضافہ پر بھی زور دیا جا رہا تھا تا کہ عالمی سطح پر فوجی دائرۂ کار کو بڑھایا جا سکے۔ امریکہ جو ابھی تک دنیا کے دوسرے خطوں بالخصوص ایشیا اور افریقہ کے معاملات میں بہت کم براہ راست ملوث ہوتا تھا اب یورپی سامراجی طاقتوں کے ماند پڑ جانے اور سوویت یونین کی فتح مند حیثیت سے ابھر آنے کے بعد ایشیا اور افریقہ میں سرگرم عمل ہونا چاہتا تھا اور اس کے لیے روایتی افواج کی ضرورت تھی۔ یہ افواج ایشیا اور افریقہ میں انقلابی تحریکوں کو کچلنے کے لیے بھی درکار تھیں۔

27/اکتوبر 1945ء کو صدر ٹرومین نے نیویارک میں یومِ بحریہ (Navy day) کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے جس پالیسی کا اعلان کیا وہ اسی جارحانہ رویہ کی عکاس تھی۔ ٹرومین نے امریکی بحری بیڑے پر کھڑے ہو کر بڑھک ماری کہ "منصوبے کے مطابق جب ہماری فوج کی تخفیف عمل میں آ جائے گی تب بھی امریکہ دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت ہو

گا۔ اس کے علاوہ دنیا کی سب سے طاقتور ائیر فورس بھی ہمارے ہی پاس ہوگی۔'' آگے چل کر اس نے ایٹم بم کی ڈگڈگی بجائی اور کہا کہ ''ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں کو ایک نئے عہد کی علامت سمجھنا چاہیے جو امن پسند اقوام کے مابین قریبی اتحاد اور بہت ہی قریبی دوستی کا عہد ہوگا اور اس میں باہمی پھوٹ پڑنے کا پرانا عمل نہیں ہوگا۔ جن قوموں نے اب تک اکٹھے مل کر بڑی جرأت اور پامردی کے ساتھ فتح کے حصول کی جنگ لڑی ہے، ان کے مابین آج جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ مایوس کن یا ناحل پذیر نہیں ہیں۔ فاتح طاقتوں کے مابین مفادات کے ٹکراؤ کی جڑیں اتنی گہری نہیں ہیں کہ وہ انہیں حل ہی نہ کر سکیں۔'' لیکن ٹرومین کا یہ منافقانہ بیان تھوڑا آگے چل کر بدل گیا۔ اس نے کہا کہ ''ہمیں اس وقت فوری اور سب بڑا جو خطرہ درپیش ہے وہ مایوسی کا ہے ایک پرفریب تشکک لاحق ہے اور بین الاقوامی تعاون کے مؤثر ہونے کا کوئی یقین نہیں ہے۔ اس یقین کا فقدان کسی وقت بھی خطرناک ہوسکتا ہے اور یہ ایٹمی دور میں تباہی و بربادی سے کم کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ باتیں بھی ہو رہی ہیں کہ ایٹم بم کی وجہ سے بحری، بری اور ہوائی افواج کو ختم کر دیا جائے گا۔ فی الحال میرا خیال ہے کہ یہ قیاس آرائی سو فیصدی غلط ہے۔ اس وقت دنیا کے تمام سمندروں کا کنٹرول امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے بحری بیڑوں کے پاس ہے۔ ان کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ ہم نے یہ تلخ سبق سیکھا ہے کہ اس عظیم جمہوریہ کی کمزوری دنیا میں کسی جگہ بھی بدنیت لوگوں کو تہذیب کی بنیادیں ہلا دینے کی ترغیب دے سکتی ہے۔'' گویا یہ ''عظیم جمہوریہ'' امریکہ اپنے ہاتھ میں ایٹم بم لے کر پوری دنیا کا مالک اور تہذیب انسانی کا محافظ بن گیا تھا۔ ایٹم بم اس کے ہاتھ میں آ جانے کے بعد اس کے سامراجی عزائم کو پر لگ گئے تھے۔ آگے چل کر اس نے مزید کہا ''ایٹم بم سے امریکہ کی بنیادی خارجہ پالیسی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اس سے ہماری پالیسی کے فروغ اور اطلاق میں اتنی تیزی آ جائے گی کہ اب سے چھ مہینے پہلے ہم اس کا صرف خواب دیکھ سکتے تھے۔ یعنی اب ہمیں بین الاقوامی مسائل تک زیادہ رفتار، زیادہ عزم اور زیادہ فراست کے ساتھ رسائی حاصل کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا تا کہ ہم ایک ایسی صورت حال کا مقابلہ کر سکیں جس کی اس سے پہلے کوئی مثال موجود نہیں ہے۔'' اور ایک بار پھر منافقت سے کام لیتے ہوئے کہا ''اس ہتھیار کے مالک بن جانے سے، جس طرح کہ ہم دوسرے ہتھیاروں کے مالک ہیں، ہم کسی قوم کے لیے خطرہ

نہیں ہیں۔ جو دنیا امریکہ کو حالیہ دو جنگوں میں دیکھ چکی ہے اس بات سے بخوبی واقف ہے۔ اس نئی تباہ کن طاقت کی ملکیت کو ہم اپنے لیے ایک مقدس امانت سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہم دنیا کی امن پسند قوم ہیں اس لیے دنیا کے سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ ہم اس امانت کی خلاف ورزی کبھی نہیں کریں گے اور اس پر پوری طرح کاربند رہیں گے۔"[30]

چرچل نے ٹرومین کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے 7/نومبر کو برطانیہ کے دارالعوام میں تقریر کی اور کہا "آج ہمارا فرض ہے کہ ہم امریکی صدر کے اس عالیشان بیان کا بالکل واضح انداز میں خیر مقدم کریں اور اپنا سلام پیش کریں۔ یہی وہ عظیم قوم اور ملک ہے جو بنی نوعِ انسان کو تاریک وادی سے باہر نکالنے کے لیے طاقت اور ایثار کی پیش کش کرتا ہے۔ ہم سب اس تاریک وادی کے مسافر ہیں۔ برطانوی اور امریکی عوام کے مابین فطری یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس کے لیے کسی پالیسی یا ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ہمارا عام قانون ایک جیسا ہے۔ ہمارے ادارے ملتے جلتے ہیں ہم اور وہ انفرادی آزادی کی یکساں چاہت رکھتے ہیں۔ ہمیں آپس میں پالیسیاں، معاہدے اور خفیہ رازداریاں بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ دنیا کے تمام انگریزی بولنے والوں کے مابین ان تمام بڑے مسائل پر جن سے ان کی راہ وروش اور وجود متاثر ہوتے ہوں، عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ برطانیہ اور امریکہ کے آپس میں قریبی اور دوستانہ تعلقات کسی تیسری طاقت کے خلاف ہیں۔" تاہم ایٹم بم کی تیاری کے راز کو روس سے خفیہ رکھنے کے بارے میں آگے چل کر اس نے کہا کہ "اگر حالات کا پانسہ پلٹ جائے اور ہمیں یا امریکہ کو روس کے اسلحہ ساز اداروں سے رجوع کرنا پڑ جائے تو ہمیں اس کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ اس پالیسی پر گامزن ہوں گے جس کا اعلان صدر ٹرومین نے کیا ہے۔ مجھے برطانوی باشندہ ہوتے ہوئے اس بارے میں ذرا سی بھی تشویش نہیں ہے کہ عظیم ایٹمی قوت امریکیوں کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے جارحانہ مقاصد کے لیے یا ملک گیری یا تجارتی ہوس کی تکمیل کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ برطانیہ کی طرح انہیں علاقائی مفادات عزیز نہیں ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ بیشتر لوگ اس امر پر خوش ہیں کہ اس قوت یعنی ایٹم بم کو تیار کرنے کی اہلیت اچھے ہاتھوں میں ہے۔" آگے چل کر بحث کے دوران چرچل نے مزید کہا

کہ ”ہمیں خود بھی ایٹم بم تیار کرنے چاہئیں اور اگر کسی اور جگہ تیار ہوں تو انہیں یہاں جمع کیا جانا چاہیے اور اس کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“[31] گویا چرچل برطانیہ کو بھی ایٹم بموں کا سٹور بنانا چاہتا تھا تا کہ اس کے سہارے زوال پذیر برطانوی سامراج اپنی عالمی ساکھ کو برقرار رکھ سکے اور سوویت یونین کو اس کا ہوا دکھا کر یورپ اور ایشیا میں اپنی شرائط منوانے پر مجبور کیا جا سکے۔

لیکن سوویت یونین نے اینگلو امریکی سامراجیوں کی دریافت کردہ نئی تباہ کن صلاحیت کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ 6 نومبر کو سوویت انقلاب کی اٹھائیسویں سالگرہ کے موقع پر سوویت وزیرِ خارجہ مالوٹوف نے تقریر کرتے ہوئے کہا: ”اس میں کسی کو کلام نہیں کہ دائمی امن کے مفادات کا تقاضا ہے کہ امن پسند اقوام کے قبضے میں اسلحہ کی مناسب قوت موجود ہونی چاہیے۔ ان ممالک کے لیے تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جن پر امن کے برقرار رکھنے کی سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ تاہم تحفظِ امن کے تقاضوں اور بڑی طاقتوں کے مابین اسلحہ کی دوڑ کی پالیسی کے درمیان کوئی شے مشترک نہیں ہے جس کا پرچار سامراجی پالیسی کے کئی سرگرم علمبردار کرتے پھر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایٹمی توانائی اور ایٹم بم کے بارے میں بھی کچھ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس کی بے پناہ تباہ کُن قوت کا مظاہرہ جاپان کے خلاف جنگ میں کیا گیا۔ گو ابھی تک ایٹمی توانائی کو جارحیت روکنے یا امن کے تحفظ کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے لیکن موجودہ دور میں یہ ممکن نہیں رہا کہ کوئی بھی بڑے سے بڑا تکنیکی راز کسی ایک ملک یا معدودے چند ملکوں کے حلقے کی خاص ملکیت میں محدود رہے۔ لہٰذا ایٹمی توانائی کی دریافت سے نہ تو اس رجحان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے کہ اس دریافت کو بین الاقوامی پالیسی میں قوت آزمائی کے لیے استعمال کیا جائے اور نہ ہی یہ ہو کہ امن پسند اقوام کو اپنے مستقبل کے بارے میں خاطر جمع رکھنے کا رویہ اختیار کرنے کے لیے کہا جائے۔“[32]
چنانچہ مالوٹوف کی طرف سے یہ واشگاف اعلان تھا کہ عنقریب سوویت یونین بھی ایٹمی توانائی تسخیر کرنے والا ہے اس لیے ایٹم بم کو بنیاد بنا کر دنیا کی غالب قوت بننے کی اینگلو امریکی کوشش ایک سعیٔ بے سود ثابت ہوگی۔

انہی دنوں ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصہ دار تینوں انگریزی بولنے والے ممالک یعنی برطانیہ،

کینیڈا اور امریکہ کے سربراہوں کا واشنگٹن میں اجلاس منعقد ہوا۔ 15 نومبر کو برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی، کینیڈا کے وزیراعظم میکنزی کنگ اور امریکی صدر ٹرومین کی جانب سے جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیہ میں مطالبہ کیا گیا کہ ایٹمی توانائی کو صرف پرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کو تباہ کن مقاصد کے لیے استعمال میں لانے پر پابندی عائد کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اقوام متحدہ کی زیرنگرانی ایک کمیشن کے قیام کی تجویز پیش کی جو بین الاقوامی تحفظات اور پابندیاں عائد کرنے کا لائحۂ عمل وضع کرے۔ اس سارے کا مقصد یہ تھا کسی طرح سوویت یونین کو ایٹم بم بنانے سے باز رکھا جائے اور اس سلسلے میں بین الاقوامی دباؤ ڈلوانے کا بندوبست کیا جائے یعنی روس سے کہا جارہا تھا کہ آپ خاطر جمع رکھیں، پُرامن مقاصد کے لئے ایٹمی توانائی کے استعمال کے بارے میں علم ہم سے لے لیں اور ایٹم بم بنانے کے چکر میں نہ پڑیں۔ غالباً اسی کے پیش نظر مالوٹوف نے سوویت انقلاب کی اٹھائیسویں سالگرہ کی تقریر میں کہا تھا۔ ''...... نہ ہی یہ ہو کہ امن پسند اقوام کو اپنے مستقبل کے بارے میں خاطر جمع رکھنے کا رویہ اختیار کرنے کے لیے کہا جائے۔''

انگریزی بولنے والے تین ایٹمی ممالک کے مذکورہ مشترکہ اعلامیہ کے جاری ہونے کے تین دن بعد یعنی 18 نومبر کو سوویت جریدے ''نیو ٹائمز'' کے ایک مبصر اے۔ سوکولوف نے لکھا ''ایٹم بم دنیا کے رجعت پسندوں کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف ایک نئے جہاد کو ابھارنے کی علامت بن گیا ہے۔'' اس کی رائے میں لندن کی وزرائے خارجہ کانفرنس کی ناکامی، ایٹم بم کا وجود، جرمنی اور مشرق بعید میں اتحادی پالیسی سب کو ملا کر امن کے دشمنوں کی جانب سے اینگلوسیکسن ممالک اور سوویت یونین کے مابین جنگ بھڑکانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس نے امریکہ کے ہرسٹ اینڈ مکارمک پریس اور برطانیہ کے کیتھولک پریس پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ امریکہ اور برطانیہ کے باہمی مفادات پر بہت زور دیا جارہا ہے۔ اس نے ایک صحافی پال ونٹرٹن کا حوالہ دیا جس نے لکھا تھا کہ ایٹم بم کی وجہ سے اب سوویت یونین ایک دوسرے درجے کی طاقت بن کر رہ جائے گا اور یہ کہ برطانیہ اور امریکہ کو یورپ پر اپنا غلبہ مسلط کرنے کا ایک موقع مل گیا ہے۔ سوکولوف نے لکھا کہ کیا یہ سوویت یونین کو یورپی امور میں شرکت سے بے دخل کرنے کی کوشش نہیں ہے؟ کیا اخلاقی قیادت کے بارے میں منافقانہ

فقرے بازی سے سامراجیوں کی ہوس پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے جو کہ اپنے سامراجی عزائم کی راہ سے سوویت یونین کو ہٹانے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں؟ اس نے مزید لکھا کہ ایٹم بم بذات خود سوویت دشمن رجحانات کے تصور کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ کوششیں اس کی ذمہ دار ہیں جو بالا دستی کی خارجہ سیاست کے کھیل میں اسے استعمال کر رہی ہیں۔ بعض رجعت پسند ایک نئی جنگ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تا کہ بہت سے پیچیدہ معاشی مسائل سے، جن کا تعلق تعمیر نو، بے روزگاری اور منڈیوں کے لیے تگ و دو سے ہے، راہِ فرار اختیار کی جا سکے۔ وہ اس قسم کے مسائل کے حل سے بھی صرفِ نظر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جیسے کہ ہندوستان کی صورت حال ہے اور ہندچینی اور انڈونیشیا کی قومی آزادی کی تحریکیں ہیں اور شام، فلسطین، یونان اور سپین کے سیاسی مسائل ہیں۔ سوکولوف نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ برطانیہ میں بعض ذمہ دار حضرات اس بات کے مخالف ہیں کہ برطانیہ کو امریکہ کا تتمّہ بنا دیا جائے یا اس کے بالعکس صورت اختیار کی جائے امریکہ کے ذمہ دار افراد بھی اس بارے میں خدشات کا اظہار کرتے ہیں کہ امریکہ غیر مشروط طور پر یورپ میں برطانیہ کی خارجہ پالیسی کے مقاصد میں شریک ہو جائے جب کہ ان مقاصد میں امریکہ کی براہ راست کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ سوویت یونین نہ صرف الفاظ سے بلکہ عمل سے بھی ثابت کر چکا ہے کہ وہ اپنے ملک کے لیے اور امن وسلامتی کی خاطر لڑ رہا ہے جو کہ سامراج سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزادی حاصل کر چکا ہے اور جہاں اب ایسے سماجی گروہوں کا کوئی وجود نہیں ہے جو امن کو خراب کرنا چاہتے ہوں۔ [33]

''نیو ٹائمز'' کے مبصر سوکولوف نے جن ذمہ دار امریکیوں کی جانب اشارہ کیا تھا ان میں سابق وزیر جنگ سٹمسن کی طرح موجودہ وزیر خارجہ بائرنز بھی شامل تھا۔ انہی دنوں اس نے چارلسٹن میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایٹم بم کی تیاری کے رازوں کو غیر ضروری طور پر زیادہ عرصے کے لیے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی روز امریکہ کے ایٹمی سائنس دانوں کی فیڈریشن نے جس میں ایٹم بم کی تیاری میں ملوث نوے فیصد سائنس دان شامل تھے، یہ مطالبہ کیا کہ صدر ٹرومین کو برطانیہ اور روس کے ساتھ فوری کانفرنس منعقد کر کے ایٹمی ہتھیار سے پیدا شدہ خطرہ کو زیر بحث لانا چاہیے۔ ''نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون'' نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیا بائرنز کی اس کوشش کا اظہار کہ دنیا اسلحہ کی دوڑ سے محفوظ رہے صدر ٹرومین کی نیوی ڈے

کی تقریر سے مطابقت رکھتا ہے؟ اخبار نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ خارجہ تعلقات کے ہر پہلو کے بارے میں دورویوں کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔[34] گویا سوویت یونین کے ساتھ معاملات طے کرنے اور ایٹم بم کو پنجہ آزمائی کے آلے کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں امریکی وزیرخارجہ بائرنز اور صدر ٹرومین کے نقطۂ نظر میں فرق پایا جاتا تھا۔

اسی طرح برطانیہ کے بعض ذمہ دار حلقوں کا رویہ بھی چرچل جیسے جنگ بازوں سے مختلف تھا۔ چرچل کی پارٹی کے سابقہ وزیرخارجہ انتھونی ایڈن نے 22/نومبر کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ حالیہ کچھ عرصہ میں سوویت یونین اور فتح میں اس کے شریک دو بڑے حصہ داروں یعنی امریکہ اور برطانیہ کے درمیان بدگمانی اور بے اعتمادی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کرنے کے بعد اس نے کہا کہ ہم تمام عالمی معاملات میں روس کی شرکت کے برابری کی سطح پر خواہش مند ہیں۔ کئی مرتبہ روسی مدبروں نے میرے اور مسٹر چرچل سے بات چیت کے دوران اپنی سلامتی کی ضرورت اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی کے بارے میں اضطراب کا اظہار کیا ہے۔ ہم نے اس پر کبھی اختلاف نہیں کیا۔ روسی اپنے ہمسایوں کے ساتھ تعلقات کے اہتمام میں بہت آگے چلے گئے ہوئے ہیں۔ روسیوں کا یہ سارا اہتمام کس کے خلاف ہے؟ مجھے معلوم ہے اور انہوں نے اس بارے میں کئی مرتبہ آگاہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے جرمنوں کے یورپ پر غلبہ کی خاطر دوبارہ اُٹھ کھڑے ہونے کے امکان کے خلاف یہ سب کچھ کیا ہے۔ روسی اس بارے میں ابھی پوری طرح قائل نہیں ہوئے ہیں جیسا کہ بعض لوگ ہو چکے ہیں کہ نازی ولولہ مکمل طور پر مردہ ہو چکا ہے۔ جس طرح ہمارے اور ہمارے مغربی ہمسایوں کے تعلقات کا رُخ روس کے خلاف نہیں ہے اسی طرح روس اور اس کے ہمسایوں کے تعلقات بھی ہمارے خلاف نہیں ہیں۔ میری رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کا واشگاف الفاظ میں اظہار کیا جائے کیوں کہ میں تو اس بارے میں پوری طرح قائل ہوں کہ حقیقت یہی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ روسیوں کا یہ سارا اہتمام ہمارے خلاف نہیں ہے۔ برطانیہ کے کم وبیش سب طبقوں میں روس کے ساتھ اتنی ہی گہری اور قریبی دوستی قائم کرنے کی خواہش موجود ہے جتنی کہ امریکہ کے ساتھ ہے۔[35]

لیکن ادھر انہی دنوں سوویت یونین اور اس کے مشرقی یورپی ہمسایوں کے مابین اتحاد

کے خلاف چرچل نے سارے یورپ کو متحد کرنے کی مہم شروع کی ہوئی تھی۔ وہ اس مقصد کے لیے یورپ کے دورے پر نکلا ہوا تھا۔ 16 نومبر کو اس نے برسلز میں تقریر کرتے ہوئے ''ریاست ہائے متحدہ یورپ'' کے نام سے تمام یورپی ممالک کو ایک ملک میں ڈھل جانے کی ترغیب دی اور توقع ظاہر کی کہ یہ براعظم ایک بار پھر اس طرح متحد ہو جائے گا کہ جس کی مثال سلطنت روما کے زوال کے بعد پھر قائم نہیں ہوئی۔ 28 نومبر کو برطانوی دارالامراء میں بھی یورپی اتحاد کا موضوع زیر بحث لایا گیا۔ وائی کاونٹ ٹمپل ووڈ نے یورپ کے مشرقی بلاک کے وجود میں آنے کی مخالفت کی اور کہا کہ جب تک یورپ میں تفریق موجود ہے اور اس کے بیچ آہنی پردہ حائل ہے اس کی ترقی اور خوشحالی ممکن نہیں ہے اور جو کہ صرف یورپی اتحاد کے ذریعے ممکن ہے۔ اس نے مزید کہا کہ ہمیں یورپ میں بہت محترم مقام حاصل ہے۔ اس لیے ہمیں الگ تھلگ رہنے کے بجائے یورپ کو واضح اور جرأت مند قیادت مہیا کرنی چاہیے۔

اس دوران امریکہ کے بعض حلقوں کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف سخت معاندانہ رویہ اختیار کرنے کی تحریک شروع ہوگئی ہوئی تھی۔ 27 نومبر کو امریکی سینیٹ میں اس بارے میں بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ مونٹانا کے سینیٹر برٹن۔ کے وہیلر نے سوویت یونین کے خلاف سخت گیر رویہ اختیار کرنے کا مؤقف اختیار کیا۔ اس نے کہا کہ ''جنگ کے دوران جس چیز کے حصول سے ہم جرمنی اور جاپان کو باز رکھنا چاہتے تھے اب اسی چیز کو روس کی فتح کے طور پر قبول کر رہے ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی مظلوم اقوام کو ہمارا آزادی دلوانا دراصل ان کو ایک ظالم اور بے رحم ڈکٹیٹر کے پنجے سے چھڑا کر ایک اور کے خون آلود اور بے درد ہاتھوں میں دینے کے مترادف ٹھہرا۔ امریکہ کو چاہیے کہ وہ روس اور برطانیہ دونوں کی دلجوئی اور اصولوں پر سمجھوتے کی روش کو ترک کر دے۔ روس کو اپنی مخالفت میں موجود منظم حب الوطن گروہوں اور غیر منظم لاچار ومفلس عوام کا قلع قمع کرنے کا موقع ملنے کی واحد وجہ یہی ہے کہ ہم نہ صرف اس کا بچاؤ کرتے ہیں اور امریکی عوام سے حقائق کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں بلکہ محض دکھاوے کے ''اتحاد'' کی خاطر اپنی تذلیل کی حد تک اس کی دلجوئی کرتے ہیں اور اس طرح ہم نے جان بوجھ کر اس کی خاطر اسی کا کھیل کھیلا ہے۔'' سینیٹر وہیلر نے جو امریکہ کو دنیا کے جھگڑوں سے الگ تھلگ رکھنے کے نقطۂ نظر کا حامی تھا، اقوام متحدہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''ایسی تنظیم

امریکیوں کو اپنا معیار زندگی کم کر کے دوسری اقوام کے معیار زندگی پر لانے پر مجبور کرے گی۔ میری رائے میں ہماری طرف سے ان ملکوں کی مدد یہی ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کریں، نہ یہ کہ ہم انہیں دیتے ہی چلے جائیں اور لگاتار دیتے چلے جائیں۔'' آخر میں سینیٹر وہیلر نے تجویز پیش کی کہ'' امریکہ کو چاہیے کہ وہ روس سمیت یا اس کے بغیر ایک حقیقی امن کانفرنس بلائے جو دنیا بھر میں جبری بھرتی پر پابندی لگائے، ہر سطح پر اسلحہ کی تخفیف کرے اور ایٹمی توانائی کے بین الاقوامی کنٹرول کے لیے ایٹلی اور کنگ کے ساتھ طے کردہ فارمولا پر عمل کرے۔'' اگلے روز اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کولوریڈو کے سینیٹر ایڈون۔ سی۔ جانسن نے کہا کہ'' ایسے طیاروں کے بلیو پرنٹ تیار ہیں کہ جن کو مناسب طریقے سے بروئے کار لایا جائے تو وہ روئے زمین کے کسی بھی مقام پر ایٹم بم گرا کر واپس اپنے اڈے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' اس دھمکی آمیز اعلان کے بعد اس نے کہا کہ'' امریکہ اور روس دونوں کا اولیں کام یہ ہے کہ وہ آپس کی جنگ سے اجتناب کریں کیونکہ یہ دونوں کی خودکشی کے مترادف ہوگی۔ ہم پورے یقین کے ساتھ روس کے ساتھ جنگ کی راہ پر گامزن ہیں۔ بدگمانی، دھوکے اور دل جوئی کا ملا جلا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہم جاپان کے ساتھ جنگ میں ملوث ہوئے تھے۔ اب ہم نوعمر لڑکوں کی جبری بھرتی کے ذریعے روس کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ہم خود بے وقوف بن رہے ہیں۔ روس کو معلوم ہے کہ ہم جبری بھرتی کی یاوہ گوئی کے ذریعے محض ایک خالی پستول کو ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اس طرح ان کی ہمارے بارے میں نفرت ہر گھڑی کے ساتھ گہری ہوتی چلی جائے گی۔ روس ایک بڑا اور طاقتور ملک ہے اور وہ دوسروں کی ان خصوصیات کا احترام کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کانگرس روسی اور امریکی طلباء کے تبادلے کے لیے لاکھوں ڈالر منظور کرے۔ مگر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ امریکہ روس کے مقابل کھڑا ہو اور سنجیدگی اور وقار کے ساتھ اسے کہے'' بھائی! اس دنیا میں ہم آپ سے کسی شے کی تمنا نہیں رکھتے سوائے تعاون، دوستی اور خیر سگالی کے، لیکن ہم پر چڑھائی کی مہلک غلطی نہ کرنا، ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔'' اور 4/دسمبر کو مسس پی کے سینیٹر جیمز۔ او۔ ایسٹ لینڈ نے سوویت دشمن مہم کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے جرمنوں کو دوبارہ روس کے خلاف کھڑا کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس نے کہا کہ'اگر جرمن عوام کو محض نان ونفقہ پر زندہ رکھا گیا اور ان کی ثقافت اور عزتِ نفس برباد ہوگئی تو وہ کمیونزم کی

آغوش میں کھینچ لیے جائیں گے۔ مغربی طاقتیں جرمن ریخ کو روس کا طفیلی بننے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔ کمیونسٹوں کو معلوم ہے کہ مفلوک الحال اور زبوں حال جرمنی لازمی طور پر کمیونزم کو قبول کرلے گا اور ایک سوویت جرمنی، مغربی یورپ کے چھوٹے ملکوں کو بھی سوویت بنا دے گا۔ اس طرح برطانیہ اور امریکہ کے سوا ہر جگہ جمہوریت کا جنازہ نکل جائے گا۔ امریکی عوام کو معلوم ہونا چاہیے کہ روس ایک لٹیرا اور جارح ملک ہے اور آج کل وہ ملک گیری اور جارحیت کی اسی بدقسمت شاہراہ پر گامزن ہے جس پر چل کر ایڈولف ہٹلر نے دنیا میں آگ لگا دی تھی۔'' اس کے بعد ایسٹ لینڈ نے جو خود کپاس کی کاشت کا کاروبار کرتا تھا اپنے حقیقی مفادات کا بھی کھل کر اظہار کیا اور کہا کہ جرمنی کی صنعت ٹھپ ہو جانے سے امریکہ اپنی ایک بہت بڑی بیرونی منڈی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس نے بتایا کہ 1920ء کے عشرے کے دوران جرمنی امریکہ سے ہر سال کپاس کی بیس لاکھ گانٹھیں لیا کرتا تھا۔ [36]

مذکورہ تین امریکی سینیٹروں کے بیانات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جنگ کے خاتمے کے تین چار ماہ کے اندر امریکیوں کا لب ولہجہ اور عزائم اس سے بہت مختلف ہو گئے ہوئے تھے جو جنگ کے دوران ظاہر ہوتے رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے نتائج ان کے اور ان کے سامراجی حلیفوں کی توقع کے برعکس نکلے تھے۔ مغربی سامراجیوں نے ہٹلر کا رخ سوویت یونین کی جانب موڑ کر چاہا تھا کہ اس طرح سوویت یونین تباہ و برباد ہو جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ تاہم سوویت یونین کو اس فقید المثال فتح حاصل کرنے کے لیے جو عظیم قربانیاں دینا پڑی تھیں اور جن مشکلات اور مصائب سے گزرنا پڑا تھا اس کے نتیجے میں اس کا یورپ سے فسطائیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور پھر کبھی اس قسم کی تحریک کے دوبارہ پنپنے کے امکان کا خدشہ پوری طرح دور کرنے کے لیے مشرقی یورپ میں مناسب بندوبست کرنا ضروری تھا۔ سوویت یونین کا مشرقی یورپ کو اپنے حلقۂ اثر میں رکھنے کی کوشش کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے تھا۔ انتھونی ایڈن جیسے لوگوں نے اسے اس تناظر میں رکھ کر مغربی سامراجیوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود رہی۔ امریکی مورخ ڈی۔ ایف۔ فلیمنگ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے کہ روس مشرقی یورپ کو محض ہماری طرف سے دل جوئی کا رویہ اختیار کرنے کی بدولت کنٹرول کر رہا ہے وہ وہاں اس لیے موجود ہے کہ قبل از جنگ

اتحادیوں نے ہٹلر کا مشرق کی سمت میں رُخ موڑنے کی جو تدبیر کی تھی وہ اب الٹی پڑ گئی تھی۔"[37] چنانچہ اینگلو امریکی سامراجیوں نے واویلا مچانا شروع کر دیا تھا کہ روس بھی فسطائیت کا دوسرا روپ ہے جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور اس کا آغاز اس نے مشرقی یورپ سے کیا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ روس کے ساتھ دل جوئی کا وہ رویہ جو دوران جنگ اختیار کیا گیا تھا۔ اس کو ختم کر کے روس سے ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا جائے تاکہ اس کی یلغار کا مقابلہ کیا جا سکے۔ چنانچہ مغربی سیاست دانوں اور ذرائع ابلاغ نے وسیع پیمانے پر سوویت دشمن مہم کا آغاز کر دیا۔ کہا جانے لگا کہ تین بڑی طاقتوں یعنی امریکہ، روس اور برطانیہ کے مابین قریبی تعاون کی راہ ترک کی جائے۔ یالٹا اور پوٹسڈم کے فیصلوں میں ترمیم کی جائے۔ ویٹو پاور کے فیصلے کو بھی بدلا جائے۔

9/دسمبر کو سوویت اخبار "پراودا" نے اس مہم کا نوٹس لیا اور اس کے ایک بین الاقوامی مبصر نے لکھا کہ "سوویت یونین ان تمام فیصلوں میں کسی بھی بنیادی تبدیلی کے خلاف ہے جو اتحادی اقوام نے جنگ کے نازک برسوں کے دوران کئے تھے۔ اس کے مطابق مغرب میں یہ بالکل واضح رجحان نظر آتا ہے کہ ہر اس چیز میں ترمیم کی جائے جس کی وجہ سے عظیم جمہوری قوتوں میں تعاون ممکن ہوا تھا اور جو اتحادی اقوام کے لیے جنگ جیتنے میں ممد ثابت ہوا تھا۔" سوویت مبصر نے لکھا کہ "جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ بعد از جنگ حالیہ چند مہینوں میں ایسا کون سا واقعہ رونما ہوا ہے کہ ایسی بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت پیش آ رہی ہے تو وہ ترمیم پسند اس سوال کا دو لفظوں میں جواب دیتے ہیں......ایٹم بم۔ یہ جواب دے کر وہ اصل بات کا اعتراف کر لیتے ہیں۔" سوویت مبصر نے مزید لکھا کہ "ایٹمی ڈپلومیسی کے علمبردار بڑی جمہوری قوتوں کے مابین تعاون کی مخالفت کر رہے ہیں اور دنیا کو قبل از جنگ کی منحوس صورت حال کی طرف دھکیل کر لے جا رہے ہیں کہ جس میں لیگ آف نیشنز متحارب بلاک اور گروہ سب ہی کچھ موجود تھا۔" آخر میں اس نے لکھا "لیکن عوام اب اس غلیظ راستے پر واپس جانے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔"[38] گویا ایٹم بم کا ہوا دکھا کر اینگلو امریکی سامراجی، دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور ایٹمی ڈپلومیسی کے ذریعے سوویت یونین کے حلقۂ اثر کو محدود اور اپنے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کے لیے سوویت یونین سے اپنی

شرائط منوانا چاہتے تھے۔ لیکن سوویت یونین ذرہ برابر بھی اس دباؤ میں نہ آیا تھا اور ستمبر کی لندن کی وزرائے خارجہ کانفرنس میں اس نے یورپ اور ایشیا میں حلقہ ہائے اثر از سرِ نو تقسیم کے بارے میں بے لچک مؤقف اختیار کیا تھا۔ جب کہ امریکہ اور برطانیہ نے یالٹا اور پوٹسڈم میں طے شدہ اصولوں سے انحراف کر کے فرانس اور چین کو ساتھ ملا کر سوویت یونین کا گھیراؤ کرنے کی کوشش کی تھی۔

لندن کانفرنس کی کانامی کے بعد اینگلو امریکی سامراجی سیاست دان اور ذرائع ابلاغ ہاتھ دھو کر سوویت یونین کے پیچھے پڑ گئے۔ لیکن اس نے اپنے مؤقف میں لچک پیدا نہ کی۔ یہاں تک کہ دسمبر کے وسط میں امریکہ اور برطانیہ سوویت مؤقف کے مطابق صرف تین بڑوں کی کانفرنس بلانے پر آمادہ ہو گئے۔ امریکی وزیر خارجہ بائرنز نے ماسکو تار بھیج کر پچھلے طے شدہ معاہدے کا اعادہ کیا جس کے مطابق تین بڑوں کے وزرائے خارجہ کی ہر تین ماہ بعد کانفرنس ہونا قرار پایا تھا۔ تاہم لندن کانفرنس میں اس اصول سے انحراف برتا گیا تھا۔ بائرنز کے تار کے جواب میں سوویت یونین نے امریکہ اور برطانیہ کے وزرائے خارجہ کو ماسکو آنے کی دعوت دے دی۔ اس طرح 15 ر دسمبر کو ماسکو میں اس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ فیصلوں میں سوویت مؤقف کو غلبہ حاصل ہوا۔

امن معاہدوں پر دستخط کرنے والے فریقین کا جو تعین لندن کانفرنس میں سوویت یونین نے کیا تھا اور جسے مغربی طاقتوں نے طریق کار کا اختلاف قرار دے کر کانفرنس کا خاتمہ کر دیا تھا، اب اس پر اتفاق کر لیا گیا۔ یعنی یہ کہ فرانس کو صرف اٹلی کے ساتھ معاہدۂ امن میں شریک کیا گیا۔ جہاں تک بلغاریہ، رومانیہ اور ہنگری کے ساتھ امن معاہدوں کا تعلق تھا، تو ان میں صرف سوویت یونین، امریکہ اور برطانیہ کو فریق بنایا گیا۔ بلغاریہ اور رومانیہ کی حکومتوں میں دو نمائندے دوسری جمہوری پارٹیوں کی طرف سے شامل ہو جانے کی صورت میں امریکہ اور برطانیہ نے ان حکومتوں کو تسلیم کرنے کا عہد کیا۔ فن لینڈ کے معاملہ میں صرف سوویت یونین اور برطانیہ فریق تھے۔ جاپان کے بارے میں طے پایا کہ اتحادی کونسل ایک سپریم کمانڈر کی ماتحتی میں ٹوکیو میں قائم کی جائے گی۔ اتحادی کونسل میں ایک رکن امریکہ کا، ایک سوویت یونین کا ایک چین کا اور ایک رکن مشترکہ طور پر برطانیہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور ہندوستان کی طرف

سے شامل کیا گیا۔کوریا اور چین میں جمہوری حکومتوں کے قیام پر اتفاق رائے ہوا۔علاوہ ازیں ایٹمی توانائی کے بارے میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی کمیشن کے قیام کی منظوری دی گئی۔

26؍دسمبر کو یہ کانفرنس خوش اسلوبی کے ساتھ خوشگوار ماحول میں اختتام کو پہنچی۔مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا تو امریکہ میں اس تاثر نے جنم لیا کہ سوویت یونین کی بہت زیادہ دل جوئی کی گئی ہے۔ بائرنز لکھتا ہے کہ ''بدقسمتی سے یہ تنقید ان لوگوں کی طرف سے کی گئی جو اپنے نظریات میں اس حد تک سوویت مخالف ہو چکے ہوئے تھے کہ کسی بھی معاملے میں کوئی بھی سمجھوتہ انہیں دل جوئی نظر آتا تھا۔'' سوویت یونین کے ساتھ نسبتاً حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے بائرنز کو خود صدر ٹرومین بھی ناپسند کرتا تھا۔ ماسکو کانفرنس کے بعد اس کی ناپسندیدگی اور زیادہ بڑھ گئی۔ ٹرومین کو نہ تو مشترکہ اعلامیہ پسند آیا اور نہ ہی بائرنز کا روسیوں کے ساتھ اختیار کردہ طور طریقہ پسند آیا۔ چنانچہ اس نے بائرنز کو 5؍جنوری 1946ء کو ایک ملامت آمیز خط لکھا جس کا اختتامی فقرہ یہ تھا کہ ''روسیوں کی طفلانہ پرورش کر کر کے میں تو تھک گیا ہوں'' فلیمنگ کے مطابق اس کانفرنس کے بعد بائرنز پر سے ٹرومین کا اعتماد ختم ہو گیا جس کے نتیجے میں تھوڑے ہی عرصہ بعد بائرنز کو وزارت خارجہ کے منصب سے ہاتھ دھونے پڑے۔''[39] امریکی انتظامیہ کے ارکان میں سوویت یونین کے ساتھ مفاہمت اور دوستی کی بجائے ٹکراؤ اور معاندانہ رویہ کے حامل افراد کی بالادستی ہوتی جارہی تھی۔ ایٹم بم کے نشے میں امریکی سامراجیوں کی قیادت کا ایسے افراد کے ہاتھ میں آنا ناگزیر تھا جو ایٹمی ڈپلومیسی کے ذریعے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے اور ''پراودا'' کے مطابق اب یہ بھی واضح ہوتا جارہا تھا کہ مشرق میں برطانوی مفادات کی جگہ امریکی مفادات لیتے جارہے ہیں۔[40] گویا ایٹم بم کے زور پر ایک نیا سامراج ابھر رہا تھا۔لیکن سوویت یونین کے قائدین اور دنیا کے دوسرے حریت پسند ایٹم بم کو کسی خاطر میں نہ لائے اور اپنے نصب العین کے حصول میں بدستور کوشاں رہے۔

21؍جنوری 1946ء کو صدر ٹرومین نے امریکی کانگرس کے نام ایک طویل پیغام جاری کیا جس میں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ امریکہ اب ساری دنیا کا ٹھیکیدار بن گیا ہے۔ اس نے کہا'' ہمارا ملک دنیا بھر کے لوگوں کے لیے جنھوں نے ہمارا جزو بننے کی خواہش کی، عظیم مواقع کی سرزمین بنا رہا ہے۔ اب ہمارا ملک دنیا بھر کے لوگوں کی عظیم ذمہ داریوں کا ملک بن گیا ہے۔

ہمیں ان ذمہ داریوں کو پوری طرح تسلیم کر کے حقائق کا سامنا کرنا ہے۔" اس کے بعد اس نے کہا "چونکہ ہم نئے بین الاقوامی دور میں داخل ہو گئے ہیں، اس لئے ہم پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں۔ ہماری حکومت اور عوام کی تمام تر قوت، عزم اور دانش ایک بین الاقوامی عمل کو متاثر کرنے کے لیے مرکوز ہونی چاہیے۔ یہ ایک پیچیدہ اور مسلسل معاملہ ہے۔" اور آگے چل کر مزید یہ کہا کہ "جنگ کے دوران امریکہ نے جس طاقت کا مظاہرہ کیا، ایک ایسی حقیقت ہے جو دوسرے ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات کی تہہ میں کارفرما رہتی ہے۔ اس نے ہمارے کندھوں پر جو ذمہ داری ڈالی ہے، ہم اس سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم جو سوچتے ہیں، جو منصوبہ بناتے ہیں اور جو کہتے اور کرتے ہیں وہ دنیا کے ہر گوشے کے مستقبل کے لیے گہری اہمیت کا حامل ہے۔" یعنی یہ کہ امریکہ کے بین الاقوامی تعلقات کی تہہ میں ایٹم بم کی طاقت کارفرما تھی۔ امریکی حکمران دوسرے ممالک کو اس طاقت سے مرعوب اور زیر کر کے اپنے سامراجی مفادات کی تکمیل کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے پوری دنیا کو اپنی جولاں گاہ سمجھتے تھے۔ اپنے مذکورہ پیغام میں ٹرومین نے اپنی سامراجی معیشت کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "امریکہ کی معاشی خارجہ پالیسی اس مقصد سے تشکیل دی گئی ہے کہ ہماری خوشحالی میں اضافہ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عالمی منڈیوں کی بحالی اور توسیع کا کام ہوتا کہ عالمی امن وسلامتی کے قیام میں مدد مل سکے۔" اس نے تجویز پیش کی کہ بین الاقوامی تجارت کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو ختم کر دینا چاہئے تاکہ اس سے امریکہ بلکہ ساری دنیا کی خوشحالی میں اضافہ ممکن ہو۔ اس کے بعد اس نے ان سامراجی عزائم کی خاطر اپنائے گئے فوجی انتظامات کا ذکر کیا اور بتایا کہ "گزشتہ چار ماہ کے دوران چار لاکھ رضا کار فوج میں بھرتی کئے گئے ہیں۔ اسی طرح نیوی میں اسی ہزار رضا کاروں کو بھرتی کیا گیا ہے۔ جنگ اور بحریہ کے محکموں نے تخمینہ لگایا ہے کہ آئندہ ایک سال کے دوران بیس لاکھ رضا کاروں کو بھرتی کیا جائے گا۔"[41]

اس طرح اس نے ایک عالمی پولیس مین کا روپ دھار لیا تھا۔ وہ اپنی فوجی تیاریوں کو جائز قرار دیتا مگر سوویت یونین کی فوجی قوت پر معترض ہوتا تھا۔ چنانچہ 24/جنوری کو امریکی وزیر خارجہ بائرنز نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے سوویت افواج کی مشرقی یورپ میں موجودگی پر نکتہ چینی کی۔ اس نے بتایا کہ بلغاریہ میں دو لاکھ سوویت فوج

موجود ہے جب کہ بلغاریہ کی اپنی بھی ایک لاکھ فوج ہے اس طرح رومانیہ میں سات لاکھ پچاس ہزار اور اتنی ہی تعداد میں ہنگری میں سوویت افواج موجود ہیں۔ بائرنز نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ''ان کی حیثیت قابض افواج کی ہے، نہ کہ وہ حیثیت ہے جو یونان میں موجود چالیس ہزار برطانوی افواج کی ہے۔'' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ مشرقی یورپ کی سابقہ حکومتوں کی کثیر التعداد افواج نے روس کے خلاف فاشسٹ یلغار میں حصہ لیا تھا اور ان کے ہاتھوں روسیوں کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا تھا۔ اس لیے مشرقی یورپ کی طرف سے پوری طرح اطمینان حاصل کرنا اور یورپ کی طرف سے آئندہ کسی یلغار کے امکان کا مکمل خاتمہ کرنے کے لیے وہاں اپنی افواج تعینات کرنا روس کی جائز ضرورت تھی جس کا اعتراف کرتے ہوئے برطانیہ کا سابق وزیر خارجہ انتھونی ایڈن بدستور اصرار کر رہا تھا کہ روسیوں کو جرمنی کے دوبارہ حملہ کا خطرہ ہے اور اسی لیے وہ مشرقی یورپ میں اپنی دوست ہمسایہ حکومتیں چاہتا ہے۔ یہ بات اس نے 21رفروری کو دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہی۔ اس نے مزید کہا کہ ''سوویت یونین نے ہمارے ساتھ اور امریکہ کے ساتھ تعاون کی خواہش کا اظہار پورے خلوص دل کے ساتھ کیا تھا۔ روسیوں نے اقوام متحدہ کی کارکردگی کے بارے میں بھی ہمیشہ نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ تاہم وہ اپنا دست تعاون اپنی شرائط پر بڑھانا چاہتا ہے۔ جلد یا بدیر اس سے ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔ اس لیے اتحادیوں کو یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہو سکتی کہ روس زبانی کلامی تو اتحاد کا راگ الاپتا رہے لیکن اپنے اتحادیوں کے جذبات و مفادات کا خیال رکھے بغیر جس پالیسی پر چاہے عمل پیرا رہے۔''[42]

گویا اب اینگلو امریکی سامراج اور سوویت یونین کا تضاد اس قدر معاندانہ ہو چکا تھا کہ بائرنز اور ایڈن قسم کے معتدل لوگ بھی ٹرومین اور چرچل جیسے جنگ بازوں کے ساتھ دھیمے سروں میں سر ملانے لگے تھے۔

سوویت یونین کا شدید ردعمل اور اینگلو امریکی سامراج کی بوکھلاہٹ

اینگلو امریکی رہنماؤں کی طرف سے اس ہمہ گیر سوویت مخالف مہم کے جواب میں سرکردہ سوویت رہنماؤں نے بھی اپنی ثابت قدمی اور الوالعزمی کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

6رفروری کوسوویت وزیر خارجہ مالوٹوف نے ریڈیو ماسکو سے ایک انتخابی تقریر میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ بیرون ملک میں کسی کا اگر خیال ہے کہ روسی قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور پارٹی کے ہاتھ میں چلی جائے گی تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ اس نے سوویت یونین کی صنعتی ترقی کے پروگرام کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کہا کہ ہمیں ایک لمبے عرصے کے لیے امن کی ضرورت ہے اور ہم اپنے ملک کی سلامتی کا تحفظ کریں گے تا کہ ہم اپنے بڑے بڑے مسائل کو حل کر سکیں۔ اسی لیے سوویت عوام کے سامنے جب ایسے مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں جن کا تعلق امن اور بین الاقوامی سلامتی میں گڑبڑ کو ہوا دینے والے خطے سے ہوتا ہے تو وہ بے حد خبردار ہو جاتے ہیں۔'' اس نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ کیا ان حقائق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ شکست خوردہ جرمن فوج کے سینکڑوں ہزاروں سپاہیوں کو ہمارے اتحادی نے اپنے زیر نگیں علاقے میں پناہ دے رکھی ہے۔ یہ باور کیا جانا چاہیے کہ ہمارے اتحادی نے اس صورت حال کو ختم کرنے کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہے۔'' اسی طرح کی ایک اور مثال دیتے ہوئے اس نے کہا کہ ''ہمارے اتحادی ابھی تک اٹلی میں موجود پولینڈ کے فاشسٹ جنرل اینڈرس کے ہزاروں سپاہیوں کی مدد کر رہے ہیں جو سوویت یونین کے خلاف نفرت کے لیے مشہور ہے اور جو نئے جمہوری پولینڈ کے خلاف کسی بھی قسم کی مہم جوئی کے لیے تیار ہے۔'' ایک اور مثال دیتے ہوئے اس نے کہا کہ ''سوویت زون کے باہر آسٹریا میں سفید روسیوں کی انفنٹری رجمنٹ ابھی موجود ہے جو دوران جنگ ہٹلر کی کمان میں تھی ہم نے اتحادیوں کے درمیان امن اور دوستانہ تعلقات کی خاطر بدمعاشوں کے اس گروہ کا قلع قمع کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔'' اس نے مزید کہا کہ ''سوویت یونین کے اندر کوئی جنگ باز مہم جو گروہ موجود نہیں ہے جب کہ ایسے گروہ دوسرے ممالک کے حکمران طبقوں میں موجود ہیں جہاں سامراجیوں کی طرف سے تیسری عالمگیر جنگ کی خطرناک بکواس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔'' لیکن اس نے یہ بھی وضاحت کر دی کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سرخ فوج کی قوت کے بارے میں لا پرواہی برت رہے ہیں۔ سوویت حکومت اور فوج کے رہنما بھرپور کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری فوج جدید ترین ہتھیاروں کے معاملے میں دنیا کی کسی فوج سے کم تر نہ رہے...... معاشی میدان میں لازماً ہم نے یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک

اور امریکہ کے نہ صرف برابر پہنچنا ہے بلکہ ان سے آگے نکل جانا ہے اور یہ سب کچھ بہت تھوڑے وقت میں کرنا ہے۔"[43]

مالوٹوف نے اپنے اتحادی امریکہ پر جرمنوں اور دوسرے فاشسٹوں کی پشت پناہی کا جو الزام لگایا تھا اس کی تصدیق 4 فروری کے "نیویارک ٹائمز" کی رپورٹ میں پہلے ہی کی جا چکی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق یورپ کے امریکی زون میں پولینڈ کے 17 ہزار باشندے جو روس کے ہاتھوں پسپا ہو کر گئے تھے۔، اب امریکی فوج میں تھے۔ ان کو محنت مشقت اور پہرے کے فرائض پر ان امریکیوں کی جگہ لگایا گیا تھا جو فارغ ہو کر محاذ سے بہت جلد واپس چلے گئے ہوئے تھے۔ اسی طرح 10 ہزار یوگوسلاویوں نے "رائل یوگوسلاوی آرمی" بنالی تھی اور سابقہ بادشاہ کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا تھا۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ٹیٹو برطرف نہ ہوگا وہ اس وقت تک اپنے ملک میں واپس نہ جائیں گے۔"[44] چنانچہ مالوٹوف نے بھی اس قسم کے کچھ حقائق گنوا کر اینگلو امریکی سامراج کی منافقت کا پردہ چاک کیا تھا۔ اگلے روز سوویت کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری مالنکوف نے بھی ریڈیو ماسکو سے تقریر کرتے ہوئے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ فتح کو مستحکم کرنے کی خاطر ملک کو درپیش کسی بھی صورت حال سے محفوظ رکھا جائے گا اور فوجی قیادت کے ذریعے اپنا وقار برقرار رکھا جائے گا۔"[45] اس کے اگلے روز 9رفروری کو مارشل اسٹالن نے اپنی انتخابی تقریر میں جنگ سے سرخرو ہو کر نکلنے والے سوویت عوام اور سرخ فوج کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ "جنگ نے ثابت کر دیا ہے کہ سرخ فوج کوئی مٹی کا مادھو نہیں ہے بلکہ اپنے عہد کی اول درجے کی فوج ہے۔ جس کے پاس انتہائی جدید ہتھیار ہیں، اس کو کمان کرنے والے لوگ بہت تجربہ کار ہیں اور یہ اعلیٰ اخلاقی اور جنگی اوصاف کی حامل ہے۔ کسی کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سُرخ فوج ہی وہ فوج تھی جس نے جرمن فوج کو، کہ جس سے یورپی ممالک کی افواج دہشت زدہ تھیں، نیست و نابود کر ڈالا۔"[46]

سوویت رہنماؤں کی ان تقریروں سے اینگلو امریکی سامراجیوں کے کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔ یورپ کا سب سے بڑا جنگ باز ونسٹن چرچل یورپ کا دورہ کرنے کے بعد اب امریکہ میں تھا۔ اسٹالن کی تقریر کے اگلے روز 10رفروری کو واشنگٹن میں چرچل اور ٹرومین کے درمیان ملاقات ہوئی۔ ٹرومین کے سیکرٹری نے اعلان کیا کہ "یہ ملاقات برطانوی قرضے یا

کسی اور سیاسی مسئلے کے بارے میں نہیں تھی بلکہ کم وبیش ساری ملاقات میں فولٹن واقع ریاست میسوری کے دورے کی تفصیلات ہی طے کی گئیں جہاں 5 /مارچ کو صدر ٹرومین نے چرچل کو ویسٹ منسٹر کالج کے طلبا کے سامنے متعارف کرانا ہے۔'' اس ملاقات میں وہ تقریر بھی زیر بحث آئی جو چرچل نے فولٹن میں کرنا تھی۔ [47] چنانچہ چرچل نے اس تقریر میں جو کچھ کہا اسے ٹرومین کی منظوری حاصل تھی۔ چرچل نے اس تقریر میں اینگلو امریکی سامراج کی ترجمانی کا کام کیا۔ چونکہ اس تقریر میں سوویت یونین پر براہ راست حملے کئے گئے تھے اس لیے چرچل ہی اس کے لیے موزوں تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا کہ وہ پروٹوکول کا پابند ہوتا۔ 5 /مارچ کو خود صدر ٹرومین بھی ویسٹ منسٹر کالج کے اجتماع میں شریک ہونے کے لیے خاص طور پر فولٹن پہنچا۔ چرچل نے اپنی اس مشہور تقریر میں کہا ''یہ بہت غلط اور ناعاقبت اندیشانہ ہوگا کہ ایٹم بم کا خفیہ علم اور تجربہ جو امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا کے مابین مشترک ہے عالمی ادارہ یعنی اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جائے جو کہ ابھی اپنے عہد طفلی میں ہے۔ ایک مضطرب اور غیر متحد دنیا میں اسے باہر نکالنا ایک مجرمانہ پاگل پن ہوگا۔ اس وقت دنیا کا کوئی شخص رات کو بے چینی کی نیند نہیں سوتا کیونکہ ایٹم بم کا علم اور اس کو بنانے کا طریقہ اور اس میں استعمال ہونے والا خام مواد امریکیوں کے ہاتھ میں ہے۔ میرا خیال نہیں کہ ہم اتنے آرام کی نیند سو سکتے تھے، اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی اور کسی کمیونسٹ یا نئے فاشسٹ ملک کو ایسے ہولناک وسائل کی عارضی طور پر ہی اجارہ داری حاصل ہوگئی ہوتی۔ محض ان کا خوف ہی دنیا کی آزاد جمہورتیوں پر جابرانہ نظام مسلط کرنے کے لیے کافی ہوتا اور اس کے نتائج انسان کے تصور سے بھی ماورا ہوتے۔ خدا کی رضا سے ایسا نہیں ہوا اور ہمیں یہ خطرہ درپیش ہونے تک کچھ دم لینے کی فرصت مل گئی ہے اور اگر ایسا ہوا تو بھی اپنی سی پوری کوشش صرف کر کے ہمیں اپنی رعب دار برتری برقرار رکھنی ہوگی تاکہ دوسروں کی طرف سے اس کے استعمال یا استعمال کی دھمکی کا مؤثر توڑ مہیا کیا جا سکے۔'' ایٹمی اسلحہ کی دوڑ شروع کرنے کے اس اعلان کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تقریر میں بار بار ''انگریزی بولنے والوں'' کے حقوق انسانی اور آزادی کے اصولوں کی برتری کا تذکرہ کرتا اور ان کے مابین اتحاد اور بھائی چارہ کے قیام کی تلقین کرتا تھا۔ اس کے نزدیک انسانی تہذیب کی اجارہ داری صرف انگریزی بولنے والی

قوموں کے پاس تھی اور صرف وہی ساری دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کر سکتی تھیں۔ اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا کہ ''کوئی نہیں جانتا کہ سوویت روس اور اس کی بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم مستقبل قریب میں کیا کرنے والی ہے اور یہ کہ اس کے توسیع پسندانہ عزائم اور اس کے فکر کے پھیلاؤ کی اگر کوئی حدود ہیں تو وہ کیا ہیں؟...... بحیرہ بالٹک میں سٹیٹن سے لے کر بحیرہ ایڈریاٹک میں ٹریسٹے تک یورپ کے بیچ ایک آہنی پردہ حائل کر دیا گیا ہے۔ اس لائن کے پار مرکزی اور مشرقی یورپ کی تمام قدیم ریاستوں کے دارالسلطنت موجود ہیں۔ وارسا، برلن، پراگ، وی آنا، بوڈاپسٹ، بلغراد، بخارسٹ اور صوفیہ ایسے مشہور شہر اور ان کے گرد آبادیاں سوویت حلقۂ اثر میں ہیں اور کسی نہ کسی طور سوویت غلبہ کے ماتحت ہیں بلکہ ماسکو کے بہت زیادہ کنٹرول میں ہیں...... یورپ کے ان مشرقی ممالک میں موجود چھوٹی چھوٹی کمیونسٹ پارٹیوں کو ان کی تعداد سے کہیں بڑھ کر فوقیت اور اقتدار سونپ دیا گیا ہے اور وہ ہر جگہ جابرانہ کنٹرول حاصل کر رہی ہیں۔'' اس نے پولینڈ کی روس نواز حکومت پر جرمنی میں اور یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو پر اٹلی میں کمیونسٹ غلبہ قائم کرنے کی کوشش کا الزام عائد کیا۔ علاوہ ازیں اس نے کہا کہ ''روسی سرحدوں سے دور واقع بہت سے ملکوں میں کمیونسٹ ففتھ کالم سرگرم عمل ہیں جو متحد ہو کر کام کرتے ہیں اور کمیونسٹ مرکز سے موصولہ ہدایات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ سوائے برطانوی دولت مشترکہ اور ریاست ہائے متحدہ کے، جہاں ابھی کمیونزم عالم طفلی میں ہے، کمیونسٹ پارٹیاں یا ففتھ کالم پوری عیسائی تہذیب کے لیے بڑھتا ہوا چیلنج اور خطرہ بن گئے ہیں۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو آزادی اور جمہوریت کے نصب العین کی خاطر عظیم الشان مسلح رفاقت کے ذریعے حاصل کی گئی فتح کے موقع پر سامنے آئے ہیں اور ہم بہت کم عقل ہوں گے اگر ہم نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ نہ کیا کہ ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ مشرق بعید بالخصوص منچوریا کے آثار اور بھی زیادہ تشویش ناک ہیں۔ معاہدہ یالٹا جس میں ایک فریق میں بھی تھا، بہت زیادہ سوویت روس کے حق میں تھا۔ لیکن یہ اس وقت کیا گیا تھا جب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جرمنی کی جنگ 1945ء کے موسم گرما اور خزاں سے آگے نہیں جائے گی اور جب کہ جاپان کی جنگ کے بارے میں توقع تھی کہ وہ جنگ کے بعد مزید اٹھارہ ماہ تک جاری رہے گی۔'' یعنی جب فسطائیت کے خلاف سوویت یونین کی جری افواج ہی واحد برتر قوت نظر آتی تھیں اس لیے

اس کے حق میں باتیں مان لی گئی تھیں۔ مگر اب نہ صرف مشرقی یورپ بلکہ ساری دنیا کمیونزم کی لہر کی لپیٹ میں نظر آ رہی تھی اس لیے ان کو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ انہیں ہر جگہ کمیونزم سے خطرہ اور کمیونسٹ ایجنٹ نظر آتے تھے جن کے سدباب کے لیے شکست خوردہ اور زوال پذیر برطانوی سامراج اُبھرتے ہُوئے امریکی سامراج کے ساتھ توقعات وابستہ کر رہا تھا۔ چنانچہ چرچل نے اپنی تقریر میں آگے چل کر کہا ''ہماری مشکلات اور خطرات ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے دور نہیں ہوں گے نہ ہی اس انتظار میں کہ دیکھو کیا ہوتا ہے، ان سے چھٹکارا ہو گا اور نہ ہی دلجوئی کا رویہ اختیار کرنے سے کوئی بات بنے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی تصفیہ کیا جائے۔ اس میں جتنی تاخیر کی جائے گی، اتنا ہی یہ مشکل ہوتا جائے گا اور ہمارے لیے خطرات بڑھتے چلے جائیں گے۔ جنگ کے دوران میں نے اپنے رُوسی دوستوں اور اتحادیوں کا جو مشاہدہ کیا ہے اس سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ وہ جتنا طاقت پر آفرین کرتے ہیں اتنا کسی شے پر نہیں کرتے اور جو چیز ان کے نزدیک سب سے زیادہ نا قابل احترام ہے وہ ہے فوجی کمزوری۔ اس لیے طاقت کے توازن کا پرانا نظریہ اب کارآمد نہیں رہا۔ ان کے ساتھ معمولی فرق سے آگے یا پیچھے رہنے سے کام نہیں چلے گا کہ اس سے طاقت آزمائی کو ترغیب ملتی ہے۔ اگر مغربی جمہورتیں متحد ہو کر اقوام متحدہ کے چارٹر میں دیئے گئے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا ہوں تو ان اصولوں کے فروغ میں ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھے گا اور کوئی ان کو گزند نہیں پہنچا سکے گا۔ لیکن اگر وہ بٹے رہے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے اور ان اہم برسوں کو ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا تو ایسی آفت آئے گی جو ہم سب کو لے ڈوبے گی۔'' اور آخر میں اس نے کہا کہ ''اگر انگریزی بولنے والوں کی دولت مشترکہ میں آباد لوگ امریکہ کے ساتھ مل جائیں اور بحر و بر اور صنعت و سائنس میں تعاون کریں تو پھر طاقت کا توازن متزلزل اور مشکوک نہیں ہو گا اور کسی کو اپنے عزائم کی تکمیل یا مہم جوئی کی ہمت نہیں ہو گی۔''[48]

ٹرومین کی موجودگی میں چرچل کی یہ تقریر اینگلو امریکی سامراج کی بوکھلاہٹ اور پریشانی کا کُھلا ثبوت تھی۔ چرچل کی اس تقریر کا اصل مفہوم یہ تھا کہ جو کام دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنی سے نہیں ہو سکا اس کی تکمیل امریکہ کو کرنی چاہیے، یعنی اسے سوویت یونین کو بلا تاخیر تباہ و برباد کر دینا چاہیے۔ یہ ملک 'بین الاقوامی اشتراکی فتنے' کا منبع ہے۔ جب تک اسے

تباہ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک یورپ، ایشیا اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں آزادی اور انقلاب کی تحریکوں کا سدباب نہیں ہو سکے گا۔ چرچل کے نزدیک انسانی تہذیب کی اجارہ داری صرف انگریزی بولنے والی قوموں کے پاس تھی اور صرف وہی ساری دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کر سکتی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے جنگ کے خاتمے پر ایٹم بم استعمال کر کے دنیا کو مرعوب کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکام ہوگئی تھی۔ گزشتہ چھ ماہ کے دوران سوویت یونین نے ان کی ایٹمی ڈپلومیسی کا جس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا اور ایٹم بم کی بنا پر بلیک میل ہونے کے بجائے ہر عالمی مسئلہ میں اپنے مؤقف پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اب دنیا سے انگریزی بولنے والوں کی برتری کا دور لد چکا ہے۔

سوویت یونین کا مردِ آہن جوزف اسٹالن نہ تو ایٹم بم سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی وہ چرچل کی ان گیدڑ بھبکیوں کو خاطر میں لایا۔ 13/مارچ 1946ء کو اس نے ''پراودا'' کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے چرچل کی تقریر کا منہ توڑ جواب دیا۔ اس نے کہا ''چرچل جنگ کو آگ دکھانے والی لکڑی کا کام کر رہا ہے اور یہ چرچل اکیلا ہی نہیں ہے، اس کے ساتھی نہ صرف انگلینڈ میں بلکہ امریکہ میں بھی موجود ہیں۔ اس لحاظ سے ہٹلر اور اس کے ساتھیوں کی یاد تازہ ہوگئی ہے۔ ہٹلر نے بھی نسلی نظریہ پیش کر کے جنگ کو ہوا دینی شروع کی تھی اور اعلان کیا تھا کہ صرف جرمن زبان بولنے والے ہی ایک انمول قوم ہیں۔ چرچل نے بھی نسلی نظریہ کے حوالے سے جنگ کو ہوا دینی شروع کی ہے اور یہ خیال پیش کیا ہے کہ صرف انگریزی بولنے والی اقوام ہی انمول اقوام ہیں اور ساری دنیا کی تقدیر کا فیصلہ انہوں نے کرنا ہے۔ جرمن نسلی نظریہ کے تحت ہٹلر اور اس کے ساتھیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایک انمول قوم کی حیثیت سے صرف جرمنوں کو ساری قوموں کے اوپر حکومت کرنی چاہیے۔ انگریزی نسلی نظریہ کے تحت چرچل اور اس کے ساتھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انگریزی زبان بولنے والی اقوام کو انمول ہونے کی بدولت دنیا کی باقی تمام قوموں پر حکومت کرنی چاہیے۔ مختصراً یہ کہ چرچل اور اس کے انگلینڈ اور امریکہ کے دوستوں نے انگریزی زبان نہ بولنے والی اقوام کو ایک طرح کا الٹی میٹم دیا ہے کہ ''ہماری سرداری کو آرام سے تسلیم کر لو تو ٹھیک ہے ورنہ جنگ ناگزیر ہے۔ لیکن قوموں نے گزشتہ پانچ برس کی وحشیانہ جنگ میں اپنے ملکوں کی آزادی اور خودمختاری کی خاطر اپنا خون بہایا ہے نہ کہ

ہٹلر کی سرداری کی بجائے چرچل کی سرداری قبول کرنے کی خاطر انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ چنانچہ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ انگریزی نہ بولنے والی اقوام جو کہ دنیا کی بھاری اکثریت پر مشتمل ہیں، ایک نئی قسم کی غلامی کو قبول نہیں کریں گی۔''[49]

یورپ میں کمیونزم کی لہر اور سامراجیوں کی پریشانی

حقیقت بھی یہی تھی کہ سوویت یونین کی طرح دنیا کی دیگر اقوام نے بھی انگریزی بولنے والوں کے ایٹم بم کا رعب قبول نہیں کیا تھا۔ چرچل اور ٹرومین کی حددرجہ بوکھلاہٹ کا سبب بھی یہی تھا کہ نہ صرف سوویت یونین ایک طاقتور قوت کی حیثیت سے ابھرا تھا بلکہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی بیشتر اقوام کی آزادی اور حریت کی مسلح تحریکیں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ خود مغربی یورپ میں جنگ کے بعد 46-1945ء کے دوران جتنے انتخابات ہوئے تھے ان میں کمیونسٹوں کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئی تھیں۔

اکتوبر 1945ء میں فرانس میں انتخابات ہوئے تو کمیونسٹ پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ حاصل ہوئے۔ پارٹی پوزیشن اس طرح تھی:[50]

پارٹی	نشستیں	ووٹ
کمیونسٹ	152	4556000
سوشلسٹ	142	4448000
ایم آر پی	142	4032000
ریڈیکل سوشلسٹ	25	
اعتدال پسند اور دایاں بازو	67	
آزاد	10	

اکتوبر ہی میں ناروے کے انتخابات میں کمیونسٹ گیارہ نشستیں جیت گئے جب کہ جنگ سے پہلے ان کو ایک نشست بھی حاصل نہیں تھی۔ فن لینڈ میں کمیونسٹوں کو پچیس فیصد رائے دہندگان کے ووٹ حاصل ہوئے۔ نومبر میں آسٹریا کے انتخابات ہوئے تو یہاں کمیونسٹوں کو چار نشستیں حاصل ہوئیں جب کہ پہلے ان کو تین نشستیں حاصل تھیں۔ فروری 1946ء میں بلجیم

کے انتخابات میں کمیونسٹوں نے اٹھاون نشستیں حاصل کیں جب کہ اس سے پیشتر 1936ء کے انتخابات میں ان کو اٹھائیس نشستیں حاصل ہوئی تھیں۔ مئی 1946ء کے اوائل میں فرانس میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے تشکیل کردہ آئین پر ریفرنڈم ہوا۔ نوے لاکھ ووٹ حق میں اور ایک کروڑ ووٹ مخالفت میں آئے اور یوں اگرچہ یہ آئین نامنظور ہوا لیکن حق میں پڑنے والے کثیر التعداد ووٹ مخالف کیمپ کے لیے پریشان کن تھے۔ ہالینڈ میں 17 رمئی کو انتخابات ہوئے جس میں کمیونسٹوں نے دس نشستیں حاصل کیں اور انہیں پانچ لاکھ ووٹ حاصل ہوئے۔ کمیونسٹوں کو ایمسٹرڈم میں ڈالے جانے والے ووٹوں کا تیس فیصد اور راٹرڈم میں ڈالنے جانے والے ووٹوں کا اٹھارہ فیصد حاصل ہوا۔ جون کے اوائل میں اٹلی میں انتخابات ہوئے۔ یہ وہ ملک تھا جس کی فاشسٹ افواج نے جرمنی کے شانہ بشانہ سوویت یونین پر یلغار کی تھی۔ یہاں انتخابات میں کمیونسٹوں کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ کمیونسٹوں کو ایک سو سات نشستیں اور بیالیس لاکھ ووٹ حاصل ہوئے جب کہ سب سے بڑی پارٹی کو ایک سو چھیانوے نشستیں اور اٹھتر لاکھ ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں سویڈن، ڈنمارک، لکسمبرگ اور آئس لینڈ میں بھی کمیونسٹوں اور بائیں بازو والوں نے خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کیں۔ [51]

اٹلی اور فرانس میں کمیونسٹوں کی نمایاں کامیابی اور یورپ کے دیگر ممالک میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر اینگلو امریکی ذرائع بلبلا اٹھے۔ 9 رجون 1946 کو نیویارک ٹائمز'' نے یورپ کا نقشہ شائع کیا اور اوپر سرخی جمائی ''کمیونسٹ چھا گئے'' اس میں ہر ملک میں کمیونسٹوں کے ووٹوں کا تناسب ظاہر کیا گیا تھا۔ مغربی یورپ کے بیشتر ممالک میں قائم ہونے والی مخلوط حکومتوں میں کمیونسٹ شامل ہوئے تھے۔ یورپ کی یہ تصویر اینگلو امریکی سامراجیوں کے لیے بڑی حوصلہ شکن اور پریشان کن تھی۔ ان حالات میں مغربی دنیا کا سب سے بڑا جنگ باز ونسٹن چرچل امریکہ گیا تھا اور وہاں صدر ٹرومین کے ساتھ مل کر انگریزی بولنے والوں کی ساری دنیا پر برتری اور غلبہ قائم کرنے کی بڑھکیں مار رہا تھا مگر جنہیں وقت نے بے اثر اور بے وقعت ثابت کر دیا تھا۔ 15 رمارچ کو نیویارک میں دو ہزار افراد نے اس ہوٹل کے باہر مظاہرہ کیا جہاں چرچل ٹھہرا ہوا تھا۔ چھ سو پولیس والے مظاہرین کا راستہ روکنے پر متعین ہوئے۔ مظاہرین نے پلے کارڈ اٹھا رکھے تھے جن پر درج تھا ''چرچل جنگ چاہتا ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں۔'' امریکی

کانگرس میں چرچل کی تقریر پر بحث کے دوران بعض سینیٹروں نے کہا کہ چرچل کی تجویز اقوام متحدہ کا گلا کاٹ کر رکھ دے گی۔ اس سے ''تین بڑوں'' کا اتحاد پارہ پارہ ہوجائے گا۔ [52] گویا یورپ کی طرح امریکہ کی رائے عامہ بھی اپنے حکمرانوں کی جنگجویانہ روش کے حق میں نہیں تھی۔ چنانچہ امریکہ اور پھر ساری دنیا میں پراپیگنڈے کی زبردست مہم چلائی گئی کہ سوویت یونین ایک ایسا عفریت ہے جس کو فوری طور پر نہ کچلا گیا تو وہ امریکہ اور یورپ کو بیک وقت ہڑپ کر جائے گا۔ چرچل نے یورپی اتحاد کی تحریک چلائی اور کہا کہ ''اے یورپیو۔ فوراً متحد ہوکر اپنے دفاع کا بندوبست کرو۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ اگر اس وقت ہوش میں نہ آؤ گے تو برباد ہوجاؤ گے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ سارے ممالک متحد ہوکر روسی جارحیت کا مقابلہ کریں۔''

چرچل کے اس جارحانہ مؤقف کی تائید بلغاریہ اور آسٹریا میں امریکہ کے سابق سفیر جارج ارل نے کی۔ وہ کئی سال بلقان کی ریاستوں اور مشرق وسطیٰ میں گزارنے کے بعد امریکہ واپس لوٹا۔ 23 ؍مارچ 1946ء کو جب وہ بوسٹن پہنچا تو اس نے کہا کہ روس نے تہذیب کو تاریخ کا سیاہ ترین روپ دے دیا ہے۔ روسیوں کو الٹی میٹم دینا چاہیے کہ وہ اپنے علاقے میں واپس چلے جائیں اور اگر وہ ایسا نہ کریں اور دوسری قوموں کو تشدد کا نشانہ بنانے سے باز نہ آئیں تو ان کو ایٹم بم سے اڑا دیا جائے۔ یہ کارروائی فوراً کرنی چاہیے۔ اگر دیر ہوئی تو وہ بھی ایٹم بم بنالیں گے اور ہم کچھ بھی نہیں کرسکیں گے۔ [53] اس کے بعد 25 ؍اپریل کو شکاگو یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ امریکہ اور کینیڈا کے وسیع علاقے میں جابجا خفیہ اڈے بنا کر ان میں ایٹمی بمبار طیاروں کے بیڑوں کو رکھا جائے اور بالشویکوں کو یہ باور کروا دیا جائے کہ اگر روس کی طرف سے ہمارے خلاف پہلا ایٹم بم گرایا گیا تو ہم اس کے انتقام میں روس کے ایک ایک قصبہ، شہر اور گاؤں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیں گے۔ اپنی حفاظت کرنا تو قدرت کا پہلا قانون ہے اور بالشویک بھی اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ یہ انتقامی ڈھانچہ ہی ہمیں بچا سکتا ہے۔ [54]

روس میں امریکہ کے سفیر جارج کینن نے اپنی حکومت کو ایک تفصیلی رپورٹ بذریعہ تار ارسال کی۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اگر پوری مضبوطی اور چوکنے پن کے ساتھ روس کو گھیرے میں لے لیا جائے تو اس پر اتنا دباؤ پڑے گا کہ اس میں اندرونی تبدیلیاں آئیں گی اور اس کی طاقت یا تو بالکل ٹوٹ جائے گی یا بہت کم ہوجائے گی۔ گویا چرچل، جارج ارل اور جارج کینن

اور بہت سے دوسرے انگریز اور امریکی لیڈر ایک ہی غم میں مرے جا رہے تھے کہ اگر سوویت یونین کا راستہ نہ روکا گیا تو وہ ساری دنیا پر چھا جائے گا۔

نئے ابھرتے ہوئے امریکی سامراج کے پاس دولت بھی تھی جس میں جنگ کی وجہ سے خوب اضافہ ہوا تھا۔ وسائل بھی تھے کہ یہ خطہ ابھی نیا نیا انسان کی دسترس میں آیا تھا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بھی تھی اور یورپ کے اہل علم و دانش، سائنس دان اور انجینئر بھی اسے مہیا ہو گئے تھے۔ جب کہ زوال پذیر برطانوی سامراج کی قوت کو جنگ نے بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور اتنی بڑی سلطنت کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ چنانچہ امریکی چرچل کی طرح محض فقرے بازی اور نعرے بازی سے کام نہیں لے رہے تھے بلکہ نو دریافت شدہ ایٹمی قوت کو بروئے کار لا کر عالمی سامراج کے نگہبان کے طور پر منظر عام پر آ رہے تھے۔ اب عالمی طاقت بننے کے لیے کسی لمبی چوڑی سلطنت کا براہ راست مالک ہونا ضروری نہیں رہ گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی پر اجارہ داری اور جدید نو آبادیاتی نظام کو بروئے کار لایا جا رہا تھا۔ جولائی 1946ء میں امریکہ نے جنوبی بحرالکاہل میں یکے بعد دیگرے ایٹم بم کے دو آزمائشی دھماکے کیے۔ مقصد یہ تھا کہ سوویت یونین کو دہشت زدہ کر کے نہ صرف یورپ میں اشتراکی انقلاب کا سدباب کیا جائے بلکہ چین اور دوسرے ایشیائی ممالک میں انقلابی تحریکوں کو ناکام کیا جائے۔ لیکن امریکی سامراج کی اس وحشیانہ کاروائی کے کسی بھی مقصد کی تکمیل نہ ہو سکی۔

سوویت قائدین کی طرح چین کی کمیونسٹ پارٹی کے قائد ماؤزے تنگ پر بھی کوئی دہشت طاری نہ ہوئی۔ اس نے اگست 1946ء میں ایک امریکی خاتون صحافی اینا لوئیس سٹرونگ سے انٹرویو میں کہا کہ تیسری دنیا کے مظلوم عوام کو ایٹم بم سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ متحد ہو کر امریکی سامراج کے خلاف جدوجہد کرنی چاہیے۔ ''ایٹم بم کاغذی شیر ہے۔ امریکی رجعت پسند عوام کو خوف زدہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں بہت خوف ناک ہے۔ درحقیقت یہ ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ ایٹم بم ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وسیع پیمانے پر قتل عام ہو سکتا ہے لیکن جنگ کے نتیجے کا فیصلہ عوام کرتے ہیں ایک یا دو نئی قسم کے ہتھیار نہیں کرتے۔''[55]

یہ پے در پے ایٹمی دھماکے سوویت یونین کو مشرقی یورپ سے ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹا سکے۔ بلکہ وہاں سوویت غلبہ کو مزید استحکام حاصل ہوتا گیا۔ اسٹالن نے ستمبر 1946ء میں لندن

کے اخبار ''سنڈے ٹائمز'' کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''میری رائے میں ایٹم بم اتنی بڑی طاقت نہیں جتنی کہ بعض سیاست دان تصور کرتے ہیں۔ ایٹم بم کا مقصد یہ ہے کہ کمزور اعصاب والے لوگوں کو خوف زدہ کیا جائے لیکن جنگ کے نتیجے کا فیصلہ ایٹم بم سے نہیں ہوتا کہ اس کے لیے محض ایٹم بم کسی لحاظ سے بھی کافی نہیں ہے۔ ایٹم بم پر اجارہ داری نے ایک خطرے کو ضرور جنم دیا ہے لیکن اس کا توڑ بھی موجود ہے۔ اول تو یہ کہ اس پر اجارہ داری زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ دوسرے یہ کہ اس کے استعمال کو ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔''[56]

لیکن اینگلو امریکی سامراجی ایٹم بم کے نشے میں خود کو دنیا کی برتر طاقت منوانے کی تگ و دو میں لگے رہے۔ ستمبر 1946ء ہی میں صدر ٹرومین کے خصوصی مشیر کلارک۔ ایم کلفورڈ نے ''سوویت امریکہ تعلقات'' کے عنوان سے امریکی صدر کے لیے ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جسے کافی عرصہ تک ایک اہم اور خفیہ دستاویز کی حیثیت حاصل رہی۔ اس نے مشرقی اور وسطی یورپ پر سوویت غلبہ، فرانس اور اٹلی میں کمیونسٹ پارٹیوں کی کامیابیوں، مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ پر غلبہ حاصل کرنے کی سوویت کوششوں اور چین، جاپان اور کوریا پر سوویت تسلط کے عزائم کا ہیبت ناک نقشہ کھینچا۔ علاوہ ازیں اس نے لکھا ''دنیا کے باقی علاقوں میں سوویت یونین وہاں کی قومی ریاستوں کی قوت اور اتحاد کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کرے گا۔ وہ ان میں نو آبادیاتی اضطراب پیدا کرنے کی کوشش کرے گا اور ریاستوں کے مابین پر فریب اختلافات کو جنم دے گا اور بین الاقوامی تعاون کے ہر اس نظام میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش کرے گا، جس میں اسے شامل نہیں کیا جائے گا۔ عالمی امور میں خاص مقام کا حامل ہونے کی بدولت امریکہ اور برطانیہ، سوویت سرگرمیوں کا لازمی نشانہ بنائے جائیں گے۔ مقامی ایجی ٹیشن کو ہوا دینے کے علاوہ سوویت یونین کی کوشش ہوگی کہ امریکہ اور برطانیہ کے اہم مفادات کے علاوہ مثلاً جنوبی امریکہ، ہندوستان، افریقہ اور بحرالکاہل میں امریکی و برطانوی مفادات کو نقصان پہنچانے اور انہیں کمزور کرنے کی کوشش کرے۔'' اس کا توڑ کرنے کے بارے میں اس نے لکھا کہ ''............مؤثر طور پر سوویت یونین کا راستہ روکنے کی خاطر امریکہ کو چاہیے کہ وہ ایٹمی اور حیاتیاتی جنگ کے لیے ہمہ وقت تیار رہے......سوویت یونین کے ساتھ جنگ ایک بھرپور جنگ ہوگی اور حالیہ جنگ سے زیادہ خطرناک ہوگی۔ چنانچہ

مدافعانہ اور جارحانہ ہر دو اقسام کے ہتھیاروں کی تیاری پر تحقیق جاری رہنی چاہیے۔'' اس نے مزید کہا کہ '' اہم نکتہ یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر امریکہ کی ایٹمی اور حیاتیاتی جنگ کے لیے تیاری مکمل ہونی چاہیے۔ ہماری یہ تیاری ہی روسی جارحیت کی راہ میں سب سے طاقتور رکاوٹ ثابت ہوسکتی ہے اور امن کی ضمانت مہیا کرسکتی ہے۔''[57] اس کے بعد امریکہ میں ان خطوط پر تیاریاں ہونے لگیں۔ مغربی یورپ کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی گئی۔ 17رجنوری 1947ء کو امریکہ کے محکمہ خارجہ کے مشیر جان فاسٹر ڈلس نے ایک تقریر میں مغربی یورپ کو مشورہ دیا کہ وہ دریائے رائن کے علاقے کی کوئلے اور لوہے کی طاقت کے اردگرد معاشی طور پر متحد ہو کر سوویت روس کے خلاف ایک فصیل بن جائیں۔ 10رفروری 1947ء کو اس نے شکاگو میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر روس کے بارے میں نرم رویہ اختیار کیا گیا تو اس کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ اگر ہم پیچھے ہٹے تو جنگ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور سوویت رہنما بے دھڑک ہو کر ہم پر چڑھ جائیں گے۔''[58]

برطانیہ کا یونان سے انخلاء اور امریکہ کی طرف سے سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کا اعلان

امریکی سامراجیوں کی طرف سے عالمی اشتراکی خطرے کی اس قسم کی گھنٹیاں بج رہی تھیں کہ یونان کا بحران پیدا ہو گیا۔ زوال پذیر برطانوی سامراج نے دنیا کے اتنے سارے خطوں میں پاؤں پھنسا رکھا تھا کہ اب وہ نئی عالمگیر ذمہ داریوں کے بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یونان میں برطانوی افواج کی تعداد تخمیناً سولہ ہزار (16000) تھی جو ایتھنز، سیلونیکا، کوالہ اور شمالی یونان کے چھ مراکز میں تعینات تھی۔ اوائل فروری میں ایتھنز میں موجود برطانوی سفارت خانے کی جانب سے یونانی حکومت کو نوٹس دے دیا گیا کہ عنقریب یونان میں موجود برطانوی افواج میں مزید تخفیف کی جائے گی۔ تخفیف کے اس عمل کے نتیجے میں جو کہ چند ہفتے تک جاری رہے گا، یونان میں موجود برطانوی فوج پچاس فیصد تک کم ہو جائے گی۔[59] لیکن چند روز میں برطانیہ نے بالکل ہی گھٹنے ٹیک دیئے اور 27رفروری کو امریکہ میں متعین برطانوی سفیر نے امریکی نائب وزیر خارجہ ڈین ایچی سن کو مطلع کر دیا کہ برطانیہ مشرقی بحیرہ روم کے

خطے میں مطلوبہ افواج رکھنے کے قابل نہیں رہا اور وہ 31؍مارچ تک یونان سے اپنی افواج نکال لے گا۔ یاد رہے کہ یہ برطانوی افواج 1945ء سے یونان میں چلی آ رہی خانہ جنگی پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اس خانہ جنگی کو یونان کے ہمسایہ کمیونسٹ ممالک کی حمایت حاصل تھی۔

اسی خطے کا دوسرا ملک ترکی تھا اور اسے بھی داخلی امن عامہ برقرار رکھنے کی خاطر بھاری مالی اور فوجی امداد کی ضرورت تھی۔ 1946ء سے امریکہ بھی اس علاقے میں ملوث ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس نے کچھ امداد کے علاوہ مشیر اور مبصر یہاں بھیج دیئے تھے۔ خدشہ یہ تھا کہ اگر یونان اور ترکی سوویت حلقۂ اثر میں چلے گئے تو بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ پر سوویت غلبہ قائم ہو جائے گا اس لیے اس خطے سے برطانیہ کے میدان چھوڑ جانے پر امریکہ کے ایوان اقتدار میں سنسنی پھیل گئی اور ہر طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ اگر فوری طور پر یونان کی مدد نہ کی گئی تو نہ صرف اس ملک پر کمیونسٹ قبضہ کر لیں گے بلکہ پورے یورپ میں آزادی اور جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

27؍فروری ہی کو وائٹ ہاؤس میں صدر ٹرومین نے اپنی انتظامیہ اور کانگرس کے اہم ارکان کا اجلاس طلب کیا جس میں روس کے بارے میں نئی جنگجویانہ پالیسی کے خطوط وضع کئے گئے جن کی بنیاد کلارک کلفورڈ کی متذکرہ رپورٹ پر رکھی گئی۔ نائب وزیر خارجہ ڈین ایچی سن نے پالیسی کے بارے میں ارکان کانگرس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس خطے کی فوجی اہمیت اور وہاں مداخلت کی ضرورت پر دلائل دیئے۔ اس نے یورپ، یونان، ترکی اور ایران پر سوویت یونین کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا نقشہ پیش کیا اور کہا کہ ''روسیوں نے کئی شرطیں بد رکھی ہیں۔ اگر وہ ان میں سے ایک بھی جیت جائیں تو دراصل وہ سب جیت گئے۔ اگر وہ ترکی پر کنٹرول حاصل کر لیں تو یونان اور ایران تک ان کا کنٹرول لازمی طور پر پھیل جائے گا۔ اگر وہ یونان کو کنٹرول کریں تو ترکی جنگ یا بغیر جنگ کئے ان کے قبضے میں چلا جائے گا اور پھر ایران بھی ان کے زیر تسلط آ جائے گا۔ اگر انہوں نے اٹلی پر غلبہ حاصل کر لیا جہاں پر کمیونسٹوں کا دباؤ ویسے بھی بڑھ رہا ہے تو یونان، ترکی اور مشرق وسطیٰ بھی ان کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور پھر وہاں سے جنوبی ایشیا اور افریقہ میں ان کی یلغار کی کوئی حد نہیں ہو گی۔'' آگے چل کر اس

نے کہا کہ برطانیہ کی بحیثیت عالمی طاقت بنیادیں ہل گئی ہیں۔ جیسا کہ باقی جمہوری ملکوں ماسوائے امریکہ سب کا حشر ہوا ہے۔ برطانیہ شدید مالی بحران کا شکار ہے۔ اس نے حال میں شائع ہونے والے دو قرطاس ہائے ابیض کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ یہ اس کی قومی بقاء کی تاریک تصویر پیش کرتے ہیں اور یہ کہ اب برطانیہ بہت سے دوسرے مقامات سے جن پر اس کی عالمی طاقت کا انحصار تھا، اپنی فوجیں واپس بلانے اور معاشی امداد روک دینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اب دنیا میں صرف دو ہی بڑی طاقتیں باقی رہ گئی ہیں، سوویت یونین اور امریکہ...... اس لیے اب یونان کی امداد کرنا اپنے وفادار اتحادی برطانیہ کی امداد کرنے کے مترادف نہیں بلکہ خود اپنی سلامتی اور بقاء کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اب ہم ایک اہم تاریخی موڑ پر پہنچ گئے ہیں جہاں امریکہ کو نڈھال برطانیہ کی جگہ آگے بڑھ کر آزاد دنیا کے قائد کی حیثیت سنبھال لینی چاہیے اور اپنی طاقت کو پورے ولولہ کے ساتھ براہ راست بروئے کار لا کر آزاد قوموں کو طاقتور بنانا چاہیے۔"[60] وائٹ ہاؤس کے اس اجلاس میں شریک امریکہ کے تمام سرکردہ رہنماؤں نے ڈین ایچی سن کے ساتھ اتفاق کیا۔

اس کے بعد صبح و شام اعلیٰ سطح کی میٹنگیں ہونے لگیں۔ کئی دن کے غور وفکر کے بعد روس کے بارے میں نئی جنگجویانہ پالیسی کے خطوط وضع کئے گئے اور پھر صدر ٹرومین 12/مارچ کو میدان میں آ گیا۔ اس نے امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے ایٹم بم کی طاقت کے نشے کے زیر اثر زبردست بڑھک ماری اور سوویت یونین کے خلاف عالمگیر سرد جنگ کا اعلان کر دیا۔ ٹرومین نے کہا کہ "یونان میں ایک جنگجو اقلیت عوام الناس کی غربت وتنگدستی سے فائدہ اٹھا کر سیاسی انتشار پھیلانے میں کامیاب ہو گئی ہے جس کے باعث اس ملک میں ابھی تک معاشی بحالی نہیں ہو سکی۔ چند ہزار دہشت پسند افراد نے جن کی قیادت کمیونسٹوں کے ہاتھ میں ہے، ملک میں ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ مقامی حکومت اس کے سامنے بے بس ہو گئی ہے۔ حالت بہت خراب ہے۔ یونان کو ہماری فوری امداد کی ضرورت ہے۔ برطانوی حکومت جو اب تک یونان کی امداد کر رہی تھی، 31/مارچ کے بعد اس کو مزید مالی یا معاشی امداد نہیں دے سکے گی۔ برطانیہ اب یونان سمیت دنیا کے بیشتر علاقوں میں اپنی ذمہ داریوں میں کمی کرنے یا دستبردار ہونے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اقوام متحدہ اور اس سے

متعلقہ کوئی بھی تنظیم یونان کی مطلوبہ امداد مہیا نہیں کر سکتی۔ ترکی بھی ہماری توجہ کا مستحق ہے اگرچہ اس ملک میں جنگ کی وجہ سے تباہ کاری نہیں ہوئی تھی تاہم اس ملک کی بھی جدید خطوط پر تعمیر نو کی ضرورت ہے۔ مشرق وسطیٰ میں امن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ترکی کی سالمیت کا تحفظ کیا جائے۔ حکومت برطانیہ نے ہمیں مطلع کر دیا ہے کہ اپنی مشکلات کی وجہ سے وہ ترکی کی مالی یا معاشی اعانت مزید جاری نہیں رکھ سکتا۔ سوویت یونین نے معاہدہ یالٹا کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پولینڈ، بلغاریہ اور رومانیہ پر اپنی من پسند آمرانہ حکومتیں مسلط کر دی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہر قوم کو فیصلہ کرنا ہو گا کہ اس نے جمہوری طرز زندگی اپنانا ہے یا ایسا طریقۂ حیات اختیار کرنا ہے جس میں دہشت گردی اور ظلم و ستم کا دور دورہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان آزاد لوگوں کی حمایت کرے جو غلامی سے بچنے کے لیے مسلح اقلیتوں کی یا بیرونی دباؤ کی مزاحمت کر رہے ہیں۔ اگر یونان مسلح اقلیت کے کنٹرول میں چلا گیا تو مشرق وسطیٰ اور یورپ میں بدامنی پھیل جائے گی۔ یونان اور ترکی کی امداد کی خاطر 30/جون 1948ء تک کے عرصے کے لیے چالیس کروڑ ڈالر کی ضرورت ہے۔ اس رقم کی فوراً منظوری دی جائے۔''[61]

صدر ٹرومین کے اس اعلان سے ساری دنیا میں سنسنی پھیل گئی۔ کیونکہ اس میں تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ نمایاں تھا۔ امریکہ کے حکمران طبقے کے سرغنہ نے صرف سوویت یونین کو ہی نہیں للکارا تھا بلکہ اس نے ساری دنیا کے ان مظلوم عوام کو دھونس دی تھی جو اپنی سیاسی آزادی اور معاشرتی انقلاب کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ فلیمنگ کے بقول صدر ٹرومین نے اس اعلان کے ذریعے ساری دنیا میں انقلاب کی ممانعت کر دی تھی جب کہ دنیا کے بیشتر علاقوں میں اربوں عوام معدودے چند استحصالیوں کی غلامی کے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔[62]

صدر ٹرومین کا یہ اعلان بعد میں ''نظریہ ٹرومین'' کہلایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راج کرے گا خاصلہ آ کی رہے نہ کوئی۔ اگر کسی ملک کے مظلوم عوام نے اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی آزادی کے لیے داخلی رجعت پسندوں یا بیرونی سامراجیوں کے خلاف جدوجہد کی تو انہیں کمیونسٹ قرار دے کر کچل دیا جائے گا۔ امریکہ نے دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک بزور قوت حالات کو جوں کا توں رکھنے کے لیے عالمی پولیس مین کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ طریقۂ کار یہ وضع کیا گیا تھا کہ سوویت یونین کا گھیراؤ کر کے اس پر اتنا دباؤ

ڈالا جائے گا کہ وہ نہ صرف یورپ میں اپنے مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہو جائے گا بلکہ اس کے اندر بھی ایسی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تبدیلی آئے گی جو امریکہ کے حکمران طبقے کے لیے قابل قبول ہو گی۔ اس دوران تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے عوام دشمن حکمران طبقوں کی پشت پناہی کی جائے گی تا کہ وہ امریکہ کے عالمی سامراجی نظام میں پٹھوؤں کا کردار ادا کرتے رہیں۔ نعرہ آزادی و جمہوریت کا لگایا جائے گا لیکن تحفظ غلامی و استبدادیت کا کیا جائے گا۔

جولائی 1947ء میں جارج کینن نے ''فارن افیئرز'' میں ایک مضمون لکھا جس میں اس نے سوویت یونین کے گھیراؤ سے متعلقہ اپنی تھیوری کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''سوویت یونین کے عوام جسمانی اور روحانی طور پر بہت تھکے ہوئے ہیں۔ پرانی نسل ختم ہو رہی ہے۔ اسٹالن مرنے والا ہے۔ اس کی موت کے بعد اقتدار کے لیے رسہ کشی ہو گی اور ملک اندرونی طور پر کمزور ہو جائے گا۔ اگر اس موقع پر دھڑے بندی کے باعث پارٹی مفلوج ہو گئی تو روسی معاشرے کے انتشار اور اس کی کمزوری کا نا قابل بیان حد تک مظاہرہ ہو گا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم آئندہ دس پندرہ سال کے دوران ایسے رجحانات کو فروغ دیں جو بالآخر اس کی طاقت کو یا تو بالکل پارہ پارہ کر دیں یا اسے نحیف و نزار کر دیں۔'' کینن کے اس مضمون میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ محض ایک شخص کی انفرادی رائے نہیں تھی بلکہ اس میں سوویت یونین کے بارے میں امریکہ کے محکمہ خارجہ کے نظریئے اور پالیسی کی آئینہ داری کی گئی تھی۔

تاہم آزاد خیال امریکی اخبار نویس والٹر لپمین نے حقیقت حال کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھا کہ ''یونان اور ترکی کو اس لیے امداد نہیں دی گئی ہے کہ یہ دونوں ممالک جمہوریت کے شاندار نمونے ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ بحر اسود اور سوویت یونین کے عقب کے دہانے پر واقعہ ہیں۔''[63] والٹر لپمین نے ایک پمفلٹ میں سوویت یونین کا گھیراؤ کرنے کی امریکی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس نے لکھا کہ ''اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے سے سوویت یونین کے گرد و نواح میں غیر منظم، غیر متحد، کمزور اور بے سلیقہ اقوام، قبائل اور گروہوں کا گٹھ جوڑ ہو گا اور امریکہ کو اس گٹھ جوڑ کے رکن ممالک کے اندرونی معاملات میں بار بار مداخلت کرنا پڑے گی۔''[64]

ماؤزے تنگ نے اس پر یہ تبصرہ کیا کہ امریکی رجعت پسند نے بہت بھاری بوجھ اٹھایا

ہے۔ اس کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ساری دنیا کے رجعت پسندوں کو سہارا دے۔ جب یہ سہارا نہیں رہے گا تو رجعت پسندی کی یہ عمارت پیوستِ زمین ہو جائے گی۔ یہ عمارت صرف ایک ستون پر قائم کی گئی ہے۔ سوویت اخبار ''ازویستیا'' نے اعلان ٹرومین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''عالمی امور کی قیادت کا امریکی دعویٰ مفاد پرست امریکی حلقوں کی ہوس نے پیدا کیا ہے۔ تاہم نئی تاریخی صورت حال میں امریکی رہنما یہ بھول رہے ہیں کہ اب پرانے نو آباد کاروں اور سخت گیر سیاست دانوں کے طریقے پچھلی صدی کی بات ہو چکے ہیں اور ناکامی ان کا مقدر بن چکی ہے۔''[65]

یورپ کی دیوالیہ سامراجی معیشت کی تعمیر نو کا امریکی ٹھیکہ۔ مارشل پلان

صدر ٹرومین کے اعلان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت امریکہ نے یونان اور ترکی کے بعد سب سے پہلے یورپ کی طرف توجہ کی۔ اس کی فوری وجہ یہ تھی کہ برطانیہ نے 1947ء کے اوائل میں ہندوستانی برصغیر سے دستبرداری کا قطعی اعلان کرنے سے پہلے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس نے پہلے تو امریکہ کو یہ بتایا کہ اس کے پاس امریکی درآمدات کی قیمت ادا کرنے کے لیے ڈالر نہیں ہیں اور پھر واشنگٹن میں مقیم برطانوی سفیر نے امریکہ کے نائب وزیر خارجہ کو مطلع کیا کہ برطانیہ یونان میں مزید فوجی مداخلت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ کا معاشی طور پر بھرکس نکال دیا تھا۔ دو ایک سال تو انگریزوں نے کسی نہ کسی طرح اپنا بھرم قائم رکھا اور یہ تاثر دیا کہ برطانیہ بدستور ایک عالمی طاقت ہے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں میں دس لاکھ فوج متعین کئے رکھی۔ حالانکہ ملک میں بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ تقریباً بیس لاکھ لوگ روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ لیکن جب جنوری 1947ء میں امریکی درآمدات کی ادائیگیوں کے لیے کوئی پیسہ نہ رہا اور بحران پیدا ہو گیا تو ان کے عالمی طاقت ہونے کا جھوٹا بھرم قائم نہ رہ سکا۔ ان کے ڈھول کا پول کھل گیا اور امریکہ کے حکمران طبقوں کو محسوس ہوا کہ یورپ میں زبردست خلا ہے۔ اگر اس خلا کو فوراً پر نہ کیا گیا تو سارے یورپ میں انقلاب آ جائے گا۔ انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ ان کے تمام یورپی سرمایہ دار حریف بری طرح مات کھا چکے

ہیں۔ اب ان میں تجارتی وصنعتی مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں۔ اس لیے موقع ہے کہ یورپ کی معیشت پر قبضہ کر کے امریکہ کی عالمی بالا دستی کو دوام بخشا جائے اور یورپ کے تباہ حال ممالک کی معیشت کو امریکہ کی نگرانی اور سرپرستی میں بحال کر کے سوویت یونین کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس مسئلہ پر امریکہ کے نائب وزیرخارجہ ڈین ایچی سن نے لب کشائی کی۔ اس نے ریاست مسی سپی کے شہر کیولینڈ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''امریکہ کی سالانہ برآمدات کی مالیت 16 ارب ڈالر ہے اور یہ مالیت ہماری درآمدات کی مالیت سے دوگنا ہے۔ اگر یہ صورت حال رہی تو غیر ملکی گاہک ہمارے مال کی قیمت کیسے ادا کرتے رہیں گے؟ ان کے پاس ڈالر کہاں سے آئیں گے؟'' ڈین ایچی سن نے کہا کہ ''چونکہ ہم امریکی امداد کے بارے میں دنیا کے سارے علاقوں کے مطالبات پورے نہیں کر سکتے اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی امداد صرف ان علاقوں کے لیے مخصوص کریں جہاں یہ عالمی استحکام کی تعمیر، انسانی آزادی اور جمہوری اداروں کے فروغ، آزاد تجارت کی ترقی اور اقوام متحدہ کو تقویت دینے کے کام میں سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو۔ ہمیں ان ممالک کی امداد کرنی چاہیے جو انسانی آزادی اور جمہوری اداروں کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر سے متفق ہیں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ سوویت یونین کی تعمیر نو کے لیے امداد نہیں دی جائے گی بلکہ ان یورپی ممالک کو امداد دی جائے گی جو سوویت یونین کے خلاف ہماری محاذ آرائی میں شامل ہوں گے۔

5 رجون 1947ء کو امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل نے ہارورڈ یونیورسٹی میں برطانیہ اور یورپ کے معاشی مسائل پر کھل کر تبصرہ کر کے ان کا امریکی حل پیش کیا۔ جارج مارشل نے کہا کہ ''ضرورت اس امر کی ہے کہ یورپ میں روز افزوں معاشی، معاشرتی اور سیاسی بدحالی کے سدباب کے لیے تین چار سال تک امداد دی جائے۔ ورنہ امریکہ کی معاشیات پر نہایت سنگین اثرات مرتب ہوں گے۔ یورپ کی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ضروریات کے بارے میں اتفاق رائے کر کے یہ بتائیں کہ وہ اپنی معاشیات کی بحالی کے کام میں خود کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ جو حکومتیں یا سیاسی جماعتیں سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے انسانی زبوں حالی کو طول دینے کے درپے ہیں انہیں امریکہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' اس کا بھی مطلب بالکل واضح یعنی یہ تھا کہ اگر سوویت یونین یا یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں نے یورپ کی معاشی بحالی کے امریکی

پروگرام کی مخالفت کی تو انہیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

جارج مارشل کے اس اعلان کے بعد جون کے آخری ہفتے میں پیرس میں برطانیہ، فرانس اور سوویت یونین کے وزرائے خارجہ کا اجلاس ہوا جس میں دس بارہ دن تک مارشل پلان کے حسن وقبح پر غور کیا گیا۔ برطانیہ اور فرانس کی تجویز یہ تھی کہ پورے یورپ کی ایک معاشی بیلنس شیٹ تیار کی جائے جس میں معاشی ذرائع اور ضروریات کی وضاحت کی گئی ہو یعنی امریکہ کو ہر ملک کی معاشیات کے بارے میں مطلوبہ معلومات مہیا کی جائیں۔ سوویت یونین کے وزیر خارجہ نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ اس طرح امریکہ کو یورپ کے ہر ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقع ملے گا اور یورپی ممالک اپنی معاشی اور قومی آزادی سے محروم ہو جائیں گے۔ سوویت وزیر خارجہ کی رائے میں امریکہ کا منصوبہ یہ تھا کہ یورپ کے بعض ممالک سے گٹھ جوڑ کر کے انہیں دوسرے ممالک کے خلاف آلۂ کار بنایا جائے اور اس طرح بالآخر پورے یورپ پر اپنی بالا دستی قائم کی جائے۔ تاہم برطانیہ اور فرانس کے وزرائے خارجہ اپنی تجویز پر مصر رہے اور اس طرح تینوں وزرائے خارجہ کی یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔ یورپ رسمی طور پر دو بلاکوں میں تقسیم ہو گیا۔ نتیجتاً یورپ میں اور پھر ساری دنیا میں بڑی شدت کے ساتھ سرد جنگ شروع ہو گئی۔ برطانیہ اور فرانس نے سوویت یونین کے زیر قبضہ مشرقی یورپ کے ممالک کو فراخدلانہ امریکی امداد کا لالچ دے کر انہیں اپنے ساتھ ملانے کی بہت کوشش کی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ سوویت یونین نے مشرقی یورپ پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ مغربی یورپ میں امریکہ کا ڈنکا بجنے لگا اور برطانیہ، فرانس اور دوسرے سرمایہ دار یورپی ممالک نے اپنی معیشتوں کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں دے کر طفیلیوں، پٹھوؤں اور حاشیہ برداروں کی حیثیت اختیار کر لی۔ تاہم ان کے حکمران طبقوں کے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ جب امریکی امداد کے باعث معاشی بحالی کا عمل شروع ہوا تو اشتراکی انقلاب کی سرخ آندھی بھی تھم گئی اور سرمایہ دارانہ نظام میں ازسرِ نو استحکام پیدا ہو گیا۔ اس استحکام سے ان سرمایہ دار ملکوں کی بقاء کا سامان تو پیدا ہو گیا لیکن ان کی وہ حیثیت کبھی بحال نہ ہو سکی جس کے ذریعے وہ دُنیا بھر میں اپنی نو آبادیوں کا بوجھ اُٹھانے کے متحمل ہو سکتے تھے۔

باب: 2

برطانوی سامراج کا دیوالیہ، عالمگیر سلطنت سے اس کی پسپائی

برطانیہ کی سامراجی معیشت کا دیوالیہ

عالمی جنگ نے برطانیہ کی سامراجی معیشت کا دیوالیہ نکال دیا تھا۔ جنگ کے آغاز سے ذرا قبل 31/مارچ 1939ء کو برطانوی خزانے میں دو ارب اسی کروڑ (2800 ملین) ڈالر کی مالیت کے سونے کا ذخیرہ موجود تھا۔لیکن ڈیڑھ سال کے اندر یعنی نومبر 1940ء تک اس کا تقریباً صفایا ہو چکا تھا اور جب یہ صرف ایک کروڑ پونڈ کی مالیت کے برابر باقی رہ گیا تو قرضے پر دارومدار ہو گیا۔ جولائی 1944ء تک برطانیہ پر تین ارب پونڈ سے زائد کا قرضہ چڑھ چکا تھا اور عنقریب چار ارب پونڈ تک پہنچ جانے کی توقع تھی۔ ان حالات میں جنگ اختتام کو پہنچی تو برطانیہ بے روزگاری، مہنگائی، اشیائے صرف کی قلت اور صنعتی بحران کی دلدل میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ جنگ کے دوران برطانیہ میں تباہ و برباد ہونے والے مکانات کی تعداد پینتالیس لاکھ تھی جن میں سے بیس لاکھ مکمل طور پر برباد ہو گئے تھے۔ املاک کے کل نقصان کا تخمینہ آٹھ ارب اسی کروڑ ڈالر کے لگ بھگ لگایا گیا۔حکومت کی طرف سے اس کی تلافی کرنے کے لیے لوگوں کو صرف ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ امداد دی گئی تھی۔ جانی نقصان کی تفصیل یہ تھی کہ دو لاکھ چالیس ہزار کی تعداد میں مسلح افواج سے، اکتیس ہزار مرچنٹ نیوی سے اور ساٹھ ہزار شہریوں میں سے مارے گئے تھے۔ برطانیہ کی تجارتی جہاز رانی کا وزن 1939ء میں

41,600,000 ٹن تھا لیکن جنگ کے اختتام پر یہ صرف 19,500,000 ٹن رہ گیا تھا۔ جب کہ جنگ کی بدولت امریکہ کی جہاز رانی کے وزن میں چار گنا اضافہ ہوا تھا اور یہ 50,000,000 ٹن کے برابر ہو گیا تھا۔ جنگ کے نتیجے میں برطانیہ کی قومی دولت میں بیس فیصد کی کمی واقع ہوئی جو ڈھائی ارب ڈالر کے برابر تھی۔ برآمدات اور درآمدات کا توازن بھی بری طرح بگڑ چکا تھا۔ 1938ء میں جنگ کا آغاز ہونے والا تھا۔ برآمدات کی مقدار درآمدات کے مقابلے میں نمایاں طور پر کم تھی۔ لیکن اس وقت عدم توازن کے اثرات کو دوسرے ذرائع آمدنی سے دور کر دیا جاتا تھا۔ ان ذرائع میں بیرون ملک سرمایہ کاری، جہاز رانی اور انشورنس کے کمیشن وغیرہ سے حاصل ہونے والی آمدنی شامل تھی۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں 1944ء کے اوآخر تک بیرون ملک سرمایہ کاری کا نصف حصہ فروخت ہو چکا تھا۔ تجارتی بیڑے کا تیس فیصد ضائع ہو چکا تھا اور برآمدات کی صورت حال 1938ء کے مقابلے میں یہ تھی کہ ان کے حجم میں 31 فیصد کمی اور ان کی قیمت میں 55 فیصد کمی واقع ہو چکی تھی۔[1]

16 رجولائی 1945ء کو رجسٹر شدہ بے روزگار مردوں کی تعداد 71,806 تھی۔ ان میں 19,507 مردوں کی وہ تعداد شامل نہیں تھی جن کو صنعتی ملازمت کے لیے غیر موزوں قرار دیا گیا تھا۔ 16 راپریل کو جاری کردہ اعداد وشمار کے مقابلے میں بے روزگار مردوں کی کل تعداد میں 10,598 کا اضافہ ہوا تھا۔ 16 رجولائی کو بے روزگار عورتوں کی تعداد 40,019 تھی۔ 16 راپریل کے اعداد وشمار کے مقابلے میں اس میں 10,558 کا اضافہ ہوا تھا۔ اس سال آنے والی سردیوں میں کوئلے کی شدید قلت دُور کرنے کے لیے اسی لاکھ ٹن مزید کوئلے کی ضرورت تھی جس کی فراہمی کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ باقی اشیائے صرف کی بھی شدید قلت پائی جاتی تھی۔ ہر شے راشن سے ملتی تھی۔ 21 راگست 1945ء کو کپڑے کے راشن میں مزید تخفیف کر دی گئی۔ ہر شخص کو چوبیس کوپن ملتے تھے جن کو وہ چھ مہینے تک کپڑا خریدنے کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اب ان کا دورانیہ بڑھا کر آٹھ مہینے تک کر دیا گیا تھا۔ اسی روز آئس کریم، چاکلیٹ، دیگر میٹھی اشیاء اور مشروبات کی صنعت میں صرف ہونے والی چینی کی مقدار میں تخفیف کر دی گئی۔ بیکرز کے استعمال میں آنے والی اشیاء کے ذخائر میں بھی کمی کر دی گئی۔ 29 رستمبر 1945ء کو شائع کردہ محکمہ خزانہ کے اعداد وشمار کے مطابق گزشتہ چھ ماہ کے دوران دو ارب پچھتر کروڑ پونڈ کے

مصارف ہوئے جب کہ آمدنی صرف ایک ارب چھتیس کروڑ پونڈ کے قریب ہوئی۔ 25 ستمبر کو برکن ہیڈ کی بندرگاہ میں ایک مقامی تنازعہ پر گودی مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور پھر اس کا دائرہ دوسری بندرگاہوں تک بھی پھیل گیا۔ یکم اکتوبر 1945ء کو برطانیہ کی دوسرے نمبر پر سب سے بڑی بندرگاہ لیورپول کے سترہ ہزار مزدوروں نے ہڑتال کر دی اور جہازوں پر مال لادنے اور اتارنے کا کام معطل ہو کر رہ گیا۔ وسطی انگلستان میں بھی لیڈز کی کپڑے کی صنعت بری طرح متاثر ہوئی کیونکہ وہاں دو ہزار ٹرانسپورٹ ورکرز نے گزشتہ ایک ہفتے سے ہڑتال کر رکھی تھی۔ 10 اکتوبر تک گودی مزدوروں کی ہڑتال برطانیہ کی تمام بندرگاہوں تک پھیل گئی اور ہڑتالیوں کی تعداد تینتالیس ہزار تک ہو گئی۔ 13 اکتوبر کو حکومت برطانیہ نے یورپ کی مختلف بندرگاہوں میں تعینات برطانوی سپاہیوں کو طلب کر لیا تا کہ وہ برطانیہ کی بڑی بندرگاہوں پر کھڑے جہازوں سے اشیائے خوردنی کے اتارنے کا کام انجام دیں جو ہڑتال کے باعث معطل پڑا تھا۔ تقریباً اکیس ہزار سپاہیوں کو اس کام پر لگایا گیا۔ یہ خدشہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ہڑتال میں انقلابی کمیونسٹ پارٹی کا ہاتھ ہے۔ تاہم ہڑتالی کمیٹی کے چیئرمین نے وضاحت کی کہ ایسا نہیں ہے۔ بالآخر 3 نومبر کو یہ ہڑتال ختم ہوئی اور گودی مزدوروں نے تمام بندرگاہوں پر دوبارہ کام شروع کر دیا۔ جس دوران یہ ہڑتال جاری تھی، راخ ڈیل میں سوتی دھاگہ بنانے والے ایک ہزار کاریگروں نے بھی ہڑتال کر دی اور اس سے لنکاشائر کی سوتی دھاگے کی صنعت کے دس ہزار مزدوروں کا کام متاثر ہوا۔ اخباری صنعت بھی بحران کا شکار تھی کیونکہ اخباری کاغذ پر جنگ کے دوران عائد کردہ پابندیاں بدستور نافذ تھیں۔

فولاد کی صنعت کی صورت حال بھی ٹھیک نہیں تھی۔ 21 نومبر کو یونائیٹڈ سٹیل کمپنیز کے چیئرمین نے ایک کتابچہ لکھا جس میں اس نے کہا کہ صنعت کی بحالی کی رفتار بہت سست ہے۔ مزدوروں اور مال کی کمی کا سامنا ہے۔ فوجیوں اور جنگی فرائض انجام دینے والے شہریوں کی واپسی سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو رہا کیونکہ ان کی وجہ سے اس عملہ کی کمی پوری نہیں ہوئی جو ریٹائر ہو چکا ہے۔ وہ نوجوان جن کو جنگ کے زمانہ میں مشین پر کام کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ ان کو اب فوج میں جانا پڑ رہا ہے۔ 15 نومبر کو محکمہ محنت و قومی خدمت کے وزیر نے جو اعداد و شمار جاری کئے ان کے مطابق 1943ء کے وسط سے ستمبر 1945ء تک تیرہ لاکھ افراد بے روزگار

ہوئے تھے اور سال کے اختتام تک مزید آٹھ لاکھ اسی ہزار افراد کے بے روزگار ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ 30/نومبر کو بورڈ آف ٹریڈ کی جانب سے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق درآمد وبرآمد کے مابین عدم توازن بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ گزشتہ نو مہینے کے دوران صرف ستائیس کروڑ بیس لاکھ پونڈ مالیت کی برآمد ہوئی جب کہ درآمدات کی مالیت ستاسی کروڑ دس لاکھ پونڈ تھی۔ دسمبر کے اوائل میں برطانوی حکومت نے معیشت کے اعدادوشمار کے بارے میں ایک قرطاس ابیض شائع کیا جو ان دنوں واشنگٹن میں امریکہ کے ساتھ مالی امداد پر ہونے والی گفت وشنید کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق آئندہ دوتین برسوں میں ادائیگیوں کے توازن میں شدید خسارے کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ اس تخمینے کے مطابق 1946ء میں پچھتر کروڑ پونڈ کے خسارہ کی توقع تھی۔ قرطاس ابیض میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ جنگ کے دوران برطانیہ کی بیرون ملک سرمایہ کاری میں سے ایک ارب بارہ کروڑ پونڈ کے لگ بھگ فروخت ہو چکا ہے۔ جب کہ بیرون ملک اس کی ذمہ داریاں بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ یہ ذمہ داریاں چھہتر کروڑ پونڈ سے بڑھ کر تین ارب پینتیس کروڑ پونڈ سے بھی تجاوز کر گئی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کا سب سے بڑا حصہ ہندوستان، برما، اور مشرق وسطیٰ میں تھا جس کی مقدار ایک ارب تہتر کروڑ پونڈ یعنی کل ذمہ داریوں کے نصف کے برابر تھی۔ ان حالات میں برطانیہ کے پاس ان ذمہ داریوں سے دستبردار ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ چنانچہ وہ ان علاقوں کو آزادی دے کر دراصل اپنی جان چھڑانے پر مجبور ہوا۔[2]

23/جنوری 1946ء کو فیڈریشن آف برٹش انڈسٹریز کے صدر کلائیو بیل ہیٹن نے ایک تقریر میں کہا کہ ''اگر برآمدات کی 1938ء کی مقدار میں قریباً پچھتر فیصد کا اضافہ کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو اس صورت میں اشیائے خوردنی کی نایابی اور ارزانی اور بہت سے خام مال کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ راشننگ کو غیر معینہ عرصے تک جاری رکھنا پڑے۔ آج کل ہماری صورت حال مکمل عدم توازن کی ہے اور اس کی مثال ایک الٹے مخروط کی سی ہے۔ جس کے نچلے سرے پر صنعت وتجارت اور کاروبار ہے اور اس نے اخراجات کا جسیم اور وزنی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔'' 3/فروری 1946ء کو بورڈ آف ٹریڈ کے صدر سر سٹیفورڈ کرپس نے برمنگھم میں کہا کہ عوام کو غیر معینہ عرصے تک حالت جنگ کے خوراک، کپڑے اور رہائش

کے گھٹیا معیار پر نہیں رکھا جا سکتا۔ ہمیں لوگوں کو بہتر معیار زندگی دینا ہوگا جو رقم کی شکل میں نہیں بلکہ اشیاء کی شکل میں ہونا چاہیے۔ پیداوار بڑھانا ہوگی مگر اس کے لیے کارکن کہاں سے آئیں گے؟ 5 ر فروری کو برطانوی وزیر خوراک بن سمتھ نے روغنیات کے راشن میں مزید کمی کا اعلان کر دیا۔ اشیائے خوردنی میں حالت جنگ کی سی قلت پہلے ہی پائی جاتی تھی۔ جانوروں کے چارے دانے کی قلت کی وجہ سے سور کا گوشت، مرغی، انڈے وغیرہ کی بھی شدید قلت پیدا ہو گئی۔ ہوٹلوں میں ڈبل روٹی پیش کرنے پر پابندی عائد تھی۔ خوراک کی اس حالت زار پر شدید ردعمل ہوا۔ 8 ر فروری کو لیور پول میں پانچ سو خواتین نے خوراک کے راشن میں کمی کے خلاف احتجاج کیا۔ 15 ر فروری کو لندن میں برطانوی خانہ دار خواتین کی لیگ کا اجلاس ہوا جس میں خوراک کی قلت اور راشن میں کمی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول نے بائیس لاکھ پچاس ہزار ٹن گندم کا مطالبہ کیا تھا۔ جسے پورا کرنے کے لیے امریکہ اور آسٹریلیا سے گندم کے جہاز منگوائے جا رہے تھے۔ ادھر سابق فوجیوں کی کانفرنسیں منعقد ہو رہی تھیں جن میں ابھی تک بے روزگار رہنے والے سابق فوجیوں کی تعداد پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔ ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ اس کے ساتھ ہی صورت حال یہ تھی کہ 10 ر مارچ کو نیشنل یونین آف مائن ورکرز کے پروڈکشن آفیسر نے چسٹر فیلڈ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کوئلہ کی ملکی اور برآمدی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مزید ایک لاکھ کان کنوں کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ کان کنی کی صنعت میں ملازمت کرنے کا رجحان تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اس ملک کی لولی لنگڑی معیشت کو سہارا دینے کے لیے پیداوار میں اضافہ کرنے والے افراد تو موجود تھے لیکن ان کو ملازمتیں دینے کے لیے اتنا سرمایہ موجود نہیں تھا جو انہیں ملازمت پر راغب کر سکتا۔ جو افراد صنعتی پیداوار میں استعمال ہو رہے تھے ان کا بھی ہڑتالوں کا سلسلہ جاری تھا۔ مارچ کے وسط میں فورڈ موٹر کمپنی کے گیارہ ہزار کارکن ہڑتال پر تھے جب کہ موٹر انجینئرنگ سے وابستہ دیگر کارکنوں نے کام کو سست کر کے ہڑتال میں شرکت اختیار کر رکھی تھی۔ 13 ر مارچ کو ریڈیو بنانے والی کمپنی اے۔ سی۔ کوٹر لمیٹڈ کی دو ہزار خواتین کارکنوں نے اپنی اجرتوں میں اضافے کے لیے ہڑتال کر دی۔ اس قسم کی ہڑتالوں کا سلسلہ سارا سال جاری رہا۔ 1946ء کے موسم سرما کا آغاز ہوا تو کوئلے کی شدید قلت پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے نہ صرف بجلی کی پیداوار متاثر ہوئی بلکہ پوری

صنعت وتجارت اور عام روزمرہ زندگی پر بہت برا اثر پڑا۔ صنعتی حلقوں میں مایوسی کی وجہ سے حصص کی قیمتیں گر گئیں۔ 5رنومبر 1946ء کو بورڈ آف ٹریڈ کے پارلیمانی سیکرٹری نے انکشاف کیا کہ اشیائے صرف کی جس قدر پیداوار جنگ کے آغاز سے قبل ہوتی تھی، جنگ کے خاتمے کے بعد گھٹ کر کہیں کم ہوگئی ہے۔ اس نے موازنہ کرنے کی خاطر 1935ء کی پیداوار کو سو فیصد فرض کر لیا اور پھر بطور مثال چند اشیاء کی 45ء اور 46ء کی پیداوار کا تناسب پیش کیا۔ چنانچہ 1935ء کے مقابلے میں جوتوں کی پیداوار 45ء میں 58 فیصد اور 46ء میں 75 فیصد ہوئی، کپڑوں کی تیاری 45ء میں 48 فیصد اور 46ء میں 65ء فیصد رہی۔ فرنیچر کی بنوائی 45ء میں 21 فیصد اور 46ء میں 61 فیصد ہوئی اور ہارڈ ویئر کی 45ء میں 45 فیصد اور 46ء میں 98 فیصد پیداوار ہوئی۔ ادھر ایندھن اور توانائی کی صورتحال مزید بدتر ہوتی گئی۔ بیسیوں فیکٹریاں بند ہو چکی تھیں یا کم وقت کے لیے کام کر رہی تھیں۔ سوتی کپڑے کی صنعت سے وابستہ 254 یونٹ بند ہو گئے تھے۔ لاکھوں کارکن بیکار بیٹھے تھے۔ صرف لیور پول میں ساٹھ ہزار کارکن متاثر ہوئے تھے۔ 22رفروری 1947ء کو وزارتِ محنت و نیشنل سروس کے جاری کردہ اعداد وشمار کے مطابق بے روزگار افراد کی تعداد بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی تھی۔ برآمدات میں بہت کمی واقع ہوئی تھی اور ادائیگیوں کے توازن میں بری طرح خسارے کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ مارچ 1947ء میں شائع شدہ اعداد وشمار کے مطابق اس سال کے دوران پینتیس کروڑ پونڈ کے خسارے کی توقع تھی۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے امریکی قرضے کا سہارا لیا جا رہا تھا۔[3]

اس جائزے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے بعد معاشی طور پر برطانیہ کی اپنی حالت بہت پتلی ہوگئی تھی۔ اس نے امریکہ سے 3075 ملین ڈالر قرضہ لیا تھا لیکن اس کے باوجود برطانوی عوام کی بدحالی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ بہت سے کارخانے بند پڑے تھے۔ سرکاری خزانے میں کوئی پیسہ نہیں تھا۔ بازار میں پونڈ کی قیمت روز بروز کم ہو رہی تھی۔ بے روزگاروں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ ہوگئی تھی۔ روٹی، دودھ، گوشت، انڈوں، پٹرول، کوئلہ، گیس بجلی، جوتوں اور کپڑوں کی بہت قلت تھی اور ہر چیز راشن پر ملتی تھی۔ جنگ کے دوران کسی نے نئے کپڑے نہیں بنوائے تھے۔ اکثریت پھٹے ہوئے یا پیوند لگے ہوئے پہنتی تھی، بچوں کے لیے گرم جرابیں نہیں تھیں، کھلونوں پر سو فیصد ٹیکس تھا۔ کرسمس کے لیے ٹرکی کا گوشت

نہیں ملتا تھا۔ بیشتر دکانوں پر اس قسم کے نوٹس نظر آتے تھے کہ ''آلو نہیں ہیں''۔ ''گوشت نہیں ہے''۔ ''سگریٹ نہیں ہیں'' اور ''کوئلہ نہیں ہے۔'' سب کو سردی لگتی تھی۔ سب بھوکے تھے اور مشہور برطانوی ماہر معاشیات میزا ڈکینز کا مشورہ یہ تھا کہ ''ہم غریب قوم ہیں۔ ہمیں غریبوں کی طرح رہنا سیکھنا چاہیے۔''[4]

لٰہذا جب جولائی 1945ء کے تیسرے ہفتے میں عام انتخابات ہوئے تو برطانوی عوام نے ''امیروں کی جماعت'' کنزرویٹو پارٹی کی بجائے ''غریبوں کی جماعت'' لیبر پارٹی کو ووٹ دیئے۔ 26/جولائی کو انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ لیبر پارٹی کو 412 نشستیں، کنزرویٹو پارٹی کو 213 اور لبرل پارٹی کو صرف 12 نشستیں ملی ہیں۔ برطانوی عوام نے اپنا یہ ''سنسنی خیز'' انتخابی فیصلہ دو وجوہ کی بنا پر صادر کیا تھا۔ پہلی وجہ تو ان کی اس توقع میں مضمر تھی کہ لیبر پارٹی بے روزگاری، مہنگائی، افراطِ زر اور غریبی میں کمی کرے گی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ لیبر پارٹی نے عالمگیر سلطنت کے بوجھ کو کم کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ برطانیہ کے ''غریب عوام'' میں اس سلطنت کو برقرار رکھنے کے لیے کوئی دلچسپی اور ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ ان میں سامراجی ولولہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

برطانوی سلطنت کے کھنڈرات پر اینگلو امریکی جدید نو آبادیاتی نظام کی استواری

تاہم برطانیہ کے حکمران طبقے نے ہمت نہیں ہاری تھی اور یہ پالیسی وضع کی تھی کہ (1) ان محکوم ممالک کو بتدریج ''آزادی'' دے دی جائے گی جن کی تحریک آزادی کی باگ ڈور غیر کمیونسٹ ''اعتدال پسند'' عناصر کے ہاتھ میں تھی۔ امید یہ تھی کہ چونکہ ''اعتدال پسند'' عناصر کا طبقاتی مفاد پرانے استحصالی نظام سے وابستہ ہوگا اس لیے وہ سامراجی مفادات کا تحفظ کرتے رہیں گے۔ (2) ان محکوم ممالک کو بھی ''آزادی'' دے دی جائے گی، جنہیں محکوم رکھنے کا خرچ آمدنی سے زیادہ تھا اور جن کی جنگی اہمیت بھی کم یا ختم ہوگئی تھی۔ (3) ان محکوم ممالک کو فی الحال ''آزادی،، نہیں دی جائے گی جن میں کمیونسٹ انقلاب کا خطرہ تھا۔ انہیں اس وقت تک محکوم رکھا جائے گا جب تک کہ انقلاب کا سدباب نہیں ہو جاتا اور جب تک کہ ایسے ''اعتدال پسند''

عناصر پیدا نہیں ہوجاتے جو سامراجی مفادات کا تحفظ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

برطانوی سامراج کا نیا پروگرام یہ تھا کہ محکوم ممالک میں براہ راست قبضے اور استحصال کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جائے گا بلکہ آئندہ یہ کام مقامی پٹھوؤں کی وساطت سے کیا جائے گا۔ ان پٹھوؤں کو قانونی طور پر ''آزادی'' دے دی جائے گی۔ لیکن ان کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں پر کنٹرول رکھا جائے گا۔ یہ پالیسی بعد میں ''جدید نوآبادیاتی نظام'' کی پالیسی کہلائی۔ یہ پالیسی دراصل نئی نہیں تھی۔ امریکی سامراج کافی عرصہ سے لاطینی امریکہ میں اس پالیسی پر کامیابی سے عمل پیرا تھا اور برطانیہ نے بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ میں اس پالیسی کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ برطانیہ نے اس پالیسی کے تحت 23رمئی 1946ء کو شرق اردن کو ''آزادی'' دی تھی اور فلپائن بھی اسی سال 4رجولائی کو اسی پالیسی کے تحت امریکہ کی غلامی سے ''آزاد'' ہوا تھا۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد کے نئے حالات میں اس پالیسی کے اندر یہ خطرہ مضمر تھا کہ جدید نوآبادیاتی ممالک میں استحصال پر برطانیہ کی اجارہ داری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔

25رفروری 1946ء کے ''نیویارک ٹائمز'' نے ''سلطنت برطانیہ کے مصائب'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ اس کا آغاز برطانوی وزیر خارجہ بیون کے اس بیان سے کیا گیا جس میں اس نے کہا تھا کہ سلطنت برطانیہ اب ''آزاد قوموں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔'' اخبار نے لکھا ''سلطنت جنگ کی وجہ سے کمزور ہوگئی ہے اور طاقت کا پرانا توازن بگڑ جانے کی وجہ سے اس کی بین الاقوامی جوڑ توڑ کی اہلیت بھی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے اپنی موجودہ ہیئت برقرار رکھنے کے لیے دو اطراف سے حملے کا سامنا ہے۔ پہلا دباؤ روس کی طرف سے مشرق وسطیٰ اور بحیرہ روم میں سیاسی، سفارتی اور معاشی نفوذ کا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے برطانیہ ہمیشہ سے اپنی سلطنت کی شہ رگ قرار دیتا آیا ہے اور ایک برطانوی ترجمان تو یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ روس نے برطانیہ کا گلا دبا دیا ہے۔ دوسری طرف مشرق میں قوم پرستی کا امڈتا ہوا سیلاب ہے جہاں آزادی سے محروم اقوام پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کر رہی ہیں اور وہ اقوام جو آزاد ہیں مگر جن میں اس سلطنت کی چھاؤنیاں قائم ہیں وہ ان سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف سے حملے کا دوسری طرف والوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور یہ ماسکو کے کمیونسٹ پراپیگنڈے سے بھی کہیں زیادہ ہے کہ جسے بیون نے عالمی امن

کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے اور یہ بائیں بازو اور کمیونسٹ عناصر کی نسبت بھی زیادہ ہے جن کو وزیراعظم ایٹلی نے ہندوستان میں ہنگاموں اور بغاوتوں کو پھیلانے کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ بیون کا یہ یقین قابل اطمینان ہے کہ ایسے حالات نہیں ہیں کہ جن میں روس اور برطانیہ کے مابین جنگ چھڑ جائے مگر ان دونوں مسائل کا فی الحال کوئی حل نظر نہیں آتا۔ چونکہ برطانوی سلطنت نے ساری دنیا میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے اس لیے یہ صورت حال دوسری قوموں کے لیے اور بالخصوص امریکہ کے لیے خود بخود ایک انتہائی تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ امریکہ کو اس بارے میں ملے جلے جذبات ہی رکھنے چاہئیں۔ گزشتہ دو جنگوں کے دوران یہ ثابت ہوا کہ سلطنت برطانیہ امریکہ کی پہلی دفاعی لائن ہے اور آئندہ کوئی جنگ ہوئی تو اس میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ اپنے دفاع کی خاطر کہ بعض دفعہ جمہورتیں اس کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتیں، امریکہ کو دو مرتبہ جنگ میں شامل ہونا پڑا اور یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اگر آئندہ کبھی پھر سلطنت برطانیہ ایسے ہی حملے سے دوچار ہوئی تو امریکہ پیچھے رہے گا۔ اگر اس حقیقت کا دنیا کو بلا شک وشبہ یقین دلا دیا جائے تو ممکن ہے فضا کی آلودگی کم کرنے میں مدد مل سکے گی۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنوں نے پہلی عالمگیر جنگ اس لیے شروع کی کہ اس میں برطانیہ کی شمولیت مشکوک تھی اور انہوں نے دوسری جنگ اس لیے چھیڑی کہ اس میں امریکہ کی شمولیت مشکوک تھی۔ اس قسم کے شکوک وشبہات کو آئندہ کسی جارح کے لیے ترغیب کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔'' آگے چل کر اس نے مزید لکھا کہ ''خوش قسمتی سے برطانیہ جواب اپنی بڑی نو آبادیوں کو سلطنت کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے آزاد قوموں کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہے، اب پوری طرح تسلیم کرتا ہے کہ دنیا سے سامراجیت کا دور لد گیا ہے اور اب وہ جہاں کہیں بھی ممکن ہے، سیلف گورنمنٹ کا حق دے رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی اپنی حکومت کو خود چلانے والے آپس میں حکومت کی نوعیت کے بارے میں متفق ہو جاتے ہیں، وہاں سیلف گورنمنٹ دے دی جاتی ہے۔ برطانیہ کی ان کوششوں کو امریکہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ اسی طریقے سے سلطنت برطانیہ کو اپنے اندرونی حملوں سے بچاؤ کا بہترین موقع میسر آ سکتا ہے کہ جن کے خلاف برطانیہ نے بیرونی امداد کے بغیر خود ہی اپنا دفاع کرنا ہے۔''

''نیویارک ٹائمز'' نے بجا طور پر امریکی سامراج کی ترجمانی کرتے ہوئے سلطنت برطانیہ کے کھنڈرات پر ایک جدید نوآبادیاتی نظام کی استواری کا نقشہ کھینچا تھا۔ وہ سیلف گورنمنٹ دیتے ہوئے پیچھے ہٹتے برطانوی سامراج کی بے چارگی پر اس سے ہمدردی کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنی پہلی دفاعی لائن یعنی سلطنت برطانیہ کی کمر ٹوٹ جانے کے بعد اب خود میدان میں آنا اس کے سامراجی مفادات کا تقاضا تھا۔ اب طریقۂ واردات مختلف تھا، سامراجیت کا دور لد گیا تھا۔ جدید نوآبادیاتی نظام کے دروازے کھل گئے تھے۔ امریکی سامراج کی فطرت بہت جارحانہ تھی۔ وہ بڑی تیزی سے ساری دنیا میں اپنے پنجے پھیلا رہا تھا۔ وہ ''کھلے دروازے'' کی پالیسی کا علمبردار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پسماندہ ممالک کے دروازے سارے استحصالیوں پر کھلے رہنے چاہئیں اور بڑی سامراجی مچھلی کو چھوٹی سامراجی مچھلیوں کو ہڑپ کرنے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ سویڈن کا مشہور مورخ گنار مرڈل لکھتا ہے کہ'' دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے اپنی عالمگیر سلطنت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ بڑی مجبوری کے تحت کیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا میں مغرب کے سفید فام سامراجیوں کو جس آسانی کے ساتھ ذلت آمیز شکست دی تھی اس نے حریت پسند ایشیائی عوام کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ سفید فام سامراجیوں کی ہیبت ختم ہو گئی تھی۔ ایشیائی عوام ان کی غلامی کا بوجھ مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ برطانیہ کو امریکہ، جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ میں تجربہ ہو چکا تھا کہ براہ راست سامراجی نظام کو بزور قوت قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ مزید برآں سوویت یونین کی اندرونی اور بیرونی کامیابیوں سے بھی ایشیا کی تحاریک آزادی کو بہت تقویت پہنچتی تھی۔ سوویت یونین مغربی سامراج کی مذمت کرتا تھا اور قوم پرستوں کے مطالبہ آزادی کی تائید و حمایت کرتا تھا۔ وہ رنگ و نسل سے بالاتر عالمگیر اخوت و مساوات کا نظریہ پیش کرتا تھا اور اس نظریئے میں اتنی طاقت تھی کہ سفید فام سامراج کا نوآبادیاتی نظام اس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔''[5] برطانوی مؤرخ ڈی۔ جی۔ ای۔ ہال کو اس تجزیے سے اتفاق ہے وہ لکھتا ہے کہ'' جنگ عظیم میں جاپانیوں کے ہاتھوں یورپی فوجوں کو آناً فاناً شکست سے ایشیائی قوم پرست تحریکوں کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور ایشیا میں ملایا کے سوا کہیں بھی سفید فام اقتدار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔''[6]

باب: 3

ایشیا میں سامراج سے آزادی کی لہر

اور

قوم پرست مسلح تحریکیں

کوریائی عوام کی جدوجہد آزادی اور کم ال سنگ کی حکومت کا قیام

یورپی سامراجیوں کی کمر ٹوٹنے کی وجہ سے ایشیا میں سامراجی مفادات کو لاحق خطرات سے امریکہ کے حکمران ہرگز غافل نہیں تھے۔ انہوں نے 2/ستمبر 1945ء کو جاپانیوں سے شکست نامہ وصول کرنے کے بعد سب سے پہلے کوریا کی طرف توجہ کی جہاں روسی فوجیں تیزی سے پیش قدمی کر رہی تھیں۔ سوویت یونین سے کہا گیا کہ 38 ویں خط متوازی پر رک جاؤ اور 8/ستمبر کو امریکی فوجیں جنوبی کوریا کی سرزمین پر اتر گئیں۔ اس وقت تک کوریا میں جاپانیوں کی مزاحمت کرنے والے محب الوطن عناصر نے اپنی عوامی جمہوری حکومت قائم کر لی تھی۔ ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں عوامی کمیٹیوں نے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھال لی تھی لیکن امریکی کمانڈر نے اس عوامی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ اس میں کمیونسٹ عناصر بھی شامل تھے۔ 10/اکتوبر کو ایک مشاورتی کونسل کی تشکیل کا اعلان کیا گیا جس میں ان رجعت پسند اور عوام دشمن حلقوں کے نمائندے شامل تھے جو جنگ کے دوران جاپانیوں سے تعاون اور اشتراک عمل کرتے رہے تھے۔ 20/نومبر کو حریت پسندوں کی عوامی حکومت کو غیر قانونی قرار

دے دیا گیا اور 14 رفروری 1946ء کو ایک ''نمائندہ جمہوری کونسل'' بنائی گئی جس کے صدر کے عہدے پر ایک قابل اعتماد سامراجی پٹھو ڈاکٹر سنگمن ری کو مسلط کیا گیا۔

دوسری طرف شمالی کوریا میں جن علاقوں پر سوویت یونین نے قبضہ کیا تھا ان کا سیاسی اقتدار وہاں کی کمیونسٹ پارٹی نے سنبھال لیا۔ کم ال سنگ کی زیر قیادت کمیونسٹ حکومت نے سب سے پہلے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کر کے ساری زرعی اراضی بے زمین کسانوں میں تقسیم کر دی۔ قدرتی طور پر اس اقدام کو عوامی تائید وحمایت حاصل ہوئی۔ کمیونسٹ حکومت مستحکم ہو گئی اور کوریا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ حالانکہ دسمبر 1945ء میں بڑی طاقتوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کوریا کو متحد کر کے وہاں جمہوری حکومت قائم کی جائے گی۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے 20 رمارچ سے لے کر 8 رمئی 1946ء تک مشترکہ کمیشن کا اجلاس ہوا مگر یہ طے نہ ہو سکا کہ موعودہ جمہوری حکومت کی تشکیل کے لیے کن مقامی عناصر سے مشورہ کیا جائے ۔سوویت یونین ان عناصر کو جمہوری حکومت میں شامل کرنے کے خلاف تھا جنہوں نے جاپانیوں سے اشتراک عمل کیا تھا۔ لیکن امریکہ ''سارے گروہوں'' کو نمائندگی دینے پر اصرار کرتا تھا۔ مشترکہ کمیشن کا دوسرا اجلاس جون 1947ء میں ہوا۔ اس وقت تک دونوں طاقتوں کے درمیان عالمی سرد جنگ کا آغاز ہو چکا تھا اس لیے کوریا کے مسئلے پر اتفاق رائے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مشترکہ کمیشن کچھ فیصلہ نہ کر سکا اور ساری دنیا پر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ کوریا کے عوام نے اپنی یکجہتی اور آزادی کا جو خواب دیکھا تھا اس کی بڑی دیر تک تعبیر نہیں ہو سکے گی۔

چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مسلح انقلابی جدوجہد کی کامرانیاں

امریکی سامراجیوں کی توجہ کا دوسرا اہم ترین مرکز چین تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ایشیا پر سامراجی غلبہ حاصل کرنے کے لیے چین کے انقلاب کا سدباب بے انتہا ضروری تھا۔ کہا جاتا تھا کہ امریکہ کے تحفظ کے لیے چیانگ کائی شیک کی فتح ضروری ہے۔ چین کی کمیونسٹ پارٹی روس کی آلۂ کار ہے۔ اگر یہ پارٹی جیت گئی تو مشرق بعید میں روس کی فیصلہ کن فتح ہو جائے گی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ چیانگ کائی شیک کی بھرپور امداد کی جائے۔ پہلا کام یہ کیا گیا کہ امریکہ کی تقریباً 90 ہزار بحری فوج کو چین پر اتار کر اسے پیکنگ، شنگھائی اور دوسرے بڑے

بڑے شہروں میں متعین کیا گیا۔ بحری جنگی جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے چیانگ کائی شیک کی 41 ڈویژن فوج کو شمالی چین میں منتقل کر کے اسے کمیونسٹوں کے آزاد علاقوں کے خلاف صف آراء کیا گیا۔ دریں اثنا امریکی سفیر کی نگرانی میں چیانگ کائی شیک اور ماؤزے تنگ کے درمیان صلح کی بات چیت کا ڈھونگ بھی رچایا گیا۔ تاکہ کمیونسٹوں پر بھرپور حملے سے پہلے چیانگ کائی شیک کی فوجوں کو جدید ہتھیاروں سے لیس کر کے اسے ازسرنو تربیت دی جائے۔ یہ کام جون 1946ء میں ختم ہوا تو کومن تانگ فوجوں نے بڑے پیمانے پر خانہ جنگی کا آغاز کر دیا، جب کہ چین کے سارے شہروں میں امریکہ کے خلاف مظاہرے ہو رہے تھے اور یہ عوامی مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ امریکی فوجیوں کو چین کی سرزمین سے نکالا جائے۔ 24/دسمبر 1946ء کو دو امریکی فوجیوں نے پیکنگ میں ایک چینی افسر کی بیٹی کی آبروریزی کی تو پورے چین میں آگ لگ گئی۔ امریکی سامراج کے خلاف عوامی احتجاج کا اس قدر طوفان اٹھا کہ حکومت امریکہ کو 19/جنوری 1947ء کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ امریکی فوجیں چین سے فوراً واپس بلا لی جائیں گی۔ اس اعلان کے بعد امریکی سفیر جنرل جارج مارشل اپنے ''مصالحتی مشن'' کو ترک کر کے واپس امریکہ روانہ ہوا تو منچوریا اور شمالی چین کے دوسرے علاقوں سے چیانگ کائی شیک کی فوجوں کی پسپائی شروع ہوگئی اور اس پسپائی کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 20/فروری کو برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ وہ بھی اپنی ہندوستانی سلطنت سے بہرصورت جون 1948ء تک پرامن طریقے سے پسپا ہو جائے گا اور پھر 2/جون کو اس نے بوجوہ یہ میعاد کم کر کے برصغیر سے اپنی دستبرداری کی تاریخ 15/اگست 1947 مقرر کر دی۔ 30/جون 1947ء کو کمیونسٹ جنرل لیو یو چینگ نے دریائے زرد کو عبور کر کے دریائے یانگسی کی طرف پیش قدمی شروع کی تو ساری دنیا کو پتہ چل گیا کہ امریکیوں نے تقریباً پانچ ارب ڈالر کے خرچ سے چینی انقلاب کے خلاف جو فوجی بند باندھا تھا وہ دراصل ریت کا بنا ہوا تھا۔

ویت نامی قوم پرست کمیونسٹوں کا اعلان آزادی اور ہوچی منھ کی حکومت کا قیام

چینی عوام کی طرح ویت نام کے حریت پسند عوام نے بھی ایٹم بم سے خوف زدہ ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے انہوں نے جنگ عظیم کے دوران کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت

جاپانی حملہ آوروں کے خلاف جو عوامی جنگ لڑی تھی اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ جاپانیوں کی شکست کے بعد اپنے ملک کو دوبارہ فرانسیسیوں کے سپرد کر دیں گے بلکہ اس کا مقصد بیرونی سامراجیوں اور ان کے مقامی جاگیردار پٹھوؤں کے استحصال سے مکمل آزادی حاصل کرنا تھا۔ مئی 1945ء میں ملک کے چھ صوبے آزاد ہو چکے تھے اور جب 14/اگست 1945ء کو جاپانیوں نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا تو اسی دن ایک قومی کانگرس منعقد ہوئی جس میں ہوچی منھ کو ویتنام کی نئی آزاد حکومت کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے دو دن بعد صدر ہوچی منھ نے اپنے عوام کو پکارا اور کہا کہ اٹھو! ہنوئی سے لے کر سائیگان تک اقتدار پر قبضہ کر کے اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کا اعلان کرو!۔ چنانچہ ملک بھر میں یورش ہوئی اور بیشتر علاقوں پر عوامی فوج کا قبضہ ہو گیا اور جب 2/ستمبر 1945ء کو جاپان نے رسمی طور پر شکست نامے پر دستخط کئے تو عین اس وقت ہوچی منھ نے جمہوریہ ویتنام کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ شہنشاہ باؤدائی تخت سے دستبردار ہو گیا اور اس نے ویتنام کی عوامی حکومت کو تسلیم کر کے اقتدار صدر ہوچی منھ کے سپرد کر دیا۔ ہوچی منھ نے اپنی نشری تقریر میں دنیا کے سارے ممالک سے درخواست کی کہ وہ ویتنام کی آزاد ریاست کو تسلیم کر لیں۔ لیکن سامراجیوں کے منصوبے کچھ اور ہی تھے۔ اس کے دس دن بعد یعنی 12/ستمبر کو ایک برطانوی کمانڈر جنرل گریسی، جو بعد میں پاکستان کا کمانڈر انچیف بنا، ہندوستانی گورکھا فوج لے کر سائیگون میں آ دھمکا۔ چونکہ قبل ازیں جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی افواج کے کمانڈر انچیف ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اعلان یہ کیا گیا تھا کہ جنرل گریسی پوٹسڈم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق محض جاپانیوں سے ہتھیار رکھوائے گا اس لیے ویتنام کے عوام نے گریسی اور اس کی فوج کا خیر مقدم کیا۔ لیکن اس سامراجی درندے نے سائیگان کے عوام کے خیر مقدمی نعروں کا جواب گولیوں سے دیا۔ اس طرح جب اس شخص نے ''امن وامان'' بحال کر لیا تو 9/اکتوبر کو برطانیہ کی لیبر حکومت کے وزیر خارجہ بیون نے حکومت فرانس کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس میں یہ تسلیم کیا گیا کہ جنوبی ویتنام میں صرف فرانس کی سول انتظامیہ کو ہی غیر فوجی قوتوں کو ہدایات دینے کا اختیار حاصل ہو گا۔ اس معاہدے کے چند دن بعد فرانسیسی سامراج کی فوج پہنچ گئی جو ایک آرمرڈ رجمنٹ، دو انفنٹری رجمنٹوں اور ایک کمانڈو بٹالین پر مشتمل تھی۔ 25/اکتوبر کو اس فوج کے سائیگان شہر میں داخل ہوتے ہی

زبردست ہنگامہ ہوا۔ جنرل گریسی نے فرانسیسی فوج کی امداد کی۔ اس نے فرانسیسوں کا اقتدار بحال کرنے کے لیے نہ صرف ہندوستانی فوج کو لوٹ مار اور قتل و غارت کی کھلی چھٹی دی بلکہ جاپانی قیدیوں کو بھی دوبارہ مسلح کر کے استعمال کیا۔ فرانسیسی فوجوں نے سائیگان کے سٹی ہال اور دوسری سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرنے کے بعد ویتنام کے بقیہ علاقے پر چڑھائی کر دی۔ لیکن وہ سولھویں خط متوازی کے شمال کی طرف پیش قدمی نہ کر سکیں کیونکہ اس اثناء میں پوٹسڈم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق چیانگ کائی شیک کی فوجیں شمالی ویتنام میں داخل ہو چکی تھیں اور فرانسیسی فوجوں کے برعکس چیانگ کائی شیک کی فوجوں نے ہوچی منھ کی حکومت کے کام میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔ حکومت برطانیہ کی ہندوستانی افواج کی امداد سے ویتنام میں اس کاروائی پر ہندوستان میں سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا۔ پورے برصغیر میں برطانیہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ جواہر لال نہرو نے 31/دسمبر 1945ء کو آل انڈیا سٹیٹس پیپلز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہم نے ویت نام میں برطانیہ کی فوجی مداخلت کو غصہ، شرم اور بے بسی کی حالت میں دیکھا ہے۔ کیونکہ ہندوستانی افواج کو ہمارے ان دوستوں کے خلاف برطانیہ کا غلیظ کام سرانجام دینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو ایسی ہی لڑائی میں مصروف ہیں جیسی کہ ہم لڑ رہے ہیں۔''[1] مگر جواہر لال نہرو کی ویتنامی دوستوں سے یہ ہمدردی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ اس نے 23/مارچ 1947ء کو دہلی میں جو ایشین ریلیشنز کانفرنس بلائی اس میں ہوچی مِنھ کی حکومت کو دعوت نہیں دی گئی تھی اور پھر 15/اگست 1947ء کو آزادی کے بعد وزیراعظم نہرو نے ویتنام کی جنگ آزادی کو کچلنے کے لیے فرانسیسی سامراج سے دواڑھائی سال تک بھرپور تعاون کیا اور اس عرصے میں اس نے کبھی ویتنامی حریت پسندوں کے لیے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ولیم وار بے لکھتا ہے کہ ''برطانیہ نے اپنے تاریخی حریف فرانس کو ہند چینی پر دوبارہ مسلط کرنے کے لیے جو فوجی کاروائی کی تھی اس کی بنیاد چرچل کی جنگی کابینہ کے اس فیصلے پر تھی کہ جنگ کے بعد فرانسیسی سامراج شام اور لبنان کو مکمل آزادی دے دے گا اور برطانیہ جواباً پورے ہند چینی پر فرانس کا اقتدار دوبارہ قائم کرنے میں مدد دے گا۔ فرانس کو اختیار ہوگا کہ ہند چینی کو آزادی دے یا نہ دے۔ مزید فیصلہ یہ تھا کہ برطانیہ ملایا اور سنگاپور پر اپنا سامراجی اقتدار دوبارہ قائم کرے گا لیکن ہالینڈ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ انڈونیشیا

کے غیر کمیونسٹ قوم پرستوں سے سمجھوتہ کرلے۔ چرچل کابینہ کے اس فیصلے کے مطابق برطانیہ اور فرانس میں خفیہ معاہدہ ہوا تھا۔ جس میں یہ طے پایا تھا کہ برطانیہ فرانسیسی سامراج کو ہند چینی پر دوبارہ مسلط کرنے میں مدد دے گا اور جب برطانیہ ملایا پر از سرِ نو سامراجی اقتدار قائم کرنے کی کاروائی کرے گا تو فرانس اس کی تائید وحمایت کرے گا۔"[2] تاہم جب فرانسیسی فوجیں شمالی ویتنام میں چیانگ کائی شیک کی فوجوں کی موجودگی کے باعث سولھویں خط متوازی سے آگے نہ بڑھ سکیں تو پیرس میں جنرل ڈیگال کی حکومت نے سیاسی جوڑ توڑ سے اپنے سامراجی مقصد کی تکمیل کرنے کی کوشش کی۔ سائیگان میں مقیم فرانسیسی ہائی کمشنر نے گفت وشنید کے ذریعے چیانگ کائی شیک کی حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ فرانسیسی فوج کو شمالی ویتنام میں داخل ہونے کی اجازت دے دے۔ ابھی یہ بات چیت جاری ہی تھی کہ جنرل ڈیگال نے جنوری 1946ء میں استعفیٰ دے دیا جس کے بعد "عوامی محاذ" کی حکومت نے ویتنام کو "فرنچ یونین" کے اندر آزادی دینے کے بارے میں ہوچی منھ سے بات چیت شروع کی۔ بظاہر یہ بات چیت کامیاب ہوئی۔ 6/مارچ 1946 کو ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ویتنام کو "فرنچ یونین" کے اندر آزادی دی گئی۔ شرط صرف یہ تھی کہ تھوڑی سی فرانسیسی فوج پانچ سال کے لیے ویتنام میں مقیم رہے گی۔ حکومت فرانس نے چیانگ کائی شیک سے بھی ایک معاہدہ کیا۔ جس میں یہ طے پایا کہ چین کی فوجیں 31/مارچ تک شمالی ویتنام سے نکال لی جائیں گی۔ ان دونوں معاہدوں کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ویتنام کے قضیے کا پرامن طریقے سے تصفیہ ہوگیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہوا تھا۔ فرانسیسی حکومت کی نیت خراب تھی حالانکہ اس میں فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندے شامل تھے۔ ہوچی منھ سے دھوکہ کیا گیا تھا۔ اس کا انکشاف تھوڑے ہی دنوں بعد ہوگیا جب کہ سائیگان میں مقیم فرانسیسی ہائی کمشنر نے ایک طرف تو چیانگ کائی شیک اور حکومت فرانس کے درمیان معاہدے کی آڑ لے کر فرانسیسی فوجوں کو ہنوئی اور ہائی فونگ کی طرف بھیج دیا اور دوسری طرف جمہوریہ ویتنام کے سیاسی نمائندوں کو سائیگان اور جنوبی ویتنام کے دوسرے شہروں میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار کردیا۔ یہ ہائی کمشنر چند دن تو جنرل گیاپ سے بات چیت کا ڈھونگ رچاتا رہا اور پھر اس نے سائیگان میں کوچین چائینا کی ایک فرانس نواز 'آزاد ریپبلک' کے قیام کا اعلان کردیا۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر ہو چی مِنھ جولائی 1946ء کو دوبارہ فرانس گیا اور اس نے وہاں تقریباً تین ماہ تک کوشش کی کہ فرانس کے سامراجیوں سے کوئی پرامن تصفیہ ہو جائے۔ حکومت فرانس کا موقف یہ تھا کہ مارچ 1946ء میں ویتنام کی آزادی کے بارے میں جو معاہدہ کیا گیا تھا اس کا اطلاق کوچین چائینا کے علاقہ پر نہیں ہوتا تھا۔ ہو چی مِنھ خالی ہاتھ واپس نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی کوشش سے معاشی اور ثقافتی امور کے بارے میں ایک سمجھوتہ کیا۔ فائر بندی کا معاہدہ کیا اور معاہدہ مارچ کی از سرِ نو برائے نام تصدیق کرائی۔ لیکن اس کی ہنوئی میں واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد فرانسیسی فوجوں نے شمالی ویتنام کے شہروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے 15/اکتوبر کو ہائی فونگ کی بندرگاہ میں محکمہ کسٹم کی عمارتوں پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش کی۔

برطانیہ کی لیبر حکومت کی امداد سے فرانسیسی سامراج کی ان چیرہ دستیوں اور زبردستیوں نے ویتنام کے عوام میں اس قدر نفرت اور غصہ کے جذبات پیدا کیے کہ نومبر میں کوچین چائینا کے پٹھو حکمران ڈاکٹر نگوین وان تھنگ نے یہ اعلان کر کے خودکشی کر لی کہ میں اپنے وطن سے مزید غداری نہیں کر سکتا۔ میں اپنی غداری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے خودکشی کر رہا ہوں اس واقعہ سے پورے ویتنام میں زبردست ہنگامے ہوئے۔ فرانسیسی فوجوں نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ انہوں نے 23/نومبر کو ہائی فونگ کی بندرگاہ پر بمباری کی جس میں ہزاروں شہری لقمۂ اجل ہو گئے۔ لہٰذا اب ویتنام کے حریت پسندوں میں صبر و تحمل کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ہو چی مِنھ اور اس کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ فرانسیسی سامراجیوں سے کسی صورت پرامن تصفیہ نہیں ہو سکتا۔

19/دسمبر کو حریت پسندوں نے ٹونکنگ اور انام میں فرانسیسی چھاؤنیوں پر بیک وقت شب خون مارے اور سینکڑوں فرانسیسی فوجیوں کو جہنم واصل کر دیا۔ اس طرح فرانسیسی سامراج کے خلاف لڑائی کا بگل بج گیا اور ویتنام کی آزادی کے لیے ہو چی مِنھ کی زیر قیادت بھرپور عوامی جنگ شروع ہو گئی۔ اس جنگ کا بیج برطانوی سامراج نے 9/اکتوبر 1945ء کو بویا تھا جب کہ اس نے حکومت فرانس سے معاہدہ کر کے جنوبی ویتنام میں اس کی سول انتظامیہ کو تسلیم کیا تھا۔ اس نے 2/ستمبر 1945ء کو قائم شدہ جمہوریہ ویتنام کو اس لیے تسلیم نہیں کیا تھا کہ یہ کمیونسٹ

پارٹی کے زیر اثر تھی۔ برطانوی مؤرخ ڈی۔جی۔ای ہال کا خیال ہے کہ ہند چینی کے قبضے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ ہو چی منہ کمیونسٹ تھا۔[3] بلاشبہ ہو چی منہ کمیونسٹ تھا۔لیکن وہ ایسا کمیونسٹ تھا جو اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ وہ اپنے وطن عزیز کے مفادات کو سوویت یونین کے مفادات کے تابع نہیں کرتا تھا۔اس کی طاقت کا سرچشمہ ماسکو نہیں تھا بلکہ ویتنام کے عوام تھے۔ ہو چی منہ نے 16 راگست 1945ء کو اپنے بے پناہ جذبۂ حُب الوطنی سے ہنوئی میں آزادی اور انقلاب کی جو شمع روشن کی تھی اس نے پورے جنوب مشرقی ایشیا کو بُقعۂ نور بنا دیا تھا۔

چونکہ برطانیہ کا سامراجی طبقہ بہت جہاندیدہ اور تجربہ کار تھا اس لیے اسے یورپ، چین اور ویتنام کی تیزی سے ''بگڑتی'' ہوئی صورت حال کا شدید احساس ہو گیا تھا۔اسے صحیح طور پر یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ چین اور ویتنام میں ماؤزے تنگ اور ہو چی منہ کی زیر قیادت آزادی و انقلاب کی جو آگ بھڑک اٹھی ہے اس کے شعلے نہ صرف پورے جنوب مشرقی ایشیا کو بلکہ برصغیر جنوبی ایشیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ لیبر پارٹی کے سیاسی مشیروں کا مشورہ یہ تھا کہ اس خطرناک صورت حال سے نمٹنے کے لیے انڈین نیشنل کانگرس کی غیر انقلابی قیادت سے بلاتاخیر ''آزادی' کا سودا کر لینا چاہیے کیونکہ کہ اس طرح برصغیر کی افرادی قوت اور دوسرے وسائل کا سامراجی مقاصد کے لیے استعمال جاری رکھا جا سکے گا۔ چنانچہ وزیراعظم ایٹلی نے ہندوستان سے دستبرداری کے بارے میں 20 رفروری 1947ء کو جو قطعی اعلان کیا تھا اس کے پس پردہ جن وجوہ کی کارفرمائی تھی ان میں سے ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ اسے قوی امید تھی کہ کانگرس سے اس قسم کی سودا بازی ہو سکے گی کیونکہ پینڈرل مون کے بیان کے مطابق ''لیبر پارٹی کی ہمدردیاں ہمیشہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے ساتھ رہی تھیں اور اس کے کئی ممتاز ارکان کے گاندھی، نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں سے خاصے گہرے روابط تھے۔ وہ ہندوستان کے حالات کو کانگرس کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے اور وہ پاکستان کی تجویز کو غیر سنجیدہ اور بے جان تصور کرتے تھے۔ وہ مسلم لیگ کے صدر قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی اہمیت کو تو نظرانداز نہیں کر سکتے تھے۔لیکن ان کا خیال تھا کہ جناح محض سیاسی سودابازی کے لیے پاکستان کے مطالبہ پر اصرار کر رہے ہیں۔''[4]

ایٹلی کے ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں اس ڈرامائی اعلان کے بعد ہو چی منھ نے فرانسیسی سامراج سے پر امن تصفیہ کی ایک اور کوشش کی۔ اس نے 4/مارچ 1947ء کو ایک بیان میں کہا کہ اگر فرانس ویتنام سے ایسا ہی سلوک کرے جیسا کہ برطانیہ نے ہندوستان سے کیا ہے تو ویتنامی عوام فرانس سے دوستانہ تعاون کریں گے۔ حکومت فرانس نے اس کا جواب یہ دیا کہ ''ہم ہند چینی میں رہیں گے۔ ہمارے آئین کے تحت ہند چینی ''فرنچ یونین'' کا ایک جزو لاینفک ہے۔'' لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہوا کہ برطانیہ اور فرانس دونوں ہی کی نئ اور پرانی سامراجی پالیسیاں زیادہ دیر تک نہ تو کامیاب ہو سکتی تھیں اور نہ ہوئیں۔

انڈونیشی حریت پسندوں کا اعلان آزادی اور سوئیکارنو کی حکومت کا قیام

ہو چی منھ کا جرأت مندانہ اعلان آزادی دراصل پورے ایشیا میں مغربی سامراج کی موت کا اعلان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس اعلان کے اگلے ہی دن یعنی 17/اگست 1945ء کو انڈونیشیا کے قوم پرست لیڈر سوئیکارنو نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس پر آسٹریلیا میں مقیم ولندیزی گورنر جنرل نے جاپانیوں کو حکم دیا کہ وہ انڈونیشیا کا اقتدار سوئیکارنو کی حکومت کے سپرد نہ کریں بلکہ سارے ملک پر اپنا ہی اقتدار قائم رکھیں تا آنکہ برطانوی فوجیں وہاں پہنچ جائیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف ایڈمرل ماؤنٹ بیٹن نے بھی جاپانیوں کو حکم دیا کہ وہ ملک کا نظم و نسق سوئیکارنو کی حکومت کے حوالے نہ کریں۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ سوئیکارنو نے جنگ کے دوران جاپانیوں سے تعاون کیا تھا۔ برطانوی فوج 29/ستمبر 1945ء کو بٹاویہ پہنچی تو اس کے کمانڈر کو فوراً ہی پتہ چل گیا اس کی ہندوستانی فوج کی ہمدردیاں انڈونیشی عوام کے ساتھ ہیں۔[5] یکم اکتوبر کو وائسرائے ہند، ویول نے وزیر ہند پیتھک لارنس کو لکھا کہ فرانسیسی ہند چینی اور ولندیزی جزائر شرق الہند (انڈونیشیا) میں ہمیں مشکل درپیش ہو گی۔ ہندوستانی افواج دونوں جگہ ملوث ہو چکی ہیں اور ہمیں اس تنقید کا نشانہ بننا پڑے گا کہ ہم ہندوستانی فوج کو قومی تحریکوں کو کچلنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔[6]

چنانچہ ان حالات میں برطانوی کمانڈر نے مصلحتاً سوئیکارنو کی حکومت کو عملی طور پر تسلیم کر کے اس سے تعاون کی درخواست کی۔ اس پر سارے موقع پرست انڈونیشی عناصر جوق در جوق

سوئیکارنو کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ ولندیزی وزیر خارجہ نے لندن پہنچ کر برطانوی وزیر خارجہ سے ملاقات کی اور پرزور درخواست کی کہ جب تک ولندیزی فوجیں وہاں پہنچیں، وہاں موجود برطانوی افواج کو چاہیے کہ وہ سرکش قوتوں کو قابو میں رکھنے کے لیے پورا زور لگا دیں۔ ادھر ویول نے پیتھک لارنس کو ایک بار پھر لکھا کہ جاوا میں مزید ایک ہندوستانی ڈویژن بھیجنے کا ارادہ ترک کر دیں کیوں کہ ہندوستانی فوجیوں کی وفاداری اور ڈسپلن میں شدید کھنچاؤ پایا جاتا ہے۔[7] چند دن بعد ولندیزی گورنر جنرل ڈاکٹر فان موک آ دھمکا اور اس کی ولندیزی فوج نے بٹاویہ میں داخل ہوتے ہی ماردھاڑ شروع کر دی۔ انڈونیشی عوام نے ولندیزیوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ اس پر صدر سوئیکارنو نے امریکہ سے ثالثی کی اپیل کی۔ حکومت امریکہ نے اس اپیل کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ 20/اکتوبر کو محکمہ خارجہ نے ایک بیان میں اعلان کیا کہ امریکہ انڈونیشی قضیے کے پرامن تصفیے کے حق میں ہے۔ مگر ولندیزی گورنر جنرل نے سوئیکارنو سے بات چیت کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس نے جاپانیوں سے اشتراک عمل کیا تھا۔ لیکن اس کے اس انکار کی اصل وجہ یہ تھی کہ ولندیزی سامراج انڈونیشیا سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ ولندیزی اور برطانوی فوجوں نے بڑی سرعت سے جزیروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

جب برطانوی فوج نے 10/نومبر کو سورابایا کے جزیرے میں پہنچ کر وہاں کے عوام کے خون سے ہولی کھیلی تو انڈونیشیا کے طول وعرض میں سامراجیوں کے خلاف مسلح مزاحمت کا آغاز ہو گیا۔ انڈونیشیا کے عوام کی اس جنگ آزادی کو ساری دنیا کے حریت پسند عوام کی تائید و حمایت حاصل ہوئی اور ہالینڈ، آسٹریلیا اور سنگاپور کے مزدوروں نے ولندیزی فوجوں کے لیے بحری جہازوں پر گولہ بارود لادنے سے انکار کر دیا۔ سیلون ٹریڈ یونین فیڈریشن نے بھی حکام کو مطلع کر دیا کہ سیلون کے مزدور سیلون کے جزیرے کو حریت پسند عوام کے خلاف کاروائیوں کے لیے اڈہ کے طور پر استعمال کرنے کی ہر کوشش کی مخالفت کریں گے۔ ہندوستان میں بھی اس کے خلاف شدید ردعمل پایا جاتا تھا۔ 11/نومبر کو جواہر لال نہرو نے بمبئی میں کانگرس کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انڈونیشیا میں گورکھا سپاہیوں کو استعمال کئے جانے پر غم وغصہ کا اظہار کیا اور مہاراجہ نیپال سے درخواست کی کہ وہ ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے اس معاملے میں

حکومت برطانیہ سے احتجاج کرے۔ کچھ عرصہ بعد لیجسلیٹو اسمبلی میں مسلم لیگ کے رہنما محمد علی جناح اور کانگرس کے رہنماؤں سرت چندر بوس اور چمن لال نے یہ قرار داد منظور کروائی کہ انڈونیشیا سے ہندوستانی افواج کو واپس بھیجا جائے۔ انہوں نے اپنی تقریروں میں کہا تھا کہ اتحادی اقوام یعنی امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ اور فرانس سامراجی طاقتیں ہیں جب کہ ہندوستان ایک محکوم طاقت ہے اس لیے اس کی افواج کو دوسرے محکوم عوام کے خلاف استعمال نہیں کیا جا سکتا جو اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ادھر وائسرائے ہند ویول بار بار وزیر ہند پیتھک لارنس کو لکھ رہا تھا کہ ہند چینی اور انڈونیشیا میں ہندوستانی افواج کو زیادہ دیر تک استعمال کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا جہاں تک انڈونیشیا میں ولندیزیوں کی بالادستی کی بحالی کا تعلق ہے تو یہ ناممکن سی بات نظر آتی ہے اس لیے جتنا جلد ہو سکے ہمیں کوئی واضح فیصلہ کر لینا چاہیے۔ جنوب مشرقی ایشیا کی برطانوی کمان کے سربراہ ماؤنٹ بیٹن کی بھی یہی رائے تھی۔ جو نومبر میں ہندوستان بھی آیا تھا جہاں وہ اور ویول ایک ملاقات میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ فرانسیسی اور ولندیزی نوآبادیوں میں برطانیہ کو زیادہ ملوث ہونے کے بجائے وہاں سے بستر گول کرنا چاہیے۔[8]

اسی صورت حال کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے ولندیزی حکمرانوں کو بلا کر یہ مشورہ دیا کہ وہ انڈونیشیا کے قوم پرستوں سے سمجھوتہ کر لیں ورنہ کمیونسٹ قبضہ کر لیں گے۔[9] اس کا یہ مشورہ صرف اس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوا کہ حکومت ہالینڈ نے نومبر کے اوائل میں اس مضمون کا مبہم سا اعلان کیا کہ انڈونیشیا ولندیزی سلطنت میں حصہ دار ہوگا جس کی تشکیل کچھ اس طرح کی جائے گی کہ جو لوگ اس میں شریک ہوں گے ان کے قومی وقار کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ اگرچہ یہ اعلان انڈونیشیا کے قوم پرست لیڈروں کے لیے قابل قبول نہیں تھا تاہم وہ ولندیزی حکومت کے ساتھ بات چیت پر آمادہ ہو گئے۔ 16 رنومبر کو تین ہزار کی تعداد میں برطانوی اور ہندوستانی فوج جزیرہ سماٹرا میں اتار دی گئی۔ اس دوران 14 رنومبر کو ایک وزارت کی تشکیل کی گئی۔ جس کے سربراہ کے طور پر ایک قوم پرست دانشور سلطان شہریار کا تقرر ہوا۔ تقرری سے ایک ہفتہ پیشتر اس نے ایک پمفلٹ جاری کیا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ انڈونیشی عوام کو اسی صورت میں اطمینان حاصل ہوگا جب دنیا سے سامراج اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جب تک حکومت اور تجارت کے بارے میں موجودہ برطانوی اور امریکی

نظریات برقرار رہیں گے ہماری آزادی محض برائے نام حیثیت کی حامل رہے گی۔ حکومت بنانے کے بعد 4 ردسمبر کو اس نے ایک بیان میں کہا کہ اس کی حکومت کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ ولندیزی حکومت جمہوریہ انڈونیشیا کو تسلیم کرے۔ ولندیزی سامراج نے حسب توقع جمہوریہ انڈونیشیا کی آزادی وخودمختاری کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور 28 ردسمبر کو لندن میں برطانوی اور ولندیزی حکام کی کانفرنس کے خاتمے پر مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ جاوا میں بنیادی مسئلہ قانون، امن عامہ اور تحفظ کی بحالی کا ہے جب تک یہ حل نہیں ہوتا انڈونیشیا کی آزادی کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوسکتی۔ ولندیزی اور برطانوی سامراج کے اس رویے کو دنیا میں سخت ناپسند کیا گیا...... 24 رجنوری 1946ء کو ماسکو ریڈیو نے سوویت اخبار ''بالشویک'' کا ایک تبصرہ نشر کیا جس میں ہندچینی اور جاوا میں برطانیہ کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ کہا گیا کہ برطانوی مداخلت کا سبب یہ خوف ہے کہ کہیں قومی آزادی کی تحریک دوسرے ملکوں میں نہ پھیل جائے۔ 8 رفروری 1946 کو اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں یوکرین کے نمائندے نے انڈونیشیا میں برطانوی کاروائی کو عالمی امن وسلامتی کے لیے خطرہ قرار دیا۔ برطانوی وزیرخارجہ بیون نے جواب میں کہا کہ برطانیہ کو یہ ناخوشگوار کام سرانجام دینے کے لیے اتحادی کمانڈر انچیف نے کہا تھا۔ اگر برطانوی افواج کے انخلا کا حکم جاری کیا گیا تو اس وقت بہت بڑی تباہی ہو جائے گی۔ یوکرین کے نمائندے نے کہا کہ میرے ملک کے فوجی، شیل آئل (تیل کی کمپنی) کے مفادات کے لیے جنگ نہیں کرتے وہ مادر وطن کے دفاع کے لیے لڑتے ہیں۔ اس نے مطالبہ کیا کہ انڈونیشی عوام کو چارٹر کے مطابق حقوق دیئے جائیں اور غیر معمولی صورت حال کو طے کرنے کے لیے ایک کمیشن روانہ کیا جائے۔ یوکرین کے نمائندے کی تجویز کو سلامتی کونسل کی منظوری حاصل نہ ہوسکی۔

چنانچہ ان حالات میں 10 رفروری 1946ء کو ایک طویل بیان میں ولندیزی حکومت کی جانب سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک ایسی انڈونیشی دولت مشترکہ کی تشکیل ہوگی۔ جو ولندیزی سلطنت کا ایک حصہ ہوگی۔ ملک کے اندرونی معاملات ایک جمہوری طور پر منتخب پارلیمنٹ نمٹائے گی۔ جس میں انڈونیشی نمائندوں کی اکثریت ہوگی اور وزارت کا سربراہ ہالینڈ کے بادشاہ کا نمائندہ ہوگا۔ اس اعلان کے فوراً بعد سلطان شہریار، ہیگ گیا اور اس نے وہاں

پہنچتے ہی اپنی حکومت کے اس بنیادی مطالبے کا اعادہ کیا کہ جمہوریہ انڈونیشیا کو تسلیم کر لیا جائے اور یقین دلایا کہ ایسی صورت میں جمہوریہ انڈونیشیا ہالینڈ سے قریبی روابط قائم کر کے اس سے بھرپور تعاون کرے گی۔ بات چیت کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا جس کے دوران ولندیزی حکومت نے صرف اتنا مانا کہ وہ جمہوریہ انڈونیشیا کو 10رفروری کے اعلان کے مطابق قائم ہونے والی وفاقی ریاست کے ایک یونٹ کے طور پر تسلیم کر لے گی۔ مزید یہ کہ جاوا اور مدورا کے جن علاقوں پر اتحادی فوجوں کا قبضہ نہیں ہوا تھا ان پر جمہوریہ انڈونیشیا کے اقتدار کو عملی طور پر تسلیم کر لیا جائے گا۔ یہ پیش کش سلطان شہریار اپنی اعتدال پسندی کے باوجود قبول نہیں کر سکتا تھا۔ بات چیت ناکام ہو گئی اور سلطان شہریار ناکام و نامراد واپس آ گیا۔ ولندیزی سامراجیوں کو بظاہر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ جمہوریہ انڈونیشیا کی قوم پرست حکومت دراصل قوم پرست نہیں تھی کیونکہ یہ کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی برطانوی سامراجیوں کو بھی اس حکومت کے پس پشت کمیونسٹ سرگرم نظر آتے تھے۔ 28رفروری کو لندن ٹائمز کے نمائندہ خصوصی نے لکھا کہ انتہا پسندوں کے اثر کی وجہ سے یہ حکومت مذکورہ پیش کش کو قبول کرنے سے گریزاں ہے۔ دنیا کے ہر انقلاب میں کرنسکی کی جگہ لینے کے لیے ہمیشہ ایک لینن منتظر ہوتا ہے۔ سامراجیوں کا یہ اندیشہ بالکل غلط بھی نہیں تھا۔

جون 1946ء میں صدر سوئیکارنو نے ہنگامی حالت کا اعلان کر دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کمیونسٹوں نے سلطان شہریار اور اس کے کئی ساتھیوں کو اغوا کر کے اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تھی۔ تاہم ولندیزیوں نے قومی محاذ آزادی میں اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر پہلے تو بورنیو اور بعض دوسرے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور پھر جولائی میں اپنے مقبوضہ علاقوں کے نمائندوں سے یہ سفارش کروائی کہ انڈونیشیا کے چار حصوں۔ جاوا، سماٹرا، بورنیو اور گریٹ ایسٹ...... پر مشتمل ایک وفاقی ریاست کی تشکیل کی جائے۔ تاہم فوری طور پر اس سفارش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہ کی گئی کیونکہ امریکہ اور برطانیہ چاہتے تھے کہ وہ اس قسم کی یک طرفہ کارروائی کرنے کی بجائے ''اعتدال پسند'' قوم پرست لیڈروں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں ورنہ کمیونسٹ اقتدار پر قبضہ کر لیں گے۔ اگست 1946ء میں ولندیزی حکومت جمہوریہ انڈونیشیا کے نمائندوں سے دوبارہ بات چیت پر آمادہ ہو گئی۔ جس کی صدارت کے فرائض برطانیہ کے نمائندے نے

سرانجام دیئے۔ 15رنومبر کو ایک سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ولندیزی حکومت جاوا، مدورا اور سماٹرا پر جمہوریہ انڈونیشیا کے اقتدار کو تسلیم کر لے گی اور دونوں حکومتیں ایک خود مختار جمہوری ریاست کے قیام کے لیے باہمی تعاون کریں گی۔ اس وفاقی ریاست کا نام یونائیٹڈ سٹیس آف انڈونیشیا ہوگا۔ ملک کے سارے علاقوں کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی۔ یہ اسمبلی ایک ایسا آئین تیار کرے گی۔ جس کے تحت نئی وفاقی ریاست ہالینڈ اور انڈونیشیا پر مشتمل ''یونین'' کا ایک جزو ہوگی اور خارجی، دفاعی، مالی، معاشی اور ثقافتی معاملات میں مشترکہ مفادات کو فروغ دیا جائے گا۔ انڈونیشیا اقوام متحدہ کی رکنیت کے لیے درخواست دے گا اور اگر دونوں کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہوا تو اس کا فیصلہ ثالثی کے ذریعے کیا جائے گا۔

اس سمجھوتے پر 25رمارچ 1947ء کو دستخط ہوئے۔ ابھی ان دستخطوں کی سیاہی نہیں سوکھی تھی کہ ولندیزی حکومت اور جمہوریہ انڈونیشیا کے درمیان اس سوال پر تنازعہ پیدا ہو گیا کہ عبوری دور میں ولندیزی حکومت کو پورے انڈونیشیا پر اقتدار اعلیٰ حاصل ہے، یا نہیں؟ جمہوریہ انڈونیشیا نے سارے ملک پر ولندیزی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ولندیزی سامراج نے نہ صرف مقبوضہ جزیرے خالی کرنے سے انکار کر دیا بلکہ مزید فوجیں بھیج دیں اور 27رمئی کو الٹی میٹم دے دیا۔ ان حالات میں سلطان شہر یار کی حکومت نے ولندیزیوں کے مطالبات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو اسے برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ سوشلسٹ لیڈر امیر شریف الدین نے حکومت کی تشکیل کی۔ یہ بات ولندیزی سامراج کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ 20رجولائی کو ایک لاکھ دس ہزار ولندیزیوں نے وسیع پیمانے پر حملہ کر کے جمہوریہ انڈونیشیا کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔

ان حالات میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ہندوستان اور آسٹریلیا کی درخواست پر پہلے تو یکم اگست کو فائر بندی کا حکم دیا اور پھر آسٹریلیا، بلجیم اور امریکہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک ثالثی کمیٹی قائم کر دی۔ تاہم ولندیزیوں کی بدنیتی کی وجہ سے فائر بندی پر پوری طرح عمل نہ ہوا۔ انڈونیشیا کے کسی نہ کسی علاقے میں چھوٹے بڑے پیمانے پر لڑائی ہوتی رہی۔ دریں اثنا ولندیزی سامراج ساری دنیا میں یہ پراپیگنڈا کرتا رہا کہ جمہوریہ انڈونیشیا کی حکومت پر کمیونسٹوں کا غلبہ ہے۔ اس پراپیگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ اسے سمجھوتے پر

مجبور نہ کریں بلکہ اسے بھی ایسی ہی مدد دیں جیسی کہ فرانسیسی سامراج کو ہندچینی میں دی جارہی تھی۔ ولندیزیوں کا یہ مؤقف بالکل بے بنیاد نہیں تھا۔ اس وقت تک انڈونیشیا میں کمیونسٹوں کی کوئی الگ تنظیم نہیں تھی۔ وہ سب وزیراعظم امیر شریف الدین کی سوشلسٹ پارٹی میں شامل تھے اور خود شریف الدین بھی مارکسی نظریات کا حامل تھا۔

ملایا کی کمیونسٹ پارٹی کی جدوجہد آزادی اور مقامی حکمرانوں پر مشتمل وفاقِ ملائیشیا کا قیام

ہوچی منہ کے اعلان آزادی سے ملایا کے عوام کی بھی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ جنگ کے دوران جاپانیوں سے نبردآزمائی کے لیے جس عوامی فوج کی تشکیل ہوئی تھی اس نے 16راگست 1945ء کو جاپانیوں کی طرف سے ہتھیار ڈالنے کے اعلان کے فوراً بعد پورے ملک پر کنٹرول قائم کر کے کوریا اور ویتنام کی طرح ہر جگہ آزادی کا پرچم لہرا دیا اور ملک کا نظم ونسق چلانے کے لیے سارے شہروں، قصبوں اور دیہات میں عوامی کمیٹیاں قائم کر دیں۔ جب برطانوی فوج 5رستمبر کو ملایا پہنچی تو اس کا کمانڈر بہت پریشان ہوا۔ ہر جگہ اس امر کی علامتیں موجود تھیں کہ کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور سامراج کے پٹھو سلطان اور جاگیرداروں کا کہیں نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ 26رستمبر 1945ء کے ٹائمز لندن میں اس کے نمائندۂ خصوصی نے ملایا کے بارے میں لکھا کہ گزشتہ چند برسوں میں یہاں بائیں بازو کی قوتوں نے بہت زور پکڑ لیا ہے۔ ان کی اصل قوت کا صحیح اندازہ ابھی نہیں لگایا جاسکتا۔ تاہم حال ہی میں انہوں نے کھل کر منظر عام پر آنا شروع کیا ہے۔ ان کے بعض مطالبے جیسے کہ اظہار اور اجتماع کی آزادی وغیرہ تسلیم بھی کیے جاچکے ہیں۔ برما، انڈونیشیا اور ہندچینی میں سیاسی شعور کی نشوونما سیدھے طور پر قوم پرستی اور جدوجہد آزادی کی شکل میں ہوئی ہے۔ جب کہ یہاں معاشی پہلو پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ یہاں بہت جلد محنت اور سرمائے کے مابین کشمکش منظر عام پر آجائے گی۔

اور پھر 21راکتوبر 1945ء کو سنگاپور کی بندرگاہ میں کام مکمل طور پر بند ہو گیا۔ یہاں کام کرنے والے سات ہزار ہندوستانی اور چینی مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ بندرگاہ کے

علاقے میں لگائے جانے والے پوسٹروں پر یہ نعرے لکھے ہوئے تھے۔ ''ولندیزیوں کی مدد مت کرو۔ فرانسیسیوں کی مددمت کرو۔'' ہڑتالیوں کے ایک غیر سرکاری ترجمان نے کہا کہ ہڑتالیوں کو انڈونیشیا میں استعمال کے لیے لادے جانے والے اسلحہ کا کام کرنے پر اعتراض ہے۔ 25/اکتوبر تک سارا سنگاپور ہڑتالوں کی وبا کا شکار ہو گیا۔ نصف سے زائد سرکاری ٹرانسپورٹ معطل ہوگئی تھی۔ سنگاپور ٹریکشن کمپنی کے ملازمین کی ہڑتال کی وجہ سے تمام بسیں اور رکشہ بند ہو گئے تھے۔ میونسپل اور پبلک ورکس محکمہ کے تمام ملازمین ہڑتال پر تھے۔ مقامی ملاحوں نے بھی تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ ہڑتالوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ 17/دسمبر کو یہ سلسلہ ایک اہم موڑ پر پہنچ گیا۔ اس روز فوجی انتظامیہ کے تحت کام کرنے والے آٹھ ہزار کارکنوں نے ہڑتال کر دی۔ ان سب کا تعلق یوٹیلیٹی سروسز کے ساتھ تھا۔

چنانچہ ان حالات میں حکومت برطانیہ ملایا سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اسے اپنے ملک کی تباہ شدہ معیشت کی بحالی کے لیے یہاں کے ربڑ اور دوسرے معدنی ذرائع کی سخت ضرورت تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں کوریا اور ویتنام کی طرح کمیونسٹ پارٹی کے برسراقتدار آ جانے کا خطرہ تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ یہاں کے بیس بائیس دقیانوسی سلطانوں میں اس وقت تک کاروبار حکومت چلانے کی اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ برطانوی فوج نے پہلے تو پورے ملک میں دہشت پھیلائی اور پھر دسمبر 1945ء میں بزور قوت عوامی کمیٹیاں توڑ کر مارشل لاء کے تحت نئی فوجی انتظامیہ قائم کر دی، مزدوروں اور کسانوں کے بہت سے لیڈروں کو گرفتار کر لیا، اخبارات پر پابندیاں عائد کر دیں اور تحریر وتقریر کی آزادیاں سلب کر لیں۔ ہندوستان کی گورکھا فوج نے ویتنام کی طرح یہاں بھی برطانوی سامراج کے اس غلیظ کام میں ''شاندار'' خدمات سرانجام دیں۔ برطانوی سامراجیوں کی اس کاروائی کے خلاف مقامی مزدوروں اور کسانوں نے زبردست احتجاج کیا۔ ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ دریں اثنا کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے روپوش ہو کر مسلح مزاحمت کی تیاریاں شروع کر دیں اور برطانیہ کے ہائی کمشنر نے ملک کی نو ریاستوں کے سلطانوں پر مشتمل ایک نو آبادیاتی سول انتظامیہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ملایا

میں ملایائی، چینی اور ہندوستانی آباد تھے۔ مقامی ملایائی بھی نو ریاستوں میں منقسم تھے۔ انگریزوں کے مفاد کا تحفظ اسی میں تھا کہ ان کو ایک مرکز کے گرد متحد رکھا جائے۔ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی ان کے لیے سودمند نہیں تھی کہ منقسم اور منتشر صورت حال سے کمیونسٹوں کے فائدہ اٹھا جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے اس وقت انگریز اپنی ہر نوآبادی میں ''متحد کرو اور حکومت کرو'' کے اصول پر کاربند تھے چنانچہ 22؍جنوری 1946ء کو نئے انتظامی ڈھانچے سے متعلقہ تجاویز پر مشتمل ایک وائٹ پیپر شائع کیا گیا جس میں انکشاف کیا گیا کہ نئے آئین کے تحت نو ریاستوں کے سلطانوں کو اپنی رعایا پر محدود اختیار حاصل ہوں گے اور مرکز کی یونین حکومت کا کاروبار ایک ایگزیکٹو کونسل چلائے گی جس کا سربراہ برطانوی ہائی کمشنر ہوگا۔ سنگاپور کو الگ حیثیت دے کر اس کا علیحدہ انتظامی ڈھانچہ وضع کیا گیا تھا جس کا سربراہ بھی الگ مقرر کیا گیا تھا۔ اس منصوبہ کے خلاف سلطانوں، جاگیرداروں اور ملایا کی مقامی آبادی کے درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر نے احتجاج کیا۔ انہوں نے ریاستوں کو زیادہ خودمختاری دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا اور 1947ء کے اوائل میں نئی دستوری تجاویز شائع کی گئیں جن میں یہ بتایا گیا کہ ریاستوں کے سلطانوں کو خودمختاری حاصل ہوگی یعنی انہیں حسب سابق اپنی رعایا کا خون چوسنے کی کھلی چھٹی ہوگی۔ مرکز میں ایک وفاقی حکومت قائم ہوگی جس کا انتظام برطانوی ہائی کمشنر اپنی ایگزیکٹو اور لیجسلیٹو کونسلوں کی مدد سے چلائے گا۔ یہ نوآبادیاتی منصوبہ ملایائی کمیونسٹ پارٹی کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ لہٰذا ایک خونریز اور طویل جنگ آزادی کے لیے میدان ہموار ہوگیا۔

برمی کمیونسٹ پارٹی کی جدّوجہد آزادی اور اعتدال پسندوں کی قیادت میں آزاد ڈومینین کا قیام

برطانوی سامراج کو جنگ کے بعد برما میں بھی کمیونزم کا زبردست خطرہ لاحق تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اگست 1944ء میں جاپانی حملہ آوروں کو ملک سے بے دخل کرنے کے لیے جو اینٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ قائم ہوئی تھی۔ اس میں کمیونسٹوں کا بہت عمل دخل تھا۔ اس تنظیم کا صدر تو ایک غیر کمیونسٹ قوم پرست لیڈر آنگ سان تھا۔ لیکن اس کے جنرل سیکرٹری کے عہدے پر

ایک بہت بااثر کمیونسٹ لیڈر تھان تن فائز تھا۔ مزید برآں جس برمی فوج نے مارچ 1945ء میں مانڈلے میں جاپانیوں کے خلاف بغاوت کی تھی وہ بھی کسی حد تک کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی۔ چنانچہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈالنے کے فوراً بعد برطانوی فوج برما میں پہنچی تو معلوم ہوا کہ یہاں زیادہ دیر تک فوجی حکومت نہیں چل سکے گی۔ قوم پرست تحریک زوروں پر تھی اور کمیونسٹوں کے اثر ورسوخ میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ تجربہ کار برطانوی حکام نے سب سے پہلے برما کی قومی فوج کی طرف توجہ کی۔ ستمبر 1945ء میں اینٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ سے معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اس قومی فوج کو توڑ کر اس کے افسروں اور سپاہیوں کو برطانیہ کی قائم کردہ باقاعدہ فوج میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہ کاروائی بڑی جلدی میں مکمل کی گئی تو فریڈم لیگ کے قائدین کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ ایک ایسی مسلح تنظیم سے محروم ہو گئے تھے جو ضرورت پڑنے پر برطانوی سامراج کی مزاحمت کر سکتی تھی۔ اس غلطی کا ازالہ یوں کیا گیا کہ ایک نیم فوجی رضا کار تنظیم قائم کی گئی۔ جس میں زیادہ تر غریب کسان شامل تھے۔ برطانیہ نے جوابی کاروائی کے طور پر اکتوبر 1945ء میں ایک سول انتظامیہ قائم کر دی جس کی بنیاد وہ پالیسی تھی جس کا اعلان حکومت برطانیہ نے مانڈلے میں برمی فوج کی جاپانیوں کے خلاف بغاوت کے بعد 17 مئی 1945ء کو کیا تھا۔ پالیسی یہ تھی کہ برما کو برطانوی کامن ویلتھ کے اندر آزادی دے دی جائے گی۔ عبوری دور میں برما کے عوامی نمائندوں کے تعاون سے حکومت برطانیہ کا براہ راست اقتدار قائم رہے گا تاکہ ملک کی تعمیر نو کا کام مکمل کر کے عام انتخابات کے لیے مناسب سیاسی فضا تیار کی جائے۔ انتخابات 1937ء کے آئین کے تحت ہوں گے اور منتخب نمائندوں پر مشتمل اسمبلی آزاد برما کا آئین تیار کرے گی۔ اس آئین کی قطعی منظوری برطانوی پارلیمنٹ دے گی۔ اس کے ساتھ ہی ایک معاہدہ کیا جائے گا جس میں ان امور کی وضاحت کی جائے گی جو برما کی آزادی کے بعد بھی حکومت برطانیہ کے سپرد رہیں گے۔

چونکہ قوم پرست لیڈر آنگ سان اپنے ملک کی مکمل آزادی وخودمختاری کا علمبردار تھا اس لیے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ اس کو ایگزیکٹو کونسل میں اتنی نشستیں دی جائیں کہ اس کی پارٹی کی اکثریت ہو اور اس کے نمائندوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ اپنی پارٹی کی سپریم کونسل کی رہنمائی میں کاروبار حکومت چلا سکیں۔ برطانوی گورنر جنرل کو یہ شرائط ہرگز منظور نہیں تھیں کیونکہ آنگ سان

کی پارٹی کمیونسٹوں کے زیر اثر تھی۔ لہٰذا آ نگ سان اور اس کی پارٹی ایگزیکٹو کونسل میں شریک نہ ہوئے۔ ملک میں ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ پولیس نے بھی ہڑتال کر دی اور غریب کسانوں نے بھی جاگیرداری کے خاتمہ کے لیے زبردست تحریک شروع کر دی۔ کمیونسٹ پارٹی ان ہڑتالوں اور مظاہروں کی روح رواں تھی۔ گورنر جنرل اور اس کی غیر نمائندہ ایگزیکٹو کونسل کے خلاف عوام میں شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ عام تاثر یہ تھا کہ جب تک آ نگ سان اور اس کی پارٹی کے آدمیوں کو حکومت میں شامل نہ کیا جائے گا، حالات قابو سے باہر ہوتے چلے جائیں گے۔

ان پریشان کن حالات میں برطانوی سامراج نے روائتی حربہ استعمال کیا یعنی اس گورنر جنرل کو برطرف کر دیا جس نے آ نگ سان کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ نیا گورنر جنرل صلح و آشتی کے نعرے لگاتا ہوا رنگون میں وارد ہوا اور اس نے دو ایک ماہ کی بات چیت کے بعد اکتوبر 1946ء میں آ نگ سان کے سارے مطالبات منظور کر کے حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی۔ آ نگ سان نے اقتدار کی گدی پر بیٹھتے ہی کمیونسٹوں کو اپنی پارٹی سے نکال دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کمیونسٹ امن و امان اور معاشی بحالی کے خلاف تھے اور ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ ملک میں طبقاتی انقلاب برپا کیا جائے۔ قدرتی طور پر آ نگ سان کی اس کاروائی سے برطانوی سامراج کو بہت خوشی ہوئی۔

''اعتدال پسند'' آ نگ سان کو جنوری 1947ء میں لندن بلایا گیا۔ اس نے وزیراعظم ایٹلی سے ملاقات کی تو فوراً ہی دونوں میں اتفاق رائے ہو گیا۔ طے یہ ہوا کہ اپریل میں عام انتخابات ہوں گے اور حکومت برطانیہ برما کی آزادی کے بارے میں منتخب نمائندوں کے ہر فیصلے کو تسلیم کرے گی اور دریں اثنا دفاع اور خزانہ کے محکمے بھی برمی وزیروں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ ''اعتدال پسند' آ نگ سان برطانوی سامراجیوں کے ''خلوص'' سے بہت متاثر ہوا لیکن کمیونسٹ پارٹی اور بعض دوسرے سیاسی عناصر نے اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو ملک میں انتشار، بدامنی اور افراتفری کا دور شروع ہو گیا۔ کمیونسٹوں کے علاوہ کیرن، شان، کاچن، چن قبائل نے بغاوتیں کر دیں۔ تاہم آ نگ سان نے معاہدے کے مطابق اپریل میں عام انتخابات کرائے جن میں اس کی پارٹی کو بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔

مئی میں اینٹی فاشسٹ فریڈم لیگ کی کانفرنس ہوئی جس میں آزاد برما کے آئین کا مسودہ منظور کیا گیا اور ایک قرارداد میں اعلان کیا گیا کہ برما مکمل طور پر آزاد وخودمختار ہوگا اور اس کا نام ''یونین آف برما'' ہوگا۔ جون میں آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا جس میں مجوزہ آئین کی متفقہ طور پر منظوری دی گئی۔ اس کے فوراً بعد تھاکن نو کی زیر قیادت ایک خیر سگالی وفد لندن بھیجا گیا تاکہ قطعی انتقال اقتدار کے لیے مناسب کاروائی کی جائے۔ لیکن برطانوی حکومت نے مطلوبہ کاروائی کرنے میں کئی دن تک پس وپیش کیا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح سودابازی کر کے برما کو برطانوی کامن ویلتھ میں رکھا جائے۔

یہ بات چیت جاری تھی کہ 19 رجولائی 1947ء کو جب رنگون میں آنگ سان کی زیر صدارت ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا ایک شخص برین گن لے کر کمرے میں آیا اور اس نے آنگ سان اور اس کے چھ وزیروں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ یہ دہشت انگیز واردات برما کے ایک سابق رجعت پسند وزیراعظم او۔ سانے کرائی تھی جو اس طرح اپنے اقتدار کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔

آنگ سان اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے بعد برما مکمل نراجیت کا شکار ہو گیا اور پورے ملک میں مار دھاڑ، لوٹ مار اور قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس صورت حال میں برطانوی حکومت نے بڑی عجلت سے یہ تسلیم کر لیا کہ آئین ساز اسمبلی کو برما کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار حاصل ہوگا اور یہ کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی حیثیت 2 راگست 1947ء سے قومی حکومت کی ہوگی۔ تھاکن نو برما کی آزاد ڈومینین کا پہلا وزیراعظم بنا۔

عرب قوم پرستی کی زبردست لہر اور برطانوی، فرانسیسی اور امریکی سامراجیوں کے عزائم کے خلاف مسلّح جدّوجہد

اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برما اور جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ممالک کے برعکس مشرق وسطٰی کے ممالک میں طبقاتی انقلاب کا فوری امکان نہیں تھا لیکن برطانوی سامراج کو اس علاقے کے بارے میں بھی بہت پریشانی لاحق تھی۔ یہ علاقہ نہ صرف ایشیا اور افریقہ پر

سامراجی غلبہ قائم رکھنے کے لیے فوجی لحاظ سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا بلکہ صنعتی مغربی ممالک کی بیشتر ترقی وخوشحالی کا انحصار اس علاقے کے تیل کے بے پناہ ذخائر پر تھا۔ نہر سویز کو تو یورپ کی شہ رگ کہا جاتا تھا۔ لہٰذا اس علاقے میں سامراجی مفادات کے لیے ذرا سا خطرہ بھی مغربی ممالک کے حکمران طبقوں پر کپکپی طاری کر دیتا تھا۔ فوری خطرہ کمیونزم کے سیلاب سے نہیں تھا بلکہ عرب قوم پرستی کے طوفان سے تھا۔

عرب عوام مغربی سامراج اور بالخصوص برطانوی سامراج سے بے انتہا نفرت کرتے تھے اور انہوں نے جنگ عظیم کے خاتمے کے فوراً ہی بعد اپنی اس نفرت کے مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ درمیانہ طبقہ کے عرب دانشور ہندوستان کے دانشوروں کے برعکس مغربی تہذیب و ثقافت سے متاثر و مرعوب نہیں تھے۔ انہوں نے ذہنی طور پر سامراج کی غلامی قبول نہیں کی تھی۔ برطانوی اخبار نویس گائی ونٹ اور پیٹر کولووکوریسی کی رائے میں اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی ممالک نے ہندوستان کے برعکس عرب ممالک کو یہ موقع نہیں دیا تھا کہ وہ عربوں پر اپنا سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور قانونی نظام مسلط کریں جیسا کہ برطانیہ نے ہندوستان میں کیا تھا[10] اور نہ ہی عرب طالب علموں نے برطانیہ اور دوسرے یورپی ممالک کی یونیورسٹیوں سے سامراج کی وفاداری اور غلامی کا درس لیا تھا۔ ہندوستان میں جن قوم پرستوں نے برطانیہ سے آزادی کی جدوجہد کی تھی وہ برطانوی راج کی ہی پیداوار تھے۔ ان کی دل ودماغ پر برطانوی سامراج کی انمٹ مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ آزادی کی جدوجہد کے دوران بھی برطانیہ کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، تعلیمی اور قانونی نظام کو مثالی تصور کرتے تھے اور اس کا برملا اعلان کرتے تھے لیکن عربوں کی قوم پرستی صحیح معنوں میں سامراج دشمن تھی۔

عربوں کی اس روز افزوں قوم پرستی کا تاریخی پس منظر یہ تھا کہ عربوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکوں کی پانچ چھ سو سالہ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے برطانوی سامراج سے امداد حاصل کی تھی۔ لیکن جب سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر گیا تو ان کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ ترکوں کے جاگیر دار سامراج کی جگہ برطانیہ اور فرانس کے سرمایہ دار سامراج نے لے لی تھی۔ برطانوی سامراج عربوں کی آزادی کو تسلیم کرنے کے وعدے سے منحرف ہو گیا۔ اس نے 1917ء میں اعلان کر دیا کہ وہ عربوں کی جدوجہد آزادی کے سدباب

کے لیے مشرقِ وسطیٰ کے قلب میں صیہونیت کے درندے کی پرورش کرے گا۔اس کا سیاسی طریقۂ واردات یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے ممالک پر براہ راست قبضہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کا استحصال بالواسطہ طور پر کیا جائے گا۔ یعنی بدکردار اور قوم فروش بادشاہوں،شیوخ اور جاگیرداروں کو ''آزادی'' دی جائے گی۔ان پٹھوؤں کے ساتھ معاہدے کر کے فوجی اڈے قائم کیے جائیں گے اور اس لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا سامراجی بازار گرم رکھا جائے گا۔ یہ پالیسی بظاہر پندرہ بیس سال تک کامیاب رہی جب کہ فرانسیسی سامراج شام اور لبنان پر براہ راست مسلط رہا۔لیکن اس کا نتیجہ عرب عوام کے سیاسی شعور میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا اور عرب قوم پرستی نے ایک سامراج دشمن طوفان کی صورت اختیار کر لی۔

جب نازی جرمنی نے 8 رمئی 1945ء کو ہتھیار ڈالے تو اس کے صرف ایک ہفتہ بعد یعنی 17 رمئی کو شام اور لبنان کے عوام نے فرانسیسی سامراج کے خلاف زبردست ہڑتال کر دی۔ شہروں میں فرانسیسی بری فوج اور محب الوطن عوام کے درمیان تصادم ہوئے اور فرانسیسی ہوائی فوج نے دمشق پر بمباری کی۔ ہنگاموں کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا تاآنکہ فرانسیسی سامراج 7 راپریل 1946ء کو شام سے رخصت ہو گیا اور اس نے اسی سال 31 ردسمبر کو لبنان کو آزادی دے دی۔فرانسیسیوں کی مشرقِ وسطیٰ سے اس بے دخلی میں برطانوی حکومت کا بھی ہاتھ تھا۔ کیونکہ برطانوی سامراج دوسری جنگ عظیم کے بعد مشرقِ وسطیٰ پر بلا شرکت غیرے غلبہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جنگ کے دوران ایک خفیہ معاہدے میں یہ طے پایا تھا کہ فرانسیسی سامراج شام اور لبنان کو خالی کر دے گا اور اس کے بدلے برطانیہ ہندچینی میں فرانسیسی سامراجی نظام دوبارہ مسلط کرنے میں مدد دے گا۔

بلا شرکت غیرے غلبہ حاصل کرنے کے لیے برطانیہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک وسیع تر عرب ایمپائر بنانے کا خواہاں تھا۔ اس منصوبے کا آغاز جنگ کے دنوں میں ہی ہو گیا تھا۔ اس کی شروعات بعض عرب لیڈروں نے جو برطانوی سامراج کے آلۂ کار سمجھے جاتے تھے،عرب یونین کے قیام کی تجویز کے ساتھ کی۔ستمبر 1943ء کے اواخر میں مصر کے وزیراعظم نحاس پاشا نے عراق کے جنرل نوری السعید پاشا اور اردن کے وزیراعظم توفیق پاشا عبدالہدیٰ کے ساتھ عرب یونین کے سلسلے میں ابتدائی بات چیت کی۔مصر کے ایک نمائندے نے سعودی عرب کا

بھی دورہ کیا اور وہاں کے فرمانروا کے ساتھ ملاقات کی۔ 30 ستمبر کو خبر آئی کہ شام نے بھی اس منصوبے میں دلچسپی ظاہر کی ہے اور عنقریب اس کا ایک نمائندہ اس سلسلے میں مصر کا دورہ کرے گا۔ مشترکہ بنیاد استوار ہونے کے بعد تمام ملکوں کے نمائندوں کی ملاقات ہو گی جس میں منصوبے کو واضح شکل دی جائے گی۔ پھر دسمبر 1943ء کے وسط میں برطانوی وزیر خارجہ انتھونی ایڈن نے لبنان کے مسئلے پر پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے عربوں کے اتحاد کی بات کی اور عرب دنیا کی قومی امنگوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔[11] اس کے بعد برطانوی حلقوں میں عرب علاقوں کو مجتمع کر کے ایک نئی ایمپائر کی تشکیل پر کھل کر اظہار خیال ہونے لگا اور عربوں کے اتحاد کے ساتھ وابستہ برطانوی مفادات کا پرچار کیا جانے لگا۔

یکم جنوری 1944ء کو برطانوی جریدے اکانومسٹ نے عرب اتحاد اور مشرق وسطیٰ کی وسیع تر سلطنت کے قیام کے نظریئے کے فروغ پر زور دیا۔ اس نے لکھا ''عرب اتحاد ابھی صرف تمنا کی حد تک پایا جاتا ہے۔ اس کی زیادہ مثبت طریقے سے حمایت کی جانی چاہیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نصف درجن کے قریب بٹی ہوئی افلاس زدہ ریاستوں کے برعکس عرب اتحاد کا وجود بڑی طاقتوں اور خاص طور پر برطانیہ کے زبردست مفاد میں ہے۔ چنانچہ ہماری طرف سے مسٹر ایڈن کی عرب یونین کے بارے میں گرم جوش مگر مبہم خوش آرائی کو دوہراتے رہنے کے بجائے کچھ زیادہ کا اہتمام ہونا چاہیے...... ایک متحد اور پرامن مشرق وسطیٰ سے صریح طور پر برطانیہ کا عمومی مفاد وابستہ ہے۔ مواصلات، تیل کی ترسیل اور سامراجی تعلقات، ان سب کا واسطہ مشرق وسطیٰ کی تقدیر کے ساتھ منسلک ہے۔ علاوہ ازیں برطانوی تشویش کی ایک اور فوری وجہ بھی ہے۔ مارچ 1944ء میں وہ دن بھی آنے والا ہے جسے قرطاس ابیض کے مطابق فلسطین میں یہودی مہاجرین کے حالات بدلنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس وقت تک حکومت پر مسئلۂ فلسطین سے متعلق اپنی پالیسی کا اعلان کر دینے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بہت سے ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ یہ مسئلہ صرف فلسطین تک محدود رکھ کر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ایک وسیع تناظر میں رکھ کر ہی حل کیا جا سکتا ہے اور یہ مشرق وسطیٰ میں عرب یونین ہی کی سطح پر ممکن ہے۔ سب سے پہلا واضح اور سیدھا اقدام یہ ہے کہ عظیم تر شام کی تشکیل بلکہ احیاء عمل میں لایا جائے جس میں شام، لبنان، اردن اور فلسطین قریبی سیاسی اور معاشی تعلق کی کوئی

صورت رکھتے ہوں۔ اس حل سے عربوں اور یہودیوں دونوں کو کشادہ جگہ میسر آ جائے گی۔ اس کو یہودی مسئلہ کے تصفیے کی کوئی ضمانت تو قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن کم از کم یہ صورت تو ختم ہو جائے گی کہ جس میں کوئی تصفیہ بالکل ناممکن نظر آتا ہے۔'' یہاں عظیم تر شام کے احیاء سے مراد از منۂ قدیم کی اسیرئین ایمپائر کے احیاء سے تھی جو پہلے 1370 ق م سے 1077 ق م تک اور پھر 883 ق م سے 608 ق م تک اس علاقے میں قائم رہی تھی۔ سامراج اپنے مفاد کی خاطر تاریخ کے سمندر سے دور کی کوڑی بھی نکال لاتا ہے۔ رجنی پالمے دت کے مطابق بھی ان دنوں برطانوی سامراج کے کارندے مشرق وسطیٰ میں ایک نئی ایمپائر کی تشکیل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہیں مشرق وسطیٰ میں اپنے حریف امریکی سامراج کے عزائم کی شدت اور وہاں کے عوام کی جدوجہد آزادی کی طاقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ انہیں اُمید تھی کہ وہ ہندوستان سے دستبرداری کے بعد مشرق وسطیٰ میں پاؤں جما کر اپنے عالمی سامراجی نظام کو برقرار رکھ سکیں گے۔[12]

لیکن جنگ کا خاتمہ ہوتے ہی برطانوی، امریکی اور ولندیزی تیل کمپنیوں کے مابین مسابقت اور مخالفت کا بازار گرم ہو گیا۔ 14 ستمبر 1945ء کو امریکی صارفین کی امداد باہمی کی تنظیم کے صدر ہاورڈ۔ اے۔ کوڈن نے ان تینوں طاقتوں کی تیل کمپنیوں کی چپقلش کو عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دیا۔ تاہم 24 ستمبر کو برطانیہ اور امریکہ کے مابین تیل کی تلاش، پیداوار اور تجارت سے متعلق ایک معاہدہ طے پا گیا جس میں ایک دوسرے کو برابر کے مواقع فراہم کرنے، ایک دوسرے کی مراعات کا احترام کرنے اور لامحدود تلاش کے حقوق کو تسلیم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد امریکہ بھی مشرق وسطیٰ کے اکھاڑے میں اتر آیا جہاں برطانیہ اور فرانس پہلے ہی دست و گریباں تھے۔ اپنے عزائم کے حصول کے لیے تینوں کے اپنے منصوبے تھے۔ امریکہ ایک صیہونی ریاست کو وجود میں لا کر اسے اپنے عزائم کی تکمیل کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔ فرانس کی امیدیں لبنان کے ساتھ وابستہ تھیں جس کی علیحدہ حیثیت برقرار رکھ کر وہ یہاں کے مارونی عیسائیوں کے ذریعے اپنے مفادات پورے کرنا چاہتا تھا کہ جن کو فرانسیسی سرپرستی کی وجہ سے لبنان میں پہلے ہی بالا دستی حاصل ہو چکی تھی۔ برطانیہ کا منصوبہ یہ تھا کہ لبنان، شام، فلسطین اور اردن پر مشتمل عظیم تر شام کے نام سے ایک متحدہ سلطنت تشکیل کی جائے اور یہاں کے رجعت پسند حکمرانوں کے ذریعے اپنے تسلط کو برقرار رکھا جائے۔ گویا انگریز یہاں بھی '' متحد کرو اور

حکومت کرو‘‘ کے اصول پر گامزن تھے۔ وہ ’’تقسیم کرو اور حکومت کرو‘‘ کی پالیسی کو اپنے لیے ضرر رساں سمجھتے ہوئے اختیار نہیں کر رہے تھے بلکہ اس کے برعکس اتحاد کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔

30 ستمبر 1945ء کے نیویارک ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق ان دنوں عرب لیڈروں اور سیاست دانوں کی دمشق میں آمدورفت اور سرگرمی کا مرکزی نکتہ عظیم تر شام کے قیام کی راہ ہموار کرنا تھا۔ اس کے مطابق اس سکیم کو تقویت حاصل ہوتی جا رہی تھی اور اس مجوزہ سلطنت کی سربراہی کے لیے ہاشمی خاندان کا نام تجویز کیا جا رہا تھا۔ اردن کے امیر عبداللہ اور عراق کے ریجنٹ شہزادہ ولی عہد عبدُ ل الٰہ کا تعلق اسی خاندان کے ساتھ تھا۔ اخبار نے مزید لکھا کہ حالیہ ہفتوں میں عراق کے سابق وزیر اعظم نوری پاشا کے عرب دارالحکومتوں میں دورے بھی اسی سلسلے کی کڑی تھے۔ اس کی ان کوششوں کی پشت پناہی اہم غیر عرب حلقوں غالباً برطانیہ کی جانب سے کی جا رہی ہے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق عیسائی لبنان کی رائے عامہ اور ذرائع ابلاغ اس مجوزہ وفاق کی مخالفت کر رہے تھے اور اس اندیشے کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ اس سے ان کے ملک کی سلامتی اور خودمختاری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مارونی عیسائیوں کے فرانسیسی زبان کے اخبار لی اورینٹ نے لکھا کہ لبنان کی اکثریتی عیسائی آبادی اپنی اس بے چینی کا اظہار کر رہی ہے کہ کہیں یہودی مسلم تنازعہ کے حل کی یہ صورت نہ پیدا ہو جائے کہ لبنان کی قیمت پر مشرق وسطیٰ میں ایک بڑا وفاق وجود میں آ جائے۔ اس اخبار نے اعلان کیا کہ لبنان خود کو کسی کے لیے بھی قربان نہیں کرے گا۔ یروشلم سے شائع ہونے والے ہفت روزہ الوضا نے لکھا کہ بادشاہت پسند گروہ تین حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ان میں سے دو حصے ہاشمی خاندان کے حق میں ہیں جن میں سے ایک اردن کے امیر عبداللہ کا حامی ہے۔ تو دوسرا عراق کے شہزادہ ولی عہد عبدُ ل الٰہ کے حق میں ہے۔ تیسرا حصہ شاہ ابن سعود کے بیٹے کو حکمران بنانا چاہتا ہے۔[13]

تاہم انگریزوں کا جھکاؤ ہاشمی خاندان کی طرف تھا اور انگریزوں کا ایک پٹھو نوری پاشا اس سلسلے میں عرب دارالحکومتوں میں جوڑ توڑ کے کام میں مصروف تھا۔ انھی دنوں عمان، دمشق، بیروت اور بغداد میں کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں عظیم تر شام کا منصوبہ ہی بحث کا مرکزی موضوع بنا رہا۔ 19 اکتوبر کے نیو یارک ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق یہ منصوبہ بندی اولاً تو حکومت برطانیہ کی رضامندی سے عمل میں آ رہی تھی اور دوسرے یہ کہ سعودی عرب کے فرمانروا

شاہ ابن سعود نے عراق کے موجودہ ریجنٹ امیر عبدُل الٰلہ کو اس مجوزہ وفاقی سلطنت کے تخت پر بٹھانے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ شام میں بھی مذکورہ چار ریاستوں کے وفاق کی صورت میں بادشاہت کو قبول کئے جانے کا رجحان پیدا ہو چلا تھا۔ لیکن لبنان کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہو رہی تھی۔

ادھر صیہونیوں کی جانب سے آزاد خودمختار صیہونی ریاست کے قیام کا مطالبہ بھی زور پکڑ رہا تھا۔ ساتھ ہی عرب عوام الناس کی جانب سے صیہونیت کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ نومبر 1945ء کے اوائل میں بالفورڈیکلریشن کی اٹھائیسویں سالگرہ کے موقع پر عرب عوام الناس کی جانب سے پرتشدد مظاہرے کئے گئے۔ جواب میں گولیاں چلیں۔ متعدد ہلاک و زخمی ہوئے۔ دنیا کے دوسرے علاقوں سے بھی فلسطینی عوام کی حمایت میں آوازیں بلند ہوئیں۔ 8/نومبر کو قائداعظم جناح نے بمبئی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی سامراج کے خلاف اور یہودیوں کی فلسطین میں غیر قانونی نقل مکانی کے خلاف عربوں کی جدوجہد میں ہندوستان کے مسلمان خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتے۔ 13/نومبر کو برطانوی وزیر خارجہ بیون نے پارلیمنٹ میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہم پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک یہودیوں کی طرف سے اور ایک عربوں کی طرف سے۔ ہماری حکومت نے ایسا بندوبست بنانے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی ہے جس میں یہودی اور عرب مل جل کر پرامن طریقے سے رہ سکیں لیکن یہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ جو بندوبست ایک کو قبول ہوتا ہے وہ دوسرے کو ناقابل قبول ہو جاتا ہے اور جو دوسرے کو قبول ہوتا ہے اسے پہلا رد کر دیتا ہے۔ 14/نومبر کو مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کے متعینہ وزیر لارڈ آلٹرنکم نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ جس طرح امریکہ کو پورے امریکی براعظم میں خصوصی دلچسپی ہے اور روس کو اپنے مغرب اور جنوب کے ہمسایہ ملکوں سے خصوصی دلچسپی ہے اسی طرح سلطنت برطانیہ کی مشرق وسطیٰ میں دلچسپی پائی جاتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہاں سیکیورٹی کی علاقائی سکیم کے لیے کافی گنجائش موجود ہے۔ جس میں سلطنت برطانیہ اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر عرب ریاستوں کی فوجوں کی امداد کر سکتی ہے۔[14] گویا عظیم تر شام کے منصوبے کا ایک دوسرا متبادل پیش کیا گیا تھا۔ لیکن برطانیہ کا المیہ یہ تھا کہ یہاں کارفرما عربوں اور یہودیوں کے مابین داخلی تضاد اور برطانیہ، فرانس اور

امریکہ کے مابین خارجی تضاد کسی صورت بھی برطانیہ کے کنٹرول میں نہیں تھے۔ چنانچہ ان تضادات کی موجودگی میں نہ تو عظیم تر شام کے نام سے برطانوی سامراج کی طفیلی ایمپائر کے وجود میں آنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکا اور نہ ہی برطانیہ اور عربوں کے اشتراک سے سیکیورٹی کی کوئی علاقائی سکیم تشکیل پاسکی۔

یہ بات برطانوی سامراجیوں کے وہم وگمان سے باہر تھی کہ مشرق وسطیٰ میں ان کے اقتدار کو سب سے پہلے امریکی سامراج چیلنج کرے گا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے آباؤ اجداد نے پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر مشرق وسطیٰ کے قلب میں صیہونیت کے جس حرامی بچے کو جنم دیا تھا وہ 1945ء میں جوان ہوکر چچا سام کے پاس چلا جائے گا۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہوتے ہی فلسطین میں آباد یہودیوں نے اودھم مچایا۔ یہودیوں کی مسلح تنظیموں کے ارکان نے بہت وسیع پیمانے پر دہشت گردی کی۔ بہت سے عرب جان بحق ہوئے۔ متعدد برطانوی فوجیوں کی جانیں تلف ہوئیں اور کئی عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ فلسطین میں برطانیہ کی انتدابی حکومت بلاتاخیر ختم کر کے موعودہ صیہونی ریاست قائم کی جائے۔ انہیں امریکہ کے سامراجیوں کی بھرپور تائیدوحمایت حاصل تھی اور انہیں اسلحہ کی بیشتر سپلائی فرانس سے ہوتی تھی۔ امریکی سامراج کا مقصد یہ تھا کہ فلسطین میں برطانوی اقتدار کو ختم کر کے وہاں ایک ایسی صیہونی ریاست قائم کی جائے جو مشرق وسطیٰ میں امریکی مفادات کی نگہبانی کرے۔ فرانسیسی سامراج برطانیہ کو فلسطین سے اسی طرح نکالنا چاہتا تھا جس طرح کہ برطانوی سامراج اسے شام ولبنان سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہودی دہشت پسندوں کو سوویت یونین کی ہمدردی بھی حاصل تھی کیونکہ ماسکو کے حکمرانوں کی بھی یہ دلی خواہش تھی کہ مشرقی وسطیٰ میں برطانوی اقتدار اور اثرورسوخ کا جلدازجلد خاتمہ ہو۔ وہ اس طرح مشرق وسطیٰ میں برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے درمیان سہ طرفہ سامراجی تضاد سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ ان کی اس غلط پالیسی کی بنیاد دراصل برطانوی سامراج کی قوت کے غلط اندازے پر تھی۔ انہیں صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ برطانوی سامراج اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا ہے اور عنقریب اس کا بولو رام ہو جائے گا۔ برطانیہ کی اس اندرونی کمزوری ہی کا نتیجہ تھا کہ مشرق وسطیٰ میں اس کی پالیسی ڈانواں ڈول ہوگئی تھی۔ وہ ایک طرف تو یہ چاہتا تھا کہ اسے عرب ممالک کے حکمران طبقوں کا اعتماد حاصل رہے

اور دوسری طرف وہ فلسطین جیسے فوجی اہمیت کے علاقے میں صیہونیوں کی سرپرستی بھی جاری رکھنا چاہتا تھا۔ یہ متضاد مقاصد بیک وقت پورے نہیں ہو سکتے تھے۔

4/مارچ 1946ء کو برطانیہ نے عظیم تر شام کے منصوبے میں ترمیم کر دی جس کے مطابق اب عراق اور اردن کو ملا کر ایک سلطنت تشکیل دی جانی تھی جس کا بادشاہ امیر عبداللہ کو قرار دیا جانا تھا۔ عراق کے شاہ فیصل دوئم کو شہزادہ ولی عہد اور امیر عبدُ ل اللہ ریجنٹ عراق کو شام کا وائسرائے بنانا طے ہوا تھا۔ امیر عبداللہ کے بیٹے امیر طلال کو فلسطین کے عرب حصے کا وائسرائے بنایا جانا تھا۔ عظیم تر شام کے اس منصوبے میں عراق اور اردن کا ادغام ہونا تھا اور اس کا شام اور فلسطین کے عرب حصے کے ساتھ وفاق تشکیل دیا جانا تھا۔ اس منصوبے کو امیر عبداللہ اور برطانوی دفتر خارجہ کے کارندوں کے مابین مارچ میں اس کے دورۂ لندن کے دوران زیر بحث لایا گیا۔ تاہم اس خبر کے ساتھ ہی دفتر خارجہ کے ذرائع نے امیر عبداللہ کے ساتھ عظیم تر شام کے مذکورہ منصوبے سے متعلق کسی قسم کی بات چیت کی تردید کر دی۔ [15] برطانیہ نیمے دروں نیمے بروں کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہودیوں میں یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ برطانیہ عرب حکمرانوں کے ساتھ مل کر اس علاقے میں جوڑ توڑ کر رہا ہے۔ اس میں یہودی مفادات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

22/جولائی 1946ء کو بیت المقدس کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں زبردست دھماکہ ہوا۔ اس ہوٹل کی عمارت میں برطانوی حکومت کا سیکریٹریٹ تھا اور فوجی ہیڈ کوارٹرز کا کچھ عملہ بھی یہیں کام کرتا تھا۔ سینکڑوں انگریز، عرب اور یہودی سرکاری ملازم مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ برطانوی حکمرانوں کا ناطقہ بند ہو گیا۔ انہوں نے بذریعہ وائٹ پیپر الزام عائد کیا کہ یہودی دہشت پسند تنظیموں کو بیرونی حمایت حاصل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ امریکہ، فرانس اور سوویت یونین ان کی ہر طرح سے امداد کرتے ہیں۔ امریکہ سے انہیں بہت مالی امداد ملتی ہے، فرانس سے اسلحہ ملتا ہے اور سوویت یونین سے سیاسی، سفارتی تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے۔

ان حالات میں مشرق وسطیٰ کے مختلف علاقوں سے آہستہ آہستہ برطانوی افواج کے انخلاء کا عمل بھی جاری تھا۔ تجویز یہ تھی کہ صرف اتنی فوج رہنے دی جائے جو برطانوی مفادات کی حفاظت کے لیے ضروری ہو لیکن فوج کی واپسی کے ساتھ بہت سے اندیشے بھی وابستہ تھے۔

صرف فلسطین میں برطانوی فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ نیویارک ٹائمز کے نمائندۂ خصوصی کلفٹن ڈینیل نے 7/اکتوبر کو لندن سے لکھا کہ ''برطانوی افواج کی واپسی سے ایک خلا پیدا ہو جائے گا اور کوئی اور طاقت اسے پر کرنے کی کوشش کرے گی۔ سب سے پہلا خیال سوویت یونین کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔لیکن کچھ برطانوی حلقوں میں یہ خیال کیا جارہا ہے کہ تیل کے مفادات کے پیش نظر امریکہ کا آنا شک وشبہ سے بالاتر ہے۔'' چنانچہ فوجوں کے انخلاء کے بارے میں برطانیہ پس وپیش کا مظاہرہ کرتا رہا۔

1947ء کے اوائل میں برطانیہ نے تجویز پیش کی کہ فلسطین پر برطانیہ کے انتداب میں مزید پانچ سال کے لیے توسیع کی جائے تاکہ پورے ملک کی آزادی کے لیے زمین ہموار کی جاسکے۔مگر یہودیوں نے یہ تجویز مسترد کر کے دہشت گردی میں اضافہ کر دیا اور امریکیوں، فرانسیسیوں اور روسیوں کی جانب سے ان کی امداد و تائید اور حمایت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ بالآخر 18/فروری 1947ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ نے ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ فلسطین میں برطانوی انتداب بالکل بے اثر ہو گیا ہے اور عربوں اور یہودیوں کے مقاصد میں یکسانیت پیدا نہیں کی جاسکتی۔ 2/اپریل 1947ء کو حکومت برطانیہ نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے درخواست کی کہ مسئلہ فلسطین کو جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔ چونکہ ان دنوں اقوام متحدہ پر امریکہ کو پوری طرح غلبہ حاصل تھا اس لیے برطانیہ کی اس درخواست کا عملاً مطلب یہ تھا کہ اس نے مشرق وسطیٰ میں امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسے اپنی معیشت کی بحالی کے لیے امریکہ کی مالی امداد کی ضرورت تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کی رائے میں دوسری جنگ عظیم کے بعد نہ صرف سارے یورپ کو بلکہ ساری دنیا کو سوویت یونین سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ امریکہ مغربی طاقتوں کی قیادت سنبھال کر اس عالمی خطرے کے سدباب کے لیے عالمی سطح پر فیصلہ کن کردار ادا کرے۔ برطانوی سامراج کا عظیم ترین سرغنہ ونسٹن چرچل اسی خواہش کے تحت امریکہ کا دورہ کر چکا تھا۔ اس نے 10/فروری 1946ء کو امریکی سامراجیوں کے سرغنہ صدر ٹرومین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ نہ صرف سوویت یونین کا گھیراؤ کر کے اسے تباہ کرو بلکہ ساری دنیا میں جہاں کہیں بھی سامراج اور مقامی رجعت پسندی سے مکمل آزادی کے لیے

جدوجہد ہو، اسے کچل دو۔ مگر مشرق وسطیٰ کے رجعت پسند حکمرانوں کی سمجھ میں یہ ساری باتیں نہ آسکتی تھیں اور نہ آئیں۔ چنانچہ وہ خود ہی برطانیہ کے پھیلائے ہوئے اقوام متحدہ کے جال میں جا گرے۔ 21 اور 22 اپریل کو مصر، عراق، شام، لبنان اور سعودی عرب نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے درخواست کی کہ فلسطین میں برطانوی انتداب کے خاتمے اور ملک کی آزادی کے مسئلے کو جنرل اسمبلی کے آئندہ اجلاس کے ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔ اس طرح فلسطین کو بین الاقوامی سیاست بازی کے لیے ایک بساط کی حیثیت دے دی گئی۔ مشرق وسطیٰ میں امریکی سامراج کی براہ راست مداخلت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا اور عالم عرب میں برطانوی سامراج کے خاتمہ کی ابتدا ہو گئی۔

مصر میں برطانوی فوجوں کے انخلاء کے لیے عرب قوم پرستوں کی جدوجہد

مشرق وسطیٰ میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کو دوسرا بڑا دھچکا مصر میں پہنچا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو مصر میں انتہائی رجعت پسند اور عوام دشمن جاگیرداروں کی جماعت وفد پارٹی کی حکومت تھی جس کا سرغنہ شاہ فاروق تھا۔ برطانوی سامراج کو معلوم تھا کہ مصر کے حکمران طبقے کے تعاون کے بغیر نئی ''مڈل ایسٹ ایمپائر'' کی تشکیل ممکن نہیں۔ لہٰذا اس نے وفد پارٹی کے لیڈروں سے آئندہ تعلقات کے بارے میں گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا۔ جب کہ مصر کے طول وعرض میں مزدوروں، کسانوں اور دوسرے حریت پسند عوام کے مظاہرے جاری تھے۔ مظاہرین کا فوری مطالبہ یہ تھا کہ 1936ء کے معاہدے کو منسوخ کیا جائے اور برطانوی فوجوں کو مصر کی سرزمین سے بلا تاخیر نکالا جائے۔ ٹریڈ یونین فیڈریشن نے اس قومی مقصد کی تکمیل کے لیے ایک مجلس عمل قائم کی اور طلباء نے ایک نیشنل چارٹر شائع کیا۔ جس میں مطالبہ کیا گیا کہ برطانیہ کی بری، بحری اور ہوائی افواج کو وادئ نیل سے فوراً اور مکمل طور پر نکالا جائے۔ چند دن بعد طلباء اور مزدوروں کی مشترکہ قومی کمیٹی نے عام ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ وفد پارٹی کے رجعت پسندوں کے لیے صورت حال بہت سنگین ہو گئی جو برطانوی سامراج سے سودا بازی کرنا چاہتے تھے۔

21 فروری 1946ء کو قاہرہ میں بے مثال مظاہرہ ہوا جس پر برطانوی فوج نے گولی

چلا دی۔ حریت پسندوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے شہیدوں کی لاشوں کو قومی پرچم میں لپیٹ کر ان کے جلوس نکالے۔ مصری عوام کے اس شدید ردعمل سے بوکھلا کر برطانوی وزیر خارجہ بیون پارلیمنٹ میں چلا اٹھا کہ ''میں سلطنت برطانیہ کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' ادھر وفد پارٹی کی حکومت بھی بے بس ہوگئی۔ اس نے برطانوی حکومت سے فوجوں کے انخلاء کے لیے بات چیت کا سلسلہ شروع کیا مگر اس کا کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مئی 1946ء کے اوائل میں برطانوی سامراج کے عظیم سرغنے ونسٹن چرچل کی گردن بھی جھک گئی۔ اس نے مصر، فلسطین اور ہندوستان میں چل رہی شدید برطانیہ دشمن عوامی تحریکوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا'' دنیا میں ہمارے مقام کا حتمی تعین آئندہ چند برسوں میں ہونے والے واقعات کریں گے۔ برطانوی عوام کو شدید صدمہ پہنچے گا کہ اگر وہ ایک صبح کو جاگیں اور انہیں یہ معلوم ہو کہ مشرق اور مشرق وسطٰی میں ہماری سلطنت اور حیثیت کا راتوں رات خاتمہ ہو چکا ہے۔'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے 12 مئی کے نیویارک ٹائمز نے لکھا کہ ''اگر ہندوستان، مصر اور فلسطین میں کوئی روشن امکانات نظر نہیں آتے تو اس کی بڑی وجہ ان تینوں علاقوں پر کمیونسٹ روس کے بڑھتے ہوئے سائے ہیں۔ جب تک مشرقی بحیرہ روم کی سمت میں سوویت حکومت کے سامراجی عزائم کا شائبہ موجود ہے۔ برطانیہ مشرق وسطٰی میں اپنے فوجی ٹھکانے سے دستبردار ہونے میں خوف محسوس کرتا رہے گا۔'' جنوری 1947ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلاء کے مسئلے پر غور کیا مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور مصری عوام کی جدوجہد آزادی شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

ایران میں تودہ پارٹی کی قیادت میں برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد

مصر کی طرح ایران میں بھی 1945ء میں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی نفرت کا جذبہ اپنے عروج پر تھا۔ لیکن نمایاں فرق یہ تھا کہ ایرانی عوام نے سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو جاگیردارانہ نظام سے آزادی کی جدوجہد سے مربوط کر رکھا تھا۔ ان میں اتنا شعور پیدا ہو چکا تھا کہ ملک میں جاگیردارانہ نظام کے مکمل خاتمے کے بغیر سامراجی چنگل سے نجات حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ان کی برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کی بنیاد یہ تھی کہ ملک میں اینگلو

ایرانین آئل کمپنی نے بے پناہ لوٹ مچائی ہوئی تھی۔ اس کمپنی نے ایرانی تیل کی صنعت میں کل 22 ملین پونڈ کا سرمایہ لگایا تھا جس سے وہ 1945ء تک تقریباً 800 ملین پونڈ کا منافع کما چکی تھی جب کہ تیل کی پیداوار میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ کمپنی کے کارندے ایران کے داخلی سیاسی امور میں کھلم کھلا مداخلت کرتے تھے۔ وہ ان جاگیرداروں کی پشت پناہی کرتے تھے جو ملک کی زرعی اراضی کے 98 فیصد رقبے کے مالک تھے اور جنہوں نے 90 فیصد آبادی کو غربت، بیماری اور جہالت کی ایسی سطح تک گرا دیا تھا کہ اس سے نیچے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ چونکہ سیاسی اقتدار ان معدودے چند جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا اس لیے یہ کوئی ٹیکس نہیں دیتے تھے۔ حکومت کے اخراجات غریبوں کی خون پسینے کی کمائی سے پورے ہوتے تھے اور کوئی سرکاری ملازم رشوت کے بغیر کام نہیں کرتا تھا۔ فلیمنگ لکھتا ہے کہ ایران کی پوری قوم چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ بیشتر چہروں پر بدحالی کے نقوش نمایاں تھے۔ تہران کے بازاروں میں گداگروں کا ہجوم تھا اور بہت سے مبصر اس رائے سے متفق تھے کہ ایران انقلاب کے کنارے پر کھڑا ہے۔ سوویت یونین کے ایرانی دوست اپنے عظیم ہمسائے سے توقع کرتے تھے کہ وہ انہیں معاشی جاگیرداریت سے نجات دلائے گا۔[16]

لیکن جنگ کے فوراً بعد سوویت یونین نے ایران سے اپنی فوجوں کا مرحلہ وار انخلاء شروع کر دیا۔ 20ر ستمبر 1945ء کو سوویت افواج تہران شہر سے رخصت ہو گئیں اور ان کی جانب سے یہاں پر عائد سنسر شپ بھی ختم ہو گئی۔ تاہم ایرانی انقلابیوں کی جانب سے نومبر 1945ء میں گوریلا جنگ کا آغاز ہو گیا۔ بالخصوص آذربائیجان میں، جس پر جنگ کے دوران اتحادیوں کے فیصلے کے مطابق روسی فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ خودمختاری کی تحریک زوروں پر تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جب حسب معاہدہ روسی فوجیں 2ر مارچ 1946ء کو آذربائیجان سے رخصت ہوں گی تو وہاں انقلابی حکومت قائم ہو چکی ہو گی۔ ان حالات میں برطانوی حلقوں نے الزامات عائد کرنے شروع کر دیئے کہ سوویت یونین ایران کے داخلی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے۔ 20ر نومبر کو ازویستیا نے جواب میں کہا کہ یہ الزام تراشی اس لیے کی جا رہی ہے تا کہ فلسطین، مصر اور انڈونیشیا کی عوامی تحریکوں سے دنیا کی توجہ ہٹائی جا سکے۔

26ر نومبر 1945ء کو امریکی حکومت نے تجویز پیش کی کہ سوویت، برطانوی اور امریکی

افواج کو یکم جنوری1946ء تک ایران سے نکل جانا چاہیے۔ مراسلے میں کہا گیا کہ ایرانی حکومت نے امریکہ کو اطلاع دی ہے کہ سوویت افواج نے ایرانی فوج کو اپنے زیر تسلط علاقے میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے جہاں وہ مقامی باغیوں کے خلاف کاروائی کے لیے جانا چاہتی تھی اسی قسم کی شکایت برطانیہ کے سفیر مقیم ماسکو نے سوویت حکومت کے گوش گزار کی اور کہا کہ ایران کو اپنے علاقے میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے اپنی فوج کو استعمال کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ یکم دسمبر کو سوویت یونین نے ایران کو احتجاجی مراسلہ بھیجا جس میں مذکورہ الزام کی سختی سے تردید کی گئی تھی۔ بلکہ الٹا الزام عائد کیا گیا کہ وہاں موجود امریکی مشن ایرانی پولیس کے ذریعہ سوویت فوج کے خلاف اشتعال انگیز کاروائیوں کو ہوا دے رہا ہے۔ اس میں کہا گیا کہ وہاں پہلے ہی کثیر تعداد میں ایران کی فوج موجود ہے۔ مزید کمک کی آمد کو اس لیے روکا گیا کہ اس سے حالات زیادہ خراب ہو جاتے اور پھر سوویت یونین کو بھی یہاں اپنی فوج میں اضافہ کرنا پڑ جاتا اور 3 ردسمبر کو سوویت یونین نے امریکہ کی پیش کردہ یکم جنوری تک افواج کے انخلاء کی تجویز کو رد کر دیا۔ 16 ردسمبر کو ایرانی آذربائیجان کی قومی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کا مرکز تبریز تھا اور اس کا سربراہ تو دہ پارٹی کا لیڈر جعفر پشیواری تھا۔ وہ 29 سال پیشتر صوبہ جیلان میں رشت کے مقام پر روسیوں کی مدد سے آزاد جمہوریہ قائم کرنے کی کوشش میں بھی ملوث ہوا تھا اور پھر 1941ء تک روس میں قیام پذیر رہا تھا۔ تبریز میں قومی حکومت کے قیام کا اعلان اس وقت ہوا جب ایرانی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج کو وہاں سے پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا تھا۔

اپنے اعلان میں قومی حکومت نے کہا کہ وہ ایران کی مرکزی حکومت کو تسلیم کرتی ہے اور وہ اس کے ایسے تمام اقدامات کی پابندی کرے گی جن سے ایرانی آذربائیجان کی خودمختاری، عوامی حقوق اور ایرانی آذربائیجان کی قومی مجلس (پارلیمنٹ) کے فیصلوں پر کوئی حرف نہ آتا ہو گا۔ ایک فرمان کے ذریعے اس قومی حکومت نے ذاتی ملکیت کو ناقابل خلاف ورزی قرار دے دیا۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری کا خاتمہ کرنے کے لیے کسانوں میں سرکاری اراضی اور ان رجعت پسندوں کی اراضی کو تقسیم کر دینے کا اعلان کیا گیا جو آذربائیجان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور آذربائیجان کی خوداختیاری کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں مصروف تھے۔ امن عامہ میں

خلل ڈالنے اور تحفظ عامہ کو سبوتاژ کرنے اور گڑ بڑ پھیلانے والوں کو عوام کا دشمن قرار دیا گیا اور قانون کے مطابق سخت سزائیں دینے کا اعلان کیا گیا۔ لیکن ایران کی مرکزی حکومت نے آذربائیجان کی اس خودمختار قومی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا۔ 18 ردسمبر کو رجعت پسند اور سامراجی پٹھو وزیراعظم ابراہیم حکیمی نے پارلیمنٹ میں کہا کہ وہ آذربائیجان صوبہ میں حکومت قائم کرنے والے باغیوں کے خلاف سخت اقدام کریں گے اور انہیں دہشت گردی، قتل اور بغاوت کے ذریعہ ملک کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس طرح تہران اور آذربائیجان کے مابین تنازعہ شدید ہوتا چلا گیا۔ تاہم آذربائیجان نے تہران سے عدم وفاداری کا اعلان نہ کیا۔ سوویت یونین کا مؤقف یہ تھا کہ آذربائیجان میں جو کچھ ہوا وہ وہاں کے عوام نے اپنی خود روی میں کیا ہے۔ ان حالات میں وہاں سرخ فوج کا موجود ہونا محض اتفاقیہ بات تھی اور ایران کے ساتھ ایک طے شدہ معاہدے کے مطابق تھی۔

دسمبر کے وسط میں ماسکو میں تین بڑوں یعنی روس، امریکہ اور برطانیہ کے وزرائے خارجہ کا اجلاس ہوا جس میں آذربائیجان کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ اگرچہ اس کے بارے میں کوئی معاہدہ تو طے نہ پایا لیکن اس قسم کے اشارے ضرور ملے جن کے مطابق سوویت یونین ایران سے اپنی افواج کے انخلاء پر اس شرط پر آمادہ تھا کہ برطانیہ اور امریکہ بھی یونان، فلسطین، انڈونیشیا، چین اور مصر سے اپنی افواج نکال لیں۔ اس دوران ایران میں رجعت پسند اور سامراجی پٹھو وزیراعظم ابراہیم حکیمی کے حامیوں نے پارلیمنٹ میں اس تجویز کو رد کر دیا کہ ایرانی دستور میں ترمیم کی جائے تاکہ اصلاحات کی جاسکیں اور آذربائیجان کی قومی حکومت سے مذاکرات کا آغاز کیا جاسکے۔ پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے لیڈر ڈاکٹر مصدق نے یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کی ''جزوی طور پر خود اختیار'' صوبوں پر مشتمل ایک وفاق کے طور پر تشکیل نو کی جائے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ شمال مغربی صوبائی علاقہ کو نظرانداز کیا گیا جو وہاں بغاوت کا سبب بنا۔ گویا نہ صرف آذربائیجان اور دوسرے صوبوں میں بلکہ خود تہران میں بھی ڈاکٹر مصدق جیسے لوگوں پر مشتمل ایک ایسا مؤثر عنصر موجود تھا جو ایرانی معاملات کو قوم پرستانہ خطوط پر حل کرنے کا خواہاں تھا اور عوام کی ان امنگوں کی ترجمانی کرتا تھا کہ ایران کو اینگلو امریکی سامراج کے تسلط سے نجات دلائی جائے۔

قدرتی طور پر ایران کے یہ حالات اینگلو امریکی سامراج کے لیے اطمینان وسکون کا باعث نہیں ہو سکتے تھے۔ برطانوی سامراج کو خاص طور پر بہت تشویش تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر ایران میں روسی طرز کا انقلاب آ گیا تو نہ صرف ایران اور خلیج فارس کے دوسرے ممالک کے تیل کے ذخائر سوویت یونین کے قبضے میں چلے جائیں گے۔ بلکہ مشرق وسطیٰ کا سارا علاقہ مغربی حلقۂ اثر سے نکل جائے گا۔ چنانچہ جنوری 1946ء میں لندن میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا تو ایرانی مندوب نے برطانیہ اور امریکہ کے وزرائے خارجہ سے مشورہ کرنے کے بعد سلامتی کونسل کی توجہ ''ایران کے بحران'' کی طرف مبذول کرائی۔ اس نے الزام عائد کیا کہ سوویت یونین ایران کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہا ہے اور مطالبہ کیا کہ روسی فوجوں کو آذربائیجان سے نکالا جائے۔ سوویت مندوب نے اپنی جوابی تقریر میں اس الزام کی تردید کی اور استفسار کیا کہ برطانوی فوجیں یونان، فلسطین، شام، لبنان، آئس لینڈ، انڈونیشیا اور متعدد دوسرے علاقوں میں کیا کر رہی ہیں۔ 14 رفروری کو لبنان کے مندوب نے جواب آں غزل کے طور پر الزام عائد کیا کہ شام اور لبنان میں برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کی موجودگی سے امن عالم کو خطرہ لاحق ہے۔ شام کے مندوب نے اس لبنانی الزام کی تائید کی اور انکشاف کیا کہ برطانیہ اور فرانس نے دسمبر 1945ء میں اپنے اس عندیے کا اظہار کیا تھا کہ وہ شام اور لبنان میں اپنی فوجیں غیر معین عرصے کے لیے مقیم رکھیں گے۔ اس نے استفسار کیا کہ کیا برطانوی اور فرانسیسی فوجوں کی موجودگی سے شام اور لبنان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں ہوتی؟ اس پر امریکی مندوب نے ایک مبہم سی قرارداد پیش کی جس میں یہ امید ظاہر کی گئی تھی کہ برطانیہ اور فرانس جتنی جلدی ممکن ہو سکا شام اور لبنان سے اپنی فوجیں نکال لیں گے لیکن سوویت یونین نے اس قرارداد کو ویٹو کر دیا کیونکہ اس میں فوجوں کے انخلاء کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ 6 رمارچ کو امریکہ کے محکمہ خارجہ نے اعلان کیا کہ امریکہ نے سوویت یونین کو ایک یادداشت بھیجی ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایران سے روسی فوجوں کو فوراً نکال لیا جائے۔ 25 رفروری کو نیو یارک میں سلامتی کونسل کا اجلاس ہوا تو سوویت وزیر خارجہ کی مخالفت کے باوجود ایران کے تنازعے کو زیر بحث لایا گیا۔ سوویت یونین نے اس بحث کو 10 راپریل تک ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا اور امید ظاہر کی کہ اس اثناء میں سوویت یونین اور ایران کے

درمیان گفت وشنید کے ذریعے معاملہ طے ہو جائے گا۔لیکن سوویت مندوب کے مؤقف کو تسلیم نہ کیا گیا اور ایرانی تنازعے پر بحث جاری رہی۔ 27 ؍مارچ کو سوویت مندوب سلامتی کونسل کے اجلاس سے یہ کہہ کر واک آوٹ کر گیا کہ سوویت یونین کو بلا وجہ بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ 3؍اپریل کو سوویت حکومت نے بذریعہ تار سلامتی کونسل کو مطلع کیا کہ روسی فوجیں ایران سے چند ہفتوں میں نکال لی جائیں گی۔

29 ؍مئی کو حکومت ایران نے اعلان کیا کہ روسی فوجیں ایران سے نکل گئی ہیں اور اب سوویت یونین اور ایران کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں ہے۔اس پر بعض مبصرین کی رائے یہ تھی کہ اسٹالن کی حکومت ایران سے محض اس لیے دستبردار ہوگئی تھی کہ وہ امریکہ کی طاقت سے فی الحقیقت خوف زدہ تھی اور وہ ایسے موقعے پر امریکی سامراج سے محاذ ارائی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی جب کہ وہ جنگ کی وجہ سے تباہ شدہ ملک کی تعمیر نو میں مصروف تھی اور مشرقی یورپ میں اپنی بالا دستی کو مستحکم کررہی تھی۔تاہم اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آذر بائیجان میں مسلح جدوجہد آزادی فوراً ختم ہوگئی کیونکہ متعدد دوسرے ایشیائی ممالک کے کمیونسٹوں کی طرح ایرانی کمیونسٹوں کی طاقت کا سرچشمہ مقامی عوام الناس کی بجائے ماسکو تھا۔جب ماسکو نے اپنے عالمی مفادات کے پیش نظر اپنے ایرانی پٹھوؤں کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا تو ان کا بھٹہ بیٹھنے میں کوئی دیر نہ لگی اور امریکی سامراج کے لیے میدان خالی ہوگیا۔جون میں حکومت امریکہ نے ایک بیان میں انکشاف کیا کہ ایران کو اڑھائی کروڑ ڈالر کی فوجی امداد دی جائے گی اس طرح ایران میں امریکی سامراج کی بالا دستی کے لیے زمین ہموار ہوگئی۔سوویت یونین کا سدباب ہوگیا۔ ایرانی جاگیرداروں کو نئے آقا و مولا کی سرپرستی حاصل ہوگئی اور برطانیہ کو ایران سے بے دخلی کا نوٹس مل گیا۔

یہ تھے وہ بین الاقوامی حالات جن کے پیش نظر برطانوی سامراج 1947ء میں اپنی عالمگیر سلطنت سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوا۔ان عالمی حالات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر دنیا کا نقشہ وہ نہیں تھا جو مغربی سامراجیوں نے اپنے ذہنوں میں کھینچ رکھا تھا۔سوویت یونین جنگ کی بے پناہ تباہ کاریوں کا شکار ہونے کے باوجود ایک زبردست عالمی سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ ماسکو کے حکمران ایٹم بم سے مرعوب نہیں

ہوئے تھے۔ سارا مشرقی یورپ ان کے قبضے میں تھا اور وہ اپنے مقبوضہ علاقوں سے دستبردار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ ایشیا و افریقہ میں کوریا سے لے کر مصر تک آزادی اور انقلاب کی جدوجہد بے مثال وسعت کے ساتھ جاری تھی۔ حریت پسند ایشیائی عوام پر ایٹم بم کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ بالخصوص چین میں فقید المثال انقلاب کی فتح یقینی نظر آتی تھی۔ دوسری طرف مغربی یورپ کی معیشتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ مفلوک الحالی اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا اور یوں لگتا تھا کہ اشتراکی انقلاب عنقریب پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ برطانوی سامراج میں اس انقلاب کا سدباب کرنے کی سکت نہیں تھی لہٰذا امریکی سامراج نے پہلے تو سوویت یونین اور ساری دنیا کے حریت پسند عوام کے خلاف سرد جنگ کا اعلان کیا اور پھر یورپ کی معاشی بحالی کے لیے میدان میں آ گیا تھا۔ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ سوویت یونین عالمی سٹیج پر آزادی اور انقلاب کے علمبردار کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا اور امریکہ نے آزادی اور انقلاب کے دشمن کا کردار سنبھال لیا تھا۔ مفلوک الحال برطانوی سامراج میں اب کوئی عالمی کردار ادا کرنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی۔ تاہم برطانیہ کے حکمران طبقے نے ہمت نہیں ہاری تھی اور یہ پالیسی وضع کی تھی کہ (ا) ان محکوم ممالک کو بتدریج آزادی دے دی جائے گی جن کی تحریک آزادی کی باگ ڈور غیر کمیونسٹ اعتدال پسند عناصر کے ہاتھ میں تھی۔ اُمید یہ تھی کہ چونکہ اعتدال پسند عناصر کا طبقاتی مفاد پرانے استحصال نظام سے وابستہ ہوگا اس لیے وہ سامراجی مفادات کا تحفظ کرتے رہیں گے۔ (ب) ان محکوم ممالک کو بھی ''آزادی'' دے دی جائے گی جنہیں محکوم رکھنے کا خرچ آمدنی سے زیادہ تھا اور جن کی جنگی اہمیت بھی کم یا ختم ہو گئی تھی۔ (ج) ان محکوم ممالک کو فی الحال ''آزادی'' نہیں دی جائے گی جن میں کمیونسٹ انقلاب کا خطرہ تھا۔ انہیں اس وقت تک محکوم رکھا جائے گا جب تک کہ انقلاب کا سدباب نہیں ہوگا اور جب تک کہ ایسے ''اعتدال پسند'' عناصر پیدا نہیں ہوں گے جو سامراجی مفادات کا تحفظ کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔

مختصر یہ کہ برطانوی سامراج کا نیا پروگرام یہ تھا کہ محکوم ممالک میں براہ راست قبضے اور استحصال کا سلسلہ جاری نہیں رکھا جائے گا بلکہ آئندہ یہ کام مقامی پٹھوؤں کی وساطت سے کیا جائے گا۔ ان پٹھوؤں کو قانونی طور پر ''آزادی'' دے دی جائے گی لیکن ان کی اندرونی اور بیرونی پالیسیوں پر کنٹرول رکھا جائے گا۔ یہ پالیسی بعد میں ''جدید نو آبادیاتی نظام'' کی پالیسی

کہلائی۔ یہ پالیسی دراصل نئی نہیں تھی۔ امریکی سامراج کافی عرصہ سے لاطینی امریکہ میں اس پالیسی پر کامیابی سے عمل پیرا تھا اور برطانیہ نے بھی پہلی جنگ عظیم کے بعد مشرق وسطیٰ میں اس پالیسی کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ برطانیہ نے اس پالیسی کے تحت 23رمئی 1946ء کو شرق اردن کو ''آزادی'' دی تھی اور فلپائن بھی اسی سال 2رجولائی کو اس پالیسی کے تحت امریکہ کی غلامی سے ''آزاد'' ہوا تھا۔لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد کے نئے حالات میں اس پالیسی کے اندر یہ خطرہ مضمر تھا کہ جدید نوآبادیاتی ممالک میں استحصال پر برطانیہ کی اجارہ داری زیادہ دیر تک قائم نہیں رہے گی۔

25رفروری 1946ء کے نیویارک ٹائمز نے ''سلطنت برطانیہ کے مصائب'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ اس کا آغاز برطانوی وزیر خارجہ بیون کے اس بیان سے کیا گیا جس میں اس نے کہا تھا کہ سلطنت برطانیہ اب ''آزاد قوموں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔'' اخبار نے لکھا کہ یہ سلطنت جنگ کی وجہ سے کمزور ہوگئی ہے اور طاقت کا پرانا توازن بگڑ جانے کی وجہ سے اس کی بین الاقوامی جوڑ توڑ کی اہلیت بھی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے اپنی موجودہ ہیئت برقرار رکھنے کے لیے دو اطراف سے حملے کا سامنا ہے۔ پہلا دباؤ روس کی طرف سے مشرق وسطیٰ اور بحیرہ روم میں سیاسی، سفارتی اور معاشی نفوذ کا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے برطانیہ ہمیشہ سے اپنی سلطنت کی شہ رگ قرار دیتا آیا ہے۔ اور ایک برطانوی ترجمان تو یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ روس نے برطانیہ کا گلا دبا دیا ہے۔ دوسری طرف مشرق میں قوم پرستی کا اُمڈتا ہوا سیلاب ہے جہاں آزادی سے محروم اقوام پہلے سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ آزادی کا مطالبہ کر رہی ہیں اور وہ اقوام جو آزاد ہیں مگر جن میں اس سلطنت کی چھاؤنیاں قائم ہیں وہ ان سے دستبردار ہونے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک طرف سے حملے کا دوسری طرف والوں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے اور یہ ماسکو کے کمیونسٹ پراپیگنڈے سے بھی کہیں زیادہ ہے کہ جسے بیون نے عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ قرار دیا ہے اور یہ بائیں بازو اور کمیونسٹ عناصر کی نسبت بھی زیادہ ہے جن کو وزیراعظم ایٹلی نے ہندوستان میں ہنگاموں اور بغاوتوں کو پھیلانے کا مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ اگرچہ بیون کا یہ یقین قابل اطمینان ہے کہ ایسے حالات نہیں ہیں کہ جن میں روس اور برطانیہ کے مابین جنگ چھڑ جائے مگر ان دونوں مسائل کا فی الحال کوئی حل نظر نہیں آتا۔

چونکہ برطانوی سلطنت نے ساری دنیا میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس لیے یہ صورت حال دوسری قوموں کے لیے اور بالخصوص امریکہ کے لیے خود بخود ایک انتہائی تشویش ناک صورت اختیار کر گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ امریکہ کو اس بارے میں ملے جلے جذبات بھی رکھنے چاہئیں۔ گزشتہ دو جنگوں کے دوران یہ ثابت ہوا کہ سلطنت برطانیہ، امریکہ کی پہلی دفاعی لائن ہے اور آئندہ کوئی جنگ ہوئی تو اس میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ اپنے دفاع کی خاطر کہ بعض دفعہ جمہوریتیں اس کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتیں، امریکہ کو دو مرتبہ جنگ میں شامل ہونا پڑا اور یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اگر آئندہ کبھی پھر سلطنت برطانیہ ایسے ہی حملے سے دو چارہ ہوئی تو امریکہ پیچھے رہے گا۔ اگر اس حقیقت کا دنیا کو بلا شک وشبہ یقین دلایا جائے تو ممکن ہے فضا کی آلودگی کم کرنے میں مدد مل سکے۔ کہا جاتا ہے کہ جرمنوں نے پہلی عالمگیر جنگ اس لیے شروع کی کہ اس میں برطانیہ کی شمولیت مشکوک تھی اور انہوں نے دوسری جنگ اس لیے چھیڑی کہ اس میں امریکہ کی شمولیت مشکوک تھی۔ اس قسم کے شکوک وشبہات کو آئندہ کسی جارح کے لیے ترغیب کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔'' آگے چل کر اس نے مزید لکھا ''خوش قسمتی سے برطانیہ جواب اپنی بڑی نوآبادیوں کو سلطنت کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے آزاد قوموں کی حیثیت سے ابھرتے ہوئے دیکھ رہا ہے، اب پوری طرح تسلیم کرتا ہے کہ دنیا سے استعماریت کا دور لد گیا ہے اور اب وہ جہاں کہیں بھی ممکن ہے سیلف گورنمنٹ کا حق دے رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی اپنی حکومت کو خود چلانے والے آپس میں حکومت کی نوعیت کے بارے میں متفق ہو جاتے ہیں وہاں سیلف گورنمٹ دے دی جاتی ہے۔ برطانیہ کی ان کوششوں کو امریکہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتا ہے کیونکہ اسی طریقے سے سلطنت برطانیہ کو اپنے اندرونی حملوں سے بچاؤ کا بہترین موقع میسر آ سکتا ہے کہ جن کے خلاف برطانیہ نے بیرونی امداد کے بغیر خود ہی اپنا دفاع کرنا ہے۔''
نیو یارک ٹائمز نے بجا طور پر امریکی بورژوازی کی ترجمانی کرتے ہوئے سلطنت برطانیہ کے کھنڈرات پر ایک جدید نوآبادیاتی نظام کی استواری کا نقشہ کھینچا تھا۔

وہ سیلف گورنمنٹ دیتے ہوئے پیچھے ہٹتے برطانوی سامراج کی بے چارگی پر اس سے ہمدردی کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنی پہلی دفاعی لائن یعنی سلطنت برطانیہ کی کمر ٹوٹ جانے کے بعد اب خود میدان میں آنا اس کے سامراجی مفادات کا تقاضہ تھا۔ اب طریقہ واردات

مختلف تھا۔ استعماریت کا دور لد گیا تھا۔ جدید نو آبادیاتی نظام کے دروازے کھل گئے تھے۔ امریکی سامراج کی فطرت بہت جارحانہ تھی۔ وہ بڑی تیزی سے ساری دنیا میں اپنے پنجے پھیلا رہا تھا۔ وہ ''کھلے دروازے'' کی پالیسی کا علمبردار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پسماندہ ممالک کے دروازے سارے استحصالیوں پر کھلے رہنے چاہیں اور بڑی سامراجی مچھلی کو چھوٹی سامراجی مچھلیوں کو ہڑپ کرنے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے۔ سویڈن کا مشہور مورخ گنار مرڈل لکھتا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے اپنی عالمگیر سلطنت سے دستبردار ہونے کا فیصلہ بڑی مجبوری کے تحت کیا تھا۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا میں مغرب کے سفید فام سامراجیوں کو جس آسانی کے ساتھ ذلت آمیز شکست دی تھی اس نے حریت پسند ایشیائی عوام کے حوصلے بہت بلند کر دیئے تھے۔ سفید فام سامرجیوں کی ہیبت ختم ہو گئی تھی۔ ایشیائی عوام ان کی غلامی کا بوجھ مزید برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ برطانیہ کو امریکہ، جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ میں تجربہ ہو چکا تھا کہ براہ راست سامراجی نظام کو بزور قوت قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ مزید برآں سوویت یونین کی اندرونی اور بیرونی کامیابیوں سے بھی ایشیا کی تحاریک آزادی کو بہت تقویت پہنچی تھی۔ سوویت یونین مغربی سامراج کی مذمت کرتا تھا اور قوم پرستوں کے مطالبہ آزادی کی تائید وحمایت کرتا تھا۔ وہ رنگ ونسل سے بالاتر عالمگیر اخوت ومساوات کا نظریہ پیش کرتا تھا اور اس نظریہ میں اتنی طاقت تھی کہ سفید فام سامراج کا نو آبادیاتی نظام اس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔[17] برطانوی مؤرخ ڈی۔ جی۔ ای ہال کو اس تجزیے سے اتفاق ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جنگ عظیم میں جاپانیوں کے ہاتھوں یورپی فوجوں کی آناً فاناً شکست سے ایشیائی قوم پرست تحریکوں کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور ایشیا میں ملایا کے سوا کہیں بھی سفید فام اقتدار کی گنجائش نہیں رہی تھی۔[18]

جزو دوم

برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے داخلی محرکات

باب: 4

ہندو مسلم تضاد اور اس کے بارے میں انگریزوں، کانگرس اور مسلم لیگ کا رویہ

برصغیر کو متحد رکھنے کے لیے کانگرس اور برطانوی حکمرانوں کے مابین ہم آہنگی

برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ ایٹلی کی لیبر حکومت نے 27رجولائی 1945ء کو برسراقتدار آنے کے بعد برطانوی سامراج کی عالمی سطح پر سیاسی پسپائی کی جو پالیسی وضع کی اس میں پہلا نمبر برصغیر جنوبی ایشیا کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تقریباً 40 کروڑ کی آبادی اور ڈیڑھ کروڑ مربع میل کے اس وسیع وعریض ملک کی داخلی صورت حال نہایت تشویش ناک تھی۔ چونکہ یہ ملک جنگ کے دوران جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی، امریکی اور ہندوستانی فوجوں کے لیے ہر قسم کی سپلائی کا مرکز تھا اس لیے اس کی معیشت تقریباً تباہ ہوگئی تھی۔ ضروریات زندگی کی بہت قلت تھی۔ قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور افراط زر کے باعث لوگوں کی قوت خرید میں بہت کمی آ گئی تھی۔ 1943ء کے بنگال کے قحط کے اثرات ابھی باقی تھے۔ سرکاری اندازے کے مطابق اس قحط میں 1,873,749 افراد لقمہ اجل ہوئے تھے لیکن غیر سرکاری تخمینہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ عوام الناس میں بہت ہیجان پایا جاتا تھا۔ روزگار کے مواقع بڑی تیزی سے ختم ہو رہے تھے۔ افلاس اور بھوک کے بھوت بیشتر دروازوں پر دستک دینے لگے تھے۔ جنوبی اور وسطی ہندوستان میں قحط کی سی حالت تھی۔ چھوٹی صنعتیں بند ہو رہی تھیں اور کاروبار مندا تھا۔ مزدور ہڑتالیں کر

رہے تھے۔ جگہ جگہ مظاہرے ہورہے تھے۔ پولیس گولیاں چلا رہی تھی اور کمیونسٹ پارٹی انقلاب کے نعرے لگا رہی تھی۔ ہندو مسلم تضاد نے نہایت سنگین صورت اختیار کر لی تھی۔ ہر روز خانہ جنگی کا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ہندوستان کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ بایں ہمہ برطانوی سامراج کو امید تھی کہ ہندوستان کے ''اعتدال پسند'' لیڈر اس سے سودا بازی کر کے برصغیر کو نراجیت، خانہ جنگی اور انقلاب سے بچالیں گے اور اس طرح یہ سونے کی چڑیا بدستور اس کے پنجرے میں ہی رہے گی۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اس پنجرے کا نام ایمپائیر کی بجائے کامن ویلتھ رکھ دیا جائے گا۔ یعنی بوتل وہی ہوگی لیبل بدل دیا جائے گا۔

15 راگست کو شہنشاہ معظم نے نئی پارلیمنٹ کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ اس کی نئی لیبر حکومت ہندوستان کی آزادی کے لیے ضروری اور مناسب اقدام کرے گی۔ ہندوستان کی کانگرس پارٹی کو لیبر حکومت کی زبردست انتخابی کامیابی اور پھر اس کے بعد اس کے اس اعلان پر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس خوشی کی بنیاد یہ تھی کہ کانگرس میں جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ کی سرکردگی میں ''بائیں بازو کے ترقی پسند'' عناصر کا لیبر پارٹی کے ''بائیں بازو کے ترقی پسند عناصر'' سے خاصی دیر سے رابطہ تھا۔ لندن میں انڈیا لیگ کا صدر کرشنامینن ''رابطہ افسر'' کے طور پر کام کرتا تھا۔ ان دونوں حاکم اور محکوم عناصر میں مشترک بات یہ تھی کہ دونوں ہی 1917ء کے روسی انقلاب کے بعد یورپ میں پیدا شدہ اس مکتب فکر سے منسلک تھے کہ جمہوری سوشلزم کا نعرہ لگائے بغیر عالمی طبقاتی انقلاب کا سدباب نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دونوں عناصر نظریاتی طور پر اس مؤقف کے حامل تھے کہ دنیا میں سوشلسٹ انقلاب جمہوری اور پرامن طریقوں سے بتدریج لایا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے تشدد اور پرولتاری آمریت کی ضرورت نہیں۔ ان کا سیاسی طریقہ کار یہ تھا کہ زبانی طور پر جمہوریت اور سوشلزم کے نعرے لگاؤ لیکن عملی طور پر جاگیرداری اور سرمایہ داری کا تحفظ کرو۔ ان کی رائے میں روس کے انقلاب کے بعد پرانے سیاسی طور طریقوں سے جاگیرداری کی استبدادیت اور سرمایہ داری کی آمریت کو قائم نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ لیبر پارٹی کے ''بائیں بازو'' کے قائدین کی یہ بھی رائے تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد پرانا نوآبادیاتی عالمی نظام نہیں چل سکتا یعنی محکوم ملکوں پر براہ راست قبضہ برقرار رکھ کر سامراجی استحصال جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ سامراجیت کے مفادات کے

تحفظ کے لیے جدید نوآبادیاتی نظام کے علمبردار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ محکوم ملکوں کے ''اعتدال پسند'' عناصر کو ''آزادی'' دے کر بالواسطہ سامراجی لُوٹ کھسُوٹ جاری رکھی جا سکتی ہے اور ہندوستان کی کانگرس پارٹی کے ''بائیں بازو کے ترقی پسند'' عناصر کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ قومی بورژوا طبقے کے ''ترقی پسند'' نمائندوں کی حیثیت سے امید کرتے تھے کہ برطانیہ اور دوسری مغربی دنیا میں جمہوری سوشلزم کے علمبرداران ہندوستان میں پُرامن بورژوا جمہوری انقلاب کی ترقی اور استحکام کے کام میں ہاتھ بٹائیں گے۔ انہیں امید تھی کہ برطانیہ اور یورپ کے ''ترقی پسند عناصر'' اس مقصد کے لیے ان کی تکنیکی اور مالی اعانت بھی کریں گے۔

چنانچہ لیبر پارٹی اور کانگرس پارٹی میں نظریاتی ہم آہنگی کے باعث بظاہر برصغیر کی آزادی کی سودابازی کے لیے زمین ہموار تھی۔ اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت رکاوٹ ہوسکتی تھی وہ اس طرح دور کر دی گئی کہ کانگرس نے اپنی صفوں میں سے کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے ''انتہا پسندوں'' کو اس الزام میں بے دخل کر دیا کہ انھوں نے جنگ کے دوران برطانوی سامراج سے اشتراکِ عمل کیا تھا اور مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی تائید وحمایت کی تھی۔ اس کے بعد لیبر پارٹی اور کانگرس پارٹی کے درمیان کسی سیاسی یا نظریاتی غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ کانگرس کے قائدین نے عملی طور پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ سوویت یونین کے پٹھو نہیں ہیں۔ وہ ''اعتدال پسند'' ہیں۔ اگر انہیں سیاسی اقتدار منتقل کر دیا جائے تو برصغیر میں انقلاب نہیں آئے گا اور برطانوی سامراج کے مفادات محفوظ رہیں گے۔ کانگرس کی قیادت کو قوی امید تھی کہ لیبر پارٹی اس سے سودا کر لے گی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ لیبر پارٹی کی قیادت اور مسلم لیگ کی قیادت میں کبھی کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان ذرا سی بھی نظریاتی ہم آہنگی نہیں تھی۔ لیبر پارٹی مطالبہ پاکستان کے خلاف تھی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوا تو اس علاقے میں سیاسی استحکام کو نقصان پہنچے گا اور اس طرح برصغیر میں سوویت یونین کے اثر و رسوخ کے لیے راستہ کھل جائے گا۔ پینڈرل مون کے بیان کے مطابق لیبر پارٹی کا خیال تھا کہ ''جناح مطالبہ پاکستان پر محض سیاسی سودابازی کے لیے اصرار کر رہا ہے۔''[1]

اس زمانے میں ہندوستان کا وائسرائے لارڈ ویول بھی مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا سخت مخالف تھا۔ لارڈ ویول کا پس منظر یہ تھا کہ اس نے مشرق وسطیٰ میں شمالی افریقہ کے محاذ پر

برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے خدمات انجام دی تھیں اور پھر ہندوستان کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا تھا۔ دو سال تک اس عہدے پر فائز رہنے کے بعد جون 1943ء کے اواخر میں جب وہ لندن میں تھا تو اسے ہندوستان کا وائسرائے نامزد کر دیا گیا۔ وہ برطانوی حکومت کے ان کارندوں میں سے تھا جنکی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ چکی تھی کہ ان کی سلطنت کا زوال ہو چکا ہے اور اب معاملہ صرف خوش اسلوبی کے ساتھ واپسی کی راہ اختیار کرنے کا ہے۔ وہ اس کا قدیم سلطنت روما کے زوال کے ساتھ موازنہ کیا کرتا تھا اور رومیوں کی جزیرہ برطانیہ سے دستبرداری کو انگریزوں کی ہندوستان سے دستبرداری کے ساتھ تشبیہ دیا کرتا تھا۔ وہ برطانوی حکومت کے دوسرے سرکردہ رہنماؤں کی طرح ہندوستان کو برطانوی سلطنت یا دولت مشترکہ کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے اور اس کو متحدہ شکل میں رکھتے ہوئے سیلف گورنمنٹ کا حق دینے کا حامی تھا۔ بطور وائسرائے نامزدگی کے بعد اس نے لندن میں اپنے ساڑھے تین ماہ کے قیام کے دوران برطانوی حکام کے ساتھ ہندوستان کے آئینی حل کے بارے میں تفصیلی صلاح ومشورہ کیا۔ وہ ہندوستان کے لیے وفاقی طرز کے آئین کا خواہاں تھا جو سوئٹزرلینڈ یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے ملتا جلتا ہو۔[2] اس مقصد کے لیے وہ ہندوستان آ کر یہاں کی اہم سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کا اجلاس منعقد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور ان کے مشورے سے مرکز میں مخلوط حکومت تشکیل دینا چاہتا تھا۔ اس نے ستمبر 1943ء کے وسط میں اپنی ان تجاویز کو ایک یادداشت کی شکل میں برطانوی کابینہ کی سب کمیٹی کو پیش کیا جو ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے لیے تشکیل دی گئی تھی۔ اکتوبر کے اوائل میں سب کمیٹی اور کابینہ کے اجلاسوں کے بعد چرچل نے ویول کو ہدایت کی کہ وہ جنگ پر توجہ دے، ہندوستان کی حالت سدھارنے کا کام سرانجام دے اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان امن قائم کرے، نیز سیاسی عمل کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اس ہدایت کے ساتھ ویول نے 19/اکتوبر 1943ء کو دہلی پہنچ کر وائسرائے کا چارج سنبھالا۔

ویول نے وائسرائے بننے کے بعد 17/فروری 1944ء کو ہندوستان کی قانون ساز اسمبلی میں اپنی سب سے پہلی اہم پالیسی تقریر میں کہا"میں آپ وہ نقطۂ نظر بتاتا ہوں جو میں جانتا ہوں کہ عملاً پوری برطانوی قوم کا اور موجودہ برطانوی حکومت کا ہے اور مجھے وثوق ہے کہ

مستقبل کی حکومت برطانیہ کا بھی یہی نقطۂ نظر ہوگا۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ ہم ہندوستان کو ایک خوشحال اور متحدہ ملک کی صورت میں دیکھیں جو قطعی اور مکمل سیلف گورنمنٹ کا استفادہ کرتے ہوئے برطانوی دولت مشترکہ میں بہ رضا و رغبت شریک ہو۔" آگے چل کر اس نے متحدہ ہندوستان میں سیلف گورنمنٹ دیئے جانے کے بارے میں 1942ء میں کرپس کی پیش کردہ تجاویز کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ پیش کش اس اُمید میں کی گئی تھی کہ جب جنگ ہندوستان کے بالکل قریب آ جائے گی اور اس کی قومی بقا خطرے میں پڑ جائے گی تو باقی ملکوں کی طرح یہاں بھی باہمی اتحاد اور تعاون کی روح اُجاگر ہو جائے گی۔ جو درپیش خطرے کی وجہ سے سیاسی اختلافات پر غلبہ پا لے گی۔ یہ امید پوری نہیں ہو سکی۔" اس کے باوجود اس نے یقین دلایا کہ حکومت برطانیہ اب بھی ان تجاویز پر ثابت اور قائم ہے۔ اس نے پرزور طریقے سے ہندوستان کی وحدت کے حق میں دلائل دیئے اور اس کو یکجا رکھنے پر اصرار کیا اس نے کہا "میں تو یہی کہوں گا کہ آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ دفاع، امور خارجہ اور بہت سے داخلی و خارجی اور معاشی مسائل کے نقطۂ نگاہ سے ہندوستان ایک قدرتی یونٹ ہے۔ دونوں بڑے فرقوں، بعض دوسری اہم اقلیتوں اور ہندوستانی ریاستوں کو ایک یونٹ کے اندر باہم مل جل کر رہنے کے لیے کیا طریقے اختیار کرنے ہیں، اس کا فیصلہ خود ہندوستانیوں کو کرنا ہوگا۔ یہ کہ دو فرقے بلکہ دو قومیں ثقافتی اور مذہبی اختلافات کے باوجود باہم مل کر رہنے کے طریقے وضع کر سکتی ہیں۔ اس کی تاریخ میں بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اس مسئلے کے کئی مختلف حل ہوتے رہے ہیں۔ انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ صدیوں کے مناقشے کے بعد ایک مکمل یونین میں ڈھل گئے ہیں۔ کینیڈا میں انگریز اور فرانسیسی عناصر نے ایک وفاق تشکیل دیا ہے جو خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی، اطالوی اور جرمن باشندے ایک مختلف نوعیت کا وفاق بنا کر رہ رہے ہیں۔ ان تمام گروہوں کے مابین مذہبی اور نسلی اختلافات پائے جاتے تھے۔ امریکہ میں بہت سے نسلی اور مذہبی عناصر ایک مصیبت خیز خانہ جنگی کے تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد ایک وفاقی ڈھانچے کی صورت میں ایک قوم میں ڈھل گئے ہیں۔ البتہ آئرلینڈ میں متحارب عناصر ابھی تک متحد ہونے میں ناکام رہے ہیں اور آئرلینڈ میں ایک طرح کا پاکستان بنا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ مماثلت بھی اضافی ہے۔ سوویت یونین نے روس میں پہلے سے موجود لچکدار نظام میں ایک نئی تبدیل شدہ

صورت وضع کی ہے جو بلا شبہ سود مند ثابت ہوگی۔ آئین سازوں کے مطالعے کے لیے یہ چند مثالیں ہیں جو ہندوستان کے سامنے موجود ہیں۔ یہ ہندوستان کا کام ہے کہ دیکھے کہ کون سی صورت اس کی ضرورتوں کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن کوئی شخص جغرافیے کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"[3]

سر محمد یامین خان نے اس تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "اس تقریر نے مسلم لیگ کو متنبہ کر دیا تھا کہ گنگا کس طرف بہے گی اور جمنا میں پانی کتنا ہے۔"[4] اپنی اس تقریر کے فوراً بعد ویول نے مدراس کا دورہ کیا۔ وہاں راج گوپال اچاریہ کے ساتھ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "میں نے اس سے کہا کہ بلا تکلف اور آف دی ریکارڈ ہو کر میں کہتا ہوں کہ ایک ایسی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کی ضرورت ہے جو ہر طرح کے باصلاحیت افراد اور ممتاز شخصیات پر مشتمل ہو، جن کو ہندوستان کے بہترین عناصر کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہو اور جو موجودہ آئین کے مطابق ہندوستان کے مسائل کا حل دریافت کریں اور فرقہ وارانہ سیاست کو خاطر میں لائے بغیر کل ہندوستان کے مفاد کو پیش نظر رکھیں۔"[5] گویا وہ سیکولر بنیاد پر ہندوستان کو متحد رکھنے کا خواہاں تھا اور اسی بنیاد پر سیلف گورنمنٹ کی تشکیل کرنا چاہتا تھا۔

وائسرائے بن کر آنے کے بعد جلد ہی اس کا گاندھی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس خط و کتابت کا آغاز 1944ء کے اوائل میں خود گاندھی نے جیل سے اس کو خط بھیج کر کیا تھا۔ جب کہ جناح کے ساتھ ویول کا رابطہ 1944ء کے اواخر میں جا کر ہوا جب 6/دسمبر کو ان کی ملاقات ہوئی۔ اس سے پیشتر 5/مئی 1944ء کو اس نے گاندھی کو رہا کر دیا تھا۔ جس نے جیل میں مرن برت رکھا ہوا تھا اور ڈاکٹروں نے رپورٹ دی تھی کہ اگر اس نے مرن برت جاری رکھا تو وہ مر جائے گا۔ ویول سمجھتا تھا کہ اگر جیل میں مرن برت کے نتیجے میں گاندھی مر گیا تو وہ تاریخ میں یسوع مسیح کا درجہ پا جائے گا جب کہ ویول پر پنطوس پیلاطس کی طرح کم از کم اگلے دو ہزار سال تک لعنت و ملامت کی جاتی رہے گی۔[6] رہائی کے بعد گاندھی اور ویول کے مابین خط و کتابت میں اضافہ ہو گیا۔ گاندھی کے خط کے جواب میں ویول جو بھی خط لکھتا اس کا مسودہ منظوری کے لیے برطانوی کابینہ کے پاس لندن بھیجا جاتا تھا۔ وہاں وزیر ہند ایمری بھی گاندھی کے بارے میں ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا۔[7] تاہم وزیر اعظم چرچل گاندھی کے جواب میں درشت لب و لہجہ اختیار کرنے پر اصرار کرتا تھا۔

24 ؍اکتوبر1944ء کو ویول نے بطور وائسرائے اپنا ایک سال مکمل ہونے پر وزیراعظم چرچل کے نام ایک مفصل خط تحریر کیا جس میں ہندوستان کے مسئلے کا فوری سیاسی تصفیہ کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''اب ہندوستان پر بزورقوت قبضہ برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ قوت کے جابرانہ استعمال کی نہ تو برطانوی عوام حمایت کریں گے اور نہ ہی عالمی رائے عامہ اس کی اجازت دے گی اور نہ ہی جنگ کے بعد انگریز فوجی اس ملک پر قبضہ برقرار رکھنے کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں یہاں رہنا گوارا کریں گے۔ موجودہ حکومت ہند غیر معینہ عرصے یا لمبے عرصے کے لیے اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ کانگرس اور مسلم لیگ ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی پارٹیاں ہیں۔ گاندھی اور جناح معتدل آدمی ہیں۔ ان کے بعد ممکن ہے ایسے لوگ نہ ملیں کہ جن کے ساتھ کوئی معاملہ طے پا سکے۔ ابھی وقت ہے کہ کوشش کی جائے تو ہندوستان کو دولت مشترکہ میں شامل رکھا جا سکتا ہے۔ اگر اس کے لیے ابھی کوشش نہ کی گئی تو شاید بڑی مشکل سے مزید چند برس اس پر قبضہ جاری رکھا جا سکے۔ لیکن بالآخر یہ انتشار کی نذر ہو جائے گا اور ممکن ہے دوسروں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اس لیے ہمیں ہندوستان کے بارے میں پرخلوص اور دوستانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ موجودہ آئین کے تحت ایک عبوری سیاسی حکومت تشکیل ہونی چاہیے جیسی کہ کرپس نے تجویز کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی فوری طور پر ایک مستقل آئینی تصفیے کے حصول کی کوشش ہونی چاہیے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ حاصل ہو تو ہمیں چاہیے کہ ابھی سے اس کے ساتھ ڈومینین کا سا برتاؤ کریں۔ یہ رائے صرف میری ہی نہیں ہے کہ اس سے پیشتر کہ بہت دیر ہو جائے کچھ نہ کچھ ضرور ہو جانا چاہیے بلکہ کمانڈر انچیف ہند اور برطانوی ہند کے تمام گیارہ صوبوں کے گورنروں کی بھی یہی رائے ہے۔ [8] ویول کے اس خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی برطانوی انتظامیہ ہندوستان کو منقسم اور منتشر کرنا نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے جوں کی توں حالت میں ڈومینین کا درجہ دینے اور اس کی دونوں بڑی پارٹیوں کے مابین آئینی تصفیہ کرانے کے حق میں تھی۔ انتشار کی صورت میں انہیں ڈر تھا کہ یہ علاقہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ چلا جائے۔ یہاں ''دوسرے'' سے مراد سوویت یونین تھا جو جنگ عظیم کے عظیم فاتح کے طور پر ابھرا تھا اور سارا مغرب اس کی قوت سے خائف تھا۔ علاوہ ازیں ایشیا میں قوم پرستی اور کمیونزم کی جو لہر آئی ہوئی تھی

ہندوستان بھی اس کی زد میں تھا اور انتشار کی صورت میں اندیشہ تھا کہ یہاں کمیونسٹ غالب نہ آ جائیں۔ چنانچہ یہاں کے برطانوی کارندے یہاں کے ''معتدل'' سیاست دانوں کے ساتھ ایک متحدہ ہندوستان کے آئین پر تصفیہ کر کے یہاں سے بوریا بستر گول کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اس سلسلے میں 6/دسمبر 1944ء کو ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات کی۔ وزیر ہند ایمری کو اس ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے ویول نے اپنی رپورٹ میں لکھا ''جناح کہتا ہے کہ اس کی رائے میں متحدہ ہندوستان برطانیہ کی تخلیق ہے اور ہندوستانی حکومت کے تحت اس کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا۔ میں نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ میری رائے میں جنگ کے بعد کے پرخطر برسوں میں ہندوستان کے لیے اپنا اتحاد برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ہندوستان کو چاہیے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو بالائے طاق رکھ دے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندوستان کی سلامتی اور اس کے انتظامی مسائل کے حل کی خاطر مل جل کر کام کریں۔ اگر بعد ازاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اکٹھے مل کر کام کرنا ممکن نہیں ہے تو پھر وہ تقسیم کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ لیکن ابھی ایسا کرنا مہلک ثابت ہوگا۔ جناح نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میرے ذہن میں موجودہ آئین کے تحت عبوری حکومت کی بحالی کا کوئی خیال جاگزیں ہے جو جنگ کے بقیہ عرصے اور بعد کے پرخطر برسوں تک قائم رہے گی۔ اس کے جواب میں میں نے کہا کہ میں صرف اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر رہا ہوں لیکن ایسی حکومت کا قیام ہی اس وقت ہندوستان کے لیے سب سے بہتر راستہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں فرقے اکٹھے کام کرنے سے عین ممکن ہے آئینی مسئلے کے کسی حل پر پہنچ جائیں۔ جناح نے کہا کہ مجھے اتفاق ہے...... جناح کی رائے میں اس قسم کی پیش کش وقتی طور پر تو ہندوستان کے لیے بہترین ہے۔ اگرچہ اسے پورا یقین ہے کہ بالآخر پاکستان کا قیام لازمی اور ضروری ہوگا اور اس کا کہنا ہے کہ اگر میں اسے مزید وقت مہیا کروں تو وہ مجھے اس بارے میں قائل کر سکتا ہے۔''[9] جناح کے ساتھ اس ملاقات کی مزید تفصیل بیان کرتے ہوئے ویول نے ایمری کے نام 12/دسمبر کے مراسلے میں لکھا کہ ''جناح ہندوستان کے اتحاد کو ایک ایسے آئیڈیئل کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا جو ناقابل حصول تھا۔ اس نے کہا کہ مسلمانوں نے کانگرس کی بالادستی کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ہی پاکستان کو واحد حل کے طور پر اختیار کیا ہے۔ میں نے

اس سے کہا کہ اگر جنگ کے بعد کے خطرناک برسوں میں کہ جن پر ہندوستان کے مستقبل کا دارومدار ہے، ہم ملک کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہو گئے تو تمام فریقین کا نقصان ہو گا۔ سب سے بہتر یہی ہے کہ فی الوقت ہندوستان کو متحد رکھا جائے اور تقسیم صرف اسی صورت میں پیش نظر ہونی چاہیے کہ مسلمان اور ہندو عملاً محسوس کریں کہ وہ اکٹھے کام نہیں کر سکتے۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا کہ جہاں تک میرا تعلق ہے میں موجودہ آئین کے تحت عبوری حکومت کی تشکیل میں تعاون کرنے پر تیار ہوں۔[10] گویا جناح بھی فی الوقت پاکستان کو ملتوی کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے۔ ویول کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح مسلمان مطالبہ پاکستان کو التوا میں ڈال دیں۔ ہندو بوڑ وا انگریزوں کا گماشتہ بن کر متحدہ ہندستان کی باگ ڈور سنبھال لے اور کوئی ایسا بندوبست بھی ہو کہ مسلمان بھی مطمئن ہو جائیں۔ 14ردسمبر 1944ء کو کلکتہ میں ہندو بورژوازی کے سب سے بڑے ادارے ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس سے خطاب کرتے ہوئے ویول نے کہا کہ ''پاکستان اس مرض کا مایوس کن علاج ہے جس کا دوسرے طریقوں سے بھی علاج کیا جا سکتا ہے۔ حکومت برطانیہ نے پوری کوشش کی ہے کہ ہندوستان کا کوئی تصفیہ ہو جائے مگر جب تک یہاں کے فریقین اپنی بدگمانیوں سے آزاد ہو کر تعاون کی حقیقی کوشش نہیں کرتے، کامیابی نہیں ہو سکتی۔''[11]

ویول کی طرح ہندوستان کے دوسرے انگریز حکام بھی پاکستان کے بارے میں معاندانہ رویہ رکھتے تھے اور اس تجویز کو ناقابل عمل سمجھتے تھے اور محض سودے بازی کا ایک حربہ گردانتے تھے۔ 17ردسمبر کو مسلم اکثریت کے سب سے بڑے صوبے یعنی بنگال کے گورنر کیسی (Caseyi) نے ویول کے نام اپنے خط میں لکھا ''مسلمانوں کے ساتھ گفتگو کے دوران پاکستان کے بارے میں سوالات پوچھنے میں مجھے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ میں اکثر کہتا رہتا ہوں کہ میں ان کے لیے خوشی محسوس کروں گا اگر مجھے یہ یقین دلا دیا جائے کہ انہوں نے پاکستان کے بارے میں اہم اقتصادی اور مالیاتی مسائل کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ عام طور پر جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آیا انہوں نے بالکل عملی نوعیت کے اقتصادی و مالیاتی امور سے متعلق تسلی بخش طریقے سے حساب کتاب لگا لیا ہے، تو وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دراصل میرا گمان یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں کے پہلو کے بارے میں عملاً انہوں نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔ یہ ماننے

کا کوئی جواز نہیں ہے کہ پاکستان کا تصور ایک سیاسی خوش فہمی سے زیادہ حیثیت کا حامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سودے بازی کا ایک گراں قدر حربہ ضرور ثابت ہوا ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے کہ پاکستان کا شیر حقیقت کا روپ دھارے، اس پر سوار جناح سمجھوتہ کرلے گا...... میری رائے میں مسلمانوں کو تصور پاکستان سے ہٹانے کے لیے ان پر بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں یہاں بنگال میں کام شروع کر دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں محتاط انداز میں بات چیت کے ذریعے آئندہ چھ ماہ میں یہاں کے مسلمانوں کے ایک حصے پر اثر انداز ہو کر اسے پاکستان کے تصور سے الگ کرنے میں شاید کامیاب ہو جاؤں گا۔"[12] اس کے جواب میں یکم جنوری 1945ء کو ویول نے کیسی کو لکھا کہ "پاکستان، بلکہ فرقہ وارانہ بدگمانی، جس کا یہ ترجمان ہے، کسی تعمیری سوچ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مسلم لیگ کبھی اس بات پر رضامند نہ ہو گی کہ ایک مضبوط مرکزی حکومت کے ذریعے ہندو غلبہ کو دوام حاصل ہو جائے۔ ہندوؤں کی اکثریت بھی خواہ مہاسبھا سے تعلق رکھتی ہو خواہ کانگرس سے، یہ نہ سمجھ پائے گی کہ مسلمانوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے ملنے والے حصے سے بھی زائد حصہ کے حصول کی کیوں ضرورت پائی جاتی ہے۔ اقلیتیں نہیں چاہتیں کہ کوئی بڑا فرقہ ان کو نیست و نابود کر دے۔ پاکستان مسلمانوں کے خوف اور بدگمانی کا ایک شدید اظہار ہے جو کہ حقیقی ہے اور کسی حد تک حق بجانب بھی۔ میرا خیال نہیں ہے کہ پاکستان قابل عمل ہو گا۔ اس سے اقلیتوں کے نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے جو موجودہ مسائل سے بھی زیادہ گھمبیر ہوں گے۔ علاوہ ازیں پاکستان کی ریاست یا ریاستیں اقتصادی لحاظ سے غیر مستحکم ہوں گی۔ پھر یہ بھی ہے کہ دیگر جذباتی نظریات کی طرح جو کسی صحیح غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتے، یہ نظریہ بھی مخالفت کی بنیاد پر پروان چڑھا ہے۔ بعض باشعور مسلمان تو اسے محض سودے بازی کا حربہ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلم لیگ کے عامتہ الناس اسے حقیقی امکان گردانتے ہیں اور اس کے ساتھ شدید جذباتی کشش رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم کھل کر پاکستان کو رد نہیں کر سکتے تا آنکہ ہم اس کا کوئی پرکشش متبادل پیش نہ کریں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں سکندر حیات خان نے اور اس سے پہلے فضل حسین نے بھی یہ کوشش کی تھی کہ مقامی وطنیت اور قومی جذبے سے اس صوبے میں فائدہ اٹھایا جائے جس کی اپنی مشترک زبان اور طرز زندگی موجود ہے۔ سیاسی جماعتوں کو فرقہ وارانہ اختلاف کے

بجائے معاشی بنیاد پر متحد کرنے کی کوشش بھی جزوی طور پر کامیاب ہوئی تھی اور اس وقت بھی خضر حیات خان کی طرف سے یہ کوشش جاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں آپ کا بھی اسی قسم کا تاثر ہے، اگرچہ ابھی اتنا زیادہ گہرا نہیں ہے۔ مسئلے کا حل یہی ہے کہ مقامی وطنیت کو استعمال کیا جائے لیکن یہ کام صرف مضبوط کردار اور پختہ عزم کے حامل لیڈر ہی انجام دے سکتے ہیں کیونکہ ہندوستانی سیاست میں مذہبی اور معاشرتی دباؤ ابھی بہت زیادہ ہیں۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو نہ بنگال کو اور نہ ہی پنجاب کو علیحدگی سے کوئی فائدہ پہنچے گا خواہ یہ علیحدگی معاشی طور پر مستحکم ہی کیوں نہ ہو۔ دونوں صوبوں میں مسلمان تھوڑے سے فرق کے ساتھ اکثریت میں ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ مزید کم بھی ہوسکتا ہے۔ دونوں صوبوں میں مسلمان اگر کوشش کریں تو قانون ساز اسمبلی اور حکومت پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں۔ علیحدگی سے ان کو سوائے مرکز سے علیحدگی کے کوئی نئی چیز حاصل نہ ہوگی بلکہ انہیں اقلیت کے شدید مسائل سے دوچار ہونا پڑے گا اور کسی منضبط حکومت کا چلنا ناممکن ہو جائے گا۔ پاکستان کے لیے محرک قوت ان صوبوں سے مہیا ہو رہی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں نہ کہ وہاں سے جو مجوزہ پاکستان کا علاقہ ہے۔ مرکزی کنٹرول سے آزادی پر کشش تو ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں ایسا معاشی جبر مسلط ہوسکتا ہے کہ ابھی مسلمانوں کو اس کا اندازہ نہیں ہے۔ جب تک ہمارے پاس پاکستان کے مقابلے میں پیش کرنے کو کچھ اور نہیں ہے میرا خیال ہے آپ کو اس کے کھلے مخالف کے طور پر سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ لیکن اس میں کوئی ہرج نہیں کہ آپ اپنے پاس آنے والے مسلمانوں سے ہمدردانہ طور پر یہ دریافت کرتے رہیں کہ اس صورت میں انہیں جو صریح مسائل درپیش ہو جائیں گے وہ ان سے کس طرح نمٹیں گے اور یہ کہ کیا تقسیم کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوسکتا۔ ہم تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جتنا بھی اس بارے میں سوچنے کی طرف مائل کرسکیں اتنا ہی بہتر ہے۔''[13] گویا برصغیر کی برطانوی انتظامیہ ہر قیمت پر برصغیر کو متحد رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے مقامی وطنیت اور سیکولرازم کے تصور کو بروئے کار لانا چاہتی تھی۔ چنانچہ جہاں تک تقسیم ہند کا تعلق تھا، کانگرس اور برطانوی انتظامیہ ایک ہی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔

کانگرس کی ہٹ دھرمی اور ویول پلان کی ناکامی۔شملہ کانفرنس جون 1945ء

اسی بنیاد پر ویول نے چرچل کو جو آئینی تجاویز ارسال کی تھیں ان سے متعلق صلاح مشورہ کرنے اور اس آئینی منصوبے پر عملدرآمد کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ویول 21/مارچ 1945ء کو دہلی سے لندن گیا۔ اس وقت تک سوویت یونین نازی جرمنی کے چھکے چھڑا چکا تھا اور یورپ کے وسط تک پہنچ چکا تھا۔ اس کی فاتحانہ قوت سے اینگلو امریکی سامراج کو سخت تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ یالٹا کانفرنس میں برطانیہ اور امریکہ کے سوویت یونین کے ساتھ مفتوحہ علاقوں کی تقسیم پر اختلافات کھل کر سامنے آ گئے ہوئے تھے۔ دیوالیہ شدہ برطانوی سامراج کو اپنی وسیع وعریض سلطنت کی فکر تھی۔ چنانچہ انہی دنوں ویول کے علاوہ ایمپائر کے دوسرے علاقوں کے حاکم بھی لندن میں موجود تھے۔ 4/اپریل کو چرچل نے ان حکام اور اپنی کابینہ کے ارکان کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے انہیں روس کے ''غیر دوستانہ'' رویہ سے ڈرایا جس کا اس کے بقول، یالٹا میں روس کی طرف سے اظہار ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے امریکہ کی فوجی قوت کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ ان حالات کے پیش نظر اس نے ایمپائر کو متحد رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔[14] ایمپائر کو ٹکڑوں میں بانٹنا برطانوی سامراج کے مفاد میں نہیں تھا۔ ویول نے وہاں دو ماہ سے زیادہ عرصہ قیام کیا۔ اس دوران ہندوستان کے آئینی حل کے بارے میں برطانوی کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کے صبح شام اجلاس ہوتے رہے اور ویول کی تجاویز اور دوسرے ارکان کی تجاویز پر غور ہوتا رہا۔ بالآخر یکم جون 1945ء کو ویول ایک منصوبہ لے کر لندن سے واپس لوٹا۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ صلاح ومشورہ کر کے ایک نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دی جائے جس میں وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ باقی تمام ارکان ہندوستانی ہوں۔ ان میں مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد برابر ہو۔ یہ کونسل موجودہ آئین کے مطابق کام کرے۔ اس کا بڑا مقصد جاپان کے خلاف جنگ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے سے متعلقہ فرائض انجام دینا ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ارکان ایک نئے اور مستقل آئین پر اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رکھیں۔

اس منصوبے کے مطابق نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے لیے ویول نے جون کے اواخر میں شملہ میں تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کی کانفرنس بلائی۔ کانگرس، مسلم لیگ، اکالی دل، یونینسٹ پارٹی اور نیشلسٹ پارٹی کے رہنماؤں اور دیگر حلقوں اور اچھوتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانگرس کے وفد کی قیادت ابوالکلام آزاد نے کی جو اس وقت کانگرس کا صدر تھا۔ مسلم لیگ کے وفد کی قیادت جناح کر رہے تھے۔ گاندھی کانفرنس کی میز پر تو نہ بیٹھا لیکن شملہ میں موجود رہا اور ویول کے ساتھ ملاقاتیں کرتا رہا اور آزاد کو مشورے دیتا رہا۔ ویول نے چودہ رکنی کونسل کی تجویز پیش کی جس کے مطابق پانچ ارکان اونچی ذات کے ہندوؤں سے، پانچ ارکان مسلمانوں سے، ایک رکن سکھ اور ایک رکن اچھوتوں سے لیا جانا تھا۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے اس میں وائسرائے اور کمانڈر انچیف کو رکھا گیا تھا۔ جناح نے مطالبہ کیا کہ پانچوں مسلمان ارکان کی نامزدگی کا اختیار مسلم لیگ کو دیا جائے کیونکہ صرف مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ حیثیت حاصل ہے۔ ویول کا ارادہ یہ تھا کہ ان پانچ میں یونینسٹ پارٹی اور کانگرس کے نمائندے بھی لیے جائیں۔ ادھر کانگرس ہندوؤں اور مسلمانوں کی نشستوں کے علاوہ اچھوت نشست کی بھی دعویدار تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا کہ ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کی نمائندگی اس درجہ محدود ہو کر رہ جاتی کہ وہ کوئی بھی کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں غالب حیثیت کانگرس کو حاصل ہوتی جس کے ہندو اور مسلمان ارکان کو سکھ اور اچھوت نمائندوں کے علاوہ یونینسٹ نمائندے کی بھی حمایت حاصل ہو سکتی تھی۔ کانگرس نے اپنے نامزد افراد کی جو فہرست ویول کو مہیا کی اس کی بنیاد پر ویول خود لکھتا ہے کہ "کونسل میں کانگرس کو مکمل غلبہ حاصل ہو جاتا۔"[15] چنانچہ ان حالات میں جناح اپنے مطالبے پر اڑ گئے کہ مسلمان ارکان کی نامزدگی صرف مسلم لیگ کا حق ہے۔ ویول نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ کانگرس نے بھی مخالفت کی اور مسلمان ارکان کی نامزدگی پر اپنے حق سے دستبردار نہ ہوئی۔ 14 رجولائی تک کانفرنس کے اندر اور باہر اس مسئلے پر کافی لے دے ہوتی رہی۔ بالآخر کانفرنس ناکام ہو گئی۔

گاندھی نے ویول سے کہا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین کبھی تصفیہ نہیں ہو سکے گا۔ بالآخر انگریزوں کو کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ویول نے گاندھی سے کہا کہ اگر حل یہی ہے تو پھر ہمیں برصغیر میں کئی سال لگ جائیں گے اور ممکن ہے اس پر عمل کروانے کے لیے

قوت کا استعمال بھی کرنا پڑے۔اس کا گاندھی نے کوئی جواب نہ دیا۔[16] کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد کا ردعمل یہ تھا کہ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کوئی مذاکرات کانگرس اور حکومت برطانیہ کے مابین مکمل اتفاق رائے کے باوجود ایک تیسرے فریق کی جانب سے ایک فرقہ وارانہ بنیاد پر ناکام ہو گئے۔گاندھی سے ملتی جلتی آزاد کی رائے بھی یہ تھی کہ ویول کو مسلم لیگ کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے تھی اور آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔''آج نہیں تو کل انہیں (یعنی انگریزوں کو) حق اور انصاف کی بنیاد پر پختہ موقف اختیار کرنا ہوگا۔اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ایک مرتبہ فیصلہ کر لیا جائے تو پھر اس پر آگے بڑھنا چاہیے۔جو آگے بڑھنے پر آمادہ ہوں انہیں ساتھ لے لینا چاہیے اور جو آمادہ نہ ہوں انہیں پیچھے چھوڑ دینا چاہیے۔پختہ عزم کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔''[17]

ممکن ہے ویول آزاد کی اس رائے پر، جس کا اظہار اس نے مذاکرات کے دوران بھی کیا تھا، عمل کر گزرتا اگر کانگرس کو مسلمان عامتہ الناس میں کچھ بھی پذیرائی حاصل ہوتی۔چنانچہ کانفرنس کی ناکامی پر ویول کا تاثر یہ تھا کہ اب کانگرس کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا کیونکہ کانگرس کی جانب سے حقیقت پسندانہ رویہ اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کا مظاہرہ ہوا ہے جبکہ لیگ کی مقبولیت گھٹے گی کیونکہ جناح نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔کانگرس مسلمانوں کو لیگ کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔[18] لیکن ایسا اس لیے نہ ہو سکا کہ جناح متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے کی بنیاد پر حکومت کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ کانفرنس سے باہر مسلمان عامتہ الناس کے دل کی آواز یعنی پاکستان کا مطالبہ بھی دہرائے جاتے تھے۔شملہ میں کانفرنس کے دوران جب تعطل پڑا ہوا تھا تو 2/جولائی کو جناح نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے مطالبہ پاکستان کا اعادہ کیا اور گاندھی کو پیش کش کی کہ ''اس کانفرنس سے ہٹ کر ہمیں آپس میں تصفیہ کر لینا چاہیے جس میں پاکستان ایک طے شدہ معاملہ ہونا چاہیے۔جب تک یہ طے نہیں ہو جاتا کہ ہندوستان متحد رہے گا یا منقسم ہوگا، کوئی عبوری حکومت نہیں چل سکتی۔جتنا جلد پاکستان کا بنیادی معاملہ طے ہو جائے اتنا ہی متعلقہ فریقین کے لیے اچھا ہوگا۔'' چونکہ ویول اور گاندھی دونوں ہی مطالبہ پاکستان کے مخالف تھے اس لیے نہ تو ''ویول منصوبہ'' کو مسلمانوں میں پذیرائی حاصل ہو سکی اور نہ ہی گاندھی اور کانگرس مسلمانوں کو مسلم لیگ سے توڑ کر اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب

ہو سکے۔ ویول کو افسوس تھا کہ متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے میں آئینی حل کا اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اب بھی اس کی امیدیں کانگرس، یونینسٹ، نیشنلسٹ اور اس طرح کے دوسرے عناصر سے وابستہ تھیں جو متحدہ ہندوستان کے حامی تھے۔ مسلم لیگ بھی متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے آئینی حل کے حصول میں حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ تھی لیکن اس کے لیے ویول کی پیش کش اس قدر محدود تھی کہ اس کو قبول کرنے کی صورت میں مسلم لیگ مفلوج ہو کر رہ جاتی۔

کانفرنس کی ناکامی پر جناح نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ''ویول پلان ایک پھندا تھا۔ اس ملی بھگت میں گاندھی اور اس کی ہندو کانگرس تھی جو متحدہ ہندوستان کی صورت میں صرف ہندوؤں کی قومی آزادی چاہتی ہے، لارڈ ویول تھا جو جغرافیائی اتحاد کا علمبردار بن کر آیا ہے اور خضر اور گلانسی تھے جو پنجاب کے مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس تانے بانے میں گھسیٹنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اگر ہم ویول کے منصوبہ کے ساتھ اتفاق کر لیتے تو یہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہوتا۔ پاکستان کا معاملہ بالائے طاق رکھا جاتا اور غیر معینہ مدت کے لیے سرد خانے کی نذر ہو جاتا۔ جب کہ کانگرس کے لیے ہندو قومی ریاست کے قیام کی راہ ہموار ہو جاتی۔''[19] جناح نے اس بیان کے ذریعے اس الزام کی صفائی پیش کی جس میں جناح کو شملہ کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار ٹھہرایا جا رہا تھا۔

وائسرائے بننے کے بعد ویول نے کافی صلاح مشورہ کر کے اپنی حکومت سے منظوری لے کر جو پہلی سیاسی پیش رفت کی تھی وہ یہاں تاریخی طور پر موجودہ ہندو مسلم تضاد کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ ویول جب وائسرائے بن کر آیا تو سمجھتا تھا کہ اصل مشکل کانگرس کے ساتھ معاملہ طے کرنے کی ہے اور اسی مقصد کے لیے اس نے آتے ہی گاندھی اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ خط و کتابت اور مذاکرات شروع کر دیئے تھے۔ اب شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہندوستان کا کوئی آئینی حل مسلم لیگ کی شمولیت کے بغیر وضع نہیں ہو سکتا۔ صرف کانگرس اور اس کی ہم نوا جماعتوں کی منظوری سے تشکیل پانے والا آئین ہندوستان میں ایسے حالات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ انگریز ان حالات کو سازگار سمجھتے ہوئے اطمینان سے یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ تاہم مسلم لیگ کو مسلم فرقے کی نمائندہ تنظیم کے طور پر تسلیم کرنے کے باوجود اس کے مطالبہ پاکستان کا بدستور مخالف رہا اور اسے ایک ناقابل عمل منصوبہ قرار دیتا رہا۔

برطانوی حکمرانوں کی طرف سے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت

برصغیر میں برطانوی انتظامیہ کے کارپردازوں اور سیاسی پارٹیوں اور گروہوں کی یہ صورت حال تھی جب جولائی کے آخری ہفتے میں برطانیہ میں لیبر پارٹی برسراقتدار آئی۔ ہندوستان کو آزادی دینے یا دوسرے لفظوں میں خود کو ہندوستان کے بوجھ سے آزاد کرانے کے معاملے میں لیبر پارٹی والے زیادہ آزاد خیال تھے اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا وہ کانگرس کے نظریہ سے اتفاق کرتے تھے۔ یہاں وائسرائے اور اس کی انتظامیہ کے کارندے پہلے ہی بستر گول کرنے کو تیار بیٹھے تھے مگر ایک متحدہ ہندوستان کو اقتدار منتقل کر کے جانا چاہتے تھے۔ تاہم مشکل یہ تھی کہ کانگرس سے ''آزادی'' کی سودابازی کے لیے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جنگ کے دوران مسلمان عوام میں مطالبہ پاکستان کو بہت تقویت پہنچی تھی بالخصوص مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقے نے اپنے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کے مطالبے کو اپنی زندگی و موت کا سوال بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کا یہ طبقہ ہندوؤں کے قدامت پسند عناصر اور ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی استحصال سے سخت خوفزدہ تھا۔ وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو اپنی بقاء کا واحد ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس نے ملاؤں، مسلمان جاگیرداروں اور ایک قومی نظریہ کے حامل مسلمان قوم پرستوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر اپنے ہی طبقے کے ایک کامیاب وکیل محمد علی جناح کو اپنا قائداعظم بنالیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے قائداعظم ایک اعلیٰ پایہ کے دیانت دار وکیل ہیں۔ وہ مطالبہ پاکستان پر کبھی سودابازی نہیں کریں گے۔ لہٰذا صورت حال پیچیدہ تھی۔

چنانچہ برطانیہ میں لیبر حکومت کے برسراقتدار آتے ہی یہاں وائسرائے ویول نے یکم اگست 1945ء کو نئی دہلی میں اپنے گورنروں کا اجلاس منعقد کیا جو دو روز تک جاری رہا۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد کی صورت حال میں ایک نئی سیاسی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے امکان کا ازسرنو جائزہ لیا گیا۔ گورنر بمبئی کی رائے تھی کہ اگر جناح تعاون پر آمادہ نہیں ہیں تو مسلم لیگ کے بغیر ہی کانگرس اور دوسری پارٹیوں کے نمائندوں پر مشتمل سیاسی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دے دی جائے۔ لیکن وائسرائے اور باقی گورنروں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ ایک دوسری رائے یہ

تھی کہ کارکردگی کی بنیاد پر نئی کونسل بنا دی جائے مگر یہ رائے بھی سب کی منظوری حاصل نہ کرسکی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ موجودہ ایگزیکٹو کونسل کو ہی برقرار رہنے دیا جائے اور فیصلہ ہوا کہ مرکزی اسمبلی کے انتخابات 1945ء کے اواخر میں اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات 1946ء کے اوائل میں منعقد کروا دیئے جائیں۔ صرف گورنر پنجاب گلانسی نے ان انتخابات کی مخالفت کی کیونکہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پنجاب میں برسراقتدار انگریزوں کی پٹھو اور پاکستان کی مخالف یونینسٹ پارٹی بری طرح شکست کھا جائے گی اور مسلم لیگ فتح یاب ہو جائے گی۔ گلانسی کا کہنا تھا کہ اگر مسلم لیگ اپنے مطالبہ پاکستان سے باز نہ آئی تو پنجاب میں خانہ جنگی ہو جائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر بے ڈھنگی صورت کے پاکستان کی لغویت کا پردہ چاک نہ کیا گیا تو پنجاب کا عام مسلمان اسے مذہبی معاملہ سمجھ کر ووٹ دے گا۔ اسی بنا پر گلانسی نے انتخابات کو کم از کم ایک سال کے لیے ملتوی کرنے کی تجویز رکھی مگر یہ قبول نہ کی گئی۔ جناح اور مطالبہ پاکستان کے بارے میں دوسرے گورنروں نے بھی معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ گورنر بمبئی اور گورنر بہار نے کہا کہ مسئلہ پاکستان کا ڈٹ کر مقابلہ ہونا چاہیے۔ گورنر مدراس نے کہا کہ جناح کی دھونس میں نہیں آنا چاہیے۔ گورنر سی۔ پی نے کہا کہ اگر مرکزی اسمبلی کے انتخابات لیگ کے حق میں ہوئے تو اس سے گروہی اور فرقہ وارانہ جذبات کو شہ ملے گی اور صوبائی انتخابات مشکل ہو جائیں گے۔ بیشتر گورنروں کی رائے تھی کہ پاکستان کا سامنا کرنا چاہیے۔ اس کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ ایک یہ کہ ہندوستانی سیاست دانوں کی کانفرنس بلائی جائے۔ ایک یہ کہ حقائق معلوم کرنے کی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ ایک یہ کہ برطانوی اور امریکی ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے۔ ایک اور یہ کہ مکمل طور پر غیر ملکی ارکان کا کمیشن مقرر کر دیا جائے اور سب سے اہم یہ کہ انتخابات کے بعد ایک آئین ساز اسمبلی وضع کی جائے اور یہ کام اس کے سپرد کیا جائے۔ 14/جولائی 1945ء کے کرپس کے ایک بیان کا بھی حوالہ دیا گیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ 1942ء کی کرپس تجاویز کے مطابق انتخابات کروائے جائیں اور پھر ایک آئین ساز اسمبلی یا تو 1942ء کی تجاویز کے مطابق یا بڑی پارٹیوں کی مرضی سے طے پانے والے طریقے کے مطابق تشکیل دی جانی چاہیے جو پاکستان کے مسئلے کا حل نکالے۔ وائسرائے کا کہنا تھا کہ جناح یا اس کے نمائندے مذکورہ کمیٹیوں، کمیشنوں یا آئین ساز اسمبلی میں اس وقت تک حصہ

نہیں لیں گے جب تک حکومت برطانیہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے حق خودارادیت کو تسلیم کرنے کا اعلان نہیں کر دیا جاتا۔ اس بارے میں سب ہی گورنر متفق تھے کہ مسلم لیگ کو بطور فریق باہر رکھ کر کوئی سیاسی اقدام نہیں اٹھانا چاہیے۔ بلکہ گورنر سرحد نے تو یہ بھی کہا کہ اگر مسلم لیگ کو نظر انداز کیا گیا تو مسلمان زیادہ تعداد میں جناح کے گرد جمع ہو جائیں گے اور لیگ کو تقویت حاصل ہو جائے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر مسلم لیگیوں کو واقعی اپنا دشمن بنایا گیا تو وہ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی مسئلوں پر ہنگامہ آرائی شروع کر دیں گے۔ لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق تھا، تو اسے شبہ تھا کہ سرحد کے مسلمانوں میں پاکستان کی حمایت ہے کہ جس کا مفہوم بھی ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ گویا بیشتر گورنر اور وائسرائے مسلم لیگ کی سیاسی اہمیت تو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن اس کے مطالبہ پاکستان کو خام اور لغو قرار دیتے تھے۔ بیشتر گورنروں نے تجویز کیا کہ حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ پاکستان کے بارے میں واضح اعلان کرے جس سے یا تو اس پورے تصور ہی کا قلع قمع ہو جائے اور یا پھر یہ واضح ہو جائے کہ ہندوستان کی تقسیم محض مسلم ووٹوں کی بنیاد پر نہیں ہو سکتی۔ گورنر پنجاب گلانسی نے کہا کہ اگر جناح انتخابات جیت گئے تو مسلمان پاکستان پر راسخ ہو جائیں گے۔ جب کہ انہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اس کا کیا مطلب ہے تو وہ پاکستان کے مخالف ہو جائیں گے۔ گورنر بنگال کیسی نے اس کے ساتھ اتفاق کیا اور کہا کہ جناح نے بالآخر ختم ہونا ہے۔ اس کے بعد شاید کچھ کیا جا سکے۔ جناح کا کوئی حقیقی جانشین نہیں ہے۔ جناح کے بعد پاکستان کے تصور کی دھجیاں بکھر جائیں گی۔ اس لیے کرپس کی 14 ر جولائی والی تجویز مان لی جائے اور اس طرح دو تین سال بحث مباحثے میں گزار دیئے جائیں۔[20]

یاد رہے کہ چرچل کے وزیر جنگ جیمز گرگ کا یہ کہنا تھا کہ ''جب تک گاندھی زندہ ہے۔ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔''[21] خود چرچل بھی گاندھی کے مرنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔[22] جب کہ جولائی 1944ء میں ویول کی رائے یہ تھی کہ ''مجھے حیرت ہوگی کہ اس وقت تک کسی حل کا کوئی امکان پیدا ہو سکے گا کہ جب تک یہ تین کٹر، ضدی اور بے لچک بزرگ راستے سے نہیں ہٹ جاتے گاندھی جو 75 سال کا ہونے کو ہے، جناح جو 68 سال کا ہے اور چرچل جو 70 سال کو پہنچ رہا ہے۔[23] زوال پذیر برطانوی بورژوا اس قسم کی باتیں بھی سوچتا

تھا۔ اسے ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے ٹھوس مادی محرکات کے بجائے چند شخصیات اس کی ذمہ دار نظر آتی تھیں جن کے مرنے کے بعد وہ اپنی مرضی کا حل ٹھونسنے کی امید لگانے کی کوشش کرتا تھا۔ دراصل وہ جس قسم کا متحد، پرامن اور باجگزار ہندوستان چھوڑ کر جانا چاہتے تھے وہ بن نہیں پا رہا تھا اور ایسا نہ ہونے کے عوامل ان کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ یہ عوامل نہ تو چند شخصیات نے پیدا کئے تھے اور نہ ان کے مرنے سے ختم ہو سکتے تھے۔ ان عوامل کو تاریخ کے جدل نے پیدا کیا تھا اور اب جدلی اصول کے تحت ہی ان کا نتیجہ سامنے آنا تھا۔

5/اگست کو ویول نے نئے وزیر ہند پیتھک لارنس کے نام اپنے مراسلے میں اسے ہندوستان کی سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا اور گورنروں کی کانفرنس کے بعد اپنے تاثرات بیان کئے۔ اس نے لکھا ''تمام گورنر متفق ہیں کہ اپنی موجودہ بھونڈی صورت میں پاکستان قابل عمل نہیں ہوگا۔ جناح نے اپنے نظریات کو کبھی معین نہیں کیا۔ البتہ 1944ء کے موسم گرما میں گاندھی کے ساتھ اس کے مذاکرات کے دوران اس کا خیال معلوم ہوا تھا کہ پاکستان مسلم اکثریت کے صوبوں (یعنی شمال مغرب میں سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان اور شمال مشرق میں آسام اور بنگال) پر مشتمل ہوگا اور اس نے اصرار کیا تھا کہ ان صوبوں کے حق علیحدگی کا تعین صرف مسلم ووٹوں کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ صریح اسباب موجود ہیں کہ ان علاقوں کے لوگوں کو پاکستان بننے سے بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یہاں ابھی انہیں سیاسی طور پر غلبہ حاصل ہے۔ اگرچہ اقلیتوں کے مسائل ہیں لیکن وہ ان کے قابو میں ہیں۔ اگر پاکستان ایک حقیقت بن گیا جیسا کہ جناح دعویدار ہے کہ بننا چاہیے تو پنجاب میں اقلیتوں کے ایسے مسائل پیدا ہو جائیں گے جو قابو میں نہیں رہیں گے۔ سکھ جو پنجاب کے وسط میں ایک ٹھوس بلاک ہیں، ایک خودمختار مسلمان ریاست میں شامل ہونے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے اور پنجابی ہندو بھی اس پر معترض ہوں گے جو اگرچہ بکھرے ہوئے ہیں مگر مشرقی اضلاع میں اکثریت میں ہیں۔ بیشتر گورنروں کی رائے یہ ہے کہ جناح کے خیالات کے بھونڈے پن کو فاش کیا جائے۔ لیکن ایسا کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ بلاشبہ آئندہ انتخابات میں مسلم نشستوں پر زیادہ تر کامیابی لیگ کو حاصل ہوگی کیونکہ عام مسلمان ووٹر کے سامنے سوال یہ اٹھایا جائے گا کہ آیا وہ اسلام کو ہندومت پر ترجیح دیتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہندوستانی سیاست دانوں پر مشتمل کوئی کمیٹی یا غیر ملکیوں پر مشتمل

امپیریل کمیٹی یا ایک ملی جلی کمیٹی جس میں برطانوی اور بعض دوسرے غیر ملکی بھی شامل ہوں، کس طرح پاکستان کو مسمار کرنے میں کامیاب ہو گی۔''[24] اس کے بعد 6/اگست کو اپنے ایک اور مراسلے میں ویول نے پیتھک لارنس کو لکھا کہ ''اجلاس میں شدت کے ساتھ یہ احساس پایا گیا ہے کہ جناح کا رویہ مزاحمانہ ہے اور یہ کہ پاکستان کے خطرات اور نقصان کو سیاسی اور معاشی نقطۂ نگاہ سے فاش کرنا چاہیے۔ حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ صاف طور پر واضح کر دے کہ ہندوستان کو محض مسلم ووٹوں کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔'' اسی مراسلے میں آگے چل کر اس نے لکھا کہ اس موقع پر حکومت برطانیہ کی جانب سے کوئی نیا اعلان ہمارے لیے سودمند ہونے کے بجائے بحران کو گہرا کرنے کا سبب بنے گا۔[25] ویول چونکہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کا سامنا کر چکا تھا اس لیے وہ بہت محتاط ہو کر اگلی پالیسی وضع کرنا چاہتا تھا۔ جناح اپنی تقریروں میں مطالبہ کر رہے تھے کہ چونکہ یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے اور جاپان کے خلاف جنگ بھی انجام کو پہنچنے والی ہے۔ اس لیے عارضی اقدامات کے بجائے ہندوستان کے آئینی مسئلے کا مستقل تصفیہ ہونا چاہیے۔ جس میں پاکستان کا تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔

وزیر ہند پیتھک لارنس نے گورنروں کی کانفرنس کی کاروائی اور ویول کے مراسلات کی بنیاد پر 11/اگست کو ایک یادداشت برطانوی کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کو پیش کی کہ اس وقت جناح کے رویے کے پیش نظر (جو اگرچہ مزاحمانہ تھا) مسلم لیگ کا تعاون حاصل کئے بغیر ایک سیاسی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دینا ناشائستہ بات ہو گی۔ اگر ایسا کیا گیا تو شاید شدید قسم کی فرقہ وارانہ گڑبڑ کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کے انعقاد کے بارے میں گورنروں کی کانفرنس کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے اس نے گورنر پنجاب کی پریشانی کا ذکر کیا کہ اس سے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے مابین طاقت کا توازن بگڑ جائے گا اور یہ صوبے میں گڑبڑ کا باعث ہو گا۔ تاہم وزیر ہند نے وائسرائے کو انتخابات کے انعقاد کا اختیار دیئے جانے کی سفارش کی۔[26]

نئے وزیر ہند پیتھک لارنس کے بارے میں ویول کی رائے یہ تھی کہ وہ برصغیر کے بارے میں جامد اور فرسودہ خیالات کا حامل ہے جو زیادہ تر کانگرس کے ساتھ رابطوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔[27] چنانچہ لیبر پارٹی والوں کو جو کانگرس کو ہندوستان کی نمائندہ سمجھتے تھے اور اس

کے ساتھ ہندوستان کا تصفیہ کر کے بہ آسانی یہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ رکھتے تھے، اب انہیں ہندوستان کی برطانوی انتظامیہ کے ارکان سے پتہ چل رہا تھا کہ بات اتنی سیدھی نہیں ہے اور یہ کہ یہاں کے داخلی تضادات اور بالخصوص ہندو مسلم تضاد کو نظر انداز کر کے چلے جانا ہندوستان کو ایک خانہ جنگی کے منہ میں دھکیل کر جانے کے مترادف ہوگا۔ وہ اس تضاد کو متحدہ ہندوستان میں حل کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ مسلمان عوام الناس میں پاکستان کے مطالبے کی طرف بڑھتے ہوئے شدید رجحان کا بھی مشاہدہ کر رہے تھے۔ مگر وہ ان مسلم لیگی قائدین سے امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے جن کے بارے میں گمان تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں زیادہ مراعات اور تحفظات لینے کی خاطر پاکستان کا محض نعرہ بلند کر رہے تھے۔

9/اگست 1945ء کو گورنر سرحد کننگھم نے ویول کے نام اپنے مراسلے میں لکھا "شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد لوگوں نے مسئلہ پاکستان کے بارے میں زیادہ سوچنا اور ذکر کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے میرے اس تاثر کو تقویت پہنچتی ہے کہ زیادہ تر لوگ پاکستان کے بارے میں بقیہ ہندوستان سے علیحدگی کے انداز میں نہیں سوچتے۔ میرے سابق وزیر اعلیٰ اورنگ زیب خان جیسے پیشہ ور مسلم لیگی بھی میرے سامنے اپنا یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں بلکہ ان میں سے ایک نے تو یہاں تک کہا کہ اب مسلمان نوجوانوں کو معاملات اپنے ہاتھ میں لے لینے چاہئیں اور پاکستان کی ماہیت کے متعلق حقیقی سوچ کو واضح کرنا چاہیے کہ اس سے مراد مرکز میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ہے نہ کہ اس سے مکمل قطع تعلقی۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ آنے والے انتخابات زیادہ تر مسئلہ پاکستان کی بھونڈی ترین شکل کی بنیاد پر لڑے جائیں گے۔"[28] مسلم لیگی لیڈروں میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے نعرے کے بارے میں سنجیدگی اور ثابت قدمی پائی جاتی تھی یا نہیں حقیقت یہ تھی کہ مسلمان عوام الناس کے لیے اس نعرے میں بڑی کشش اور جاذبیت موجود تھی۔ انگریزوں کے لیے لیگی لیڈروں کے مؤقف کے بجائے مسلم عوام کا رویہ زیادہ پریشان کن تھا۔ ویول نے 12/اگست 1945ء کو پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں لکھا کہ "کمانڈر انچیف نے چند روز ہوئے مجھے بتایا ہے کہ مسلمانوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ انتخابات فوری منعقد کئے جائیں تو جناح تمام نشستیں جیت جائے گا البتہ اگر انہیں ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے تو پھر اسے نسبتاً کم کامیابی

حاصل ہو گی۔'' لیکن ویول نے اس سے مختلف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ''نہ صرف یہ کہ اب انتخابات ہوں تو جناح کو مکمل کامیابی ہو گی بلکہ اگر انہیں ایک سال کے لیے التواء میں ڈالا گیا تو جناح کو زیادہ کامیابی حاصل ہو گی کیونکہ اسے اپنی جماعت کی تنظیم کی بہتر طور پر استواری اور فنڈز کے جمع کرنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔'' مسلمانوں میں جناح اور مطالبہ پاکستان کی بے پناہ مقبولیت صرف انگریزوں کے لیے تشویش کا باعث نہیں تھی بلکہ کانگرس بھی پریشان تھی اس لیے بقول ویول اگرچہ دونوں جماعتیں آئندہ انتخابات میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے پر آمادہ تھیں۔لیکن کانگرس اس بارے میں اتنی پرجوش نہیں تھی۔[29]

ادھر برطانوی لیبر پارٹی کی حکومت جلد از جلد ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کر کے اس کے بوجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی اور برطانوی کابینہ میں اس بارے میں مشورے ہو رہے تھے اور سوچا جا رہا تھا کہ ویول کو لندن طلب کر کے جلد کوئی منصوبہ وضع کیا جائے۔ 17/اگست کو کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ اس وقت ہندوستان اس بات کا منتظر ہے کہ نئی کابینہ اس کے لیے کیا کرتی ہے اور یہ کہ ہندوستان میں اس وقت حیران کن حد تک قبولیت کا موڈ پایا جاتا ہے۔ اگر ہم صحیح سمت میں سرعت کے ساتھ کاروائی کریں تو اس وقت بڑا موقع ہے۔ کرپس نے مسلمانوں کے جذبات کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور کہا کہ اس کی اطلاع یہ ہے کہ مسلمانوں میں جناح کا ساتھ چھوڑنے کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور یہ کہ شملہ کانفرنس کے نتیجے میں ان کی طرف سے اس کی حمایت متزلزل ہو چکی ہے۔ کرپس نے کہا کہ ہمیں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہ صرف مسلم لیگ ہے نہ کہ ہندوستان کے تمام مسلمان جو شملہ کانفرنس میں زیر بحث تصفیے جیسے کسی بھی تصفیے کے خلاف ہے۔[30]

کرپس کی رائے کے برعکس ویول اور اس کے گورنر اپنے مراسلوں میں نئی حکومت کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے تھے کہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کیا جائے اور کوئی ایسا منصوبہ وضع نہ کیا جائے جو کسی ایک فریق کو تو مطمئن کر دے لیکن دوسرے فریق مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوں تاہم انہوں نے نئی حکومت کو اپنی اس پختہ رائے سے بھی آگاہ کر دیا کہ تقسیم ہند ایک ناقابل عمل منصوبہ ثابت ہو گا۔ نیز اگلے انتخابات میں پاکستان کے نعرے کے مضمرات پر اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا۔16/اگست کو گورنر پنجاب گلانسی نے ویول کو لکھا'' مجھے تسلیم ہے کہ میں

اس صورت حال سے بہت سخت پریشان ہوں کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ شدید خطرہ موجود ہے کہ انتخابات ایک بالکل فضول مسئلے پر لڑے جائیں گے۔ بے ڈھنگا پاکستان اگرچہ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لیے بالکل غیر منطقی، غیر واضح اور تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس بناء پر بطور سیاسی نعرہ اس کی قوت میں کمی نہیں آ سکتی۔ ایک بے علم مسلمان سے کہا جائے گا کہ وہ انتخاب میں جس سوال کا جواب دینے کے لیے آیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا وہ سچا مومن ہے یا کہ کافر اور غدار ہے؟ اس نعرے کے جواب میں یونینسٹوں کے پاس کوئی خاص نعرہ نہیں ہے...... جب سے میں دہلی سے واپس آیا ہوں میں نے عمومی صورت حال پر مختلف لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا ہے جن میں سرکاری وغیر سرکاری اور ہندوستانی و یورپی سب شامل ہیں۔ ان تمام کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اگر پاکستان حقیقت کا روپ اختیار کر گیا تو یہاں وسیع پیمانے پر خون خرابہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ غیر مسلم بالخصوص سکھ محض دھونس نہیں دے رہے ہیں، وہ پرامن طریقے سے کسی ایسی حکومت کی اطاعت قبول نہیں کریں گے جس پر ''محمڈن راج'' کا لیبل چسپاں ہو۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے پاکستان کی تھیوری کے غبارے سے ہوا نکالنے کے لیے کاروائی کرنا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگر کسی کانفرنس یا کمیشن کا اہتمام کرنا قابل عمل نہ ہو کہ جو بعد از جنگ منصوبہ بندی کے حوالے سے یہ جائزہ لے کہ ہمیں پورے ہندوستان کے لیے ایک مربوط مرکزی حکومت قائم کرنی چاہیے، تو پھر میں پوری طرح کلوو (گورنر آسام) کی اس تجویز سے متفق ہوں جو حال میں اس نے دہلی میں پیش کی تھی کہ ہائی اتھارٹی کی جانب سے یا اس کی منظوری سے تقسیم کے بارے میں ایک وضاحتی بیان جاری کر دیا جانا چاہیے۔ کرپس کی پیشکش میں ہر ''صوبہ'' کو ''انڈین یونین'' سے الگ تھلگ رہنے کا حق دیا گیا ہے۔ کیا یہاں لفظ ''صوبہ'' سے مراد ہو بہو وہ صوبہ لیا گیا ہے جیسا کہ آج کل موجود ہے۔؟ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ کسی موجودہ صوبے میں اگر ایک بڑے ملحقہ علاقے میں (جس کا سائز تقریباً ڈویژن کے برابر ہو) آبادا کثریت علیحدگی کے خلاف ہو تو یہاں کے باشندوں کو اپنی خواہشات کے خلاف انڈین یونین سے علیحدہ ہونا پڑے گا؟ اگر ایسا ہے تو پھر اس صوبے (پنجاب) کے لوگوں کو بڑی سنگینی کے ساتھ سوچنا ہوگا۔ کیونکہ پنجاب کے کل پانچ میں سے دو ملحق ڈویژن (انبالہ اور جالندھر) ایسے ہیں کہ جن کے ایک ضلع میں بھی مسلمان اکثریت میں

نہیں ہیں اور اس وسیع علاقے کے ساتھ ملحق امرتسر کا نہایت اہم ضلع بھی واقع ہے۔ اس عملی مثال کا حوالہ کافی مددگار ثابت ہوگا۔ اگر ان خطوط پر کاروائی کی جائے تو کم از کم یونینسٹ پارٹی کے پاس لوگوں کو پاکستان کے خلاف مجتمع کرنے کا نعرہ آجائے گا۔ اس مثال میں ایک ایسی بات موجود ہے جو ہر رائے دہندہ کو بری لگے گی۔ کوئی پنجابی خواہ وہ کتنا ہی بے علم کیوں نہ ہو وہ اس صوبے کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے پر کہ جس سے لفظ پنجاب ہی غائب ہو جائے، جسے گزشتہ دو ہزار سال سے احترام حاصل ہے، ضرور ٹھنڈے دل کے ساتھ سوچے گا۔ میں بے شک اس کے حق میں ہوں کہ مرکز میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی اور ہر ممکن تحفظات دیئے جانے چاہئیں۔ میری رائے میں جناح اور اس کے حامیوں کے ناپاک اور نافہم چوں چوں کے مربے کے مقابلے میں یہی منصوبہ ایک حقیقی پاکستان کے مترادف ہوگا۔"[31] چنانچہ انگریزوں نے پاکستان کو بھونڈہ، بے ڈھنگا اور ناقابل عمل ثابت کرنے اور "اس غبارے سے ہوا نکالنے" کی خاطر پنجاب کے مشرقی اضلاع کی غیر مسلم اکثریت بالخصوص سکھوں کی مخالفت کو بطور لیور استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو اپنے قومیتی حقوق کی الگ تحریک چلا رہے تھے۔

19/اگست کو ویول نے اپنے ایک مراسلے کے ذریعے وزیر ہند پیتھک لارنس کو گورنر پنجاب کے مذکورہ خدشات کے بارے میں آگاہ کیا اور لکھا کہ بنگال میں بھی ایسے ہی مسئلے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے مسئلہ پاکستان کا بہت محتاط جائزہ لینے کی ضرورت پر بھی زور دیا اور ہندوستان کے مسئلے کے مجموعی حل کے لیے کسی طویل المیعاد منصوبے کے اعلان سے پہلے مسئلہ پاکستان پر قطعی نتائج اخذ کرنے کو لازمی قرار دیا۔ 20/اگست کو گورنر بمبئی نے بھی ویول کو لکھا کہ "ہمیں جلد ہی پاکستان کا فیصلہ کن مقابلہ (Show down) کر لینا چاہیے اور اس کی چھان بین کے لیے کوئی ایسی باوقار کمیٹی یا ٹریبونل وضع کر دینا چاہیے جس کے سامنے جناح اپنا کیس پیش کرنے میں تامل سے کام نہ لے سکے۔" دراصل انگریز چاہتے تھے کہ کوئی ایسا متوازن حل ڈھونڈا جائے جو ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور اچھوتوں کو اس طرح مطمئن کرے کہ ان کے جانے پر یہ خطہ انتشار اور افراتفری کا شکار نہ ہو جائے اور ان کے یہاں سے جانے کے باوجود یہاں ان کے مفادات پر زد نہ پڑنے پائے۔ وہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے بجائے "متحد رکھو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر کاربند ہو کر ہی سمجھتے تھے کہ اس خطے کو اپنے

زیر اثر رکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان کی پوری کوشش تھی کہ کسی طرح یہ تمام متحارب فریق ایک متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کسی تصفیے پر پہنچ جائیں تو پھر وہ اقتدار کی منتقلی کا کام سرانجام دیں۔

نئی لیبر حکومت ہندوستان کے معاملہ کو سرعت کے ساتھ نمٹانا چاہتی تھی۔ 20 ر اگست کو اس کی کابینہ نے فیصلہ کیا کہ وزیر ہند پیتھک لارنس اور وائسرائے ویول فوری طور پر کوئی تبصرہ کئے بغیر فقط اتنا اعلان کر دیں کہ آئندہ موسم سرما میں صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوں گے۔ کابینہ نے ویول کو فوری طور پر لندن طلب کرنے کا بھی فیصلہ کیا تاکہ طویل المیعاد منصوبہ پر تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔ کابینہ نے بحث کے دوران اس امر پر زور دیا کہ موجودہ اسمبلیاں 1936ء کی منتخب شدہ ہیں اور اب غیر نمائندہ ہو چکی ہیں اس لیے اگر ان اسمبلیوں نے آئندہ آئین ساز اسمبلی کو منتخب کرنے کے لیے انتخابی کالج بننا ہے تو ان کی نمائندہ حیثیت بحال ہونی چاہیے اور یہ صرف انتخابات ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لیے پنجاب کو ان انتخابات سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا جیسا کہ وہاں کے گورنر کا مطالبہ ہے۔ یاد رہے کہ گورنر گلانسی کا مطالبہ یہ تھا کہ پنجاب میں انتخابات کو کم از کم ایک سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے کہ اس وقت رائے عامہ جو بہت زیادہ مسلم لیگ کے حق میں جا رہی ہے اسے اس عرصے میں پنجاب کی تقسیم اور اس کے مضمرات کا خوف دلا کر بدلا جا سکے۔ تاہم کابینہ کے فیصلے کی روشنی میں 21 ر اگست کو ویول نے نئی دہلی میں اور پیتھک لارنس نے برطانوی دارالعوام میں آئندہ موسم سرما میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے اعلان سنتے ہی ویول کو ایک احتجاجی تار اور پھر اگلے روز ایک احتجاجی مراسلہ ارسال کیا جس میں کہا گیا تھا کہ انتخابات کے لیے کانگرس کے حالات سازگار نہیں ہیں۔ کانگرس کے ارکان جیلوں میں بند ہیں۔ اس کے فنڈز اور املاک ضبط پڑی ہیں، حالت جنگ کے تحت شہری آزادیوں کو محدود کرنے والے قوانین بدستور لاگو ہیں۔ چنانچہ انتخابات کو منظم کرنے کے لیے کانگرس کو خاصی دیر تک معمول کے مطابق کام کرنے کا موقع فراہم کئے بغیر انتخابات کا انعقاد ایک صریح ناانصافی ہوگی۔[32] اصل بات یہ تھی کہ گلانسی کی طرح کانگرس کا بھی خیال تھا کہ اگر کچھ وقت مل جائے تو اس دوران تقسیم اور پاکستان کے

خلاف مہم چلا کر مسلمانوں میں جناح اور مسلم لیگ کی مقبولیت کا زور توڑنے کی کوشش کی جائے اور اس سے پہلے کہ انتخابات کے ذریعے اس مقبولیت کا کھل کر اظہار ہو حکومت برطانیہ سے اقتدار کی منتقلی پر کوئی سودے بازی کرنے کی کوشش کی جائے۔

ہندوستان کے برطانوی حکام بھی تقسیم کے بدستور مخالف تھے لیکن شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد سے وہ مسلمانوں کو ایک متحد ہندوستان میں تحفظات اور حق خودارادیت دینے کے بارے میں سنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ انتخابات کے اعلان کے بعد اب لندن میں ہندوستان کے مسئلہ کے مستقل حل کے بارے میں کوئی فیصلہ طے پانا تھا۔ لندن والوں کا خیال تھا کہ 1942ء کی کرپس تجاویز میں تھوڑا بہت ردو بدل کر کے ایک لائحہ عمل وضع کر دینا چاہیے اور اس کا اعلان بھی کر دینا چاہیے۔ ادھر ویول قریباً ہر روز اپنے مراسلوں میں لندن والوں کو لکھ رہا تھا کہ جلدی میں 1942ء کے مسوّدۂ اعلان میں ترمیم یا بغیر ترمیم کوئی اعلان نہ کریں، جناح اور مسلم لیگ تعاون سے انکار کر دیں گے اور مطالبے لے کر نکل آئیں گے۔ اگر کوئی ترمیم کر کے جناح کو مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی تو ہندو اور سکھ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے اور وہ مخالفت میں نکل آئیں گے اس لیے کوئی گھڑا گھڑایا اعلان کسی بھی طویل المیعاد منصوبے کی کامیابی کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ویول لندن جانے سے پہلے لندن والوں کو بار بار اپنے مراسلوں میں قیام پاکستان کے نتیجے میں پنجاب کی تقسیم اور اس کے خوفناک نتائج پر اپنی اور گلانسی کی تشویش سے آگاہ کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ جناح پورا صوبہ پنجاب لینا چاہیں گے۔ جب کہ مشرقی اضلاع کے ہندو اور سکھ اس پر آمادہ نہیں ہوں گے اور فساد برپا کریں گے۔ 20/اگست کو پیتھک لارنس کے نام اپنے مراسلے میں اس نے لکھا کہ ''گلانسی کی رائے ہے کہ اگر پنجابیوں کے سامنے دو متبادل رکھے جائیں، ایک یہ کہ انڈین یونین میں مسلمانوں کو حقیقی تحفظات حاصل ہوں گے اور دوسرے یہ کہ اگر پاکستان وجود میں آئے اور صوبہ تقسیم ہونے لگے تو وہ اول الذکر کا انتخاب کریں گے۔''

21/اگست کو ویول نے پاکستان اور تقسیم پنجاب کے مسئلہ پر اپنی جانب سے ایک مفصل خط اور ایک تفصیلی یادداشت پیتھک لارنس کو ارسال کی۔ اس کے ہمراہ گلانسی کے 16/اگست کے اپنے نام آئے ہوئے مراسلے کے پنجاب سے متعلقہ اقتباسات بھی منسلک کر

دیئے۔ ویول نے اپنے خط میں لکھا کہ پنجاب پاکستان کے مشکل ترین صوبوں میں سے ہوگا۔ اگر چہ بنگال بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوگا لیکن پنجابی بنگالیوں کے مقابلے میں زیادہ سخت گیر واقع ہوئے ہیں اور سکھ، جو پنجاب پر ہمارے قبضہ سے پیشتر یہاں حکمران تھے، اپنی ارضِ مقدس کو مسلمانوں کی مستقل حکومت کے ماتحت دے دینے کے بجائے اس پر لڑ مریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کا تصور مسلم اقلیت کے صوبوں میں پاکستانی صوبوں کی نسبت زیادہ جاگزین ہے۔ بظاہر یہ بات حیران کن سی لگتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب میں مسلمان پہلے ہی بالا دست حیثیت کے حامل ہیں اور اگر تھوڑی بہت خندہ پیشانی کا مظاہرہ کریں تو اقلیتوں کو مطمئن کر کے رکھ سکتے ہیں۔ پاکستان بننے سے ان کو کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ ان کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ اقلیتوں کا پیدا ہو جائے گا جو شاید قابو سے باہر ہو جائے۔ بنگال میں اگر چہ مسلمان تعداد میں زیادہ ہیں لیکن دولت اور تعلیم میں ہندوؤں کے مقابلے میں کم تر ہیں مگر وہ بھی پاکستان بننے سے غالباً فائدہ کے بجائے نقصان زیادہ اٹھائیں گے۔ آسام ویسے ہی مسلم اکثریت کا صوبہ نہیں ہے اس کا پاکستان میں شامل ہونا ویسے ہی مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ جب سے میں نے وائسرائے کا چارج سنبھالا ہے یہ بالکل واضح ہو گیا ہے کہ پاکستان کا مسئلہ مسلمان اور دوسرے فرقوں کے مابین ناقابل مصالحت ہو چکا ہے۔ شملہ کی تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے مسئلہ سے درگزر کر کے فریقین کو مرکزی حکومت میں اس امید پر مجتمع کر دیا جائے کہ باہم تجربے سے ان میں حقیقت پسندانہ رویہ پیدا ہو جائے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہم اس مسئلے سے درگزر سے کام نہیں لے سکتے لیکن اس سے ایسے آرام سے بھی نہیں نمٹا جا سکتا کہ جیسے یہ کسی قطعی طویل المیعاد منصوبے کا کوئی ضمنی حصہ ہو، کیونکہ یہ فرقے کسی منصوبہ کو اس وقت تک زیر بحث ہی نہیں لائیں گے جب تک انہیں پہلے پاکستان کے بارے میں اطمینان نہیں دلا دیا جاتا اور اس وقت جذبات کی جو کیفیت ہے اس میں ہمارے لیے ان کو اطمینان دلانا قطعی ناممکن ہے۔ میرا خیال ہے کہ گورنر کی اس رائے کے بارے میں بہت کچھ کہا جانا چاہیے کہ جناح کے نظریات کے بھونڈے پن کا پردہ چاک کیا جائے اور پھر اس کے بعد پاکستان کے امکانات کے بارے میں انکوائری کا اہتمام آئندہ کسی بھی آئینی تبادلۂ خیال کے اہم ابتدائیہ کے طور پر کیا جانا چاہیے۔ میری ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اس قسم کی

انکوائری سے اجتناب کیا جائے کیونکہ میرا خیال ہے کہ جناح اس کا بائیکاٹ کرے گا اور اس سے فرقہ وارانہ جذبات مزید بھڑک اٹھیں گے۔لیکن مجھے یقین ہے کہ جب تک میدان کو اس سے صاف نہیں کر لیا جاتا اور اس کی جگہ منطقی اور معقول دلائل کی بنیاد پر متبادل تجاویز نہیں رکھ دی جاتیں،ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' ویول نے اس مراسلے کے ہمراہ بھیجی جانے والی تفصیلی یادداشت میں بتایا کہ جناح کے منصوبۂ پاکستان میں پورے صوبہ پنجاب کو شامل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے 1940ء کی قرارداد لاہور اور 1944ء میں گاندھی جناح خط و کتابت کے حوالے دیئے۔ ویول نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ مذکورہ قرار داد میں'' تھوڑے بہت علاقائی ردوبدل'' کے مطابق شاید انبالہ ڈویژن کو جزوی یا کلی طور پر چھوڑ دیا جائے۔مسئلے کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بتایا کہ'' پنجاب کی کل آبادی دو کروڑ چوراسی لاکھ ہے جس میں ایک کروڑ باسٹھ لاکھ مسلمان ہیں اور باقی ایک کروڑ بائیس لاکھ غیر مسلم ہیں۔محض ان اعدادوشمار کی بنیاد پر جناح کے منصوبے کو تسلیم کر لینا ممکن نہیں ہے۔کیونکہ یہ ناانصافی ہوگی کہ ایک کروڑ باسٹھ لاکھ لوگوں کو مستقلاً دوسرے ایک کروڑ بائیس لاکھ افراد کا مستقبل طے کرنے کا حق دے دیا جائے۔ پھر اس نے پنجاب کے پانچوں ڈویژنوں کی آبادی کی فرقہ وارانہ ترکیب کی بنیاد پر تین علاقے بنائے۔

''1۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ جس میں ملتان اور راولپنڈی ڈویژن شامل تھے۔ان دونوں ڈویژنوں کی کل آبادی ایک کروڑ دس لاکھ تھی۔جس میں نوے لاکھ مسلمان اور صرف بیس لاکھ غیر مسلم تھے۔

''2۔ ملا جلا علاقہ جس میں لاہور ڈویژن کو شامل کیا گیا تھا۔اس کی کل 72 لاکھ کی آبادی میں بیالیس لاکھ مسلم اور تیس لاکھ غیر مسلم تھے۔ جب کہ ضلع امرتسر میں مسلمان اکثریت میں نہیں تھے۔اس کے بقول لاہور اور گورداسپور کے اضلاع میں زیادہ تر اراضی کے مالک سکھ تھے اور وہ یہاں سیاسی اور معاشی لحاظ سے اپنی تعداد کے برعکس زیادہ بااثر حیثیت کے حامل تھے۔

''3۔ غیر مسلموں کی غالب اکثریت کا علاقہ جو جالندھر اور انبالہ ڈویژن پر مشتمل تھا ان دونوں ڈویژنوں کی کل آبادی ایک کروڑ دو لاکھ تھی جس میں مسلمان بتیس لاکھ تھے۔

اس فرقہ وارانہ علاقائی تقسیم کا نقشہ کھینچنے کے بعد ویول نے لکھا ''اس تجزیے سے صاف ظاہر ہے کہ مسلم استصواب کا جناح کا منصوبہ نہ صرف کثیر تعداد غیر مسلموں کے لئے بلکہ غیر مسلم علاقے کے لئے سخت ناانصافی کا موجب ہوگا نہ ہی، علاقائی ردوبدل'' قابل عمل معلوم ہوتا ہے۔ انبالہ ڈویژن کو بقیہ پنجاب سے جدا کرنا بھی کوئی حل نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے سارا جالندھر ڈویژن اور سکھوں کی ''مقدس سرزمین'' پاکستان میں رہ جاتی ہے جو زیادہ تر جالندھر اور لاہور ڈویژن کے بیشتر اضلاع پر مشتمل ہے۔ ملتان اور راولپنڈی ڈویژن کی پنجاب سے علیحدگی سے بھی مسلمانوں کے لیے کوئی تسلی بخش یونٹ تشکیل نہیں پا سکتا اور نہ ہی یہ مسلمانوں کو پسند آئے گا۔ آخر کار لاہور ڈویژن کے درمیان سے گزرتی ہوئی باؤنڈری کھینچ کر تقسیم کی جائے تو اس سے بھی دونوں یونٹوں کے اندر اقلیتوں کے لاتعداد مسائل جنم لے لیں گے۔ پنجابی بولنے والوں کا ہم آہنگ علاقہ عین درمیان سے کاٹ ڈالا جائے گا...... لاہور اور امرتسر کے شہروں کا درمیانی فاصلہ صرف پچیس میل کا ہے۔ دو خود مختار ریاستوں کی باؤنڈری ان دونوں کے درمیان سے گزارنا ایک بے ڈھب بلکہ ناممکن سی بات ہوگی۔ اس لیے میں پوری طرح واضح ہوں کہ پنجاب کو مسلم استصواب کی بنیاد پر نہ تو اپنی موجودہ شکل میں اور نہ ہی ''علاقائی ردوبدل'' کے بعد پاکستان میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ جناح کے منصوبے کا پنجاب پر اطلاق ناانصافی ہوگا۔ اس منصوبے کو قبول کر لینے سے خانہ جنگی کے سے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ اگر حکومت برطانیہ جناح کے منصوبے کو رد کر دیتی ہے جو میرا خیال ہے کہ رد کر دینا چاہیے تو پھر سنجیدگی کے ساتھ دیکھنا ہوگا کہ اس کی جگہ ہم کیا پیش کریں گے اور اس کا کس طرح اعلان کریں گے۔ ہندوستان میں مجموعی طور پر مسلمان اپنی تعداد اور اثر و رسوخ میں اس قدر ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ہندوستان کے مسئلے کے تصفیے میں ان کے معاملے نمٹانا بے حد ضروری ہوگا۔'' آگے چل کر ویول نے مزید لکھا کہ ''مسلمانوں میں ایک چھوٹا مگر بااثر گروہ موجود ہے جو سیاسی حقیقتوں کو سمجھتا ہے اور واقعی کسی بڑی تبدیلی کا خواہاں نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ کھل کر اس کا اظہار کرنے کی جرأت نہیں رکھتے کیونکہ پاکستان کے بارے میں بے ہدایت مسلمانوں کے جذبات بہت شدید ہیں اور باقی علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی آئندہ انتخابات میں جناح کو بلا شبہ تمام مسلمان نشستوں پر کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے فوری طور پر جو صورت حال پیدا ہوگی

اس میں جناح پنجاب کے لیے اپنے فضول مطالبے پر اصرار کرے گا اور اگر اسے رد کر دیا گیا تو حکومت برطانیہ پر الزام عائد کیا جائے گا کہ اس نے مسلمان رائے دہندگان کی جانب سے دیئے گئے واضح مینڈیٹ (Mandate) کو نظر انداز کر دیا ہے۔ طویل تناظر میں دیکھا جائے تو تعلیم یافتہ مسلم رائے عامہ رفتہ رفتہ بھونڈی صورت کے پاکستان کو ناقابل عمل سمجھنے لگے گی۔ حکومت برطانیہ یقیناً اس مشکل صورت حال سے دوچار ہے کہ اس کے پاس اس کے مدمقابل کوئی ایسی تجویز موجود نہیں ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو مطمئن کر دے البتہ اس کے دو امکانات پیش نظر ہیں۔

''1۔ ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق جس میں تمام صوبے اور بعد ازاں تمام ریاستیں شمولیت اختیار کریں اور جس میں مرکزی اختیارات کو محدود کر کے کم سے کم کر دیا جائے۔ نیز مرکزی ایگزیکٹو میں مسلمانوں کو دوسرے فرقوں کے مساوی حیثیت دی جائے۔ یا

''2۔ ایک مضبوط قسم کا وفاق ہو جس میں صوبوں اور ریاستوں کو شامل ہونے یا الگ رہنے کا حق دیا گیا ہو بلکہ شمولیت کے بعد بھی اگر چاہے تو علیحدگی کا اختیار حاصل ہو۔''

''مجھے شبہ ہے کہ آیا پہلی صورت جناح کے نقطۂ نگاہ سے قابل قبول ہوگی۔ بیشتر ہندو بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف یہ (یا ایسی کوئی صورت) ہی پنجاب کا حل ہے۔ جناح دوسری صورت کی بھی مخالفت کرے گا''۔ آگے چل کر یادداشت کے آخر میں ویول نے لکھا ''ہم اس وقت ایسی صورت حال سے دوچار ہو گئے ہیں جس سے بچنے کے لیے شملہ تجاویز رکھی گئی تھیں۔ اب اگر ہم نے آگے بڑھنا ہے تو ہمیں جلد از جلد فقط مسئلہ پاکستان پر حملہ کرنا چاہیے۔ اس کی پیچیدگی ثابت کرنے کے لیے پنجاب ایک اچھی مثال ہے۔ اگر حکومت برطانیہ کے پیش نظر ایک طویل المیعاد منصوبہ ہے تو میری تجویز ہے کہ ہمیں کوئی متبادل تجاویز پیش کرنے سے پہلے پاکستان کے قابل عمل ہونے پر غالباً ایک پارلیمانی کمیٹی کے ذریعے مفصل انکوائری کروا لینی چاہیے۔ اس طریقے سے وقت مل جائے گا جو عقلِ سلیم کے حق میں جائے گا اور اگر بیچ میں کوئی ایسا وقفہ آ گیا جس میں مسلم لیگ موجودہ آئین کے تحت پنجاب میں برسر اقتدار رہی تو میرا خیال ہے یہ تجربہ بھی سودمند ثابت ہو سکے گا۔''[33] ویول کے خط اور یادداشت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی برطانوی انتظامیہ نے مسلمانوں کے مطالبہ

پاکستان کو رد کرنے کی خاطر پنجاب کی فرقہ وارانہ ''پیچیدگی'' کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اسی طرح 23/اگست کو آسام کے گورنر اے۔ کلو نے وائسرائے کے نام پاکستان کے بارے میں اپنی ایک رپورٹ میں مشرقی علاقے میں اس سکیم کے ناقابل عمل ہونے کے ثبوت فراہم کئے۔ اس کے مطابق آسام میں وادی سُرما کے علاوہ تمام صوبہ غیر مسلم اکثریت کا تھا اس لیے اس کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے تقسیم کرنا ناگزیر تھا۔ بنگال کے بارے میں اس نے کہا کہ یہاں کے مالدار ہندو ہمیشہ ہی غریب اور پس ماندہ مسلمانوں کے ووٹ اور وفاداریاں خرید کر یہاں غلبہ حاصل کئے رہیں گے جس سے پاکستان سکیم کا مقصد ویسے ہی فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ بنگال کو بھی تقسیم کرنا پڑے گا جس سے بے شمار مسائل جنم لیں گے۔ مسلمانوں کو بنگال کے خوشحال ترین حصے سے کہ جس کی معیشت پر ان کی بقا کا انحصار ہے دستبردار ہو کر اس کے پس ماندہ علاقے میں محدود ہونا پڑے گا۔ اس طرح کی پیچیدگیاں گنوا کر اس نے تجویز کیا کہ حکومت برطانیہ کو واضح اعلان کر دینا چاہیے کہ وہ ہندوستان کے کسی علاقے کی علیحدگی کے معاملے میں فریق نہیں بنے گی۔ اس سے ہندوستان میں بالعموم اور مسلم لیگ کو بالخصوص حقیقت حال کا احساس پیدا ہوگا۔ مسلم لیگ اپنے تمام تر پراپیگنڈے اور مذہبی جوش و خروش کے لیے کشش رکھنے کے باوجود جلد ہی پاکستان کے ناقابل عمل ہونے کا احساس کر لے گی اور مرکز میں مراعات پر سمجھوتہ کر لے گی۔[34] اس طرح انگریزوں کو یہ پورا یقین تھا کہ پاکستان سکیم کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر مسئلہ پاکستان پر کھلی انکوائری اور بحث مباحثے میں جناح مات کھا جائیں گے اور پاکستان کا مطالبہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔

ویول کا دورۂ لندن اور برصغیر کے مستقبل کے بارے میں برطانوی کابینہ کا موٴقف

24/اگست کو ویول نئی دہلی سے لندن کے لیے روانہ ہوا۔ 27/اگست کو وزیر ہند پیتھک لارنس نے ویول کے ساتھ اپنی پہلی بات چیت میں اس کو ان اسباب سے آگاہ کیا جن کی وجہ سے لیبر حکومت ہندوستان کے بارے میں جلد کارروائی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا ''ایک تو یہ کہ لیبر پارٹی کے رہنما ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے بارے میں صریح اعلانات کر

چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور تیسرے یہ کہ آئندہ ماہ کے اوائل میں برطانیہ امریکہ اور سوویت یونین کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ جس میں بیون نے ہندوستان کے بارے میں کوئی کارگزاری پیش کرنی ہے اور یہ بھی دکھانا ہے کہ کانگرس اب صلح جوئی پر مائل نظر آتی ہے۔'' جواب میں ویول نے کہا کہ جلد تصفیہ کرانے کے بارے میں حکومت کے دلائل یوں تو سمجھ میں آتے ہیں لیکن ان کے لیے کسی ایسی کاروائی کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ جو ہندوستان کو انتشار اور افراتفری کی نذر کر دے۔ سیاسی مسئلہ کے علاوہ ہماری اور ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان میں وہ اقلیتیں بھی ہیں جو مسلمانوں کے علاوہ ہیں وہ مزدور بھی ہیں جو کارخانہ داروں کے مقابلے پر ہیں اور وہ کسان بھی ہیں جو زمینداروں کے مقابلے پر ہیں اور پھر بعد از جنگ مسائل بھی درپیش ہیں۔ ہم چند سیاسی رہنماؤں کو خوش کرنے کی خاطر ان مسائل کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' ویول کے اس خدشہ کا مطلب یہ تھا کہ کہیں جلدی میں اٹھایا ہوا کوئی قدم ہندوستان میں فرقہ وارانہ تضاد کے علاوہ طبقاتی تضاد کو بھی شدید نہ کر دے کہ جس سے انتشار اور افراتفری پھیل جائے اور کمیونسٹ اس سے فائدہ نہ اٹھالے جائیں۔ ویول نے مزید کہا کہ'' کانگرس کے اغراض و مقاصد میں اگرچہ کوئی بنیادی تبدیلی تو رونما نہیں ہوئی لیکن اس نے اب نسبتاً حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا ہے کیونکہ وہ دوبارہ اقتدار میں آنا چاہتی ہے۔ کوئی قدم آگے بڑھانے سے پیشتر ہمیں مسئلہ پاکستان کا سامنا کرنا ہی ہوگا اور اس کے حقیقی مضمرات کو منظر عام پر لانا ہو گا۔ اس سارے سلسلے میں وقت یقیناً زیادہ لگے گا جو ممکن ہے پانچ یا چھ سال پر محیط ہو۔'' ویول نے متنبہ کیا کہ ''اگر کرپس تجاویز کو لاگو کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے خاص طور پر پنجاب میں۔'' اس نے جناح کے رویے اور اُن کے مطالبہ پاکستان پر بھی یہی بات کی اور ان مشکلات اور مسائل سے آگاہ کیا جن کا پنجاب کو اس سکیم میں شامل کرنے سے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ویول اور پیتھک لارنس کے مابین کئی گھنٹے تک تبادلۂ خیال ہوتا رہا جس میں ویول یہی زور دیتا رہا کہ مستقل آئینی حل کے بارے میں کسی قطعی منصوبے کا فوری اعلان کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ پیتھک لارنس نے اس کو یہ تاثر دیا کہ میں خود تو جلدی میں نہیں ہوں، کابینہ اور پارٹی (لیبر) کی جانب سے مجھ پر بڑا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔''[35] اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی برطانوی حکومت ہندوستان کے داخلی جھگڑوں میں الجھے بغیر جلد از جلد یہاں

سے کوچ کرنا چاہتی تھی جب کہ یہاں متعین حکام کی رائے یہ تھی کہ اس طرح یہ علاقہ فرقہ وارانہ اور طبقاتی تضادات کے نتیجے میں انتشار کا شکار ہو جائے گا اور یہاں برطانوی مفادات کو، جو وہ یہاں سے جانے کے بعد بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے، بری طرح خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لیکن ادھر حقیقت یہ تھی کہ برطانوی حکومت کو ایک اور مشکل کا بھی سامنا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ دنیا میں طاقت کا پرانا توازن تباہ ہو گیا تھا۔ سوویت یونین ایک عظیم قوت کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ امریکہ ایٹم بم اور مال و دولت کے زور پر سوویت یونین کے مدمقابل قوت کے طور پر سامنے آ گیا ہوا تھا۔ دنیا میں حلقہ ہائے اثر کی ازسرنو تقسیم ہونا ناگزیر تھی اور اس مسئلے پر بڑی طاقتوں کے مابین کشمکش یالٹا اور پوٹسڈم میں کھل کر سامنے آ چکی ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں اب 11 ستمبر کو لندن میں بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اس میں برطانیہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہندوستان سے دستبردار ہو چکا ہے اس لیے اب وہ ایران اور مشرق وسطٰی کو اپنے زیر تسلط رکھنے میں حق بجانب ہے۔ دیوالیہ شدہ برطانوی سامراج کے لیے ہندوستان کی اتنی بڑی نو آبادی کا انتظام سنبھالے رکھنا گھاٹے کا سودا تھا جب کہ ایران اور مشرق وسطٰی کے تیل کے کاروبار اور نہر سویز کی ٹھیکیداری سے اس کی زبوں حال معیشت کو سہارا مل سکتا تھا۔ چنانچہ اس بنیاد پر کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی نو آبادی ہندوستان کا مالک ہے اس لیے ایران اور مشرق وسطٰی کو دوسری طاقتوں کے لیے چھوڑ دے، وہ دوسری طاقتوں کی اس دلیل کے فریب میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ امریکہ ایران اور مشرق وسطٰی پر اپنے دانت تیز کر رہا تھا اور جلد از جلد یہاں برطانیہ کی جگہ لینا چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ کی حیثیت ایک بڈھے شیر کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ سوویت یونین بھی بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کے ساحلوں پر اڈوں کا مطالبہ کر رہا تھا جن میں ٹریپولی، تانیا اور ایتھوپیا وغیرہ شامل تھے۔ ادھر ایران کا صوبہ آذربائیجان بھی سوویت یونین کے حامیوں کے قبضے میں چلا گیا ہوا تھا۔ ان حالات میں برطانیہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو اپنی سلطنت کے نقشے سے خارج ظاہر کر کے تیل اور سویز کے علاقے میں اپنے مفادات پر اڑ جائے کہ اب اسی پر گزراوقات ہے اس کو بھی لیے جاتے ہو!

یہ تھی وہ وجہ جس کی بنا پر برطانوی حکومت لندن میں عنقریب منعقد ہونے والی بڑی طاقتوں کی وزرائے خارجہ کانفرنس سے پہلے یا دوران ہندوستان سے اپنی دستبرداری کا ایک

واضح منصوبہ پیش کر دینا چاہتی تھی اور یہ بھی کہ کانگرس اب صلح پر مائل نظر آتی ہے کیونکہ امریکہ اور سوویت یونین میں کانگرس ہی کو ہندوستان کی واحد نمائندہ تنظیم سمجھا جاتا تھا۔ اس بنا پر وزیر خارجہ بیون بڑی طاقتوں کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اب ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی واقعی حقیقت کا روپ دھارنے والی ہے۔ لیکن ویول اپنے گورنروں سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد لندن پہنچا تو اس کی رائے مختلف تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر صرف کانگرس کو پیش نظر رکھ کر کسی منصوبہ کا اعلان کر دیا گیا تو ملک افراتفری اور انتشار کا شکار ہو جائے گا اور اگر صرف مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو پیش نظر رکھ کر تقسیم ہند کا اعلان کر دیا گیا تو بھی ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ جائے گا جو بہت نقصان دہ ثابت ہوگی۔ اس لیے مستقل حل کے بارے میں جلد بازی میں کوئی اعلان نہ کیا جائے۔ البتہ ایسے اقدامات ضرور کئے جائیں جو مستقل حل کے لیے راہ ہموار کریں۔ پاکستان کے منصوبے پر کھلے عام تنقید کی جائے اور اسے ناقابل عمل اور فضول ثابت کر کے اس کے پرخچے اڑا دیئے جائیں۔ پھر مرکز میں مسلمانوں کو کچھ تحفظات دے کر متحدہ ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس کے لیے وہ پانچ چھ برس کا عرصہ تجویز کرتا تھا۔ لیکن حکومت برطانیہ کے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا۔

28 راگست کی صبح کو ویول اور پیتھک لارنس کی ملاقات ہوئی تو ویول کا خیال تھا کہ گزشتہ روز سیاسی صورت حال پر بات چیت ہو چکی ہے اس لیے آج مختلف انتظامی امور اور گورنروں وغیرہ کے متعلق بات ہوگی۔ لیکن پیتھک لارنس نے ملتے ہی اس سے کہا کہ آج شام تک ہندوستان کے متعلق اعلان کا مسودہ تیار کرنا ہے تا کہ کل کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی میں اس پر بحث ہو سکے۔ ویول لکھتا ہے کہ ''یہ سب اتنی تیزی کے ساتھ سامنے آیا کہ میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ تاہم شام تک مسودہ تیار کیا گیا اور 29 راگست کو کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کے اجلاس میں پیش کر دیا گیا جس کی صدارت وزیر اعظم ایٹلی نے کی۔ ویول نے کمیٹی کو ہندوستان کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی پر گاندھی نے کہا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین کبھی تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ انگریزوں کو خود ہی کسی ایک کے حق میں فیصلہ کر کے اسے قوت کے زور پر لاگو کرنا ہوگا خواہ اس میں کئی سال لگ جائیں۔ تاہم اس نے بتایا کہ کانفرنس کی ناکامی کا عام اثر یہ ہوا ہے کہ فرقہ وارانہ جذبات میں شدت پیدا ہوگئی ہے۔

یہ غیر یقینی نظر آتا ہے کہ جناح کسی بھی ایسے مذاکرات میں شامل ہوں گے جس میں پاکستان کا اصول تسلیم کرنے کی گارنٹی نہ دی گئی ہو۔ جناح ہندوستان کی ننانوے فیصد مسلمان آبادی میں پائے جانے والے ہندو غلبہ کے خوف کی ترجمانی کرتے ہیں۔ گورنروں اور دوسرے اہل الرائے لوگوں کا اندازہ ہے کہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کو اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کا موقع ملے گا اور وہ کانگرس سے بھاری تعداد میں نشستیں جیت لے گی۔ ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ جناح کی اصل قوت ہندوستانی مسلمانوں میں حقیقی طور پر موجود یہ عام خوف ہے کہ ہندو غلبہ کر کے ہندو راج قائم کر لیں گے۔ یہ خوف ممکن ہے بے بنیاد ہو ممکن ہے بے بنیاد نہ ہو، لیکن اس کے وجود اور حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کانگرس نے 39-1937ء میں اپنے غیر دانش مندانہ رویے کی وجہ سے مسلم لیگ کو مستحکم ہونے اور اسے پاکستان کا تصور استوار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کی جڑ میں یہی نفسیاتی مسئلہ تھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ویول نے مزید کہا کہ 1942ء کی کرپس تجاویز کو اب اختیار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کے بعد سے ہندوستان کے فریقین کے مابین زیادہ شدت آ گئی ہوئی ہے۔ اگر ان تجاویز کے مطابق آئین ساز اسمبلی تشکیل دی گئی تو ممکن ہے ایک فرقہ یا ممکن ہے دونوں ہی فرقے اس کا بائیکاٹ کر دیں۔ اس پر کرپس نے جو انڈیا و برما کمیٹی کا رکن تھا، سخت حیرت کا اظہار کیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے ویول کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہندو اہل الرائے کی جانب سے جن میں شیوراؤ، درگا داس، مسٹر این۔ آر۔ سرکار اور مسٹر برلا شامل ہیں، میرے پاس ایسے شواہد موجود ہیں جن کے مطابق ہندو اس آئین ساز اسمبلی میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے اور اس کی تشکیل کا خیر مقدم کریں گے۔ جواب میں ویول نے کہا کہ اگر مسلمان فرقے نے خود کو اس آئین ساز اسمبلی سے بالکل الگ تھلگ کر لیا تو بھی مشکل بن جائے گی۔ ویول نے کہا کہ اس معاملہ میں آگے بڑھنے سے پہلے مسئلے کی اصل جڑ یعنی پاکستان کا پردہ چاک کیا جانا چاہیے۔ آج تک اس کا کھلے عام معروضی تجزیہ نہیں کیا گیا۔ یہ معروضی تجزیئے کے سامنے ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ اگر کھل کر یہ ثابت کر دیا جائے کہ پاکستان ایک بالکل ناقابل عمل سکیم ہے تو مسلم رائے عامہ میں اس کے لیے موجود جوش و خروش ماند پڑ جائے گا۔ اس کو ناقابل عمل ثابت کرنے کے لیے اس نے کئی مثالیں دیں اور پنجاب پر اس کے ہولناک اثرات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ویول

نے تجویز رکھی کہ ہندوستان کے مستقل حل کے بارے میں کوئی اعلان کرنے سے پہلے پاکستان پر انکوائری کے لیے یک رکنی یا سہ رکنی برطانوی کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا جانا چاہیے۔ پیتھک لارنس نے اس سے دریافت کیا کہ آیا یہ کمیشن انتخابات سے پہلے ہی مقرر کر دینا چاہیے تو اس پر ویول نے زور نہیں دیا۔ اس کے بعد اس اعلان کے مسودے پر غور ہوا جو ویول نے واپس ہندوستان جا کر کرنا تھا اور جسے ایک روز قبل اس نے تیار کیا تھا۔ اس پر کافی لے دے ہوئی اور اتفاق رائے نہ ہو سکا البتہ چند رہنما خطوط تیار کر لیے گئے جن پر اس اعلان کو استوار کیا جانا تھا۔ ان میں کہا گیا کہ اس اعلان سے کسی بھی بڑی پارٹی کے ساتھ ٹکراؤ پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اس اعلان سے یہ ظاہر ہو جانا چاہیے کہ حکومت برطانیہ ایک میثاق کی تیاری میں مصروف ہے اور اپنی نیت میں واقعی پرخلوص ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ جلد بازی کی صورت میں سنگین فرقہ وارانہ فسادات کے پھوٹ پڑنے کا خطرہ واقعی موجود ہے اور اس صورت میں ان برطانوی مسلح افواج کو ہندوستان سے واپس بلانا دشوار ہو جائے گا جن کو حکومت برطانیہ سمندر پار دوسری جگہوں پر تعینات کرنا چاہتی ہے۔ کابینہ کے ارکان نے ویول کے تیار کردہ مسودۂ اعلان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ 1942ء کی کرپس تجاویز کو برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کے لیے ایک طے شدہ پالیسی سمجھنا چاہیے۔ ضرورت صرف اس میں تھوڑے بہت ردوبدل کی ہے۔ اگر اس سے مکمل انحراف کیا گیا تو ہم پھر سے گول میز کانفرنسوں کے چکر میں پڑ جائیں گے۔ پاکستان کے بارے میں کسی تکنیکی قسم کی چھان بین کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وائسرائے کے مطابق یہ محض ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ چنانچہ اگر کوئی انکوائری کروا بھی لی گئی تب بھی متعلقہ فرقوں کے نظریات پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ارکان کابینہ نے یہ بھی کہا کہ یہ واضح کر دینا چاہیے کہ اگر کرپس کے مجوزہ آئین ساز ادارہ سے ہندوستان کی پارٹیوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو بھی حکومت برطانیہ اپنے عہد کا پاس کرتے ہوئے آئین ساز اسمبلی بنا ڈالے گی۔ اگر ہندوستان کی پارٹیاں تعاون نہیں کرتیں تو یہ ان کی ذمہ داری ہوگی۔ حکومت برطانیہ نے تو اپنا فرض ادا کر دیا ہوگا۔ اگر یہ معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا تو دنیا پر یہ تو عیاں ہو جائے گا کہ اس کی ذمہ دار برطانوی حکومت نہیں بلکہ خود ہندوستان کی پارٹیاں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وائسرائے کے بیان کردہ خدشات بجا ہیں لیکن کیا ان سے بچا جا سکتا ہے؟ کیا وقت گزرنے کے ساتھ فرقہ وارانہ جذبات میں کمی واقع ہو

سکتی ہے؟ کیا فیصلہ کن انداز سے اور تیزی سے اقدامات نہ کرنے کے نتیجے میں برابر کے خطرات موجود نہیں ہیں؟ وزیراعظم ایٹلی نے بھی اپنے ارکان کابینہ کی تائید کی اور کہا کہ نیا مسودۂ اعلان تیار ہونا چاہیے جس سے صاف عیاں ہو کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو جلد از جلد سیلف گورنمنٹ دینے کے اپنے تمام وعدوں پر قائم اور ثابت قدم ہے۔ انتخابات کے بعد وائسرائے تمام ہندوستانی سیاسی رہنماؤں کو طلب کر کے ان سے کرپس تجاویز کا کوئی متبادل دریافت کرے گا۔ اگر وہ کسی متبادل طریقے پر متفق نہ ہو سکیں گے تو پھر حکومت برطانیہ اپنے وعدے کا پاس کرتے ہوئے ضروری اقدام کرے گی اور کرپس تجاویز کے مطابق آئین ساز اسمبلی تشکیل کر دے گی۔ [36]

کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کے اس اجلاس سے ویول کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس نے قائم مقام وائسرائے کو لِول کو تار ارسال کیا جس میں اس سے کہا کہ تم پنجاب، بنگال، یوپی اور مدراس کے گورنروں سے خفیہ طور پر مشورہ کرو کہ اگر کرپس تجاویز کا احیاء کیا جائے تو اس پر کیا ردعمل ہوگا اور پھر مجھے ان کی رائے سے آگاہ کرو۔ کولول نے ان گورنروں سے مشورہ کے بعد ویول کے مؤقف کی تائید میں جواب بھیجا۔

31/اگست کو ویول نے وزیر خارجہ بیون کے ساتھ ملاقات کی۔ بیون نے اصرار کیا کہ 10/ستمبر سے پہلے پہلے جب کہ وہ لندن میں امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ کے ساتھ ملنے والا تھا، ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر پیش رفت کے بارے میں کوئی اعلان ضرور جاری کیا جانا چاہیے۔ [37] مقصد یہی تھا کہ بڑی طاقتوں کے ساتھ سودے بازی کے دوران کسی طرح ہندوستان کو آزاد ملک کے طور پر گِنا جاتا، تاکہ دنیا کے باقی علاقوں بالخصوص مشرق وسطیٰ اور ایران پر برطانیہ کا حق تسلیم کرلیا جاتا۔ لیکن برطانیہ کا دوسرا مفاد یہ بھی تھا کہ ہندوستان متحد اور پر امن ملک کی حیثیت سے اس طرح ''آزاد'' ہوتا کہ اس کے جملہ وسائل سوویت یونین کے خلاف استعمال ہو سکتے۔ داخلی انتشار اور فرقہ وارانہ خانہ جنگی سے دوچار ہندوستان اس مقصد پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اس لیے ویول اور اس کے گورنروں کا کہنا تھا کہ کوئی ایسا حل جو دو بڑے فرقوں میں سے کسی ایک کے لیے بھی ناقابل قبول ہوا، ملک کو فرقہ وارانہ فسادات کی نذر کر دے گا اور یہاں سے برطانوی افواج اور انتظامیہ کا انخلاء ممکن نہیں رہے گا اور انگریز ہندوستان کی

دلدل میں بری طرح پھنس کر رہ جائیں گے۔ اس لیے کسی ایسے حل کے لیے کوشش کی جائے جس پر دونوں بڑے فرقوں کا اتفاق بھی ہو اور ہندوستان کا اتحاد اور امن عامہ بھی برقرار رہے۔

3 ستمبر کو کولول کا جواب موصول ہونے پر ویول نے ایک نوٹ لکھ کر پیتھک لارنس کے ذریعہ کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کو دیا۔ اس میں ویول نے ہندوستانی رہنماؤں سے صلاح و مشورہ کیے بغیر ہندوستان پر کوئی آئین ساز ادارہ مسلط کر دینے کے خلاف اعتراضات گنوائے تھے۔ اس میں ایک بار پھر پاکستان کے مسئلے سے نمٹنے پر زور دیا گیا تھا اور چند روز پیشتر کابینہ کے لیے تحریر کردہ اپنے ایک نوٹ کا حوالہ دیا گیا تھا جس میں اس نے بنگال اور پنجاب کی آبادی کے تناسب کے اعداد وشمار دے کر ہندوستان کی تقسیم کو ناقابل عمل ثابت کیا تھا۔ اب اس دوسرے نوٹ میں پھر کہا گیا کہ حکومت برطانیہ کو تقسیم ہند کے سارے مضمرات کا اچھی طرح بغور جائزہ لے کر اس پر ایک حتمی رائے قائم کر لینی چاہیے۔ اپنی رائے کا اعادہ کرتے ہوئے اس نے مزید لکھا کہ ''میں خلوص نیت کے ساتھ یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسئلہ کا تصفیہ بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتفاق رائے سے ہی طے پائے گا۔ اگر ہم صبر اور احتیاط سے کام لیں تو یہ کوئی ناممکن بات نہ ہوگی۔ اگر جلد بازی کی راہ اختیار کرنے یا زبردستی کوئی حل ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو سنگین ترین نتائج کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جن کے بارے میں پوری شدت کے ساتھ حکومت کو متنبہ کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ ہندوستان کو سنگین فرقہ وارانہ فسادات سے بچانا حکومت برطانیہ کے لیے ایسے حالات میں خاص طور پر اہم ہے جب کہ کثیر تعداد میں ہندوستانی سپاہیوں کی دوسرے ملکوں کی چھاؤنیوں میں ضرورت ہے اور جب کہ برطانوی سپاہیوں کو کثیر تعداد میں ہندوستان میں رکھنا مطلوب نہیں ہے۔''[38]

چنانچہ اس وقت انگریز ہندوستان میں اپنی سامراجی ضرورت کے تقاضے کے تحت ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے بجائے ''متحد رکھو اور حکومت کرو'' کے اصول پر عمل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جہاں تک ہندوستان کو متحد رکھنے کا تعلق تھا، ویول اور لیبر حکومت کی کابینہ کے مابین کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس کو متحد اور پر امن حالت میں برقرار رکھنے کے لیے طریق کار پر اختلاف تھا۔ کابینہ کی رائے تھی کہ 1942ء کے کرپس تجاویز کے گھڑے گھڑائے فارمولے کو اٹھا کر لاگو کر دیا جائے اور اس میں تاخیر نہ کی جائے ورنہ وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان انتشار

اور فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہو جائے گا۔ جب کہ ویول اور اس کے گورنروں کی رائے اس کے برعکس تھی کہ اگر ایسا کیا گیا اور دونوں بڑے فرقوں کے رہنماؤں کے مابین مشترک لائحہ عمل پر اتفاق کروانے کے لیے مناسب وقت نہ دیا گیا تو حالات بگڑ کر افراتفری اور فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا روپ دھار لیں گے۔

4رستمبر کو ویول کا کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کے ساتھ ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت وزیراعظم ایٹلی نے کی۔ ویول اور ارکان کمیٹی اپنے اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دیتے رہے۔ ایٹلی نے کہا کہ یہ مان لیا جائے کہ تمام مسلمان جناح کے ساتھ ہیں اور تمام ہندو کانگرس اور اس کے رہنما گاندھی کے پیچھے ہیں تو کیا ان رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں؟ جس طرح ماضی میں ان کے ساتھ بات چیت کا کوئی فائدہ نہیں نکلا، آئندہ بھی نہیں نکلے گا۔ اس لیے اب کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیے کہ محض پارٹی رہنماؤں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ عوام کے نومنتخب نمائندوں کے ساتھ بھی مشورہ ہو سکے۔ سٹیفورڈ کرپس نے ویول کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ مسلمان آئین ساز ادارے کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے۔ اس صورت میں اس نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے ''ہندوستان'' کا آئین بنانا پڑے گا۔ کرپس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہندو، ہندوستان کو تقسیم سے بچا کر رکھنے کے اس درجہ خواہاں ہیں کہ وہ اپنے منصوبوں کو ایسی صورت دینے پر آمادہ ہوں گے جو مسلمانوں کو بھی قابل قبول ہوں۔ انڈیا کمیٹی کا یہ اجلاس بھی کسی اتفاق رائے کے بغیر ختم ہو گیا۔ یہ سب لوگ ہندوستان کو اکٹھا رکھ کر کوئی حل تلاش کر رہے تھے مگر اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس پر مختلف آراء تھیں۔

6رستمبر کو 53 ارکان پارلیمنٹ نے مزید دس ارکان لیبر پارٹی کے ہمراہ اخبارات کے نام ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے نمائندہ پارٹی قرار دیا اور اس پر عائد مختلف پابندیوں کو ہٹانے، اس کے کارکنوں کو رہا کرنے اور آئندہ انتخابات کی تیاری کے لیے اسے مناسب وقت دیئے جانے کا مطالبہ کیا۔ یہ ہو بہو وہی مطالبہ تھا جو کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے ویول کے 21راگست کے نشری اعلان پر کیا تھا۔ انگریزوں میں کانگرس کے نقطۂ نظر کو خوب پذیرائی حاصل تھی اور وہ اسے سارے ہندوستان کا نقطۂ نظر گردانتے تھے۔ ویول اپنی خودنوشت کے 3رستمبر کے اندراج

میں لکھتا ہے ''مجھے معلوم ہے کہ برلا، شیوراؤ اور کانگرس کے دوسرے ڈھنڈورچی کرپس اور ایٹلی وغیرہ سے ملتے رہتے ہیں اور وہ جو کچھ کہتے ہیں یہ (کرپس اور ایٹلی) اس کو وحی کا درجہ دیتے ہیں''[39] اور 4رستمبر کے اندراج میں انڈیا و برما کمیٹی کے اجلاس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارکان کمیٹی کے بارے میں ویول نے لکھا ''صاف لگتا ہے کہ یہ لوگ ہندوستان کو اپنے کانگرسی دوستوں کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔''[40] ویول ان کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایسا کرنے کی صورت میں ہندوستان کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ خونریزی کا ایسا سلسلہ شروع ہو جائے گا کہ ہم وہاں بری طرح پھنس جائیں گے۔ اس لیے یہ اقدام نہ کیا جائے۔ پہلے فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی حل تلاش کر کے جناح کے مطالبہ پاکستان کا اچھی طرح سدباب کر دیا جائے اور پھر آگے بڑھا جائے۔

6رستمبر کو انڈیا و برما کمیٹی کا ایک اور اجلاس وزیراعظم ایٹلی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس میں اس مسودۂ اعلان کو آخری شکل دی گئی جس کا ویول کی جانب سے ہندوستان واپسی پر اعلان کیا جانا تھا۔ کافی غور وخوض کے بعد بالآخر ویول کے تیار کردہ مسودہ کی چند اہم ترامیم کے ساتھ منظوری دے دی گئی۔ 11رستمبر کو ایٹلی نے کابینہ سے اس کی منظوری حاصل کر لی۔ کابینہ نے بھی زور دیا کہ بلا تاخیر ساری دنیا کو ہندوستان کے بارے میں ہمارے ارادوں کا علم ہو جانا چاہیے اور یہ بھی کہ ہم اس میں مضمر ہر طرح کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ یاد رہے اسی روز لندن میں بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کا اجلاس بھی شروع ہوا جس میں برطانیہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ہندوستان سے دستبرداری کے سلسلے میں اقدامات کا آغاز کر چکا ہے اور یہ کہ اس کے بارے میں ابتدائی اعلان کا مسودہ منظور کیا جا چکا ہے۔

11رستمبر کو انڈیا و برما کمیٹی کا ویول کے ساتھ ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں منظور شدہ مسودۂ اعلان کے مطابق منعقد ہونے والے انتخابات کے بعد آئین ساز ادارے کے قیام کی تفصیلات اور اس سے متعلق اہم آئینی امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ صوبوں کے علیحدگی اختیار کرنے کے حق کو اختیار کرنے کے طریقہ کار پر بحث کرتے ہوئے سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ صوبے کی پوری آبادی کا ریفرنڈم ہونا چاہیے۔ ویول نے اختلاف کیا اور کہا کہ مسلمان اور سکھ اس اصول کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ بحث میں ایسے اقدام اٹھانے پر زور دیا گیا کہ جن سے یہ

واضح ہو جائے کہ جناح کا یہ مطالبہ قابل قبول نہیں ہوگا کہ صرف مسلم فرقے کے ووٹوں کی بنیاد پر علیحدگی کا فیصلہ کرنے کا حق تسلیم کیا جائے۔ یہ تجویز کیا گیا کہ وائسرائے کابینہ کے مذکورہ منظور شدہ بیان کے ہمراہ اپنی طرف سے جو بیان جاری کرے اس میں اس معاملہ کو بھی کھول کر بیان کر دے۔ تاہم بعض ارکان نے رائے دی کہ یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اس پر اس طرح کا اظہار خیال مناسب نہ ہوگا۔ ویول کی یہ رائے تھی کہ ''ابھی اس بارے میں کاروائی سے اجتناب برتنا چاہیے۔ اگر کچھ وقت گزرنے پر یہ محسوس کیا گیا کہ کوئی مسئلہ پیدا ہو رہا ہے اور غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں تو میں کسی پبلک بیان میں یہ معاملہ صاف کر دوں گا۔'' اجلاس میں یہ معاملہ بھی زیر غور آیا کہ اگر تین یا چار صوبوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا تو پھر کیا ہوگا؟ یہ صورت حال کب تک چل سکے گی؟ کیا یہ صوبے الگ الگ ڈومینین کی حیثیت سے اپنی حکومت چلا سکیں گے؟ پیتھک لارنس کی رائے تھی کہ ان حالات میں کچھ عرصہ کے لیے وائسرائے اور حکومت ہند کی پوری مشینری کو مزید وہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ ویول نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس اجلاس میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا گیا کہ فرض کیا مسلمانوں نے اور بیشتر ریاستوں نے آئین ساز ادارہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو اس ادارہ کے فیصلوں کی کیا حیثیت ہوگی؟ کرپس کی رائے میں اس طرح عملاً انڈیا کی تقسیم ہو جائے گی۔ ایک تو ہندوستان ہوگا جو مذکورہ ادارے میں طے شدہ آئینی تدابیر کو بروئے کار لائے گا اور دوسرے باقی ماندہ علاقہ جو دراصل پاکستان ہوگا، اس کے لیے علیحدہ تدابیر سوچنا پڑیں گی۔ کرپس نے مزید کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم مسلمانوں کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ دیں کہ انہیں اکٹھے رہنے کی بجائے علیحدہ ہونے میں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ اس کے خیال میں مسلمانوں کو آئین ساز اسمبلی میں شامل رکھنے کا بہترین طریقہ انہیں یہ باور کرا دینے میں مضمر تھا کہ اگر انہوں نے بائیکاٹ کیا تب بھی اس کی کاروائی جاری رہے گی۔ اس مقام پر ویول نے اختلاف کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو شمولیت پر آمادہ کرنے کے لیے انہیں کچھ مراعات دینی پڑیں گی۔ اس کے خیال میں اتنے اہم معاملے سے مسلم رائے عامہ کو الگ تھلگ رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے رائے دی کہ ابھی جلد بازی میں کوئی واضح قسم کی یقین دہانی نہ کرائی جائے بلکہ وقت آنے دیا جائے تو پھر ان دونوں انتہاؤں کے مابین درمیانی راہ ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ کمیٹی نے ویول کی رائے سے اتفاق کر لیا۔[41] کمیٹی کی اس بحث سے پتہ چلتا ہے کہ انگریز

ہندوستان کو یکجا رکھنے کی خاطر کیا کیا تدابیر کر رہے تھے اور کس کس طرح پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔

16 رستمبر کو ویول واپس ہندوستان پہنچ گیا۔ 19 رستمبر کو ویول نے نشری تقریر کے ذریعے کابینہ کے منظور شدہ مسودۂ اعلان کو جاری کر دیا۔ اسی روز ایٹلی نے بھی لندن سے نشری تقریر کی۔ ادھر لندن میں بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں روس اور مغربی بلاک کے مابین اختلافات کی خلیج وسیع ہو چکی تھی اور مذاکرات تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ ان حالات میں ایٹلی نے اپنی نشری تقریر میں دنیا کو یہ یقین دلایا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کا انتظام ہندوستان کے حوالے کرنے پر سنجیدگی سے عمل پیرا ہے اور اس سلسلے میں 1942ء سے جن اقدامات کا آغاز کیا گیا تھا انہیں تیزی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچایا جا رہا ہے۔ اس نے ہندوستانیوں سے درخواست کی کہ ''جس طرح ہندوستانیوں سمیت اقوام متحدہ نے آپس کے جھگڑے اور اختلافات کو بھلا کر باہمی اتحاد کے ذریعے جنگ میں کامیابی حاصل کی ہے، ہندوستانیوں کو اس مثال پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی متحدہ کوشش سے ایک ایسا آئین وضع کرنا چاہیے جو اکثریتی اور اقلیتی سب فرقوں کو قابل قبول ہو اور جس میں صوبے اور ریاستیں بھی اپنا مقام رکھتی ہوں۔''[42] گویا اس میں تقسیم یا علیحدگی کے امکان کو بالکل رد کیا گیا تھا اور ''تقسیم کرو'' کے بجائے ''متحد رہو'' پر زور دیا گیا تھا۔

ویول نے حکومت برطانیہ کی منظوری سے جو اعلان جاری کیا اس میں کہا گیا تھا کہ مرکزی اور صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کے انتخابات آئندہ موسم سرما میں منعقد ہو جائیں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ صوبوں میں وزارتی ذمہ داریاں سیاسی رہنما قبول کر لیں گے۔ حکومت برطانیہ جلد از جلد ایک آئین ساز ادارہ قائم کرنا چاہتی ہے جس کے ابتدائی اقدام کے طور پر مجھے اختیار دیا گیا ہے کہ میں انتخابات کے فوراً بعد صوبوں کی قانون ساز اسمبلیوں کے نمائندوں سے مذاکرات کروں اور یہ دریافت کروں کہ آیا 1942ء کی تجاویز انہیں قابل قبول ہیں یا ان کے پاس اس کا کوئی متبادل ہے یا وہ اسی میں کسی ترمیم شدہ سکیم کو قبول کرنے پر آمادہ ہیں؟ ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ بھی یہ جاننے کے لیے مذاکرات کئے جائیں گے کہ وہ آئین ساز ادارے میں کسی طور بہترین کردار ادا کر سکتی ہیں۔ حکومت برطانیہ ایک عہد نامے کا مضمون تیار کر

رہی ہے جو برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے درمیان طے پایا جانا ہے۔ ان تیاریوں کے مراحل کے دوران حکومت ہندوستان کا کاروبار چلانے اور فوری معاشی اور معاشرتی مسائل کے حل کرنے کا کام جاری رہے گا ۔حکومت برطانیہ نے مجھے اختیار دیا ہے کہ جونہی صوبائی انتخابات کے نتائج منظر عام پر آ جائیں، میں ایک نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دوں جسے ہندوستان کی بڑی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو[43] اس اعلان میں بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں تھا کہ عام انتخابات کے نتائج میں اگر سیاسی پارٹیاں واضح طور پر فرقوں کی نمائندہ بن کر ابھر آئیں تو تقسیم ہند کے امکان پر بھی غور ہوسکتا ہے۔ البتہ ویول کے اصرار پر کرپس تجاویز کے ساتھ کسی اور متبادل سکیم یا اس میں ردوبدل کر کے کسی سکیم کو اختیار کرنے کا جائزہ لینے کی گنجائش بھی پیدا کی گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی کوئی واضح یقین دہانی نہ کرائی جائے اور دیکھا جائے کہ انتخابات سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ پھر دونوں انتہاؤں یعنی کانگرس اور مسلم لیگ کو درمیانی راہ اختیار کرنے پر مائل کیا جائے۔ چنانچہ تقسیم ہند کا کوئی منصوبہ قطعاً ان کے پیش نظر نہیں تھا کہ یہ درمیانی راہ نہیں بلکہ انتہائی قدم تھا جو انگریز ہرگز اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

برصغیر کے مستقبل کے بارے میں کانگرس کا مؤقف اور فرقہ وارانہ کشیدگی

ایٹلی اور ویول کی جانب سے جاری کردہ اعلانات پر جناح کا ردعمل یہ تھا کہ ''پاکستان کو بنیاد بنائے بغیر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی کہ یہی وہ بڑا مسئلہ ہے کہ جس کا ہندوستان کے بہی خواہوں اور اس کو آزادی وخودمختاری دلانے کے شدت سے خواہش مند لوگوں کو جتنا جلد ممکن ہو تصفیہ کر دینا چاہیے۔ ہندوستان کے پیچیدہ آئینی مسئلے کا واحد حل اس کی تقسیم ہے اور یہی اس برصغیر میں آباد چالیس کروڑ عوام کی مسرت، خوشحالی، بہبود اور آزادی کی بنیاد ہے۔'' تاہم مسلم لیگ انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر چکی تھی اور ''پاکستان'' ہی مسلم لیگ کا واحد انتخابی نعرہ تھا جس کے لیے مسلمان درمیانہ طبقہ پرجوش انداز سے سرگرم عمل ہو چکا ہوا تھا۔ اس لیے جناح اس سے کم اور کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ برطانوی حکومت کے اعلان پر کانگرس کا ردعمل کوئی خوش گوار نہیں تھا۔ جب 21راگست کو ویول نے لندن جانے سے پہلے انتخابات کے انعقاد کا اعلان کیا تھا تب ہی کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے اس پر احتجاج کیا تھا کہ ان حالات میں

جبکہ کانگرس کے سارے کارکن رہانہیں کئے گئے، اس کے فنڈ زمنجمد پڑے ہیں اور بہت سی پابندیاں موجود ہیں، انتخابات کی تیاری کے لیے کانگرس کو مزید وقت دیا جانا چاہیے تھا۔ ابوالکلام آزاد کا خیال تھا کہ اگر کچھ وقت مل جائے تو مسلم رائے عامہ کی طرف سے مسلم لیگ کو حاصل زبردست حمایت میں کمی پیدا کی جا سکے گی۔ اس مقصد کے تحت اگست کے اوائل میں آزاد نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی حیثیت سے ایک یادداشت بھی گاندھی کو پیش کی تھی۔ اس کے ہمراہ خط میں اس نے لکھا تھا کہ کانگرس کو مسلمانوں کے خدشات دور کرنے کے لیے طریقے وضع کرنے چاہئیں اور مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں قطعی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔ مسلم لیگ سے علیحدہ دوسری تمام مسلمان تنظیموں کو پوری طرح منظم ہو کر آئندہ آئین کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ پھر کانگرس کو ان کا یہ فیصلہ قبول کر لینا چاہیے اور ان مسلمان تنظیموں کی حمایت کرنی چاہیے۔ یادداشت کے شروع میں اس نے اس پر زور دیا کہ فرقہ وارانہ مسئلے کو تسلیم کرنا چاہیے اور اس فضول بحث میں نہیں پڑنا چاہیے کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور اس کو پیدا کرنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان خائف ہیں اور ان کے خدشات کو صرف اس صورت میں دور کیا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسی سکیم وضع کی جائے جس میں وہ خود کو محفوظ محسوس کریں۔ مرکز میں وحدانی حکومت بنانے کی کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ تقسیم بھی ناکام ثابت ہوگی اور خود مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ثابت ہوگی۔ ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تقسیم کو شکست خوردگی پر معمول کرتے ہوئے اسے رد کرتا ہوں۔ آگے چل کر اس نے آئین کا خاکہ تجویز کیا جس کے مطابق:

1۔ ہندوستان کا مستقبل کا آئین وفاقی ہوگا جس میں شامل تمام یونٹ پوری طرح خودمختار ہوں گے اور مرکز کے پاس صرف وہی معاملات ہوں گے جن کی آل انڈیا نوعیت ہوگی اور جن پر تمام یونٹوں کو اتفاق ہوگا۔

2۔ یونٹوں کو حق علیحدگی دیا جائے گا۔

3۔ مرکز اور صوبوں میں انتخابات مشترکہ بنیاد پر ہوں گے۔ مگر جہاں کہیں کسی فرقے کی آبادی کی قوت کو ظاہر کرنا ضروری ہوگا وہاں نشستیں مخصوص کی جا سکتی ہیں اور رائے دہی کے لیے جداگانہ طریقہ بھی اختیار کیا جا سکے گا۔

4۔ مرکزی اسمبلی اور مرکزی ایگزیکٹو میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو گی یہاں تک کہ وہ وقت آ جائے کہ جب فرقہ وارانہ خدشات بالکل ختم ہو چکے ہوں اور پارٹیاں معاشی اور سیاسی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔

5۔ ایک ایسی روایت ہونی چاہیے کہ ابتدائی دور میں وفاق ہندوستان کا صدر باری باری ایک مرتبہ ہندوؤں اور ایک مرتبہ مسلمانوں سے لیا جائے۔

اس خاکے کی روشنی میں اس یادداشت میں کہا گیا تھا کہ متحد رہنے کے لیے مضبوط مرکز کا ہونا ضروری نہیں ہے جیسا کہ سوویت یونین کی مثال سے ظاہر ہو چکا ہے۔ صوبائی انتخابات کے لیے مشترکہ طریق انتخاب ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو قابل قبول ہو گا کہ اس طرح اکثریتی فرقے والوں کو کوئی خدشہ نہیں رہے گا اور اقلیتی فرقے والے بھی اکثریت کے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی حیثیت کے حامل رہیں گے۔ مرکز میں مشترکہ طریق انتخاب سے مسلمان خائف ہوں گے لیکن مرکزی اسمبلی اور ایگزیکٹو میں برابری کا اصول اور صوبوں کے لیے حق علیحدگی تسلیم کیے جانے کے بعد ان کا خوف بے بنیاد ہو جائے گا۔ آخر میں آزاد نے اپنے ہندو دوستوں سے اپیل کی تھی کہ ''ہندوستان کے مستقبل کے آئین میں مسلمانوں کی حیثیت کے تعین کا معاملہ مکمل طور پر مسلمانوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جب مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو گا کہ کسی غیر مسلم ایجنسی کی جانب سے ان پر فیصلہ نہیں ٹھونسا جا رہا ہے تو وہ تقسیم کے خیال کو ترک کر دیں گے اور یہ محسوس کر لیں گے کہ ان کے مفادات کا بہترین تحفظ ایک وفاقی اور متحدہ ہندوستان ہی میں ہو سکتا ہے۔'' اس نے مزید کہا کہ ''ایک مرتبہ ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل ہو گیا تو پھر معاشی، سیاسی اور طبقاتی مفادات، فرقہ وارانہ مفادات کا خاتمہ کر دیں گے۔''[44] آزاد کی اس یادداشت کو گاندھی نے کوئی اہمیت نہ دی اور کانگرس کی مجلس عاملہ نے بھی اس کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ آزاد کی حیثیت کانگرس کے صدر کے طور پر محض ایک ''شو بوائے'' کی سی تھی۔ ہندو بورژوا کا یہ پرانا طریقۂ واردات رہا ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ تضادات کو حل کرنے کے لیے وہ ان میں سے کسی شو بوائے کو ڈھونڈ لیتے ہیں اور اسے اپنی سیکولرازم کے ثبوت کے طور پر پیش کر کے سرے سے اس اقلیت کی حیثیت اور حقوق کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد آزاد اس یادداشت کے ذریعے ہندو مسلم تضاد کا معترف ہوا اور ان کو علیحدہ حیثیت دینے اور اپنا معاملہ خود

طے کرنے کا حق دینے اور ایک ڈھیلے ڈھالے غیر وحدانی مرکز کے قیام کا قائل ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے یہ خیالات اس کی ذات تک محدود رہے۔ ہندو بورژوا نے اس کے ان خیالات کو کچھ اہمیت نہ دی مگر وہ پھر بھی بدستور ہندو بورژوا سے وفاداری کا مظاہرہ کرتا رہا۔ کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کے بارے میں اسی قسم کے رویے نے مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ کیا تھا۔ مسلم عامتہ الناس اسی پلیٹ فارم کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔

مسلم لیگ کے دوست اور دشمن سب جانتے تھے کہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ مسلمانوں کی تمام نشستیں حاصل کر لے گی۔ چنانچہ کانگرس فی الوقت انتخابات سے احتراز برتنے لگی۔ جب ویول اور انڈیا کمیٹی کے ارکان لندن میں مسودۂ اعلان پر غور وخوض میں مصروف تھے تو ستمبر کے پہلے ہفتے میں الہ آباد میں یوپی کی پراونشل کانگرس کمیٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس نہرو کی رہائش گاہ آنند بھون میں منعقد ہوا اور نہرو بھی اس میں شریک ہوا۔ اس میں مطالبہ کیا گیا کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات منعقد کروائے جائیں اور جب تک اس بنیاد پر نئی انتخابی فہرستیں تیار نہ ہو جائیں انتخابات نہ کروائے جائیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ موجودہ فہرستیں ناقص اور بے کار ہیں۔ انہی دنوں آزاد نے بھی اسی مضمون کا بیان جاری کیا۔ مقصد ویول اور برطانوی کابینہ پر جو کہ صلاح ومشورہ میں مصروف تھے، دباؤ ڈالنا تھا تا کہ کسی طرح انتخابات مزید کچھ عرصہ کے لیے ملتوی ہو جائیں۔ لیکن جب لندن کے ذرائع سے معلوم ہوا کہ برطانوی حکام آئندہ موسم سرما میں بہرحال انتخابات کرانا چاہتے ہیں اور مستقبل کے آئین کا دارومدار بھی ان انتخابات پر ہو گا تو کانگرس نے آئین کے بارے میں بحث چھیڑ دی اور مضبوط مرکز کے حامل متحدہ ہندوستان کے اپنے پرانے مؤقف پر زور دیا۔ 14 ستمبر کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا پونا میں اجلاس منعقد ہوا ☆۔ اس میں قرارداد منظور کی گئی کہ "کانگرس کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ آئین وفاقی ہو گا جس میں یونٹوں کے پاس صرف بچے کھچے اختیارات ہوں گے...... کانگرس کسی ایسی

☆ اس اجلاس میں شرکت کے لیے آزاد سری نگر سے پونا پہنچا۔ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد کلکتہ اور دوسری چھاؤنیوں سے امریکی فوجی ہزاروں کی تعداد میں تفریح کے لیے کشمیر چلے گئے تھے۔ وہاں آزاد کا بہت سے امریکی افسروں سے رابطہ قائم ہوا۔ امریکی کمانڈر کے خصوصی طیارے کے ذریعے آزاد کو سری نگر سے دہلی پہنچایا گیا جہاں سے وہ پونا خود پہنچا۔ [45]

تجویز کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتی جس میں کسی ریاست یا علاقائی یونٹ کو انڈین یونین یا وفاق سے باضابطہ علیحدگی کا اختیار دے کر ہندوستان کے ٹکڑے کرنے کی بات کی گئی ہو۔ کانگرس ہندوستان کی آزادی اور اتحاد پر اٹل طریقے سے قائم ہے۔ ہندوستان کے اتحاد میں خلل آنا، خاص طور سے جدید دنیا میں جب کہ لوگوں کے ذہن بڑے بڑے وفاقوں کے بارے میں سوچتے ہیں، تمام متعلقین کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوگا اور اس کا تصور ہی بڑا تکلیف دہ ہوگا۔''
اپریل 1942ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کسی علاقائی یونٹ کو اس کی اعلانیہ اور مسلمہ نارضامندی کی صورت میں انڈین یونین میں شمولیت پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اب اس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں مختلف یونٹ مشترکہ اور باہمی قومی زندگی استوار کر سکیں۔ قرارداد کے حوالے سے مزید کہا گیا کہ اس اصول کے تسلیم کیے جانے میں یہ بات لازماً شامل ہے کہ ایسی تبدیلیاں نہیں کی جائیں گی کہ جن سے تازہ مسائل پیدا ہو جائیں اور اس علاقے میں (جو علیحدہ ہونا چاہیے) دوسرے اہم گروہوں پر کوئی جبر مسلط ہو جائے۔[46]

گویا مجلس عاملہ کے پونا کے اجلاس نے 1942ء کی مجلس عاملہ کی قرارداد کی تقریباً نفی کر دی کیونکہ اب اسے پنجاب اور بنگال کی علیحدگی کی صورت میں غیر مسلموں کے گروہوں پر ''جبر'' مسلط ہونے کا امکان نظر آنے لگا تھا۔ اس لیے 1942ء کی قرارداد میں دیئے گئے حق علیحدگی سے انکار بھی نہ کیا گیا اور ایک متحدہ ہندوستان کی جس کے یونٹ محض بچے کھچے اختیارات کے حامل تھے، پرزور حمایت بھی کی گئی۔ پونا کی قرارداد میں اور آزاد کے اس فارمولے میں جو اس نے اپنی ذاتی حیثیت میں گاندھی کے حضور پیش کیا تھا کوئی مطابقت نہ تھی۔ اس فارمولے میں آزاد نے مسلمانوں کے لیے تھوڑی بہت گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جانے اور مرکز کے پاس صرف آل انڈیا نوعیت کے معاملات رکھنے اور صوبوں کو حق علیحدگی دینے کی بات کی تھی۔ لیکن 14 ستمبر کو خود آزاد اپنے مؤقف سے پھر گیا اور اس نے ٹائمز آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم صوبوں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن علیحدگی کی مذمت کرتے ہیں۔ اسی حق کو تسلیم کرنے سے علیحدگی کے رجحانات کی اصولی طور پر کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔'' پھر

20 ستمبر کو بمبئی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آزاد نے کہا" ہندوستان کے مستقبل کے آئین کے بارے میں کانگرس کے پاس ایک مثبت منصوبہ موجود ہے۔ وہ ایک متحدہ ہندوستان چاہتی ہے جس میں وفاقی حکومت قائم ہو اور اس کے وفاقی یونٹ خودمختار ہوں اور بچے کھچے اختیارات کے حامل ہوں۔" گویا کانگرس ایسی کوئی رعایت دینے پر تیار نہ تھی کہ جس سے مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں اپنے تحفظ کا کوئی احساس حاصل ہو جاتا اور وہ تقسیم کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتے۔ ہندو بورژوا نے آزاد جیسے افراد کو محض دکھاوے کے لیے رکھا ہوا تھا جو کانگرس کے فیصلوں پر ذرا سا بھی اثر نہ رکھتے تھے۔ کانگرس بنیادی طور پر ہندو بورژوا کے مفاد کی نمائندہ تھی جس کی تنگ نظری اور تعصب کا یہ عالم تھا کہ کانگرس کے پٹھو مسلمان رہنماؤں کی طرف سے مسلمانوں کے بارے میں دی جانے والی کسی رائے کو کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ ہندو بورژوا کے اس رویے کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں علیحدہ خودمختار وطن کی خواہش دن بدن جڑ پکڑتی چلی گئی۔

12 ستمبر کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں ویول اور ایٹلی کی جانب سے کئے گئے حکومت برطانیہ کے اعلان پر غور وخوض ہوا۔ بقول آزاد" گاندھی سمیت بہت سے رہنماؤں کی رائے یہ تھی کہ ہمیں الگ سے کوئی تعمیری کام کرنا چاہیے کیونکہ اب سیاسی سطح پر کوئی خاص امید باقی نہیں رہ گئی ہے۔" تاہم آزاد کی رائے تھی کہ ہمیں کوئی نئی تحریک چلانے کے بجائے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے۔ کافی بحث مباحثے کے بعد بالآخر انتخابات میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا۔[47] درحقیقت تو یہ فیصلہ 7 ستمبر کو الہ آباد میں نہرو کے آنند بھون ہی میں کر لیا گیا تھا اور پھر 14 ستمبر کو پونا میں مجلس عاملہ نے اس کے حق میں قرارداد بھی منظور کر دی تھی۔ مسلمانوں میں مسلم لیگ کی مقبولیت کے پیش نظر انتخابی تیاری کے لیے کچھ وقت لینے کی خاطر لیت ولعل کا رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ وقت لے کر مسلم رائے عامہ کو" متاثر کرنے" اور مسلم لیڈروں کے ساتھ جوڑ توڑ کرنے کا بھی ارادہ تھا۔ چنانچہ بمبئی کے اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اب کانگرس کے رہنما مسلم لیگ کے ساتھ سروکار نہیں رکھیں گے بلکہ وہ براہ راست مسلم عوام کے ساتھ رابطہ استوار کریں گے اور اپنے انتخابی منشور کے ذریعے ان میں اپنا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ اس اجلاس میں صوبوں کو حق علیحدگی دیئے جانے کی تجویز

کے خلاف بھی بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں [48] اس قسم کے رویے کے ساتھ یہ کیسے ممکن تھا کہ کانگرسی رہنما مسلم رائے عامہ کو متاثر کرنے میں کوئی کامیابی حاصل کر لیتے کیونکہ مسلم رائے عامہ تو علیحدگی اور تقسیم کو اپنا نصب العین بنا چکی ہوئی تھی۔ لیکن ویول اور دوسرے انگریز حکام کی طرح کانگرسی رہنماؤں کا بھی یہ خیال تھا کہ تقسیم کو نا قابل عمل ثابت کر کے مسلم رائے عامہ کو مطالبہ پاکستان اور مسلم لیگ سے منحرف کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کانگرس کے دلائل بھی وہی تھے جو ویول اور دوسرے انگریز حکام پیش کرتے تھے۔

26 ستمبر کو جواہر لال نہرو نے بمبئی میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال پاکستان میں شامل نہیں کئے جا سکتے کیونکہ ان میں علی الترتیب سکھوں اور ہندوؤں کی زبردست اکثریت ہے۔ یہ قطعاً بے ہودگی ہوگی کہ ایک فرقہ کے لیے حق خودارادیت کا مطالبہ کیا جائے اور بعض دوسرے فرقوں کی وسیع تر تعداد کو پاکستان کا حصہ بننے پر مجبور کیا جائے۔ اس لیے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بغیر پاکستان کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تقسیم کا مطلب یہ ہوگا کہ پنجاب کا شمال مغربی حصہ اپنے وسائل اور اقتصادی پوزیشن کے اعتبار سے کمزور ہوگا۔ کوئی بنگالی یا پنجابی خواہ وہ ہندو، مسلم یا سکھ ہو، بنگال یا پنجاب کی تقسیم نہیں چاہتا۔ ہندوستان کے تمام صوبوں میں سے بنگال سب سے زیادہ مضبوط تمدنی یونٹ ہے اور بنگال اور پنجاب دونوں، دوسرے صوبوں کی نسبت زیادہ صوبائی احساسات رکھتے ہیں۔ [49]

بمبئی میں نہرو کی اس پریس کانفرنس کو ابھی چند گھنٹے بھی نہ گزرے تھے کہ اسی روز رات کے وقت بمبئی میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ جمبلی محلہ سے شروع ہونے والے یہ فسادات شہر کے دوسرے حصوں میں پھیلتے چلے گئے۔ 28 ستمبر کو کرفیو نافذ کر دیا گیا اور جنازوں تک کے جلوس پر پابندی لگا دی گئی۔ اس روز تک فسادات میں بائیس افراد ہلاک اور ایک سو چار افراد زخمی ہو چکے تھے۔ اسی روز ہندوؤں نے ایک مسجد کو بھی آگ لگا دی تھی۔ 30 ستمبر تک مرنے والوں کی تعداد 28، زخمیوں کی تعداد 143 اور گرفتار ہونے والوں کی تعداد 460 ہو چکی تھی۔ برطانوی فوج کو طلب کر لیا گیا تھا۔ [50]

11 اکتوبر تک حالات معمول پر آئے اور کرفیو اٹھا لیا گیا۔ نمائندہ ٹائمز، لندن نے ان

فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ فسادات شملہ کانفرنس کی ناکامی، بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں مسلم لیگ پر شدید حملوں اور کانگرس کی انتخابی مہم کا آغاز کرتے ہوئے بمبئی میں نہرو کی اشتعال انگیز تقریر کا نتیجہ تھے۔اس تقریر میں اس نے پاکستان کی پرزور مخالفت کی تھی اور متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کوئی خاص تحفظات کی پیش کش نہ کی تھی۔''[51] تاہم بمبئی کے ہندو بورژوا کو اس قسم کی یقین دہانی کروا کر ہی کانگرس کی انتخابی مہم شروع ہونا تھی۔

مرہٹواڑ کے ضلع ستارہ میں مرہٹہ نوجوانوں کی بہت سی تنظیموں نے اگست کے آخری ہفتے کے دوران زبردست دہشت پسندی پھیلا دی تھی۔ مرہٹہ دہشت پسندوں کی یہ تحریک 1946ء میں کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ جب پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو ان دہشت پسندوں نے پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا اور روپوش ہو گئے۔ انہوں نے ضلع ستارہ کے ایک حصے میں متوازی حکومت بنانے کی بھی کوشش کی۔ جو لوگ ان کی اتھارٹی ماننے سے انکار کرتے ان پر سختیاں کرتے تھے۔ ڈاکے ڈال کر مال جمع کرتے یا دھمکیاں دے کر رقوم وصول کرتے تھے۔ اگست 1945ء کے اواخر میں جب حکومت نے کانگرس پر سے پابندیاں اٹھا لیں اور میانہ رو سیاست کا دور دورہ ہوا تو مذکورہ دہشت پسندوں کی سات تنظیموں کو جن میں راشٹریہ سیوادل بھی شامل تھی، خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ان کے تین سو افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس کی بھاری نفری تعینات کر دی گئی۔[52] ان حالات میں ستمبر میں اس علاقے میں واقع پونا اور بمبئی میں کانگرس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے مذکورہ اجلاس منعقد ہوئے جن میں متحدہ ہندوستان کے حق میں سخت مؤقف اختیار کیا گیا اور پاکستان کی پرزور مخالفت کی گئی۔ ستمبر کے اواخر میں بمبئی کے ہندو مسلم فسادات ہندو بورژوا کے اسی رویے کا شاخسانہ تھے۔

21ر ستمبر کو لکھنؤ یونیورسٹی میں بھی ہندو اور مسلمان طلباء کے گروہوں کے مابین تصادم ہوا اور فریقین نے تشدد کے مظاہرے کئے۔ کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کے بارے میں عاقبت نااندیشانہ رویہ اختیار کئے جانے پر تنقید کرتے ہوئے کانگرس کے وفادار مسلمان دانشور ڈاکٹر ذاکر حسین نے 12ر اکتوبر کو لکھنؤ میں بیان دیا کہ ''پاکستان کا مطالبہ ابتداء میں محض سودا بازی کے حربے کے طور پر پیش کیا گیا تھا مگر کانگرس کی طرف سے اس مطالبہ کے سامنے واحد

راستہ یہ تھا کہ وہ اس مطالبہ کو قبول کر لیتی اور ہندوستان کی آزادی کے اصول پر مسلمانوں سے اتحاد کر لیتی۔ ہندوؤں کی طرف سے صرف مسٹر گاندھی ہی ایسی شخصیت ہیں جو اس مطالبہ کو منوا سکتے ہیں۔ میں نے اس بارے میں مسٹر گاندھی سے بات چیت کی ہے اور گاندھی۔ جناح مذاکرت میں مسٹر گاندھی اس مطالبہ کو ایک حد تک تسلیم کر چکے ہیں۔ مسٹر گاندھی اس بارے میں اس حد سے آگے جانے پر اس خوف کی وجہ سے آمادہ نہ ہوئے کہ مبادا ہندو قوم اس کا انکار کر دے۔'' ذاکر حسین نے مزید کہا کہ '' پاکستان اٹل ہے۔ کیونکہ مسلمان اقلیت میں ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ اگر سارے ہندوستان کے لیے ایک مرکزی حکومت بنائی گئی تو ایسی حکومت ہندو اکثریت کے رحم وکرم پر ہوگی اور مسلمان عمرانی اور اقتصادی ارتقاء کے موقع سے محروم ہو جائیں گے۔ مسلمان اپنے لیے وطن چاہتے ہیں جہاں وہ اپنے نظریۂ حیات، روایات اور تمدن کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ کانگرس کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں۔ پاکستان کو قبول کر لیا جائے یا مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے اگر مسلمانوں کو ختم بھی کر دیا جائے تب بھی مسلمان ملک کے امن کے لیے ایک مستقل خطرہ ہیں۔'' ایک اور سوال کے جواب میں ذاکر حسین نے کہا کہ لیگ کی انتخابات میں کامیابی یا ناکامی اہم نہیں کیونکہ ان انتخابات کے ذریعے اس کا پیغام پنجاب کے کونے کونے تک پہنچ جائے گا۔''[53] لیکن کانگرس کے حامی مسلمانوں کے یہ خیالات ان کی ذاتی حیثیت سے زیادہ کوئی اہمیت حاصل نہ کر سکے۔ ان کے ذاتی مفادات ان کے ذاتی خیالات پر حاوی ہو گئے اور وہ ہندو بورژوا کا دم بھرتے رہے۔ ہندو بورژوا مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ہندوستان کے کسی نہ کسی علاقے میں ہندو مسلم فسادات کا جاری رہنا ایک معمول کی بات بن گیا ہوا تھا۔ صدیوں پرانا ہندو مسلم تضاد اب حل طلب مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔

دیگر غیر مسلم اقلیتوں کا کانگرس کے ساتھ تضاد

متحدہ ہندوستان میں ہندو غلبے کا خوف صرف مسلمانوں کو ہی نہیں تھا بلکہ اچھوتوں، سکھوں اور جنوبی ہند کے ہندوؤں میں بھی پایا جاتا تھا۔ 4/اکتوبر 1945ء کو آل انڈیا شیڈول کاسٹس فیڈریشن کی مجلس عاملہ کا اجلاس این۔ شوراج کی صدارت میں پونا میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ اس میں منظور کردہ قرارداد میں کہا گیا کہ

مرکزی اسمبلی کی حیثیت ایسی ہے کہ پس ماندہ طبقات کو اس میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں۔ اس لیے ایسے ادارے کے لیے انتخابات کا انعقاد بیکار ہے۔ موجودہ انتخابات کا مفہوم ملک کے غاصب طبقہ کو اختیار سونپ دینا ہے۔ ایسی مجلس دستور ساز کا انعقاد اس وجہ سے بھی بیکار ہے کیونکہ کوئی اقلیت اپنے فرقہ وارانہ مسائل کا حل اکثریت کے سپرد کرنا کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کرے گی۔ [54] اچھوتوں کے ان مطالبات کے جواب میں کانگرس ہمیشہ یہ رویہ اختیار کرتی تھی کہ اچھوت کوئی علیحدہ قوم یا فرقہ نہیں ہیں بلکہ ہندو ہیں جنہیں ہریجن کہا جانا چاہیے اور اس طرح ان کے قومیتی اور فرقہ وارانہ حقوق سے انکار کر دیا جاتا تھا۔ سکھوں کی جماعت اکالی دل اپنے قومیتی حقوق کے بارے میں آواز بلند کرتی تو ان کے بارے میں بھی اسی قسم کا رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ جب کہ سکھ خود کو ہندوؤں سے بالکل جداگانہ فرقہ گردانتے تھے۔ 10 رنومبر کو لدھیانہ میں اکالی دل کے زیر اہتمام جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے سردار منگل سنگھ نے کانگرس پر کڑی نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ ہندوؤں کی جماعت ہے۔ اس پر اکالی سکھوں اور کانگرسیوں میں تصادم ہو گیا جس میں لاٹھیاں اور کرپانیں بھی استعمال ہوئیں۔ فریقین کے بیشتر لوگ مجروح ہوئے۔ [55]

فرقہ وارانہ قومیتوں کے علاوہ علاقائی اور نسلی حوالے سے بھی بہت سے گروہ اپنی جداگانہ حیثیت کا دعویٰ کرتے تھے اور علیحدگی کے رجحانات کے حامل تھے۔ ان میں جنوبی ہندوستان کے ہندو، جو دراوڑی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، قابل ذکر تھے۔ ان کا شمالی ہند کے آریائی نسل کے ہندوؤں کے ساتھ تاریخی تضاد موجود تھا۔ 8 راگست کو مدراس کی اقتصادی ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام تقریر کرتے ہوئے۔ ایس۔ راماناتھن سابق وزیر حکومت مدراس نے ہندوستان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے کہا کہ ''ہندوستان کے جغرافیائی اتحاد کا تصور بے بنیاد ہے۔ غیر ملکی قبضہ کا قائم کردہ اتحاد قابل فخر نہیں ہے بلکہ غلامی کی علامت ہے۔ موجودہ حالات میں ہمارے سامنے متحدہ ہندوستان اور تقسیم شدہ ہندوستان میں انتخابات کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستان اور تقسیم شدہ آزاد ہندوستان کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔ اس مطالبہ کی حمایت میں دو اطراف سے آواز بلند کی گئی ہے۔ مسٹر جناح نے اسلامی ہند کی طرف سے یہ آواز اٹھائی ہے اور ہندوستان کی تقسیم

کی دوسری آواز جنوبی ہندوستان نے اٹھائی ہے۔ ہندوستان کو اس وقت تک اختیارات نہیں مل سکتے جب تک مسٹر جناح کا مطالبہ پاکستان پورا نہیں کیا جاتا۔ مسٹر جناح کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ ہمیں اس فریب میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ لیبر حکومت متعلقہ پارٹیوں کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہندوستان پر ٹھونسے گی۔ عقل اور دانائی کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبہ کو کاملاً تسلیم کر لیا جائے۔ ہندوستان میں پانچ ریاستیں قائم ہوں گی۔ شمالی، جنوبی، مشرقی، مغربی اور وسطی۔"[56] چنانچہ جنوبی ہند کے دراوڑی ہندوؤں میں ان کے شمالی ہند کے آریائی ہندوؤں کے ساتھ تضاد کی وجہ سے نہ صرف اپنی جداگانہ قومیت کی بنیاد پر علیحدہ ریاست کے قیام کی خواہش موجود تھی بلکہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کے ساتھ ہمدردی بھی پائی جاتی تھی۔

جنوبی ہند کے ایک بڑے معتبر اور مقتدر رہنما اور مدراس کے سابق وزیر اعلیٰ راج گوپال اچاریہ نے ہندو مسلم تضاد کے حل کے لئے اپریل 1944ء میں جو فارمولا وضع کیا تھا اس میں ہندوستان کی تقسیم اور کسی نہ کسی شکل میں پاکستان کے قیام کی تجویز قبول کر لی گئی تھی۔ بعد ازاں ستمبر 1944ء میں اس فارمولے کی بنیاد پر گاندھی۔ جناح مذاکرات ہوئے جو ناکامی پر منتج ہوئے تھے۔ گاندھی نے مسلم اکثریت کے علاقوں میں بھی تقسیم کے مسئلے پر استصواب کرائے جانے اور اس بنیاد پر سرحدوں کو متعین کرنے اور اس سارے معاملے کو آزادی کے بعد تک اٹھا رکھنے کا مؤقف اختیار کیا تھا۔ جناح نے اس پاکستان کو کٹا پھٹا اور التوا پذیر قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ تاہم سی۔ آر۔ فارمولے میں پہلی مرتبہ کانگرس کی جانب سے تقسیم اور پاکستان کو برائے بحث تسلیم کیا گیا تھا۔ 20/اکتوبر 1945ء کو سی۔ راج گوپال اچاریہ نے کمبا کونم کی بار ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مرکز میں نصفا نصف نمائندگی (پیرٹی) کے اصول کی بنیاد پر ہندو اور مسلمانوں کے غیر حقیقی اشتراک سے بہتر ہے کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ شکوک اور تعصّبات سے اٹی ہوئی ہے اس لیے مشترکہ حکومت برائے نام حکومت ہوگی۔ یہ ایک منفی حکومت ہوگی۔ کسی اکثریت والے علاقے میں جہاں کہیں اقلیت بستی ہے تو ایسی اکثریت کو رشوت دے کر راضی کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ ان کی علیحدہ حکومت قبول کر لی جائے۔"[57] گویا متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مراعات دینے کے بجائے ان کا علیحدہ وطن قائم کر دینے پر جنوبی ہند کی ہندو رائے عامہ کے لیڈروں کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شمالی

ہند کا ہندو بورژوا نہ تو مسلمانوں کو مراعات دینا چاہتا تھا اور نہ ہی ان کا علیحدہ ملک بنائے جانے پر راضی تھا۔ اس کے اسی رویئے کی وجہ سے مسلمان کانگرس پر سے اعتماد کھو بیٹھے تھے اور مسلم لیگ ان کی امنگوں کی آئینہ دار بن گئی ہوئی تھی۔

باب: 5

آزاد ہندفوج کا مقدمہ

ہندوستان میں موجود مختلف النوع رجحانات کو یکجا کرنے میں کانگرس کو کامیابی حاصل نہ ہوسکی تھی۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ ان رجحانات کے حامل ''اعتدال پسند'' رہنماؤں کی مدد سے وہ ایک متحد اور پرامن ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ کے حصے کے طور پر برقرار رکھیں گے۔لیکن اس موقع پر انگریز حکام نے ایک ایسا احمقانہ فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں برصغیر سے برطانوی سامراج کی روانگی کا عمل غیر متوقع طور پر بہت تیز ہو گیا اور کانگرس، جس کی قوت 1942ء کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کے کچلے جانے کے بعد منتشر ہوگئ ہوئی تھی، دوبارہ بحال ہوگئ۔ فیصلہ یہ تھا کہ نام نہاد آزاد ہندفوج کے ان افسروں پر فوجی عدالتوں میں مقدمے چلائے جائیں گے جنہوں نے جنگ کے دوران شعوری طور پر جاپانیوں کا ساتھ دیا تھا اور جو اپنے بعض 'وفادار' ساتھیوں کے قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔حکومت ہند نے اس فیصلے کا اعلان 27/اگست کو کیا جب کہ وائسرائے ویول لندن میں حکومت برطانیہ کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں مشورہ کر رہا تھا۔

آزاد ہندفوج کا پس منظر

آزاد ہندفوج کا پس منظر یہ تھا کہ بنگال کے ایک قوم پرست رہنما سبھاش چندر بوس نے 1941ء میں کلکتہ سے خفیہ طور پر راہ فرار اختیار کی اور وہ کابل اور ماسکو کے راستے ہوتا ہوا برلن پہنچ گیا۔ یہاں اس نے انگریزوں کے خلاف نازیوں کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کیا اور ان سے برطانوی جنگی قیدیوں میں شامل ہندوستانی سپاہیوں کو حاصل کر کے ایک انڈین نیشنل آرمی

تشکیل دینے کا منصوبہ بنایا جس کے مطابق نازی افواج کے ساتھ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں شامل ہوکر نازیوں کے رُوس پر قبضہ کے بعد وہاں سے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندوستان کو انگریزوں کے قبضے سے آزاد کروانا تھا۔ چنانچہ اس نے شمالی افریقہ کے محاذ سے ہاتھ آئے ہوئے ہندوستانی جنگی قیدیوں کو نازیوں سے حاصل کیا اور انڈین نیشنل آرمی تشکیل دی۔ انہی دنوں ایک اور بنگالی لیڈر، رش بہاری بوس نے ہندوستان سے فرار ہوکر جاپان کی شہریت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ جب 1942ء کے اوائل میں جاپان کو جنوب مشرقی ایشیاء میں فتوحات حاصل ہوئیں اور سنگا پور تک جاپانیوں کا قبضہ ہو گیا تو جنوب مشرقی ایشیاء میں موجود ہندوستانی قوم پرستوں نے ٹوکیو میں جمع ہوکر رش بہاری بوس کی قیادت میں انڈین انڈی پنڈنس لیگ قائم کی اور جاپانیوں کے ہاتھوں بنائے جانے والے ہندوستانی جنگی قیدیوں پر مشتمل انڈین نیشنل آرمی بنانے کا فیصلہ کیا۔ ملایا کے محاذ پر ہتھیار ڈالنے والی پنجاب رجمنٹ کے کیپٹن موہن سنگھ کو جاپانیوں نے مذکورہ انڈین نیشنل آرمی کی قیادت کے لیے آمادہ کیا۔ سنگا پور کے محاذ پر ہتھیار ڈالنے والے چالیس ہزار جنگی قیدی موہن سنگھ کے حوالے کر دیئے گئے۔

15رجون 1942ء کو بنکاک میں انڈین انڈی پنڈنس لیگ کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں رش بہاری بوس، موہن سنگھ اور کثیر تعداد میں دوسرے منحرف ہندوستانی سپاہیوں نے شرکت کی۔ آزاد ہندوستان کا تین رنگوں والا جھنڈا لہرا کر ہندوستان کو بزور شمشیر آزاد کرانے کا عہد کیا گیا۔ یکم ستمبر 1942ء کو انڈین نیشنل آرمی کا باقاعدہ قیام عمل میں آ گیا۔ اس کی ایک کونسل آف ایکشن تشکیل دی گئی۔ جس کا صدر رش بہاری بوس کو اور کمانڈر انچیف موہن سنگھ کو بنایا گیا۔ سپاہیوں کے تربیتی کیمپ قائم ہو گئے۔ لیکن جلد ہی کونسل آف ایکشن کے ارکان کے مابین اختلافات ہو گئے۔ جاپان کی طرف سے اس فوج کی تعداد کا تعین کرنے اور ہندوستان کے بارے میں اپنا مؤقف واضح نہ کرنے کی بنا پر بھی مایوسی پیدا ہو گئی۔ موہن سنگھ نے جاپانیوں کو الٹی میٹم دے دیا۔ جاپانیوں نے موہن سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ ساری تنظیم انتشار کا شکار ہو گئی۔ ویسے بھی اس فوج میں بعض لوگ تو سامراج دشمنی کے جذبے کے تحت شامل ہُوئے تھے لیکن بیشتر اس لیے شامل تھے کہ جاپانیوں کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں زندگی بہت دشوار تھی۔ تاہم نیشنل آرمی کو بھی جاپانیوں کی طرف سے کوئی خاص پذیرائی حاصل نہ ہوئی اور اس کے جوانوں میں مایوسی پیدا ہوئی۔

ان حالات میں 1943ء میں سبھاش چندر بوس، نے جوان دنوں جرمنی میں تھا اور اٹلی اور جرمنی کی مدد سے انڈین نیشنل آرمی منظم کرنے میں مصروف تھا، فیصلہ کیا کہ فاشسٹوں کی روس پر فتح اور پھر اس راستے ہندوستان پر چڑھائی اتنا آسان کام نہیں ہے جب کہ جنوب مشرقی ایشیا کے محاذ پر انڈین نیشنل آرمی کو زیادہ کامیابی حاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ سبھاش چندر بوس جرمنی اور جاپانی آبدوزوں کی مدد سے خفیہ طور پر طویل سمندری راستہ طے کر کے 13/جون 1943ء کوٹوکیو پہنچ گیا۔ جاپانی وزیراعظم ٹوجو نے اسے بھر پور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ 2 جولائی کو وہ سنگا پور پہنچ گیا۔ رش بہاری بوس نے ہزاروں افراد کے مجمع کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور خود انڈین انڈی پنڈنس لیگ کی قیادت اس کو سونپ کر سبکدوش ہوگیا۔ اگلے روز سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج کے نام سے انڈین نیشنل آرمی کی تشکیل نو کا اعلان کر دیا جس کے نعرے تھے ''چلو دہلی'' اور ''جنگ کی مکمل تیاری کرو'' مردوں اور عورتوں کی بھرتی اور تربیت کے لیے کیمپ قائم کر دیئے گئے۔ 21/اکتوبر کو سنگا پور میں ''آزاد ہند'' کی عارضی حکومت کا اعلان کر دیا گیا جس نے برطانیہ اور امریکہ کے خلاف کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ چند ہی روز میں اس عارضی حکومت کو جاپان، جرمنی، اٹلی، کروشیا، برما، تھائی لینڈ، نیشنلسٹ چین، فلپائن اور منچوریا نے تسلیم کرلیا۔ نومبر 1943ء میں آزاد ہند فوج کی طرف سے شاہنواز خان کی کمان میں پہلی گوریلا رجمنٹ کو برما کے محاذ پر جاپانیوں کے ہمراہ لڑائی میں حصہ لینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ 1944ء کے اوائل میں یہ رجمنٹ امپھال (منی پور) کے محاذ پر جاپانیوں کے شانہ بشانہ جنگی کارروائیوں میں شریک ہوگئی۔ سبھاش چندر بوس نے رنگون کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔ 1944ء کے دوران آزاد ہند فوج کی کئی رجمنٹوں نے امپھال اور ناگالینڈ کے محاذوں پر دلیری اور جانبازی کے کارنامے انجام دیئے اور کئی چوکیوں کو برطانوی فوج کے قبضے سے آزاد کرایا۔ ان مہمات میں مسلمان اور سکھ فوجی افسروں اور جوانوں نے قیادت کی اہم ذمہ داریاں بڑی جواں مردی اور لگن کے ساتھ پوری کیں۔ ہندوؤں نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ کمانڈر شاہنواز خان، میجر عابد حسین، کیپٹن عبدالرشید، کیپٹن برہان الدین، جمعدار فتح خان، لیفٹیننٹ گربخش سنگھ ڈھلوں، صوبیدار شنگرا سنگھ، لیفٹیننٹ عجائب سنگھ، کیپٹن پی۔ کے سہگل، کیپٹن سورج مل اور لیفٹیننٹ مان سکھ لال کے نام قابل ذکر ہیں۔

1944ء کے اواخر میں جاپانیوں کی پسپائی شروع ہوگئی۔ جاتے وقت انہوں نے رنگون کو آزاد ہند فوج کے حوالے کر دیا جہاں بالآخر مئی 1945ء میں برطانوی افواج نے قبضہ کر لیا۔ آزاد ہند فوج کے تمام افسر اور جوان گرفتار کر لیے گئے۔ جن کی تعداد پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ سبھاش چندر بوس رنگون سے فرار ہوکر بنکاک اور پھر وہاں سے سنگاپور چلا گیا۔ یہاں سے وہ جون، جولائی 1945ء کے دوران شملہ کانفرنس اور ویول پلان کے خلاف تقریریں نشر کرتا رہا۔ اگست کے وسط میں جاپان نے تمام محاذوں پر ہتھیار ڈال دیئے اور جنگ ختم ہوگئی۔ 18راگست کو سبھاش چندر بوس بعض دوسرے جاپانی افسروں کے ہمراہ ایک بمبار طیارے میں سائیگون سے ٹوکیو جا رہا تھا کہ تائیوان کے اوپر سے پرواز کے دوران اسے آگ لگ گئی اور یہ گر کر تباہ ہوگیا۔ سبھاش چندر بوس مر چکا تھا لیکن ہندوستان میں بہت سے لوگ بڑی دیر تک یہ سمجھتے رہے کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ سبھاش چندر بوس اور اس کی آزاد ہند فوج کو ہندوستان کے تمام فرقوں میں مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ اس میں شامل افسروں اور سپاہیوں کا تعلق تمام فرقوں کے ساتھ تھا بلکہ بیشتر قائدانہ ذمہ داریاں اقلیتی فرقوں کے افسروں کے سپرد تھیں۔

عوام الناس کے سامراج دشمن مظاہرے اور کانگرس کی مفاد پرستی

جب اس فوج کے افسروں پر ''شہنشاہ معظم'' کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں مقدمے چلانے کے فیصلے کا اعلان ہوا تو ہندوستان کے طول وعرض میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔ معاشی بدحالی کا دور تو شروع ہو ہی چکا تھا۔ بے روزگاری عام تھی۔ مہنگائی بہت زیادہ تھی اور ضروریات زندگی کی قلت تھی۔ لہٰذا غریب عوام کو سامراج کے خلاف اپنے غصے اور نفرت کے اظہار کے لیے اچھا خاصا بہانہ مل گیا۔ ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جس میں مسلمانوں نے بھی شرکت کی۔ کوئی آواز آزاد ہند فوج اور اس کے افسروں کے خلاف نہیں اٹھتی تھی۔ متفقہ مطالبہ یہ تھا کہ محبوس افسروں کو فوراً رہا کیا جائے۔ جب 5رنومبر کو ان افسروں کے خلاف دہلی کے لال قلعے میں مقدموں کی سماعت شروع ہوئی تو کانگرس کی طرف سے وکلاء کا ایک پینل جو بھولا بھائی ڈیسائی، سر تیج بہادر سپرو اور جواہر لال نہرو پر مشتمل تھا، ملزموں کی پیروی کے لیے پیش ہوا۔ مسلم لیگ کی

طرف سے بھی کئی وکیلوں نے پیروی کی کیونکہ ملزموں کی فہرست میں مسلمان افسروں کے نام بھی شامل تھے۔ لال قلعے میں اس مقدمے بازی سے 1857ء کی جنگ آزادی کی یاد تازہ ہو گئی اور برطانوی سامراج کے خلاف نفرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانی فوجوں کو ویتنام، ملایا اور انڈونیشیا میں حریت پسندوں کو کچلنے کے لیے استعمال کیا جارہا تھا۔ عوامی مطالبہ یہ تھا کہ آزاد ہند فوج کے مجاہدین آزادی کو رہا کیا جائے اور ویتنام، ملایا اور انڈونیشیا سے ہندوستانی فوجوں کو واپس بلایا جائے۔ مقدمے کی کاروائی کے پروپیگنڈے کے ساتھ ساتھ عوامی مظاہروں کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ دہلی اور لاہور سے لے کر کلکتہ، مدراس اور بمبئی تک وسیع پیمانے پر فسادات ہوئے، لوٹ مار ہوئی اور پولیس نے گولیاں چلائیں۔ متعدد لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ بدامنی کئی ہفتے تک جاری رہی تاآنکہ 3رجنوری 1946ء کو مقدموں کے فیصلے سنائے گئے۔ سارے ملزموں کو مختلف میعاد کی قید کی سزائیں دی گئیں۔ لیکن چند دن بعد کمانڈر انچیف نے یہ سزائیں معاف کر کے سارے ملزموں کو رہا کر دیا۔ برطانوی سامراج کو بہت خفت اٹھانا پڑی۔ عوامی غصے اور نفرت نے اسے ذلت آمیز پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا وقار مٹی میں مل گیا تھا۔

آزاد ہند فوج کے مسئلے پر حکومت برطانیہ کے خلاف ایجی ٹیشن سے کانگرس کو بہت فائدہ پہنچا جو 1942 کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' ایجی ٹیشن کے کچلے جانے کے بعد سے انتشار کا شکار ہو گئی ہوئی تھی۔ کانگرسی لیڈریوں تو ہمیشہ سبھاش چندر بوس کے مخالف رہے تھے۔ اس کی ''تشدد پسندی'' کے مقابلے میں گاندھی ہمیشہ ''عدم تشدد'' کا علمبردار بن کر میدان میں نکل آتا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ زندہ نہیں رہا تھا اور اس کے ساتھیوں کے خلاف انگریز حکام کی کاروائی کے اعلان سے ملک میں ایجی ٹیشن کی فضا قائم ہو گئی تھی تو اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے سارے کانگرسی رہنما میدان عمل میں نکل آئے تھے۔ آر۔سی۔ موجمدار لکھتا ہے کہ '' کانگرس کو آئندہ انتخابات لڑنے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا تھا۔ یہ تین سال سے بدحالی کا شکار تھی۔ چونکہ اس کے بہت سے رہنما اور کارکن جیلوں میں تھے اس لیے اس کی تنظیم ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس کے فنڈ زحکومت نے ضبط کر رکھے تھے۔ لیکن جیسا کہ ماضی میں ایک سے زیادہ مرتبہ ہو چکا تھا اس مرتبہ بھی ہوا کہ حکومت سے ایسی غلطیاں سرزد ہو گئیں جو ایسے نفسیاتی مرحلے میں

اس (یعنی کانگرس) کے کام آ گئیں جب کہ اس کی تقدیر کا ستارہ زوال کی آخری حد کو چھو رہا تھا۔'' آگے چل کر آر۔سی۔موجمدار نے ہوگ ٹوائے (Hugh Toye) کا حوالہ دیتے ہوئے مزید لکھا ہے کہ ''یہ بات ماننے کے لیے خاصی معقول بنیاد موجود ہے کہ آزاد ہند فوج کے آدمیوں پر مقدمہ چلانے کے حکومت کے فیصلے کو خود کانگرسی رہنماؤں نے اطمینان بخش پسندیدگی سے دیکھا چونکہ کانگرسی رہنما اور سبھاش بوس ایک دوسرے سے سخت بیزار رہتے تھے اور کانگرسی رہنماؤں نے سبھاش بوس کے جاپانیوں کے ساتھ اتحاد پر کڑی تنقید کی تھی اور یہ دھمکی دی تھی کہ اگر وہ ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کے خلاف لڑائی کی جائے گی اس لیے اب کانگرسی رہنماؤں کے رویے میں یکا یک تبدیلی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو قدرتی طور پر یہ شبہ ہوا کہ کانگرس سوچی سمجھی تدبیر کے طور پر آزاد ہند فوج کے مسئلے کو الیکشن سٹنٹ کے طور پر استعمال کر رہی ہے۔ اس میں کوئی سچائی تھی یا نہیں لیکن اس بات میں ذرا سا بھی شک نہیں ہے کہ کانگرس نے آزاد ہند فوج کے افراد پر مقدمے سے پیدا شدہ عوامی جوش و خروش کی لہر کے ابھار پر انتخابات میں بھاری کامیابی حاصل کی۔''[1]

جہاں تک کانگرسی رہنماؤں کی آزاد ہند فوج کے افراد کے ساتھ ہمدردی کا تعلق تھا تو ایک کانگرسی رہنما اور صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے گورنر سرحد جارج کننگھم سے کہا تھا کہ ''اگر ان کو رنگون یا سنگاپور ہی میں گولی سے اڑا دیا جاتا تو اس پر ہر شخص خوش ہوتا۔''[2] لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ بقول وی پی مینن ''ان افراد پر مقدمہ چلانے کا انگریزوں نے احمقانہ فیصلہ کیا۔'' اور کانگرس کے پاؤں تلے یہ بٹیرا آ گیا جس پر اس نے اپنی انتخابی مہم استوار کی۔ ابوالکلام آزاد نے بھی یہ تفصیل بیان کی ہے کہ اس ایجی ٹیشن کے دوران کانگرس کی مقبولیت میں کس طرح اضافہ ہوا اور اس عرصے میں جہاں بھی جاتا لوگ کس طرح اس کے گرد جمع ہو جاتے اور گرم جوشی کا اظہار کرتے تھے۔ تاہم کانگرسی رہنما اس ایجی ٹیشن میں تشدد کے عنصر کے داخل ہونے اور اس کے بے قابو ہو جانے کے خلاف تھے کہ وہ اسے محض ''الیکشن سٹنٹ'' کے طور پر ہی استعمال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ آزاد ہند فوج کے افسروں کے خلاف مقدمات کے نتیجے میں جو شدید عوامی ردعمل ہوا اس نے تشدد کا رخ اختیار کر لیا ہوا تھا۔ انگریزوں کی اتھارٹی کو ہر جگہ تشدد کے ساتھ چیلنج کیا جانے لگا۔ برصغیر

کے مختلف علاقوں میں بہت سی دہشت پسند تنظیمیں جو پہلے ہی موجود تھیں انہیں سرگرم ہونے کا موقع مل گیا۔ ان میں بمبئ کے ضلع ستارہ میں راشٹریہ سیوک دل، ناگ پور میں ہندوستان ریڈ آرمی، سی پی میں امراؤ اور آسام میں سانتی سینا زیادہ اہمیت کی حامل تھیں۔ اگرچہ ان پر پابندی عائد تھی لیکن وہ سرگرم تھیں۔ کلکتہ میں سبھاش چندر بوس کے حامی بنگالی قوم پرست درمیانے طبقے نے مشتعل ہو کر اتنے پرتشدد مظاہرے کئے کہ فوج کو طلب کرنا پڑا۔ لوگوں نے فوج کی بھی پرواہ نہ کی اور فوجی گاڑیاں نذر آتش کر ڈالیں۔ صورت حال بڑی مشکل سے فوج کے قابو میں آئی۔ اسی دوران ہندو مسلم فسادات کی آگ بھی بھڑک اٹھی۔ بمبئ کے فسادات پر قابو پانے کے لیے پونا سے برطانوی بٹالین کو بلا کر تعینات کیا گیا۔ اگرچہ بظاہر حالات پر قابو پا لیا گیا تھا۔ لیکن چھرا گھونپنے کی اکا دکا وارداتیں جاری رہیں۔ گویا فوج بھی پوری طرح امن عامہ بحال نہ کر سکی تھی۔

یو۔ پی میں بھی حکومت مخالف دہشت پسند گروہ منظم ہو رہے تھے۔ 19 ر نومبر کو یو۔ پی کے گورنر مالکم ہیلی نے ان گروہوں کے بارے میں ویول کو لکھا۔ اس نے بتایا کہ" خفیہ رپورٹوں سے معلوم ہوا ہے کہ بنارس اور الہ آباد میں دہشت پسند بریگیڈ بنائے جا رہے ہیں۔ الہ آباد والے گروہ کی قیادت آزاد ہند فوج کا ایک سابقہ لیفٹیننٹ ہریش چندر ورما کر رہا ہے۔" ایک اور رپورٹ کے مطابق، اس نے بتایا کہ" اچھوت پت وردھن" نامی تنظیم کی جانب سے ایک سرکلر جاری ہوا ہے جس میں اس کے ارکان سے کہا گیا ہے کہ سابق فوجیوں، آزاد ہند فوج کے قیدیوں کے اقارب، سول اور ریلوے افسران اور ان کے اقارب کے ساتھ رابطے استوار کیئے جائیں۔"[3] اس قسم کی خبروں سے انگریز افسروں اور ان کے وفادار ہندوستانی افسروں میں بے چینی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ویول، جس نے انہی دنوں یو۔ پی کا دورہ کیا تھا، اس بارے میں پیتھک لارنس کو اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے 16 ر نومبر کے مراسلے میں لکھتا ہے کہ گورنر سے لے کر نچلے سرکاری وغیر سرکاری افراد تک جن سے میں ملا ہوں، میں نے سب کو کانگرسی رہنماؤں کی طرف سے سرکاری ملازموں کے خلاف اور برطانیہ کی مدد کرنے والے دیگر افراد کے خلاف کی جانے والی اشتعال انگیز تقریروں اور دھمکیوں سے پریشان پایا ہے۔ برطانوی افسروں

میں سینئرز کی بہت بڑی تعداد اس رسوا کن صورت حال سے تنگ آ کر پہلا موقع پاتے ہی ریٹائر ہونے کی خواہاں ہے۔ ان کو اپنے بال بچوں کے تحفظ کے بارے میں سخت تشویش لاحق ہے۔ ہندوستانی افسروں کو زیادہ مشکل صورت حال کا سامنا ہے اور ان کے اعصاب بہت آسانی سے متاثر ہو سکتے ہیں کیوں کہ حالات خواہ جو رخ بھی اختیار کریں ان کو بہرصورت یہیں رہنا ہے۔ اس لیے کسی گڑ بڑ کی صورت حال میں ان کی ثابت قدمی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ اسی طرح اس نے فوج کے کمانڈر انچیف کے ایک مراسلے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ آزاد ہند فوج کے مقدمات اور ہندوستانی فوج کے انڈونیشیا میں استعمال کے خلاف تحریک کا یہاں ہندوستانی فوج پر برا اثر پڑ رہا ہے۔[4]

سی۔ پی کے گورنر نے بھی ویول کے نام 26 رنومبر کو اپنے ایک مراسلے میں لکھا تھا کہ ہندو سرکاری افسروں میں کانگرس کے ساتھ ہمدردی پائی جاتی ہے۔ عوام کے حالیہ ایجی ٹیشن کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''اس کا یورپی افسروں پر گہرا اثر ہو رہا ہے اور وہ سخت پریشان ہیں۔ میں پہلے ہی مٹھی بھر یورپی افسروں کی مدد سے اس ایک کروڑ اسی لاکھ کی آبادی اور ایک لاکھ مربع میل کے رقبے پر مشتمل صوبے کا انتظام چلا رہا ہوں۔ اگر ان میں سے کچھ بھی ریٹائر ہو گئے تو مجھے نہیں معلوم کہ صوبے کی انتظامیہ کیسے چلے گی۔''[5] یکم دسمبر کو آسام کے گورنر کلو و نے بھی ویول کو اسی نوعیت کا خط لکھا جس میں یورپی افسروں میں مقامی ماتحتوں اور مقامی آبادی سے خوف میں اضافہ کا ذکر تھا۔ انگریز حاکموں کے ان مراسلوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان اب ان کے لیے ایک بوجھ بن گیا تھا۔ جس سے وہ جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ انگریز سول اور فوجی حکام بری طرح تھک چکے تھے۔ جنگ عظیم دوم کی تباہ کاری نے برطانیہ کو دنیا میں جس مقام پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے پیش نظر برطانوی حکام کے حوصلے ویسے ہی پست ہو چکے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو زیادہ عمر کے تھے وہ اپنے جزیرے میں واپس جا کر ریٹائرڈ زندگی گزارنا چاہتے تھے اور جو کم عمر تھے وہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں اپنے لیے بہتر مواقع دیکھ رہے تھے۔ اب ان کے لئے ہندوستان محض ایک دردِ سر تھا جہاں بے روزگاری، معاشی بدحالی اور فرقہ وارانہ تضاد کی شدت نے امن عامہ اور قانون وضابطے کی صورت کو بے قابو کر دیا ہوا تھا۔

یہ صورت حال ہندو بورژوا کے لیے بھی باعث تشویش تھی۔ گاندھی اور کانگرس کا ایک سرپرست اعلیٰ جی۔ ڈی۔ برلا بعض کانگرسی رہنماؤں کی انتہا پسندانہ تقریروں اور نعروں سے پریشان تھا۔ اس نے اپنے اخبار ہندوستان ٹائمز کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ان کانگرسی رہنماؤں کے سخت بیانات کو ذرا نرم کر کے شائع کیا جائے۔ [6] حکومت ہند کے محکمہ خارجہ سے منسلک ایک نامہ نگار ایف۔ جی اے۔ ونٹ نے برطانوی پارلیمنٹ کے ایک لبرل رکن سر جارج شوسٹر کو 15 ر نومبر کو دہلی سے اپنے ایک خط میں لکھا کہ ''یہاں انتہا پسندی کی حوصلہ شکنی کے لیے برلا اپنا اثر و رسوخ پوری طرح استعمال کر رہا ہے۔'' [7] شوسٹر نے یہ خط وزیر ہند پیتھک لارنس کو بھیج دیا۔ ہندو بورژوا کی نمائندہ کانگرس گڑبڑ کی اس صورتحال سے فائدہ بھی اٹھانا چاہتی تھی لیکن اسے ایک حد سے بڑھنے دینے کی بھی روادار نہیں تھی۔ جب تشدد حد سے بڑھنے لگتا تھا تو گاندھی عدم تشدد کا علمبردار بن کر میدان میں آ جاتا تھا۔

وی۔ پی۔ مینن جو آئی سی ایس تھا اور وائسرائے کے سٹاف میں مشیر برائے آئینی امور کی حیثیت سے تعینات تھا، کانگرس اور حکومت کے مابین رابطے کا کام کرتا تھا۔ اس نے 25 ر اکتوبر کو وائسرائے کے پرنسپل سیکرٹری ایوان جینکنز کے نام اپنے مراسلے میں لکھا ''ہمارے اپنے نقطۂ نظر سے بھی کانگرس کو انتظامیہ میں شریک کر لینا چاہیے کہ اس طرح امن و قانون کے مسئلے پر ہماری پریشانی میں خاصی کمی واقع ہو جائے گی۔ کانگرس کی بے چینی کی جڑ میں اس کے سیاسی عزائم کی ناکامی پوشیدہ ہے۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کی ہفتہ وار رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کانگرس کی مجلس عاملہ اب بات چیت کی طرف مائل ہے اور براہ راست دباؤ کو صرف آخری حربے کے طور پر استعمال کرنے کی خواہاں ہے۔ میرا تاثر بھی یہی ہے اور اس کی تصدیق دوسرے ذرائع سے بھی ہوئی ہے۔'' [8] چنانچہ 3 ر نومبر کو جواہر لال نہرو نے ویول کے ساتھ ملاقات کی جس میں نہرو نے کہا کہ اگر جائز مقاصد کی تکمیل کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو پھر تشدد سے احتراز کیونکر برتا جا سکتا ہے۔ ویول نے کہا کہ ہندوستان کے مستقبل کا انحصار ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تصفیہ پر ہے۔ اس پر نہرو نے کہا کہ مسلم لیگ کی موجودہ قیادت اور پالیسی کے ساتھ کانگرس کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔ [9] چنانچہ آزاد ہند فوج کے مقدمات کے خلاف اکتوبر۔ نومبر میں عوامی احتجاج کی جو لہر اٹھی تھی اس کی بنیاد پر کانگرسی رہنما انگریز

حکمرانوں کے ساتھ پورے ہندوستان کا سودا کرنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ ادھر انگریزوں کو جب کانگرس کے ساتھ مشکل سودے بازی کا سامنا ہوتا تھا تو وہ مسلمانوں کے حقوق کا معاملہ سامنے رکھ دیتے تھے۔ یوں ان کے پیش نظر یہ حقیقت بھی ہوتی تھی کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ طے کئے بغیر ہندوستان آزاد کر دیا گیا تو یہاں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اور اس خون خرابے میں برطانوی مفادات کو زک پہنچنے اور کمیونسٹوں کے فائدہ اٹھا جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

نہرو اور ویول کی ملاقات ناکام رہی تاہم تھوڑے عرصے کے لیے نہرو کی تقریروں کی شدت میں کمی آ گئی لیکن احتجاجی تحریک میں تشدد کا عنصر بڑھتا چلا گیا۔ ہندو بورژوا اس تشدد سے فائدہ تو اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے بڑھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ عدم تشدد کے علمبردار گاندھی کی ایک ذاتی سیکرٹری راجکماری امرت کور نے جو نومبر کے وسط میں لندن گئی ہوئی تھی، وہاں سر سٹیفورڈ کرپس کے ساتھ ملاقات کی جو برطانوی کابینہ کا اہم رکن اور کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کا چیئر مین تھا۔ امرت کور نے کہا کہ ''اگر برطانوی پالیسی کو مناسب طریقے سے ہندوستانی رائے عامہ کے سامنے رکھا جائے تو ہندوستان کو درپیش خطرات کو ٹالنے میں مدد مل سکتی ہے۔'' اس نے فوری طور پر چار اقدام تجویز کئے جو دراصل گاندھی کے تجویز کردہ تھے جو اس نے اپنی سیکرٹری کے ذریعے برطانوی حکومت کے سامنے رکھے تاکہ ان خطرات سے بچا جا سکے جو ہندوستان کے پرتشدد حالات کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے تھے۔ یہ اقدامات تجویز کئے گئے تھے:

1۔ ایک پارلیمانی وفد کو ہندوستان بھیجا جائے۔

2۔ وائسرائے اور گاندھی کی ملاقات ہو۔

3۔ وزیر ہند کو چاہیے کہ وہ نہرو اور جناح کو مذاکرات کے لیے برطانیہ آنے کی دعوت دے۔

4۔ وزیر ہند کو یہ واضح کر دینا چاہیے کہ برطانوی حکومت انتخابات کے بعد اپنی تجاویز پر عملدرآمد کا پختہ ارادہ رکھتی ہے اور اس میں تاخیر کے لیے کوئی بہانہ تلاش نہیں کیا جا رہا ہے۔

19رنومبر کو انڈیا و برما کمیٹی کے اجلاس میں ان تجاویز پر غور ہوا۔ صدارت سٹیفورڈ کرپس نے کی۔ کرپس نے کمیٹی کے ارکان کو امرت کور کے ساتھ اپنی طویل ملاقات سے آگاہ کیا اور اس کی پیش کردہ تجاویز کو ارکان کے سامنے رکھتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ گاندھی ہندوستانی رائے عامہ کو اعتدال کی جانب مائل کرنے کے لیے تیار اور آمادہ ہے۔ کرپس نے یہ بھی بتایا کہ حال ہی میں مجھے نہرو کا ایک خط موصول ہوا ہے جس سے اس کے مایوس کن رویہ کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن امرت کور اور نہرو کے دوسرے دوستوں کا اس خط کے بارے میں کہنا ہے کہ یہ محض شوروغوغا ہے، اگر اسے لندن آنے کی دعوت دی گئی تو وہ ضرور آئے گا۔ کمیٹی کے ارکان نے مذکورہ چاروں اقدامات پر غوروخوض کیا اور ان پر اتفاق کیا۔[10]

گویا گاندھی کی تجاویز بغیر کسی ردوبدل کے قبول کر لی گئی تھیں۔ 22رنومبر کو پیتھک لارنس نے ایک یادداشت کے ذریعہ کابینہ کو مجوزہ چاروں اقدامات پر انڈیا کمیٹی کے ارکان کے متفقہ فیصلے سے آگاہ کیا۔ ویول کی رائے بھی طلب کی گئی۔ 23رنومبر کو ویول نے جوابی تار میں اس تجویز کے پہلے اور چوتھے نکتے سے اتفاق کیا یعنی یہ کہ ایک پارلیمانی وفد کو ہندوستان بھیجا جائے اور یہ کہ برطانوی وزیرہند ہندوستان کے متعلق حکومت برطانیہ کی واضح پالیسی کا اعلان کرے۔ لیکن دوسرے اور تیسرے نکتے کے ساتھ اس نے اختلاف کیا۔ اس نے کہا کہ گاندھی کو ملاقات کی دعوت دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ الٹا نقصان ہوگا۔ کانگرس اسے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرے گی اور مطالبات پر زور دے گی اور مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے لیے شکوک وشبہات پیدا کرنے کا باعث بنے گی۔ نہرو اور جناح کو لندن آنے کی دعوت دیئے جانے کے ساتھ بھی اس نے اتفاق نہ کیا۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ یہ دونوں حضرات اس دعوت کو رد کر کے اس کا سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ دوسری اقلیتیں شبے میں مبتلا ہو جائیں گی۔ یہ بھی شک کیا جائے گا کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے ان دونوں کو انتخابی مہم سے دور لے جانے کا داؤ کھیلا گیا ہے۔[11]

27رنومبر کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام ایک اور مراسلے میں اپنے مذکورہ موقف کا اعادہ کیا۔ 27رنومبر کو یعنی اُسی روز برطانوی کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں بیشتر ارکان نے ویول کی حکومت ہند پر تنقید کی کہ اس نے برطانوی پالیسیوں کی مناسب طور پر تشہیر

نہیں کی۔ تاہم اس میں پارلیمانی وفد بھیجنے اور ہندوستان کے بارے میں پالیسی بیان کے اجراء سے اتفاق ظاہر کیا گیا۔ 28 نومبر کو کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی کا اجلاس بھی وزیراعظم ایٹلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں گاندھی اور وائسرائے کے مابین ملاقات اور نہرو اور جناح کو لندن آنے کی دعوت کی تجاویز پر ویول کی اختلافی رائے کا جائزہ لیا گیا۔ کرپس کا اصرار تھا کہ ''اس کی اطلاع کے مطابق نہرو تو ضرور دعوت قبول کر لے گا۔''[12] ارکان کے مابین ان تجاویز پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ تاہم کابینہ اور اس کے چند وزیروں پر مشتمل انڈیا و برما کمیٹی کے مذکورہ اجلاسوں میں کانگرس کے بارے میں عمومی طور پر ہمدردانہ رویہ پایا جاتا تھا۔ کمیٹی نے پالیسی بیان کی منظوری دے دی اور 4 دسمبر کو وزیر ہند پیتھک لارنس نے پارلیمنٹ میں یہ بیان جاری کر دیا۔ اس میں کہا گیا کہ ہندوستان میں انتخابات کے فوراً بعد منتخب نمائندوں اور ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ آئین وضع کرنے کے طریقہ کار پر مذاکرات کئے جائیں گے۔ یہ خیال غلط طور پر جڑ پکڑ گیا ہے کہ ان مذاکرات کو تاخیری حربے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ اس پالیسی بیان میں برطانوی پارلیمانی وفد کے ہندوستان بھیجے جانے کا بھی اعلان کیا گیا اور کہا گیا کہ یہ لوگ بہ نفس نفیس جا کر برطانیہ کے عوام کی اس خواہش کے بارے میں اہل ہندوستان کو آگاہ کریں گے کہ ہندوستان بہت جلد برطانوی دولت مشترکہ میں شریک ایک آزاد ریاست کا درجہ حاصل کر لے گا۔[13] چنانچہ یہاں بھی صرف ایک آزاد ریاست کے طور پر ہندوستان کا ذکر کیا گیا۔ تقسیم یا علیحدگی کی جانب کوئی اشارہ تک نہیں کیا گیا تھا۔

گاندھی اور ویول کے مابین براہ راست مذاکرات تو نہ ہو سکے جیسا کہ گاندھی نے اپنی سیکرٹری امرت کور کے ذریعے برطانوی حکومت کو تجویز کیا تھا تاہم دسمبر کے اوائل میں گاندھی نے کلکتہ جا کر بنگال کے گورنر کیسی کے ساتھ ملاقاتیں کیں جو بالواسطہ طور پر ویول اور حکومت برطانیہ کے ساتھ ہی تھیں کیونکہ کیسی ہر ملاقات کی تفصیل سے بذریعہ ٹیلی فون اور تار ویول کو آگاہ کر کے اس کی رائے حاصل کر لیتا تھا اور اس بات چیت کی تفصیل کی ایک نقل پیتھک لارنس کو لندن بھی بھیج دیتا تھا۔ کیسی اور گاندھی کے مذاکرات یکم دسمبر کو شروع ہوئے اور 4 دسمبر تک جاری رہے۔ کیسی نے گاندھی سے کانگرسی لیڈروں کی تشدد آمیز تقریروں کے بارے میں شکایت کی۔ گاندھی نے اس تشدد آمیزی کا سبب شملہ کانفرنس کی ناکامی کو قرار دیا۔ کیسی نے

اسے یقین دلایا کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ ہندوستان کو جلد از جلد سیلف گورنمنٹ دیئے جانے کے خواہاں ہیں اور شملہ کانفرنس اسی خواہش کے تحت بلائی گئی تھی۔ کیسی نے کہا کہ ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دیئے جانے کی راہ میں انگریز نہیں بلکہ مسلم لیگ حائل ہے جو ہندوؤں کے خوف (Hinduphobia) میں مبتلا ہے اور کسی بھی آل انڈیا گورنمنٹ کی تشکیل کی سختی سے مخالف ہے کہ اس میں ہندوؤں کو غلبہ حاصل ہوگا۔ کیسی نے کہا کہ کانگرس نے جانتے ہوئے یا انجانے میں صورت حال کو توڑ مروڑ کر پیش کیا اور اپنے مخالف کے بجائے امپائر (Umpire) کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔ انگریزوں کو تو اس طرح الزام دیا جا رہا ہے۔ گویا مسلم لیگ کو کانگرس سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ کیسی نے کہا کہ ہمارے ساتھ تعلقات میں تلخی پیدا کرنے کے بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ مستقبل کے آل انڈیا آئین میں مسلمانوں کے لیے تحفظات کا عام اعلان کر دیں کہ جو کانگرس کو بخوشی قابل قبول ہو اور اس طرح مسلمانوں کے خدشات کی بیخ کنی کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ سارے مسلمان پاکستان کے خواہاں نہیں ہیں بلکہ وہ مستقبل میں منصفانہ سلوک کی ٹھوس شہادت چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں گاندھی نے کیسی سے کہا کہ ہم (یعنی گاندھی اور کانگرس) اس سے پیشتر مسلمانوں کو آئینی تحفظات فراہم کرنے کے لیے جن باتوں پر رضامند ہوتے رہے ہیں ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ ہم مسلم لیگ کو انتہا درجے کی رعائتیں دینے پر بھی آمادہ ہوئے، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جناح مسلسل قیمت بڑھاتا چلا گیا...... یہاں تک کہ وہ ان تحفظات کے منطقی انجام پاکستان تک پہنچ گیا۔ اس سے کم کوئی چیز اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ اس بناء پر میں ان تحفظات کا عام اعلان نہیں کروں گا جن پر میں اس سے پیشتر رضامندی ظاہر کر چکا ہوں۔ میں تو پاکستان کو بھی بالذات تسلیم کر چکا تھا۔ گاندھی نے مزید کہا کہ جناح ایک بوالہوس شخص ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مشرق وسطیٰ اور دوسری جگہوں کے مسلمانوں کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ حالیہ گڑ بڑ اور ہنگاموں کے بارے میں بات ہوئی تو کیسی لکھتا ہے کہ ''اس نے یہ کہہ کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ وہ اس دوران ان لوگوں کے ساتھ ملاقات کرنے سے اجتناب برتتا رہا ہے جنھوں نے ان ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر تقریریں کی تھیں۔''[14] گویا گاندھی خود کو ایک علیحدہ غیر جانبدار حیثیت میں رکھ کر حالیہ ہنگاموں اور گڑ بڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگرس اور

حکومت کے مابین سودے بازی کرانا چاہتا تھا۔ ہندوستان میں جب بھی تشدد کی لہر پھیلتی تھی، گاندھی حکومت کے ساتھ اس تشدد کا سودا چکانے کیلیے بیچ میں آ جاتا تھا اور اس مقصد کے لیے خود عدم تشدد کا علمبردار بن جاتا تھا۔ حالیہ ہنگاموں میں سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کے افراد پر مقدمات کی وجہ سے بنگالی قوم پرست نوجوانوں نے سب سے زیادہ گڑ بڑ پھیلائی تھی یہاں تک کہ کلکتہ کو فوج کے حوالے کر دینا پڑا تھا۔ اس صورت حال پر انگریز حکومت کے ساتھ ساتھ ہندو بورژوازی کو بھی سخت تشویش لاحق ہوگئی تھی کہ اس کا مفاد بھی تشدد کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ہندو بورژوازی کے مفاد ہی کی خاطر گاندھی نے عدم تشدد کا نعرہ وضع کیا تھا۔ جب اور جہاں کہیں تشدد بھڑکتا گاندھی عدم تشدد کا چیمپیئن بن کر وہاں پہنچ جاتا چنانچہ اس مرتبہ پھر گاندھی دسمبر کے اوائل میں بنگال کا دورہ کرنے آ پہنچا تھا۔ گورنر کیسی نے اس کو بذریعہ کار اور بذریعہ کشتی سفر کرنے کی تمام تر سہولتیں بہم پہنچانے کے اہتمام کے بارے میں ویول کو پہلے ہی آگاہ کر دیا ہوا تھا۔[15] گاندھی کا یہ دورۂ بنگال انگریز حکومت اور ہندو بورژوازی دونوں کے مشترکہ مفاد کے تحت عمل میں لایا گیا تھا۔ مذکورہ ایجی ٹیشن پر گھنشام داس برلا کی تشویش کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ گاندھی کے اس دورے کا اہتمام ٹاٹا گروپ کی طرف سے گورنر کیسی کے تعاون سے کیا گیا تھا۔

کیسی اور گاندھی کے مابین مذاکرات میں بھی ٹاٹا گروپ کو دخل تھا۔ 4/دسمبر کو کیسی نے ویول کو اپنے ایک مراسلے میں اس بارے میں آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''گاندھی کے ساتھ اپنے مذاکرات کی رپورٹ ارسال کرنے کے علاوہ میں آپ کو اپنے دو مزید مذاکرات کی تفصیل سے بھی آگاہ کرنا چاہتا ہوں جو ایک یورپ زدہ ہندو نوجوان سدھیر گھوش کے ساتھ ہوئے ہیں جو کہ ٹاٹا کی آئرن اینڈ سٹیل کمپنی کے جنرل مینجر سر جہانگیر (جیوانی) گھانڈی کا پرسنل اسسٹنٹ ہے۔ وہ ایم کے گاندھی کا ذاتی دوست ہے اور اُس کے دورۂ بنگال کے انتظامات کے سلسلے میں گزشتہ چھ مہینے سے میرے اور گاندھی کے درمیان بیچو لئے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ میری اس سے کئی بار ملاقات ہوئی ہے۔ میں اسے بالکل صحیح آدمی سمجھتا ہوں۔''[16] اس کے بعد وہ سدھیر گھوش کے ساتھ اپنی 2/دسمبر کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ'' گاندھی کے اردگرد موجود لوگوں کا عمومی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ چونکہ انتخابات سے پیشتر یا بعد میں شملہ کانفرنس کی طرز پر ہونے والے مذاکرات کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اور یہ کہ ہندوستان کا کوئی متفقہ حل دریافت نہیں ہو

سکتا، کانگرس ملک کی سب سے بڑی جماعت ہے اس لیے اگر مسلم لیگ اتفاق نہیں کرتی تو ہندوستان کا کنٹرول کانگرس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ کانگرس خود مسلم اقلیت کو مطمئن کر لے گی کیونکہ ظاہر ہے دس کروڑ کی اس آبادی کو مستقل طور پر بے چین حالت میں نہیں رکھا جا سکتا کہ اس طرح تو ہندوستان میں کوئی منظم حکومت قائم ہی نہیں ہو سکے گی۔ برطانوی وائسرائے چند برس تک آئینی سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دے سکتا ہے اور اسے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے خصوصی اختیارات حاصل ہوں گے۔'' 4/دسمبر کو کیسی اور سدھیر گھوش کی پھر ایک ملاقات ہوئی جس میں اس نے ولبھ بھائی پٹیل اور کانگرس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے رہنماؤں کے خیالات سے کیسی کو آگاہ کیا۔ یہ رہنما کلکتہ میں جمع ہوئے تھے اور انتخاب کے بعد وسیع پیمانے پر تحریک چلانے اور بقول نہرو ''انقلاب کرنے'' کے عزائم کا اظہار کر رہے تھے۔ گھوش کے مطابق گاندھی کا خیال تھا کہ اس آفت کو ٹالنے کی ایک ہی صورت ہے کہ انتخابات کے بعد کانفرنس بلائی جائے۔ گھوش کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد کیسی انہی دنوں میں اپنی گاندھی کے ساتھ ملاقاتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''ان ملاقاتوں میں گاندھی نے مجھ سے دراصل یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ تحریک کی صورت میں ہم کانگرس کو کس حد تک جانے کی چھوٹ دے سکتے ہیں۔''[17] کیسی کے گاندھی اور سدھیر گھوش کے ساتھ مذاکرات کا لب لباب ایک ہی تھا کہ اگر ہندوستان کو تشدد کی لہر سے محفوظ رکھنا مقصود ہے تو کانگرس کو پورے ہندوستان کا اقتدار منتقل کر دیا جائے، تو اس صورت میں برطانوی وائسرائے کی بالا دستی بھی چند برس کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے جو یہاں اپنے مفادات کی نگرانی کر سکتا ہے۔

6/دسمبر کو جی۔ ڈی برلا نے حکومت برطانیہ کے پارلیمانی نائب وزیر ہند مسٹر ہینڈرسن کو خط میں لکھا کہ ''خوش قسمتی سے گزشتہ چار روز سے گاندھی جی اور مسٹر کیسی کے مابین مذاکرات چل رہے ہیں جو ایک بہتر ماحول پیدا کرنے کی راہ ہموار کریں گے۔''[18] چنانچہ برلا اور ٹاٹا دونوں کی امیدیں گاندھی کے ساتھ وابستہ تھیں کیونکہ دونوں کو ایک ہی تشویش لاحق تھی کہ اگر عوام الناس تشدد کی راہ پر چلتے ہوئے کسی اور سمت میں نکل گئے تو برطانوی سامراج کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا، خود ہندو بورژوا کے مفاد کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ یاد رہے کہ سرت چندر بوس

نے کلکتہ کے حالیہ پرتشدد ہنگاموں کی ذمہ داری کمیونسٹوں پر عائد کی تھی۔[19] چنانچہ ان حالات میں برلا اور ٹاٹا بہت جلد انگریزوں کے ساتھ بلاشرکت غیرے پورے ہندوستان کا سودا چکانا چاہتے تھے۔ طریقۂ واردات یہ تھا کہ ان کا آلۂ کار گاندھی بین بین چل رہا تھا۔ جب کہ نہرو اور پٹیل انتہا پسندانہ روش اختیار کئے ہوئے تھے۔ آزاد ہند فوج کے مقدموں کے حوالے سے ہنگاموں کی جو حالیہ لہر چلی تھی، کانگرسی رہنما اس کا فائدہ بھی اٹھانا چاہتے تھے اور اسے ایک حد کے اندر محدود بھی رکھنا چاہتے تھے۔ وہ محدود پیمانے کی ہنگامہ آرائی اور اپنی شعلہ بیان تقریروں کے ذریعے برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے علاوہ انتخابی مہم کو بھی گرم کرنا چاہتے تھے۔ انتخابات کے بعد بھی وہ یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہتے تھے۔ مگر وہ بھی حد کے اندر رہ کر اور اسی ''حد'' کا عندیہ لینے کی خاطر گاندھی نے کیسی کے ساتھ ملاقاتیں کی تھیں۔ اسی پس منظر میں 7 /دسمبر کو آزاد، پٹیل اور نہرو نے بھی کیسی کے ساتھ ملاقات کی۔ انہوں نے شملہ کانفرنس کی ناکامی پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ جس میں کانگرس وائسرائے کی نئی ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہونے کے لیے تیار ہوگئی تھی اور اس کی طرف سے نامزد ارکان کی فہرست بھی وائسرائے کو بھیج دی گئی تھی۔ انہوں نے آئی۔ سی۔ ایس افسروں پر الزام دھرا جو ''ہمیشہ مسلم لیگ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے لیے تیار رہتے ہیں'' اور یہ کہ وائسرائے ان کے کہنے میں آ گیا۔ جواب میں کیسی نے اس الزام کو غلط قرار دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر تشدد کی راہ اختیار نہ کریں۔ حکومت کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ تشدد سے نپٹ سکتی ہے۔ اس طرح یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔

10 /دسمبر کو ویول ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرنے کے لیے کلکتہ میں تھا۔ گاندھی نے اسی روز شام کو اس کے ساتھ ملاقات کی۔ اس ملاقات کی تفصیل سے پیتھک لارنس کو آگاہ کرتے ہوئے ویول نے اپنے مراسلے میں لکھا کہ ''گاندھی نے تسلیم کیا ہے کہ تشدد کا خطرہ واقعی موجود ہے اور یہ کہ وہ اس کے ٹمپریچر کو کم کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔'' اسی مراسلے میں ویول نے دیگر رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ''گاندھی کانگرس کے لہجے کو نرم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور یہ کہ کانگرس اس وقت کسی گڑبڑ کے حق میں نہیں ہے۔''[20] 14 /دسمبر کو بمبئی کے گورنر کولول نے بھی ویول کو لکھا کہ ''یہاں عدم

تشدد کے حامی عناصر کے اثر ورسوخ سے اچھے نتائج پیدا ہوئے ہیں۔ کانگرس ہائی کمان میں بھی یہ رجحان غالب ہو رہا ہے۔ نیز یہاں ایسی علامتیں مل رہی ہیں جن سے نرم روی کا اندازہ ہوتا ہے۔"[21] 18 دسمبر کو ویول نے بھی پیتھک لارنس کو لکھا کہ کانگرس کی جانب سے انتخابات کی تکمیل تک میانہ روی اختیار کیے جانے کے آثار نظر آتے ہیں۔[22] اس طرح آزاد ہند فوج کے افسروں کے خلاف مقدمات کے ردعمل میں اٹھنے والی شدید سامراج دشمن عوامی لہر کو ہندو بورژوا کی نمائندہ جماعت کانگرس نے اپنے انتخابی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بعد منتشر کر کے عدم تشدد، میانہ روی اور نرم روی کی نذر کر دیا۔

انتخابات مکمل ہو چکے تو آزاد ہند فوج کے بعض افسر ابھی بھی قید میں تھے جن کی رہائی کے لیے مارچ 1946ء کے اوائل میں کلکتہ اور پھر دہلی میں پرتشدد مظاہرے ہوئے لیکن کانگرس کو اب اس ایجی ٹیشن کی مزید کوئی ضرورت نہیں رہ گئی تھی کیونکہ وہ انتخابات میں وسیع کامیابی حاصل کر چکی تھی اور اب صوبائی حکومتوں کی تشکیل میں مصروف تھی۔ اس سلسلے میں پنجاب میں یونینسٹوں کے ساتھ جوڑ توڑ کرنے کے بعد ابوالکلام آزاد دہلی پہنچا تو لکھتا ہے کہ "...... میں لارڈ ویول سے ملا۔ اس نے ان واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ سب کچھ کانگرس کی اس یقین دہانی کے برعکس ہے جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کا سیاسی مسئلہ پرامن ماحول میں حل کیا جائے گا۔ میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوا کہ اس کی شکایت بجا تھی۔ میں نے دہلی کے کانگرس کے تمام کارکنوں کو طلب کیا اور ان سے کہا کہ کانگرس کو شدید بحران کا سامنا ہے۔ تمام قومی تحریکوں میں ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں رہنماؤں کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ آیا انہوں نے عوام کی قیادت کرنی ہے یا پیروی کرنی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ہم اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ اگر کانگرس سمجھتی ہے کہ ہندوستانی مسئلے کا حل صرف پرامن ذرائع سے ہی ممکن ہے تو پھر کانگرس والوں کو چاہیے کہ یہ پیغام عوام تک پہنچائیں اور خود بھی اس پر عمل کریں۔ میں نے ان سے کہا کہ کم از کم میں تو اس کے لیے تیار نہیں ہوں کہ سب سے سہل راستہ اختیار کیا جائے اور عوام جو بھی کریں اسے تسلیم کر لیا جائے۔ دہلی میں جو کچھ ہوا ہے وہ میں سمجھتا ہوں کہ غلط ہوا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں رائے عامہ کی رہنمائی اور رہبری کرنے کی تو کوشش کروں گا لیکن میں ہجوم کی خواہشات کی

تقلید نہیں کروں گا۔ اگر آپ کو میرا یہ رویہ پسند نہیں ہے تو آپ کوئی اور رہنما ڈھونڈ لیں۔"[23]
آزاد کی اس قدر بوکھلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ سرکاری ذرائع کے مطابق مذکورہ پرتشدد ہنگاموں میں کمیونسٹ ملوث تھے[24] اور صورت حال کانگرسی کارکنوں کے قابو سے باہر نکل گئی تھی۔ کانگرس بنیادی طور پر ہندو بورژوا کے مفاد کی نمائندہ جماعت تھی اس لیے انتخابات میں "الیکشن سٹنٹ" کی حد تک تو اس ایجی ٹیشن سے فائدہ اٹھایا گیا مگر پھر جب معاملہ ہاتھ سے نکلتا ہوا اور کمیونسٹوں کے پاس جاتا نظر آنے لگا تو ایجی ٹیشن کی حوصلہ شکنی کر کے خود کو اس سے الگ تھلگ کر لیا گیا۔

باب: 6

انتخابی مہم کا بنیادی سوال: منقسم یا متحدہ ہند

مسلم لیگ کے حصول پاکستان کے نعرے پر کانگرس، انگریزوں اور سکھوں کی تشویش

آزاد ہند فوج کے افراد پر مقدمے کے خلاف ایجی ٹیشن اور ساتھ ساتھ چلنے والی انتخابی مہم کے دوران کانگرسی رہنماؤں نے بالعموم اور نہرو، پنت اور پٹیل نے بالخصوص اپنی تقریروں اور پراپیگنڈے میں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کے خلاف سخت گیر رویہ اختیار کیا ہوا تھا۔ وہ ہر جگہ کہتے تھے کہ بہت جلد برطانوی سامراج کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے گا۔ عنقریب کانگرس کو پورے ہندوستان کی حکمرانی ملنے والی ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ یہ ایک مصنوعی مسئلہ ہے جسے انگریزوں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے اصول کے تحت پیدا کر رکھا ہے۔ بمبئی کے ہندو مسلم فسادات چند شر پسندوں کی کاروائی تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مسلم لیگ کے ساتھ کسی قسم کی بات چیت نہیں ہوسکتی۔ یہ ناقابل عمل نظریات کی حامل ایک رجعت پسند جماعت ہے۔ دراصل برطانیہ مخالف ایجی ٹیشن کی جو فضا بن گئی تھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کانگرس کی کوشش یہ تھی کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ انتخابات کی تکمیل ہوتے ہی انگریز یہاں سے کوچ پر مجبور ہو جائیں اور کانگرس کو بلا شرکت غیرے پورے ہندوستان کا اقتدار منتقل کر جائیں۔ اس بنیاد پر ہندوؤں کی اکثریت کانگرس کی حمایت میں پرجوش تھی۔

ادھر مسلم لیگ کی صورت حال یہ تھی کہ مطالبہ پاکستان اس کا انتخابی منشور بن گیا تھا۔

مسلمان درمیانہ طبقہ بھی اب برملا اظہار کر رہا تھا کہ انگریز، جو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہیں، انہیں ہندوؤں کی کانگرس کو پورے ہندوستان کی عملداری سونپنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنے سے پہلے پاکستان کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس سے پنجاب میں سکھوں اور ہندوؤں میں بے چینی پھیل گئی۔ انگریزی سامراج کے وفادار یونینسٹ جاگیردار بھی بہت پریشان ہوئے اور اپنی وفاداریاں مسلم لیگ سے وابستہ کرنے کی سوچنے لگے۔ فیروز خان نون جیسے لوگ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل چھوڑ کر مسلم لیگ میں آ کر شامل ہو گئے۔ کانگرس کے مسلمان ارکان بھی مایوس ہو کر لیگ کا رخ کر رہے تھے۔ پنجاب کانگرس کے صدر میاں افتخار الدین نے 22 ستمبر کو بمبئی میں ہونے والے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں حق خود ارادیت کے مسئلے پر کانگرسی لیڈروں کے معاندانہ رویے سے بددل ہو کر استعفیٰ دے دیا اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ صوبہ سرحد کے گورنر کننگھم کی ویول کو ارسال کردہ 9 اکتوبر کی ایک رپورٹ کے مطابق وہاں بھی پڑھے لکھے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین منافرت بڑھ رہی تھی اور بیشتر مسلمانوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ میں شمولیت کر لی تھی۔ اس نے رپورٹ میں لکھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد سے فرقہ وارانہ احساسات میں شدت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے اور اب فرقہ وارانہ کشیدگی اس قدر سنگین ہے کہ میرے خیال میں بھی نہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان سرکاری افسر جو اس سے پہلے کبھی سیاست میں ذرا دلچسپی نہ لیتے تھے اب تیزی کے ساتھ ہندوؤں کے مخالف اور مسلم لیگ کے حامی ہوتے جا رہے ہیں۔[1]

ادھر گورنر بنگال کیسی کا بھی یہی مشاہدہ تھا جو بار بار اپنی ڈائری میں درج کرتا تھا کہ وہاں کے مسلمان یہ سوچے سمجھے بغیر کہ پاکستان سیاسی اور معاشی طور پر قابل عمل ہوگا یا نہیں، پاکستان کی حمایت میں پرجوش ہیں اور اس پر کوئی بحث کرنا نہیں چاہتے۔''[2]

درحقیقت انگریزوں کو تشویش اس بات پر تھی کہ ایک طرف تو ان کے خلاف ایجی ٹیشن اور بڑھتا جا رہا تھا، جس سے کانگرس فائدہ اٹھانے کی فکر میں تھی اور دوسری طرف ہندو مسلم تضاد میں اضافہ ہو رہا تھا اور مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان شدت پکڑتا جا رہا تھا۔ انگریز برصغیر سے بوریا بستر لپیٹنے کے لیے تو تیار تھے اور اس کے لیے آئینی طریقے وضع کر رہے تھے۔ لیکن وہ برصغیر کو کسی قیمت پر تقسیم کرنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ ایک منقسم اور منتشر برصغیر، سوویت یونین اور

کمیونسٹ چین کے مدمقابل ایک مضبوط فصیل کا کام نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے جب مسلمان درمیانے طبقے نے پاکستان کو مسلم لیگ کے انتخابی منشور کی حیثیت سے اپنا نصب العین بنا لیا اور انتخابی مہم میں گلی گلی اور محلے محلے "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بن کے رہے گا پاکستان" کے نعرے گونجنے لگے تو برطانوی حکام کے لیے لمحہ فکریہ پیدا ہوا۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتے کے دوران ویول نے راولپنڈی میں فوجی مصروفیات کے سلسلے میں قیام کیا۔ یہاں پنجاب کے گورنر گلانسی اور وزیر اعلیٰ خضر حیات ٹوانہ نے ملاقات میں ویول کو پنجاب کی صورت حال سے آگاہ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ "حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے بارے میں اپنی قطعی پالیسی کا اعلان کرے یعنی یہ واضح کر دیا جائے کہ کرپس تجاویز میں انڈین یونین سے کسی صوبے کو علیحدگی کے حق کا جو وعدہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت اس کا کیا مطلب ہے۔"[3]

اس کے بعد دہلی پہنچ کر ویول نے 22 اکتوبر کو پیتھک لارنس کو لکھا "مجھے اپنے پنجاب کے دورے کے دوران معلوم ہوا ہے کہ مسلم لیگ کا پاکستان کے بارے میں پراپیگنڈہ بڑے پریشان کن اثرات مرتب کر رہا ہے۔ لیگ کے مقررین کھل کر یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ انتخابات اس امر کا فیصلہ کر دیں گے کہ پاکستان بنے گا یا نہیں۔ اور اگر لیگ پاکستانی صوبوں میں جیت گئی تو پھر (پاکستان کے لیے) استصواب یا اسمبلی میں رائے شماری کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس قسم کے بیانات نے نہ صرف مسلمان یونینسٹوں کو بلکہ ہندوؤں اور سکھوں کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ اس سلسلے میں کوئی بیان جاری کریں بلکہ بہتر ہوگا کہ پارلیمنٹ میں اس بارے میں سوال اٹھوانے کا اہتمام کریں اور پھر اس کے جواب میں یہ بیان جاری کریں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ ہم کسی صوبے کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ نئے آئین سے باہر ہونے یا بعد ازاں علیحدگی اختیار کرنے کا حق صوبائی اسمبلی کے انتخابات یا خالص مسلم استصواب کی بنا پر حاصل کر لے گا۔"[4] یاد رہے کہ کرپس تجاویز کے مطابق صوبے کو علیحدگی کا حق اس صورت میں دیا جانا تسلیم کیا گیا تھا، جب بلا تخصیص فرقہ اس صوبے کی ساری آبادی کا استصواب اس کے حق میں ہو۔ مطلب یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں جہاں کہ مسلمانوں کو صرف چند فیصد ہی کی برتری حاصل تھی، کل آبادی کی بنیاد پر کرائے جانے والے استصواب میں ان اضافی چند فیصد مسلم رائے دہندوں کو علیحدگی کے خلاف رائے دینے پر مائل کر لینے سے علیحدگی کو ناکام

بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے جناح صرف مسلم آبادی کے استصواب کا مطالبہ کرتے تھے اور چونکہ مذکورہ انتخابات میں مسلم لیگ تمام مسلم نشستوں پر انتخاب لڑ رہی تھی اس لیے کہا جا رہا تھا کہ اگر مسلم لیگ ان نشستوں پر انتخاب جیت گئی تو گویا اس نے پاکستان پر استصواب جیت لیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے انتخابات کی اس تشریح پر انگریزی حکام اور ان کے پٹھو یونینسٹ وزیر اعلیٰ خضر حیات خان کو پریشانی لاحق ہوئی اور ویول نے اس تشریح کو رد کرنے کے لیے پیتھک لارنس سے برطانوی پارلیمنٹ میں بیان جاری کرنے کی درخواست کی۔ اس کے بعد 25/اکتوبر کو ویول نے پیتھک لارنس کو ایک اور مراسلہ بھیجا جس میں پارلیمنٹ میں وضاحتی بیان جاری کرنے پر مزید زور دیا اور لکھا کہ ''اگر اس اہم مسئلے پر حکومت برطانیہ نے اپنی پوزیشن واضح نہ کی تو انتخابات کے بعد جناح یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ نے اس غلط مفروضے کو درست کرنے کی زحمت کیوں نہیں کی اور ہمیں اس بنیاد پر رائے دہندگان سے ووٹ لینے کا موقع کیوں دیا۔ اور یہ کہ مسلم لیگ کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔'' اس کے بعد ویول نے اسی مراسلے میں اس سوال کا متن درج کیا جو پارلیمنٹ میں کسی ممبر کے ذریعے اٹھوانے کا بندوبست کیا جانا مقصود تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''1942ء کی کرپس تجاویز کے حوالے سے جو کہ آئندہ انتخابات کے بعد وائسرائے اور ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے مابین مذاکرات کی بنیاد ہوں گی، کیا حکومت برطانیہ ایسا کوئی ارادہ رکھتی ہے کہ کسی صوبے کو یہ حق دیا جائے گا کہ وہ ہندوستان کے نئے آئین کو کسی ایک فرقے کی رائے شماری کی بنیاد پر رد کر دے؟'' اور ساتھ ہی ویول نے اس کے جوابی بیان کا متن بھی درج کیا جو پیتھک لارنس کی جانب سے دیا جانا مقصود تھا۔ اس میں کہا گیا کہ ''حکومت برطانیہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی کہ کسی صوبے کو مذکورہ حق صرف ایک فرقے کے ووٹوں کی بنیاد پر دے دیا جائے گا۔''[5] چنانچہ پنجاب کی فرقہ وارانہ ہیئت ترکیبی کو پاکستان کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر حائل کرنے کی کوشش کی گئی۔

27/اکتوبر کو پنجاب کے گورنر برٹرینڈ گلانسی نے ویول کو مراسلہ بھیجا جس میں پنجاب کابینہ کے وزیر ترقیات بلدیو سنگھ کے حوالے سے کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے حامی نعرے لگا رہے ہیں کہ ''پاکستان بہت جلد حقیقت بننے والا ہے اور یہاں شریعت کے مسلم قوانین لاگو ہو جائیں گے اور تمام غیر مسلموں کو بھی اپنی شکایتیں اور مسائل طے کروانے کے لیے مسجدوں کا

رخ کرنا پڑے گا۔ اس پر یہاں کے ہندوؤں اور سکھوں میں بے چینی کے آثار ابھر رہے ہیں۔'' چنانچہ گلانسی نے پھر زور دے کر کہا کہ ''حکومت برطانیہ یہ اعلان کرے کہ کرپس تجاویز میں لفظ ''صوبہ'' سے مراد وہ صوبہ نہیں ہے جو آج کل مراد لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا باوثوق اعلان بڑا بروقت ہوگا اور مسلم لیگیوں کے سخت متعصّبانہ اور خطرناک نظریات کے خلاف تادیب ثابت ہوگا۔ تاہم اگر یہ عندیہ دے بھی دیا جائے کہ انبالہ اور جالندھر کے ڈویژنوں کو علیحدگی کے منصوبے میں شامل نہیں کیا جائے گا تب بھی اس بے ڈھنگے پاکستان کی وجہ سے صوبہ پنجاب کے بقیہ علاقوں میں بے شمار مسائل پیدا ہو جائیں گے جو ناحل پذیر ہوں گے۔ لیکن اگر مذکورہ بیان جاری کر دیا جائے تو اس سے ممکن ہے کہ آئندہ انتخابات کے ایک بیہودہ مسئلہ پر لڑے جانے کے امکان کا کچھ تدارک ہو جائے گا اور اس سے بھی اہم یہ کہ اس سے خانہ جنگی کا خطرہ بھی ٹل جائے گا جو موجودہ حالات میں روز بروز قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔''[6] جہاں تک شریعت کے مسلم قوانین کے لاگو کئے جانے اور غیر مسلموں کو مسجدوں کا رخ کرنے پر مجبور کئے جانے کے نعروں کا تعلق ہے تو ان کی سوائے بلد یو سنگھ کے کسی اور ماخذ سے تصدیق نہیں ہوتی اور نہ ہی لیگ کے کسی رہنما نے کبھی اس قسم کا کوئی بیان جاری کیا۔ دراصل اس قسم کے خدشات کو پاکستان کے مخالف عناصر کی جانب سے ہوا دی جارہی تھی اور پاکستان کو ایک ناقابل عمل سکیم ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ ان میں پاکستان دشمن مسلمان ملاؤں کی جماعتیں، سکھ، ہندو، کانگرسی، انگریز اور یونینسٹ شامل تھے۔

23ر اکتوبر کو اکالی پارٹی کے رہنما مسٹر تارا سنگھ نے بھی ویول کی وساطت سے وزیراعظم ایٹلی کو خط لکھا تھا جس میں مسلم لیگیوں کی جانب سے پاکستان کا نعرہ زیادہ سے زیادہ شدت سے بلند کرنے پر سخت تشویش ظاہر کی گئی تھی اور یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر پنجاب کو اس کی موجودہ سرحدوں کے ساتھ کرپس تجاویز کے مطابق علیحدگی کا حق دے دیا گیا تو سکھ اس کی شدت سے مخالفت کریں گے اور ضرورت پڑی تو مسلح جدوجہد بھی کریں گے۔ حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ وہ صوبہ کی اصطلاح کی وضاحت میں بیان جاری کرے کہ اس سے صوبہ کی موجودہ سرحدیں مراد نہیں لی گئیں ہیں اور یہ کہ صوبے کی حکومت میں سکھوں کو موثر نمائندگی دیئے جانے کا سکھوں کا مطالبہ پورا کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔ اس میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر ان مسلم

علاقوں کو جنہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فتح کر کے پنجاب میں شامل کیا تھا، پنجاب سے نکال دیا جائے تو پنجاب مسلم اکثریت کا صوبہ نہیں رہ جاتا۔[7] تاراسنگھ اور گلانسی کے خطوط میں کم وبیش ایک ہی بات کہی گئی تھی۔

ان خطوط کے حوالے سے ویول نے 29/اکتوبر کو پیتھک لارنس کے نام ایک اور مراسلہ بھیجا جس میں ایک بار پھر زور دیا گیا تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بیان کے ذریعے حکومت برطانیہ کے پاکستان کے بارے میں رویہ سے متعلق پائی جانے والی غلط فہمی کا ازالہ کیا جائے اور یہ واضح کر دیا جائے کہ جناح کا یہ دعویٰ کہ مسلم اکثریتی صوبے کو بقیہ ہندوستان سے صرف مسلم ووٹوں کی بنیاد پر علیحدگی دے دی جائے، قابل قبول نہیں ہے۔ تا آنکہ 1942ء کے مجوزہ اعلان ہی میں کوئی ترمیم کی جائے۔[8] اس کے جواب میں 8/نومبر کو پیتھک لارنس نے ویول کو لکھا کہ ''میں پاکستان کو کوئی تسلی بخش حل نہیں سمجھتا کیونکہ اس سے بے شمار مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔'' 9/نومبر کو پیتھک لارنس نے استصواب کے بارے میں پارلیمنٹ میں مجوزہ بیان دیئے جانے سے اختلاف کرتے ہوئے ویول کو لکھا کہ ''میں آپ کے بیان کردہ دلائل کی قدر کرتا ہوں اور مسلم لیگ کی طرف سے رائے دہندگان کو گمراہ کئے جانے کے خطرے کا بھی مجھے بخوبی اندازہ ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ جناح کو کسی طرح بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہمیں الزام دے کہ ہم نے اس سلسلے میں کوئی غلط مفروضہ قائم کرنے کی اسے اجازت دی ہے۔ ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے کہ جس سے وہ اپنے اس دعویٰ کا جواز مہیا کر سکے کہ ہم اس کے خیالات کو قبول کرتے ہیں کیونکہ مسلم لیگ نے جب کرپس تجاویز کو رد کیا تھا تو اس کی قرارداد میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ ان تجاویز میں علیحدگی کے لیے صرف مسلمانوں کے استصواب کو بنیاد تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جس نوعیت کا بیان جاری کرنے کی آپ نے تجویز دی ہے وہ مناسب نہیں ہے۔''[9]

دراصل حکومت برطانیہ کوئی ایسا اعلان کرنا نہیں چاہتی تھی کہ جس سے ہندوستان کے مستقبل کی آئینی بحث انتخابات میں پارٹی پوزیشن واضح ہونے سے پہلے ہی کسی تعطل کا شکار ہوجائے۔ البتہ یہ نظر آ رہا تھا کہ مارچ 1946ء میں انتخابات کا عمل مکمل ہوجانے کے بعد فریقین کے مابین کھینچا تانی اپنے عروج پر پہنچ جائے گی اور جس مسئلے کو صاف کرنے کی خاطر بیان جاری

کرنے پر ویول کی طرف سے اس وقت زور دیا جارہا تھا، اس وقت پیچیدہ تر صورت اختیار کر چکا ہوگا۔ اس آنے والے خطرہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے 20 رنومبر کو ویول نے پیتھک لارنس کو لکھا ''اگر کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ بات چیت نہ کرنے کے بارے میں اپنے مؤقف پر ڈٹی رہی جیسا کہ اس کے رہنماؤں کے بیانات سے ظاہر ہے اور ادھر مسلم لیگ بھی کسی مفاہمت پر راضی نہ ہوئی تو مجھے اور آپ کو آئندہ موسم گرما میں ہونے والے مذاکرات میں سخت دشواری کا سامنا ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ نے پاکستان کی حد بندی کا ارادہ کیا تو مجھے امید نہیں کہ دونوں فریقین کسی سرحد پر متفق ہو سکیں گے۔ کانگرس صرف اس حد بندی پر رضامند ہوگی جس میں مسلمانوں کے لیے ایسا علاقہ چھوڑا گیا ہوگا کہ ان کے لیے تقسیم بے سود ثابت ہوگی۔ وہ یقیناً پنجاب اور بنگال کو خالصتاً فرقہ وارانہ ووٹ کی بنیاد پر مسلمانوں کے حوالے نہیں کرے گی اور چونکہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر یا حق رائے دہی رکھنے والے تمام لوگوں کے ووٹ کی بنیاد پر جناح کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوں گے اس لیے جناح صرف مسلمانوں کے حق رائے دہی کی بنیاد پر ہی ان صوبوں کو ان کی موجودہ صوبائی حدود کے ساتھ شامل کرنے کو قبول کرے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ ہندوؤں کے بجائے مسلمانوں پر دباؤ ڈالے گی کیونکہ ان کا مطالبہ غیر معقولیت پر مبنی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے پیش نظر بھی تو کچھ ہوگا کہ جس کی بناء پر وہ خود کو ہندو غلبہ سے محفوظ رکھنے کی واحد ممکنہ صورت پیدا کئے بغیر اپنے مطالبات میں کوئی کمی واقع نہیں ہونے دیں گے۔ مجھے شک ہے کہ خانہ جنگی کی صورت کے بغیر کوئی مؤثر دباؤ ڈالا جا سکے گا۔''[10] چنانچہ انگریزوں کو یہ اندیشہ تھا کہ انتخابات کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین تعطل پڑ جانے کی وجہ سے ملک خانہ جنگی کی لپیٹ میں آجائے گا اس لیے وہ مسلسل کسی درمیانی راہ کے بارے میں پہلے ہی سے سوچ بچار کر رہے تھے۔

تاہم فوری مسئلہ یہ تھا کہ انتخابی مہم میں پنجاب میں غیر مسلموں اور بالخصوص سکھوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا تھا کہ اگر پاکستان سکیم کے سامنے حکومت برطانیہ نے اور پھر بالآخر کانگرس نے گھٹنے ٹیک دیئے تو ان کا کیا بنے گا۔ کیونکہ جناح مسلم اکثریت کے تمام صوبوں اور آسام کو ان کی سرحدوں میں کوئی تغیر و تبدل کیے بغیر پاکستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ 8 رنومبر کو انہوں نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کے ساتھ انٹرویو میں اپنا یہ

مطالبہ دہراتے ہوئے ان صوبوں کی علیحدگی کے لیے استصواب کا بھی ذکر نہیں کیا کہ آئندہ انتخابات کے پیش نظر اب وہ اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر یونینسٹ جاگیردار، سکھ، ہندو اور خود انگریز حکام پریشان تھے اور اسی پریشانی کے رفع کے لیے ویول نے پیتھک لارنس سے برطانوی پارلیمنٹ میں بیان جاری کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن اس دوران کانگرس نے جناح کے مطالبے کے خلاف سخت گیر مؤقف اختیار کر کے برطانوی حکومت کی یہ مشکل آسان کر دی۔ 22 نومبر کو ویول نے پیتھک لارنس کو لکھا ''پٹیل اور نہرو نے کانگرس کی جانب سے اعتراضات وارد کئے ہیں۔ اور اب جبکہ کانگرس کی پوزیشن واضح ہو گئی ہے۔ تو سکھوں کی پریشانی بھی دور ہو گئی ہے جو کہ ڈر رہے تھے کہ کہیں کانگرس استصواب کے معاملے میں گھٹنے نہ ٹیک دے۔ ان حالات میں (پارلیمنٹ میں) سوال و جواب کے حق میں میرا بڑا استدلال اب کمزور پڑ جاتا ہے اور اس سے آپ نے بھی جو اختلاف کیا ہے اس میں بھی وزن ہے اس لیے اب اس تجویز کو موقوف کر دینا چاہیے۔''[11] یعنی اب پارلیمنٹ میں بیان دینے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا ہوا دکھا کر پاکستان کی راہ میں روڑہ اٹکانے پر کانگرس اور حکومت برطانیہ دونوں متفق تھے۔ وہ ان دونوں صوبوں کو محض مسلم استصواب کی بناء پر علیحدگی کا حق دینے کو تیار نہ تھے اور اگر تھے تو اس صورت میں وہ ان کی تقسیم چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ جناح کو ان دونوں صوبوں کی تقسیم ناقابل قبول ہے اس لیے اگر ہم اس پر زور دیں گے تو جناح مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ انتخابات کے بعد جب حکومت کے ساتھ مذاکرات شروع ہوں گے تو مسلمانوں کے مابین اپنے مستقبل کے بارے میں اختلافات پیدا ہو جائیں گے۔ 23 نومبر کو پیتھک لارنس نے ویول کو لکھا ''میرا نہیں خیال کہ ان حالات میں مسلمان رہنما بہت زیادہ مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں بھی ان کے حامیوں کے درمیان پھوٹ پڑ چکی ہے چنانچہ انتخابات کے بعد کے مذاکرات میں جناح کے ہاتھ کمزور ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان مذاکرات سے ایک ایسے استصواب کا امکان مشکوک ہو جائے گا جو صرف علیحدگی کے حق میں ووٹ دینے والے مسلمانوں تک محدود ہو۔''[12] چنانچہ انگریز اور کانگرس دونوں مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کی بہرطور ناکامی کے خواہاں تھے۔

تقسیم ہند کے بارے میں برطانوی حکمرانوں کے اندیشہ ہائے دُور دراز

انتخابات کی آمد آمد تھی اور وائسرائے اور اس کے معتمد اور لندن میں انڈیا آفس کے کارپرداز انتخابات کے فوراًبعد پیدا ہونے والی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیاریاں کررہے تھے۔ دونوں بڑی پارٹیوں نے انتخابات کے بعد اپنے دعووں میں زیادہ سخت گیر ہوکر سامنے آنا تھا۔ ان کا سامنا کرنے کے لیے مختلف فارمولے اور پلان وضع کئے جارہے تھے کہ جو ان دونوں کو قابل قبول ہوں۔ کوشش یہی تھی کہ کسی طرح دونوں فریق متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ انگریزوں کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ یہاں سے رخصت ہوتے وقت ایک ایسا بندوبست چھوڑ کر جانا چاہتے تھے جس سے ہندوستان انتشار کا شکار نہ ہو اور یہاں ان کے مفادات محفوظ رہیں۔ یہاں سوویت یونین، کمیونسٹ چین اور ایشیاء کی دوسری سامراج دشمن اشتراکی اور قوم پرست تحریکوں کا اثر ونفوذ نہ ہوسکے بلکہ یہ ان کے مقابلے میں ایک قلعہ ثابت ہو۔ ہندو بورژوا بھی یہی چاہتا تھا۔ لیکن صدیوں پرانا ہندو مسلم تضاد ایک متحدہ ہندوستان کی راہ میں حائل ہو چکا تھا۔ اس میں توازن کی کوئی صورت بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ انگریزوں کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ انتخابات کے بعد فریقین کے مابین ہونے والے مذاکرات میں اگر کوئی سمجھوتہ طے نہ پاسکا اور تعطل کی صورت پیدا ہوگئی تو ملک میں انتشار پھیل جائے گا۔ فرقہ وارانہ فسادات اور حکومت مخالف ہنگامے زور پکڑ جائیں گے۔ اس صورت حال سے بچاؤ کے لیے انگریز پہلے ہی سے کوئی منصوبہ وضع کر لینا چاہتے تھے۔ اسے انہوں نے ریزرو پلان یا بریک ڈاون پلان کا نام دیا تھا۔

29 نومبر کو ویول کی رائے یہ تھی کہ اس قسم کی صورت حال میں حکومت پارٹیوں سے مشورہ کیے بغیر خود ہی ایک آئین ساز ادارہ تشکیل دے دے گی جس میں تمام مفادات کے نمائندوں کو شامل کیا جائے گا۔ اس ادارہ کے دو تہائی ارکان جو آئین منظور کریں گے اسے حکومت برطانیہ ایک قانون کے ذریعہ نافذ کردے گی۔ ویول کی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے اس کے پرائیویٹ سیکرٹری جی۔ ای۔ بی۔ ایبل نے 30 نومبر کو لکھا کہ "اگر کانگرس نے اپنے نمائندوں کو اس آئین ساز ادارے میں شرکت سے منع کردیا اور عدم تعاون کا مظاہرہ کیا تو

مشکل پڑ جائے گی۔ کیونکہ اس کو شامل کئے بغیر اگر کوئی آئین لاگو کیا گیا تو ہندوستان میں اگلے ہی روز انقلاب آ جائے گا۔ بصورت دیگر ہندوستان کو بزورقوت رکھا بھی جا سکتا ہے لیکن اس طرح برطانوی افواج کو یہاں سے کبھی نکالا نہیں جا سکے گا کہ ان کے بغیر نئے آئین پر عمل ہو ہی نہیں سکے گا۔ چنانچہ آسان تر صورت یہی ہے کہ آئین ساز ادارے کے اصول اس طرح وضع کئے جائیں کہ یہ ہندوؤں کو قابل قبول ہوں خواہ مسلمان انہیں قبول نہ کریں۔ کانگرس کی نسبت مسلم لیگ کم مضبوط جماعت ہے اور بہت سے مسلمان متحدہ حکومت کے حامی بھی ہیں۔ اگرچہ اس طرح تشکیل پانے والے آئین کا نفاذ بھی کچھ عرصے بعد مسلمانوں کی مخالفت اور نفرت کی وجہ سے ہندوستان کو انتشار کی نذر کر دے گا۔'' دو ہندو آئی۔سی۔ایس افسر بھی آئینی مسئلہ پر ویول کی مشاورت کر رہے تھے۔ ہندو نوکر شاہی کے ان نمائندوں میں سے ایک وی۔پی۔مینن تھا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور دوسرا بی۔این۔راؤ تھا جو وائسرائے کے افسر بکار خاص کے طور پر کام کر رہا تھا۔ بی۔این۔راؤ کی تجویز تھی کہ ہندو اکثریت پر مشتمل صوبوں کا ایک وفاق ''ہندوستان'' کے نام سے تشکیل دے دیا جائے۔ مسلم اکثریت کے صوبے جن کو پاکستان صوبے کہا جا رہا ہے وہ بدستور موجودہ آئین کے تحت برطانوی سپرداری میں رہیں۔ اس دوران ہندوستان کا وفاق اپنا آئین وضع کر لے۔ اس کے بعد پاکستانی صوبے اس آئین کو دیکھ کر ہندوستان کے وفاق میں شمولیت یا علیحدگی کا فیصلہ کر لیں۔ اس صورت میں پاکستانی صوبوں کو علیحدہ ڈومینین کا درجہ دے دیا جائے گا۔ تاہم پاکستانی صوبوں کے غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کو ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔ اس پر ایبل نے کہا کہ مسلم لیگ اس کی شدید مخالفت کرے گی جب کہ کانگرس ان اضلاع پر اپنا دعویٰ جتائے گی اور ایک بار پھر تعطل کی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔''[13]

6/دسمبر کو وی پی مینن اور بی۔این۔راؤ نے ایک تفصیلی منصوبہ تشکیل دے کر ایبل کے حوالے کیا۔ اس میں ہندوستان کی صورت حال کو کینیڈا کے مماثل قرار دیتے ہوئے دونوں کا موازنہ کیا گیا۔ کہا گیا کہ ''جس طرح وہاں کیتھولک فرقے کے فرانسیسیوں اور پروٹسٹنٹ فرقے کے انگریزوں کے درمیان بالآخر ایک وفاق پر سمجھوتہ ہو گیا ہے ویسا ہی یہاں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بھی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تجویز کیا کہ انتخابات کے بعد ایک

کانفرنس بلائی جائے جس میں صوبائی اسمبلیوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کے علاوہ دو اچھوت، ایک سکھ، ایک ہندوستانی عیسائی، ایک یورپی اور ایک اینگلو انڈین بھی شامل کیا جائے۔ کانفرنس کے ارکان کی کل تعداد 35 مقرر کی گئی جس میں 7 نشستیں ریاستی نمائندوں کے لیے تھیں۔ بقیہ 28 نشستوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دوسرے گروپ بھی شامل کر دیئے گئے۔ تجویز کیا گیا کہ یہ کانفرنس ایک آئین ساز ادارہ تشکیل دے اور اس کی ہیئت ترکیبی، اختیارات اور طریقۂ کار کا تعین کرے اور پھر یہ ادارہ جو آئین وضع کرے اسے نافذ کر دیا جائے۔[14] ہندو نوکر شاہی کے ان ارکان نے مجوزہ کانفرنس میں چھوٹے چھوٹے اقلیتی گروپوں کو نمائندگی دے کر غیر مسلم ارکان کی تعداد کو اس قدر بڑھا دیا کہ اس میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر رہ گئے۔ ویول اس تجویز کے مؤثر ہونے کے بارے میں مطمئن نہ ہوا۔

اسی روز 6/دسمبر کو ہندو سرمائے کے ایک بہت بڑے رُکن جی ڈی۔ برلا نے پارلیمانی نائب وزیر ہند ہینڈرسن کو اپنے خط میں ہندوستان کا مسئلہ حل کرنے کے بارے میں لیبر حکومت کی مخلصانہ کوششوں کی تعریف کرنے کے بعد لکھا ''میں چاہتا ہوں کہ حکومت برطانیہ یہ واضح کر دے کہ دونوں بڑے فرقوں کے مابین عدم مفاہمت کی صورت میں وہ کیا کرے گی۔ میں بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب تک جناح کو اپنی ہٹ دھرمی سودمند معلوم ہوتی رہے گی کسی سمجھوتے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ماضی میں بھی کئی تصفیے ہو چکے ہیں۔ معاہدہ لکھنؤ، نہرو رپورٹ اور پھر رمزے میکڈانلڈ کا فرقہ وارانہ ایوارڈ، ان سب کو پہلے تو قبول کر لیا جاتا رہا مگر پھر از سر نو بحث چھیڑ دی جاتی رہی۔ اس کے پیش نظر اس مرتبہ کوئی حتمی سمجھوتہ ہونا چاہیے...... اور حتمی سمجھوتہ صرف اسی صورت میں ہوگا جب یہ احساس موجود ہوگا کہ عدم مفاہمت کی صورت میں ایک حل ازخود مسلط ہو جائے گا۔'' اس کے بعد اس نے جناح کے مطالبہ پاکستان پر تنقید کی اور اپنی طرف سے اس مسئلے کا یہ حل پیش کیا کہ پنجاب اور بنگال کے ان سرحدی اضلاع میں جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں، پہلے وہاں استصواب کرایا جائے جس میں ہندو، مسلم اور سکھ سب حصہ لیں۔ استصواب اس سوال پر ہو کہ اگر پاکستان بنے تو ان اضلاع کو پاکستان میں جانا چاہیے یا ہندوستان میں؟ پھر اس استصواب کی بنیاد پر صوبوں کی نئی حد بندی کی جائے۔ اس کے بعد ان

نئے تشکیل کردہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دے دی جائے جس میں حق علیحدگی بھی شامل ہو۔ اس کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے لکھا کہ ان نئے صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد 60 سے 65 فیصد ہو جائے گی۔ اگر علیحدگی کے لیے استصواب ہو اور مسلم اور غیر مسلم تمام اس میں حصہ لیں تو 65 میں سے 51 فیصد کے ووٹ علیحدگی کے لیے کافی ہوں گے۔[15] گویا اگر پنجاب میں کانگرس اور یونینسٹ مل کر 65 میں سے 15 فیصد ووٹ علیحدگی کے خلاف حاصل کر لیں تو صوبہ کی کل آبادی کا باقی ماندہ 50 فیصد جو کہ صوبہ کی کل مسلم آبادی کا 77 فیصد بنتا تھا علیحدگی کا حامی ہونے کے باوجود علیحدگی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ کم و بیش یہی صورت حال بنگال میں تھی۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی ایک متحدہ وفاق جس میں رہتے ہوئے ہندو مسلم تضاد مزید شدید تر ہو سکتا تھا، اس کو کم یا ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہندو بورژوا کی نمائندہ جماعت کانگرس اس تضاد کو ہی تسلیم کرنے پر تیار نہ تھی۔ ہندو بورژوا کے نزدیک یوں تو ہندو مسلم ''بھائی بھائی'' تھے اور ایک ملک میں متحد ہو کر رہ سکتے تھے لیکن مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل ایک ملک میں ان چند اضلاع کو شامل رکھنا گوارا نہیں تھا جن میں ہندو کثرت سے آباد تھے۔ اس کے لیے متحدہ برصغیر میں مسلمانوں کو اقلیت بنا کر رکھنا روا تھا لیکن پاکستان میں ہندوؤں کا اقلیت بن کر رہنا گوارا نہیں تھا۔ یہاں وہ ہندوؤں کی زیادہ آبادی والے اضلاع کی علیحدگی کا علمبردار بن کر میدان میں آ گیا تھا۔ اس کو بنیاد بنا کر انگریز، جناح کے مطالبہ پاکستان کو بھونڈا اور ناقابل عمل ثابت کرتے تھے اور پاکستان سے دستبردار ہونے کے لیے کہتے تھے۔ کہ وہ بھی اپنے عالمی اور داخلی مفادات کی خاطر برصغیر کو ایک متحدہ وفاق کی شکل میں دولت مشترکہ کا رکن بنانے کے خواہاں تھے۔ 7 دسمبر کو پیتھک لارنس نے ویول کے نام مراسلے میں مرکز اور صوبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے لکھا کہ مرکز کو اتنے زیادہ اختیارات مت دیتے چلے جاؤ کہ معلوم ہو کہ وحدانی طرز حکومت کے حق میں پلڑا بھاری کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے امکان کی راہ میں نئی رکاوٹیں کھڑی ہو جائیں جسے نہرو اور جناح دونوں موجودہ آئینی مسئلے کا ایک ممکنہ حل سمجھتے ہیں۔[16]

ویول بھی وہی چاہتا تھا جو لندن کی برطانوی حکومت چاہتی تھی لیکن اس کے نزدیک ہندوستان کا مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ یہاں کے داخلی تضادات کے ساتھ براہ راست الجھا

ہوا تھا اس لیے ان کی پیچیدگی کو سمجھتا تھا۔ 10 دسمبر کو کلکتہ میں ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا "میں غیر مبہم الفاظ میں یقین دلاتا ہوں کہ برطانوی حکومت اور برطانوی عوام دیانتداری اور خلوص کے ساتھ اس امر کے خواہاں ہیں کہ اہل ہندوستان کو سیاسی آزادی حاصل ہو اور وہ اپنی مرضی کی حکومت یا حکومتیں قائم کریں۔ لیکن اس سلسلہ میں چند پیچیدگیاں بھی درپیش ہیں جنھیں تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی شناخت کے لفظ یا کسی فارمولا کو دہرا دینے سے یہ مسئلہ نہ حل ہوسکتا ہے اور نہ حل ہو سکے گا۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ "کھل جا سم سم" کے طلسماتی اثرات پیدا نہیں کرسکتا جس نے علی بابا کے غار کا در کھول دیا تھا۔ تشدد سے بھی یہ معاملہ طے نہیں ہو سکتا...... یہاں متعدد فریق ہیں جن کا ہم آہنگ ہونا کسی سمجھوتے کی شرط اول ہے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ فریق آپس میں معاملات طے کر کے کسی نہ کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ ان میں ایک کانگرس پارٹی ہے جو ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے۔ اقلیتوں میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور انہیں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ ایک اور فریق دیسی ریاستوں کے حکمرانوں کا ہے اور ایک فریق برطانوی حکومت ہے۔ ان سب کا مقصد ایک ہے جو کہ ہندوستان کی آزادی اور بہبود ہے۔ میں نہیں مانتا کہ ان تمام فریقین کا کسی حل پر متفق ہونا ناممکن ہے۔ میرے خیال میں تو یہ بہت مشکل بھی نہیں ہے جب کہ ہر طرف سے خیر سگالی، عقل اور صبر و برداشت کارفرما ہو...... اگلے سال جو مذاکرات ہونے والے ہیں اگر ہم نسلی اور فرقہ وارانہ منافرت کو ان پر اثر انداز ہونے کی اجازت دے دیں یا اس فضا کی وجہ سے کوئی تشدد ہو جائے تو یہ ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے لیے المناک سانحہ ہوگا...... ہماری کوشش یہ ہو گی کہ کسی ایسے دستور اساسی کی تدوین کے لیے ہندوستان کی امداد کی جائے جسے مرکزی اسمبلی کی بڑی بڑی پارٹیوں کی تائید و حمایت حاصل ہو۔ وقت آ گیا ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی نہ کسی ذمہ دارانہ حیثیت کا حامل ہے لازمی طور پر عزم صمیم کے ساتھ فیصلہ کرے کہ وہ ہندوستان کی گتھی کو منصفانہ اور پائیدار حل کے ذریعے سلجھانے کی حتی المقدور کوشش کرے گا اور اس عظیم الشان سرزمین کو آویزش کا اکھاڑہ نہیں بننے دے گا۔"[17] ویول نے اپنی اس تقریر میں کانگرس پارٹی کو تو ایک فریق کا درجہ دیا لیکن مسلم لیگ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ ایک بڑی اقلیت

کی حیثیت سے مسلمانوں کو تو بطور فریق تسلیم کیا گیا لیکن مسلم لیگ کو ان کی نمائندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ گویا مطالبہ پاکستان کی مخالف جماعتوں یعنی کانگرس اور یونینسٹ پارٹی میں بعض مسلمان رہنماؤں کی موجودگی کی بنا پر ان جماعتوں کو بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق جتانے کا موقع دیا گیا تھا۔

جناح نے وائسرائے کی تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے اگلے روز کہا کہ ''ہندوستان میں سب سے بڑی سیاسی پارٹی کہلانے کا حق صرف کانگرس ہی کو حاصل نہیں۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں اور مسلم لیگ بغیر کسی شک و شبہ کے مسلمانان ہند کی موثق، بااختیار اور نمائندہ جماعت ہے۔'' حقیقت یہ تھی کہ انگریزوں کو آمدہ انتخابات میں مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی اکثریت کے ساتھ کامیابی کی تو توقع تھی لیکن اس قدر بھرپور کامیابی کی توقع نہیں تھی کہ اسے مسلم فرقہ کی واحد نمائندہ جماعت کا درجہ حاصل ہو جائے گا جیسا کہ انتخابی نتائج سے ثابت ہوا۔ ویول نے اس تقریر میں اہل ہندوستان کو اپنی مرضی کی ''حکومت'' یا ''حکومتیں'' قائم کرنے کی آزادی کا جو تذکرہ کیا اس میں ''حکومتیں'' سے مراد دیسی ریاستوں کی حکومتیں بھی ہوسکتی تھیں کہ جن کو ایک تیسرے فریق کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا تھا اور ''پاکستان'' کے امکان کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا تھا کہ جناح نے اپنے تبصرہ میں لفظ ''حکومتیں'' کے استعمال پر وائسرائے کو سراہا تھا کہ اب اس نے ہندوستان کے حالات کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ حقیقت یہ تھی کہ ہر دو صورتوں میں اس کا مقصد محض کانگرس کو تنبیہہ کرنا تھا جو انتخابات کے بعد ملک میں پرتشدد تحریک چلانے کی دھمکیاں دے رہی تھی اور ریاستوں سمیت پورے برصغیر پر بلا شرکت غیرے اپنی ملکیت کی دعویدار تھی۔ چنانچہ اسی روز شام کو جب گاندھی ویول سے ملنے آیا تو اس نے یہ یقین دہانی کرانے کے بعد کہ وہ کانگرس کا ٹمپریچر کم کرنے کی کوشش کر رہا ہے، یہ الزام لگایا کہ ہم نے تو مسلمانوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ لیکن انگریزوں کی ہمیشہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کی وجہ سے اس سلسلے میں ناکامی ہوتی رہی ہے۔ ویول نے جواب میں کہا کہ یہ بالکل لغو ہے، دراصل ہم آپ دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے ہیں اور یہ کہ فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کی ذمہ

داری کانگرس پر عائد ہوتی ہے جس کی وزارتوں نے 39-1937ء کے دوران اپنے عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کبھی مساوی سلوک نہیں کرے گی اور پھر اس کے نتیجے میں مسلم لیگ ابھری اور تصور پاکستان ابھر کر سامنے آیا۔ گاندھی نے کانگرسی وزارتوں کے رویے کا دفاع کیا اور انہیں حق بجانب قرار دیا۔ ویول نے کہا کہ حقائق خواہ کچھ بھی تھے لیکن مسلمانوں پر جو نفسیاتی اثرات مرتب ہوئے ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گاندھی نے اس بات سے اتفاق کیا۔[18] اسی روز جناح نے ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم ہندوستان کے مسئلہ کو دس منٹ میں حل کر سکتے ہیں اگر گاندھی یہ کہہ دے کہ مجھے پاکستان منظور ہے اور میں اس امر سے اتفاق کرتا ہوں کہ ایک چوتھائی ہندوستان جو پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، بنگال اور آسام کی موجودہ سرحدوں پر مشتمل ہے، ریاست پاکستان ہوگا۔تو پھر یہ آسان ہو جائے گا کہ ہم دوستوں کی طرح مل بیٹھیں اور اس برصغیر کی دو بڑی قوموں کے مابین دوستوں اور ہمسایوں جیسی زندگی کے بارے میں تفصیلات طے کر لیں۔ کینیڈا اور امریکہ باہم مل کر رہتے ہیں تو پھر ہندو اور مسلمان کیوں نہیں رہ سکتے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ردوبدل کرنا پڑے گا۔تبادلۂ آبادی کے امکان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ بشرطیکہ یہ خالصتاً رضا کارانہ بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ بلاشبہ بعض علاقوں میں جہاں بنیادی طور پر ہندو اور مسلم علاقے ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ ملحق ہیں وہاں سرحدوں کی نظرثانی بھی درکار ہو گی۔مگر ابتداً موجودہ صوبائی سرحدوں کو ہی پاکستان کی سرحدیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ پاکستان کا آئین وفاقی طرز کا ہوگا۔صوبوں کو داخلی خودمختاری حاصل ہوگی۔ دفاع اور امور خارجہ کے کلیدی اختیارات مرکز کو حاصل ہوں گے۔مگر اس کا فیصلہ ہماری الگ آئین ساز اسمبلی کرے گی۔''[19] چنانچہ جناح نے پاکستان کے سوال کو اس کے مجوزہ صوبوں کی اس وقت کی سرحدوں کے برقرار رکھنے کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ انگریزوں نے انتظامی اعتبار سے ان صوبوں کی جو سرحدیں مقرر کی تھیں، جناح کے پاکستان میں یہ صوبے من وعن شامل کئے گئے تھے۔ سرحدوں کے تھوڑے بہت ردوبدل کے لیے وہ تیار تھے لیکن یہ کہ صوبوں کو تقسیم کیا جائے گا، یہ ان کی پاکستان سکیم کے برخلاف بات تھی۔

تقسیم ہند کے مطالبے کو رد کرنے کے لیے تقسیم پنجاب و بنگال کا ہوّا

کانگرس اور برطانوی حکومت دونوں کی طرف سے پاکستان سکیم کو رد کرنے اور اسے بے ڈھنگا اور نا قابل عمل ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ دی جارہی تھی کہ پنجاب کا مشرقی حصہ، بنگال کا مغربی حصہ اور آسام کا پورا صوبہ غیر مسلم اکثریت پر مشتمل ہے۔ اس لیے پورے پورے صوبے شامل کر کے پاکستان نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ پاکستان کا مطالبہ واپس لیا جائے کہ یہ ایک لغو اور بے ہودہ مطالبہ ہے۔ لیکن جناح سختی سے اس مؤقف پر قائم تھے کہ مذکورہ صوبوں کی جوں کی توں سرحدوں کو پاکستان کی سرحد تسلیم کئے بغیر کوئی بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان حالات میں یہ صاف نظر آرہا تھا کہ انتخابات کے بعد جب برصغیر کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے متعلقہ فریقین کے مابین مذاکرات ہوں گے تو کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین تعطل پڑ جائے گا جس کے نتیجے میں ملک میں انتشار، بدامنی اور خانہ جنگی تک کی نوبت آسکتی ہے اور انگریز ہندوستان کی معاشی، فوجی اور سیاسی ذمہ داری سے چھٹکارا پانے کے بجائے اس میں بری طرح پھنس سکتے ہیں چنانچہ وہ ایک بریک ڈاؤن پلان بھی ساتھ ساتھ تیار کر رہے تھے۔ پرائیویٹ سیکرٹری برائے وائسرائے، ایبل نے 17 ردسمبر کو اس کا ایک خاکہ بنا کر ویول کو پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ تعطل کی صورت میں وہ علاقے جو واقعتاً مسلم علاقے ہیں ان کا حق خود ارادیت تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غیر مسلم آبادی کی اکثریت کو اس کی مرضی کے خلاف پاکستان میں شامل رکھنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ایبل نے مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا کہ پاکستان کی کشش بالکل غائب ہو جائے گی جب معلوم ہوگا کہ کلکتہ اور مغربی بنگال اس سے نکل گیا ہے اور پنجاب کے پورے دو ڈویژن اس سے نکل گئے ہیں۔ انصاف یہی ہے کہ یہ علاقے پاکستان کے بجائے ہندوستان میں شامل کیے جائیں۔ امید کی جاتی ہے کہ پاکستان جس میں صرف مسلمانوں کی غالب اکثریت کے علاقے ہی شامل ہوں گے، کچھ ہی عرصے میں فیڈریشن میں شامل ہو جائیں گے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مسلمان شروع میں ہی دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے فیڈریشن میں شامل ہو جائیں۔ یہاں فیڈریشن سے اس کی مراد متحدہ ہندوستان کی فیڈریشن تھی۔ اس کے بعد اس نے لکھا ''اب یہ لازمی ہو گیا ہے

کہ کسی تصفیے پر پہنچنے کی خاطر پوری کوشش صرف کر دی جائے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ جونہی تعطل پیدا ہو فوری طور پر مطالبہ پاکستان کو پوری طرح رد کر دینا چاہیے کہ ایسا کئے بغیر کوئی تصفیہ ممکن نہیں ہے۔ میں مسٹر مینن کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتا کہ اس معاملہ کو اس وقت تک درگزر کرنا ممکن ہوگا جب تک کہ صوبے الحاق کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس سے اس کو (یعنی پاکستان کو) آزمانے کی ترغیب موجود رہے گی۔ اور اگر اس معاملہ کو پس پشت ڈالا بھی گیا تو بھی نتیجہ یہ ہوگا کہ شمالی ہندوستان کو کچھ عرصہ کے لیے موجودہ آئین کے تحت رکھنا پڑے گا اور میرے خیال میں حکومت برطانیہ کے لیے یہ بھی باعث الجھن ثابت ہوگا اور کوئی حل نہیں نکلے گا۔ سکھوں کا مسئلہ تو کسی بھی قسم کے پاکستان کے خلاف ایک سنگین عذر کا حامل ہے۔ میں ذیل میں جو ایوارڈ تجویز کر رہا ہوں اس کے مطابق اگر مسلمان پاکستان پر اڑے رہے تو کچھ سکھ اس کی سرحد کے ایک طرف رہ جائیں گے اور کچھ دوسری طرف رہ جائیں گے۔ اس کے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا'' اس کے بعد اس نے اپنی طرف سے ایک ''بریک ڈاؤن ایوارڈ'' کا خاکہ پیش کیا جس کے مطابق یہ تجویز کیا گیا کہ اگر کم از کم چھ صوبے ایک یونین کے آئین پر متفق ہو جائیں گے تو حکومت برطانیہ اس کو ان صوبوں اور ریاستوں کے لیے تسلیم کر لے گی جو اس سے الحاق کرنے پر رضا مند ہوں گے۔ اگر کچھ صوبے اپنی آئین ساز اسمبلیوں میں صرف سادہ اکثریت سے مذکورہ یونین میں اِلحاق نہ کرنے کا فیصلہ کریں گے تو حکومت برطانیہ ان کو ایک ڈومینین کا درجہ دلانے کے لیے علیحدہ آئینی پیش رفت کی خاطر اقدامات کرے گی۔ لیکن جونہی مذکورہ یونین تشکیل پائے گی، اس یونین سے ملحق بڑے علاقے (جو ایک کمشنری سے کم نہ ہوں) اپنے ہمسایہ صوبے میں شامل ہو کر مذکورہ یونین کا حصہ بن سکیں گے۔ اس صورت میں زیر نظر علاقوں کی حلقہ بندیوں کے نمائندہ ارکان اسمبلی اپنا علیحدہ خصوصی اجلاس منعقد کر کے سادہ اکثریت کے ساتھ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے۔ دیسی ریاستوں کے بارے میں تجویز کیا گیا کہ اگر کچھ ریاستیں نہ تو بڑی یونین میں اور نہ ہی علیحدگی اختیار کرنے والے صوبوں کی یونین میں شامل ہونے کا فیصلہ کریں گی تو پھر حکومت برطانیہ اس وقت دیکھ لے گی کہ ان کا کیا کرنا ہے۔ ایوارڈ کا خاکہ کھینچنے کے بعد ایبل نے اس کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا کہ اس کے نتیجے میں پنجاب کے دو ڈویژن اور پورا مغربی بنگال بشمول کلکتہ

مذکورہ بڑی یونین میں شامل ہو جائیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کی سودا کاری کی قوت بہت کمزور ہو جائے گی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہوگا کہ کانگرس پر یہ واضح کر دیا جائے کہ وائسرائے اس یونین میں مسلمانوں کے لیے منصفانہ شرائط طے کئے جانے کا خواہاں ہے۔ آگے چل کر ایبل لکھتا ہے کہ ''میرا یہ خیال ہے کہ کانگرس یقیناً تعاون کرے گی لیکن لیگ کی جانب سے سنگین گڑ بڑ کی توقع ہو سکتی ہے۔ تاہم لیگ کانگرس کی نسبت ایک بہت کمزور تنظیم ہے، اس کا کوئی مؤثر پریس نہیں ہے۔ اس کے لیڈر جیل جانے پر بھی تیار نہیں ہوں گے اور اس کے عام کارکنوں کی پرورش ایجی ٹیشن کے طریق پر نہیں ہوئی ہے۔ مزید یہ حقیقت کہ اس ایوارڈ میں صرف غالب مسلم اکثریت کے علاقوں ہی کو حق خودارادیت دیا گیا ہوگا اس لیے ایسے لوگوں کی تعداد بہت حد تک کم ہو جائے گی جو ایک صحیح معنوں میں پرتشدد ایجی ٹیشن میں حصہ لینے پر آمادہ ہوں گے۔ وائسرائے کو پورے ہندوانڈیا اور پوری دنیا کی رائے عامہ کی حمایت حاصل ہوگی۔ یہ ایوارڈ عملاً پاکستان کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دے گا جس کے بارے میں اپنی گزشتہ کانفرنس میں گورنروں نے تشویش کا اظہار کیا تھا اور اپنے حالیہ دورے میں سر اینڈریو کلوو (گورنر آسام) اور سر تھامس ردرفورڈ (گورنر بہار) نے بہت زور دے کر اپنی یہ رائے دی تھی کہ مسئلے کو حل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ کانگرس کی بجائے مسلم لیگ پر زیادہ دباؤ ڈالا جائے۔ میری رائے میں یہ انصاف کی رو سے بھی اور مصلحت کے تقاضے کے تحت بھی بالکل درست رائے ہے۔''[20]

27 دسمبر کو ویول نے یہ بریک ڈاؤن پلان پیتھک لارنس کو بھیج دیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ویول نے اپنے مراسلے میں یہ تاثر دیا کہ بعد از انتخابات تعطل (بریک ڈاؤن)، جناح کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیدا ہوگا۔ اس نے لکھا کہ ''اس صورت میں میں جناح کو بلاؤں گا۔ اور اس پر دباؤ ڈالوں گا کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کرے اور ضرورت پڑنے پر اس پر یہ بھی واضح کروں گا کہ اگر وہ بدستور اڑا رہا تو حکومت برطانیہ از خود کوئی فیصلہ کرے گی اور یہ فیصلہ لیگ کے لئے انتہائی ناخوش گوار ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ جناح کے لیے اتنا ہی کافی ہو اور وہ اپنی پالیسی بدل ڈالے۔ تاہم اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اسے مذکورہ پلان سے آگاہ کر دیا جائے گا جس پر عملدرآمد کی صورت میں پنجاب کے دو ڈویژن اور قریباً سارا مغربی بنگال بشمول کلکتہ یونین

میں چلا جائے گا۔ مسلمانوں کے لیے پاکستان میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جائے گی جناح کے بقول اس میں صرف ''بھوسہ'' باقی رہ جائے گا۔ جب جناح کو حکومت برطانیہ کے اس رویے کا سامنا کرنا پڑے گا تو وہ واقعی اپنی حیثیت کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔'' آگے چل کر اس نے مزید لکھا کہ ''اس قسم کے ایوارڈ کے سبب سے کانگرس اور مسلم لیگ باہم سمجھوتے پر رضامندی ظاہر کر دیں گی تو پھر ایک ایسا آئین وضع کیا جا سکے گا جو مسلمانوں کے لیے اس قدر پرکشش ہوگا کہ مسلمان شروع ہی سے فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادہ ہو جائیں گے۔''[21]

27 ردسمبر ہی کو ویول نے ہندوستان کی صورت حال کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ پیتھک لارنس کو ارسال کی۔ اس میں بھی اس نے یہی زور دیا کہ ''ہمارا بڑا مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پُل کی استواری ہے۔''[22] اس مقصد کے حصول کی خاطر ویول نے جناح کو ایک کٹے پھٹے پاکستان کا نقشہ دکھا کر دباؤ کا آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کٹے پھٹے پاکستان کو محض برائے بحث فرض کیا گیا تھا۔ تاکہ جناح جو اسے بھوسے سے تشبیہ دیتے تھے، اس کو رد کر کے متحدہ ہندوستان پر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن لندن میں انڈیا آفس والوں کو اس فرضی پاکستان پر بھی اعتراض ہوا۔ وزیر ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری ایف۔ ایف ٹرنبل نے ویول کے مجوزہ بریک ڈاؤن پلان پر ایک نوٹ تیار کیا جس میں اس نے لکھا ''کوئی نہیں مانتا کہ پاکستان عملی نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کے بہترین مفاد میں ہوگا اور نہ ہی کوئی یہ جانتا ہے کہ اگر ہندوستان کی تقسیم کا سلسلہ ایک مرتبہ شروع ہو گیا تو پھر کیا یہ پوری طرح بلقانیائے جانے (یعنی ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے) سے بچ سکے گا۔ مزید برآں اگر ابتدائی مراحل میں تعطل پڑ بھی گیا تو یہ فیصلہ کہ پاکستان عمل میں آئے گا، ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی بنیاد پر کسی سمجھوتے کے امکان کو بالکل معدوم کر کے رکھ دے گا۔ مزید یہ کہ اگر ہم یہ طے بھی کر دیں کہ پاکستان بن جائے گا تو پھر اس پر عمل درآمد کیسے ممکن ہو سکے گا جب تک کہ اس کے حق میں فریقین کے مابین سمجھوتہ نہ ہو جائے؟ کیا ایسا تو نہیں ہوگا کہ وائسرائے کا تجویز کردہ فیصلہ مسلمانوں کو بھی ناقابل قبول ہو، ہندوؤں کو بھی ناقابل قبول ہو اور سکھ پُرتشدد ہو کر اس کی مخالفت میں نکل آئیں؟ اس نکتے سے دو صورتیں سامنے آتی ہیں:

1۔ اگر ضروری ہو تو کیا حکومت برطانیہ کو کوئی فیصلہ صادر کرنا بھی چاہیے یا نہیں؟
2۔ اگر فیصلہ صادر کرنا ہی ہو تو پھر یہ کس مرحلہ پر کیا جائے کہ اس کے نتیجے میں متحدہ ہندوستان برقرار رہ جائے؟"[23]

گویا انگریزوں نے ایک کٹے پھٹے پاکستان کی فرضی تجویز کو ترپ چال کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی بنیاد یہ یقین تھا کہ جناح اور کانگرس دونوں ہی اس چال کے سامنے مات کھا جائیں گے اور مجبور ہو کر کوئی سمجھوتہ کر لیں گے جس سے ہندوستان متحدہ حالت میں برقرار رہ جائے گا۔

باب: 7

عام انتخابات میں تقسیم کے مسئلے پر برصغیر کے عوام کا فیصلہ

غیر مسلم نشستوں پر کانگرس اور مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی

لیبر حکومت کی 18 ستمبر کو اعلان کردہ پالیسی کے مطابق دسمبر 1945ء اور جنوری 1946ء میں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ مسلم لیگ نے مسلمان رائے دہندگان سے اپیل کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو مطالبہ پاکستان کے نمائندوں کی حیثیت سے ووٹ دیں۔ مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے طلباء نے اس انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہاتی علاقوں میں بھی پاکستان کا وسیع پیمانے پر پراپیگنڈا کیا۔ پنجاب مسلم لیگ کا انتخابی منشور ایک سرکردہ کمیونسٹ کارکن دانیال لطیفی نے لکھا تھا۔ منشور میں وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ کا معاشی نظام سوشلزم پر مبنی ہوگا۔ انقلابی زرعی اصلاحات ہوں گی اور بڑی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ لہٰذا سندھ پنجاب اور سرحد کے بیشتر مسلمان جاگیرداروں نے نواب الہ بخش، سرخضر حیات خان ٹوانہ اور عبدالغفار خان کی سرکردگی میں آگے بڑھ کر مسلم لیگ کی مخالفت کی۔ جمعیت العلمائے ہند، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا مومن کانفرنس، مجلس احرار ہند اور جماعت اسلامی کے علاوہ متعدد دوسری مذہبی تنظیموں کے جغادری ملاؤں نے بھی تحریک پاکستان کے خلاف محاذ آرائی کی۔ قائداعظم جناح کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے اور کانگرس کا ساتھ دیا۔

مسلم لیگ کو سب سے شدید مخالفت کا سامنا پنجاب میں کرنا پڑا، جہاں یونینسٹ پارٹی سے منسلک مسلمان جاگیرداروں کے ایک بہت بڑے گروہ نے تحریک پاکستان کے خلاف مورچہ قائم کر رکھا تھا۔ سر فیروز خان نون لکھتا ہے کہ ''اگرچہ یہ بات واضح طور پر نظر آ رہی تھی کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے اور اب اس کا انحصار ہم مسلمانوں پر تھا کہ ہم ہندوستان کا بٹوارہ کرا کے پاکستان بنوائیں لیکن ''چند بڑے بڑے برطانوی حکام'' نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو یقین دلایا تھا کہ برطانیہ ہندوستان نہیں چھوڑے گا اور یونینسٹ پارٹی یہ سمجھتی تھی کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کے تعاون سے حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہو جائے گی۔ اگرچہ اس حکومت میں مسلمانوں کی تعداد بہت مختصر ہوگی۔ ان حکام کو غالباً یہ علم نہ تھا کہ لندن میں کیا ہو رہا ہے اور اگر انہیں علم تھا بھی تو سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ حقائق کو اپنے دوستوں سے آخری لمحہ تک اس توقع کے تحت چھپایا جائے کہ پاکستان نہیں بنے گا...... مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سر خضر حیات برطانیہ گئے تھے تو وہاں انہوں نے مسٹر چرچل اور وزیر ہند کے علاوہ اعلیٰ حضرت شاہ برطانیہ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان سب نے فرداً فرداً انہیں یقین دلایا تھا کہ ملک تقسیم نہیں ہوگا۔ یہ ان لوگوں کی بدقسمتی تھی کہ لیبر حکومت قائم ہوگئی اور سر خضر حیات اس تبدیلی کا احساس نہ کر سکے۔''[1] برطانوی سامراج کے پشتنی پٹھو فیروز خان نون کو قیام پاکستان کے بیس پچیس سال بعد بھی ''چند بڑے بڑے برطانوی حکام'' کے نام لینے کی جرات نہیں ہوئی۔ مطلب صاف واضح ہے کہ وائسرائے ویول اور گورنر پنجاب برٹرینڈ گلانسی پاکستان کے خلاف تھے اور یونینسٹ پارٹی نے ان کی پشت پناہی کی وجہ سے مسلم لیگ کے خلاف محاذ آرائی کی ہوئی تھی۔ تاہم خود فیروز خان نون کو ستمبر 1945ء میں پتہ چل گیا تھا کہ انتخابات میں پنجاب کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ چنانچہ اس نے وائسرائے کی کونسل میں وزیر دفاع کے عہدے سے استعفیٰ دے کر قلابازی کھائی اور انتخابات میں حصہ لینے کے لیے مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ پنجاب میں اس قسم کے بعض دوسرے موقع پرست مسلمان جاگیرداروں نے بھی انتخابی مہم کے دوران ہوا کا رخ دیکھ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

مرکزی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج کا اعلان دسمبر 1945ء کے اواخر میں ہوا جب کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج جو جنوری اور اپریل کے درمیانی عرصے میں منعقد

ہوئے، جنوری 1946ء کے آخری ہفتوں میں سامنے آنے شروع ہو گئے تھے۔ حسب توقع کانگرس کو مرکزی اور صوبائی ہندو حلقوں میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے مرکزی اسمبلی کی مخصوص نشستوں کے سوا ساری ہندو نشستیں جیت لیں اور صوبائی اسمبلیوں میں اس کے منتخب نمائندوں کی تعداد 704 سے بڑھ کر 930 ہو گئی۔ وہ آٹھ صوبوں میں قطعی اکثریت سے ابھری تھی۔ لیکن مسلم لیگ کی کامیابی خلاف توقع اور حیرت انگیز تھی۔ اس نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں جیت لی تھی۔ یہ سو فیصد کامیابی ہندوستان کے انتخابات کی تاریخ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی تھی۔ تقریباً 90 فیصد مسلمان رائے دہندگان نے مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی مسلم لیگ کو صوبہ سرحد کے سوا باقی تمام صوبوں میں نمایاں کامیابی ہوئی تھی۔ اس نے صوبائی اسمبلیوں کی 492 مسلم نشستوں میں سے 428 نشستیں جیتی تھیں۔ حالانکہ 1936ء کے انتخابات میں اس نے صرف 109 نشستیں حاصل کی تھیں۔ مسلم لیگ کی پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں کامیابی سب سے زیادہ حیرت انگیز تھی۔ اس نے 86 مسلم نشستوں میں سے 75 نشستیں جیتی تھیں۔ جاگیرداروں کی جماعت یونینسٹ پارٹی کا جنازہ نکل گیا تھا۔ اس نے صرف 10 نشستیں حاصل کی تھیں اور اس طرح جناح کا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور مطالبہ پاکستان کو مسلمان عوام کی زبردست تائید وحمایت حاصل ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ مسلمان عوام اپنے بنیادی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے حصول کی جدوجہد کے دوران کانگرس نواز اور قدامت پسند مُلاؤں کے دلکش مذہبی نعروں کے فریب میں مبتلا نہیں ہیں۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کو اپنا قائد تسلیم کیا تھا جو پوری طرح مغربیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، جو عالم دین نہیں تھا، جو انگریزی اور گجراتی کے سوا کسی زبان پر دسترس نہیں رکھتا تھا اور جسے بعض بدبخت مُلاؤں نے کافر اعظم قرار دیا تھا۔

انتخابات نے برصغیر کو واضح طور پر دو حصوں میں بانٹ دیا تھا لیکن برطانوی سامراج اپنے مفادات کی خاطر اسے متحد رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ 1946ء کا آغاز پیتھک لارنس کی طرف سے سال نو کے اس نشری پیغام کے ساتھ ہوا کہ ہندوستان کے لیے جو منصوبہ وضع کیا جائے ''وہ ایک ایسا منصوبہ ہونا چاہیے جس کے ذریعے اس شکل کی حکومتیں قائم کر کے

اقتدار ہندوستانی کنٹرول میں دے دیا جائے جو ہندوستان کے وسیع تر عوام الناس کو بخوشی قابل قبول ہوں تا کہ ہندوستان اندرونی جھگڑوں اور خلفشار کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو سکے۔"[2]
اس نے تمام فرقوں پر زور دیا کہ اعتدال پسندی اور صلح جوئی کے ذریعے ہی یہ عظیم مسئلہ حل کیا جانا چاہیے۔ ادھر جناح نے 5رجنوری کو ویول کے ساتھ ملاقات میں یہ واضح کر دیا کہ "حکومت برطانیہ جو کچھ بھی کرے گی ہم اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تو تیار ہوں گے لیکن مصالحت نہیں کریں گے۔" یہ پختہ عزم درحقیقت ان کروڑوں عوام الناس کی امنگوں کی ترجمانی تھا جنہوں نے انتخابات میں مسلم لیگ کو بے مثال کامیابی سے ہمکنار کر کے پاکستان کے مطالبے کے ساتھ اپنی مکمل اور غیر متزلزل یگانگت کا ثبوت مہیا کیا تھا۔

مطالبہ پاکستان کے بارے میں مسلم اکثریت کے اس قدر پرجوش رجحان کا توڑ کرنے کے لیے انگریز حکام ایک ایسے کٹے پھٹے پاکستان پر رضامندی ظاہر کرنے کے بارے میں صلاح ومشورہ کر رہے تھے جس کو قبول کرنے کے بجائے مسلمان مطالبہ پاکستان ہی سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جائیں۔ بنگال کے گورنر کیسی نے ویول کے نام 31ردسمبر اور پھر 8رجنوری کے مراسلوں میں مسلم لیگ کی مرکزی اسمبلی کی نشستوں پر سو فیصد کامیابی اور آمدہ صوبائی انتخابات میں متوقع بھاری کامیابی کے پیش نظر تجویز کیا کہ اگر پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کرنا ہی پڑ جائے تو پھر ضلعی سطح پر بالغ مردوں کا استصواب کرایا جائے۔ "اس کے نتیجے میں وہ پاکستان یقیناً وجود میں نہیں آئے گا جس کا جناح مطالبہ کر رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اس میں مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال کے غیر مسلم اکثریت کے اضلاع شامل نہیں ہوں گے، جب کہ جناح ان صوبوں کو تقسیم کیے بغیر پاکستان میں شامل کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔" کیسی نے لکھا کہ "مجھے یقین ہے کہ جب مسلم لیگ والوں کو معلوم ہو گا کہ انہیں ویسا پاکستان نہیں مل سکے گا جیسا کہ وہ چاہتے ہیں تو پھر وہ معقول بات سننے پر آمادہ ہو جائیں گے اور ایک متحدہ وفاق کو تسلیم کر لیں گے جس میں ان کو فراخدلانہ اور قانونی تحفظات مہیا کئے گئے ہوں گے۔"[3]

مسلم لیگ کی جانب سے پنجاب، بنگال اور آسام کے غیر مسلم اکثریت والے اضلاع سمیت یہ پورے صوبے پاکستان میں شامل کرنے پر اصرار اس وجہ سے بھی تھا کہ اس طرح پاکستان کے حصے میں بھی غیر مسلم اقلیت کی قابل ذکر تعداد آ جاتی تھی جن کو تحفظات اور مراعات

مہیا کرنے کے عوض میں ہندوستان میں رہ جانے والی مسلم اقلیت کے لیے تحفظات اور مراعات کا سودا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ غیر مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کے لیے پاکستان کا مطلب فقط یہی تھا کہ اس کی وجہ سے ان کو اپنے علاقوں میں رہتے ہوئے ہی تحفظات اور مراعات حاصل ہو جائیں گی۔ ہجرت یا نقل مکانی ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی، پاکستان کے بارے میں اپنے اس تصور کا اظہار ان علاقوں اور بالخصوص یو پی کے مسلم لیگی رہنما کرتے رہتے تھے۔ ان میں چودھری خلیق الزمان، جو کہ آل انڈیا مسلم لیگ مجلس عاملہ کا رکن ہونے کے علاوہ یو پی سے صوبائی اسمبلی کا رکن بھی منتخب ہوا تھا، نے گورنر یو پی، ایف۔ وائلی کے ساتھ ملاقات میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس ملاقات کی تفصیل سے ویول کو آگاہ کرتے ہوئے وائلی اپنے 2/جنوری کے مراسلے میں خلیق الزمان کے متعلق لکھتا ہے۔ ''میں نے اس کو پسند کیا ہے لیکن سب سے گہرا تاثر جو اس کے ساتھ گفتگو کے دوران مجھے ملا وہ یہ تھا کہ اسے پاکستان کے بارے میں اس سے زیادہ یقین نہیں ہے جتنا کہ مجھے ہے۔ اگر علیحدہ مسلم ریاستیں وجود میں آئیں گی تو پھر اس کے خیال میں ان کے اندر ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد ضرور ہونی چاہیے کہ جن کے عوض اودھ کے مسلمانوں کو یہاں کے اکثریتی فرقہ کی طرف سے روا رکھی جانے والی بدسلوکی کے برخلاف کوئی ضمانت حاصل ہو سکے۔ یہ اس نے بڑے بھولے پن سے کہا اور تقریباً چٹخارہ لیا جب اسے اس لطف کا خیال آیا جو پاکستان کی حکومت (حکومتیں) عوضانے میں ہندوستان میں اپنے ہم مذہبوں کا تحفظ کر کے حاصل کرے (کریں) گی!''[4] غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں آباد مسلمان درمیانہ طبقہ جو ہندوؤں کے معاشی اور معاشرتی غلبہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنی ترقی وخوشحالی کی خاطر تحفظات اور رعایتوں کا طلب گار تھا فقط اسی حوالے سے پاکستان کو دیکھتا تھا اور اسی بناء پر اس نے انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ نقل مکانی یا ہجرت کر کے کسی ممکنہ پاکستان میں جا کر آباد ہونے کا اسے خیال تک نہ تھا۔ پاکستان کے وجود میں آنے کا بھی ان کو کوئی یقین نہیں تھا۔ تاہم وہ مطالبہ پاکستان کے نعرے میں مسلم اکثریت کے علاقوں کے مسلمانوں کے ہم نوا اس لیے ہو گئے تھے کہ اکثریتی علاقے کے مسلمانوں کی قوت کے بل پر ہی وہ اقلیتی علاقے میں رہتے ہوئے اپنے لیے تحفظات اور مراعات حاصل کر سکتے تھے۔

یو۔ پی کے بیشتر مسلمان جاگیر دار اور تعلقہ دار جو اگر چہ کچھ تو درمیانے طبقے کے دباؤ کے تحت اور کچھ 39-1937ء کے دوران کانگرسی حکومت کے دور میں کانگرس کی بے التفاتی کا رویہ دیکھ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے، پنجاب اور سندھ کے بہت سے جاگیرداروں کی طرح مسلم عوام الناس کی قوت پر انحصار کرنے کے بجائے آخر وقت تک انگریزوں سے امیدیں لگائے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا سیکرٹری جنرل نواب زادہ لیاقت علی خان بھی یو۔ پی کے اسی طبقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ وہ پہلی بار 24 رجنوری 1946ء کو ویول سے ملا۔ اپنے روز نامچے میں اس ملاقات کا احوال قلم بند کرتے ہوئے ویول لکھتا ہے ''...... وہ نسبتاً پر کشش اور خوش گوار شخص ہے اور جناح کی نسبت اس کے ساتھ بات چیت کرنا آسان ہے۔ اس کی گفتگو کا لُبِ لباب یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان کبھی مفاہمت نہیں کریں گے اور انگریزوں کو پاکستان کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑے گا اور کوئی حل نکالنا پڑے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ اگر ہم نے کوئی حل ٹھونسنے کی کوشش کی تو پھر اس پر عملدرآمد کی خاطر ہمیں ہندوستان میں مزید ٹھہرنا پڑے گا۔ اس پر اس نے کہا کہ خواہ کوئی بھی صورت پیدا ہو، مزید کئی سال کے لیے ٹھہرنا تو آپ کو پڑے گا ہی اور یہ کہ مسلمان تو ہرگز اس کے خواہش مند نہیں ہیں کہ آپ یہاں سے جائیں۔ ہندوستان تنہا نہیں رہ سکتا۔ یہاں کوئی بدتر آقا آ جائے گا۔''[5] گویا وہ یہاں انگریزوں کا غلبہ برقرار رکھتے ہوئے کسی ایسے حل کا خواہاں تھا جس میں آزاد اور خودمختار پاکستان کے بجائے کچھ مراعات اور تحفظات حاصل ہو جاتے۔

مسلمانوں میں تھوڑا بہت تجارتی سرمایہ دار طبقہ جو کلکتہ اور بمبئی میں مقیم تھا، وہ بھی پاکستان کے بجائے ایسے تحفظات اور مراعات کا خواہاں تھا جن کی بدولت وہ ہندو بورژوازی کے ساتھ مسابقت کے قابل ہو سکے۔ مزرا ابوالحسن اصفہانی (ایم۔اے۔ایچ اصفہانی) جس کے خاندان کا کلکتہ میں کافی کاروبار تھا اور جو 1937ء سے بنگال لیجسلٹیو اسمبلی کا رکن تھا اور اب آل انڈیا مسلم لیگ مجلس عاملہ کا بھی رکن تھا، اس نے 2 رجنوری 1946ء کو بنگال کے گورنر کیسی کے ساتھ ملاقات میں اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس بارے میں کیسی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے ''میں نے اصفہانی سے پوچھا کہ کیا مسلم لیگ ابھی تک پاکستان بنانے پر تلی ہوئی ہے اور کسی دوسری چیز پر راضی نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ جہاں تک اس کا تعلق ہے تو وہ اس کے حق

میں نہیں ہے۔ اس کی رائے میں اصل مسئلہ اقتصادی ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کے مواقع انتظامی طور پر اور دیگر اعتبار سے مہیا ہونے چاہئیں۔ اس سے مجھے یہ قطعی تاثر مِلا ہے کہ مسلمانوں کو پاکستان کے بجائے مناسب تحفظات قابل قبول ہو نگے...... وہ (اصفہانی) اس بات کا بھی پوری طرح قائل ہے کہ اب چھوٹی ریاستوں کا زمانہ لد گیا ہے۔ اس نے مجھے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ مسلمان کانگرس سے مناسب تحفظات حاصل نہیں کرسکیں گے البتہ انگریز ایسا کر سکتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ اگر ہم ہندوستان میں ایک ایسی عبوری حکومت قائم کریں جس میں مسلمانوں کے لیے مناسب تحفظات کا بندوبست ہو تو یہ ان کو قابل قبول ہو گی۔''[6]

چنانچہ مسلم لیگ میں شامل جاگیرداروں، تعلقہ داروں اور سرمایہ داروں کو علیحدہ مملکت پاکستان کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ صرف تحفظات چاہتے تھے جو کہ کانگرس تو دینے پر آمادہ نہ تھی البتہ انہیں انگریزوں سے یہ توقع تھی کہ وہ کانگرس کو ان کے لیے تحفظات مہیا کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ مگر کانگرس کی تنگ نظری کی وجہ سے یہ توقع کبھی پوری نہ ہوئی۔ تاہم درمیانے اور نچلے طبقے کے مسلم عوام الناس مطالبہ پاکستان کے بارے میں بہت زیادہ پرجوش تھے اور جناح ان کے وکیل کی حیثیت سے سختی سے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے اور اسی لیے انہوں نے ان کو اپنا ''قائداعظم'' بنالیا ہوا تھا۔

برطانوی پارلیمانی وفد کی آمد اور اس کے ارکان کی طرف سے تقسیم کی مخالفت

5/جنوری 1946ء کو برطانوی پارلیمنٹ کی جانب سے ایک دس رکنی نمائندہ وفد ہندوستان کے دورے پر آیا جس کا مقصد یہاں کے مسئلے کا موقع پر جائزہ لینا تھا۔ اس وفد کے ارکان نے 8/جنوری کو جناح کے ساتھ اور 10/جنوری کو نہرو کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح نے اپنا مؤقف واضح کیا جس میں دو آئین ساز اسمبلیوں کا قیام، مسلم لیگ اور تمام دوسری جماعتوں کے مابین مساوی نمائندگی کی بنیاد پر ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل اور پاکستان کے قیام کا اصول تسلیم کیا جانا شامل تھا۔ وفد کے رکن وڈرووائٹ کے ساتھ ملاقات میں جناح نے یہ تاثر بھی دیا کہ وہ

غیر مسلم اکثریت کا انبالہ ڈویژن کا علاقہ چھوڑ دینے پر آمادہ ہیں بشرطیکہ پاکستان کو معاشی اور ثقافتی لحاظ سے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے۔ انہوں نے یہ یقین دہانی بھی کروائی کہ پاکستان برطانوی گورنر جنرل کی زیرنگرانی رہتے ہوئے سلطنت برطانیہ میں شامل رہے گا۔ برطانوی صنعت وتجارت کی حوصلہ افزائی کی جائے گی تاکہ وہ ترقی کر سکے کیونکہ وہ معاشی طور پر ہندوستان سے بہت پیچھے ہوگا۔ نہرو نے اپنا مؤقف واضح کرتے ہوئے وڈرووائٹ کو بتایا کہ اگر حکومت برطانیہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہی ہو جائے تو پھر سرحدی علاقوں میں استصواب کرایا جائے تاکہ وہاں کی غیر مسلم آبادی کو تھوڑے بہت علاقائی ردوبدل کے ساتھ ہندوستان میں شامل ہونے کا موقع مل جائے۔ ایسا ہونے کی صورت میں وہ پاکستان کو قبول کرلے گا۔ پارلیمانی وفد یکم فروری تک ہندوستان میں ٹھہرا جس دوران اس نے دیگر مکاتیب فکر کے رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتیں کیں۔

واپس جاکر 13رفروری کو اپنے تاثرات قلم بند کرواتے ہوئے اس وفد کے ارکان نے بتایا کہ جب وہ ہندوستان گئے تھے تو ان کے ذہن میں ایک متحدہ ہندوستان کا تصور تھا مگر وہاں قیام کے دوران واضح ہوگیا کہ یہ دو فریقین کے مابین بٹا ہوا ہے۔ ایک رکن لارڈ منسٹر کی رائے یہ تھی کہ ''حکومت برطانیہ کو پاکستان کے حق میں اعلان کر دینا چاہیے۔ یہ ایک انتہائی افسوس ناک راستہ ہوگا۔ پاکستان ایک قابل عمل تجویز نہیں ہے......'' مسز نکول کا کہنا تھا کہ ''پنجاب کی صورت حال بڑی دھماکہ خیز بنی ہوئی ہے۔ مسلمان آبادی مکمل طور پر پاکستان کے حق میں ہو چکی ہے۔ میں نے اپنا دورۂ ہندوستان اسی خیال سے شروع کیا تھا کہ ہندوستان کا متحد رہنا بے انتہا ضروری ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر یہ کھلا کہ پاکستان کی کوئی نہ کوئی صورت تسلیم کرنا پڑے گی۔ جناح اپنے مطالبہ پاکستان کے موجودہ منصوبے میں تھوڑا بہت ردو بدل کرسکتا ہے لیکن جب تک اسے ابتدا ہی میں اصولی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا جناح تعاون پر آمادہ نہیں ہوگا۔ جناح یہ تسلیم کرتا ہے کہ پاکستان کا دفاع بغیر برطانوی افواج کے قابل عمل نہیں ہوسکتا۔'' جب ان پارلیمانی ارکان سے پیتھک لارنس نے پوچھا ''کہ کیا آپ میں سے کسی نے جناح کو ایک ایسی مرکزی ایجنسی کے بارے میں تجویز کیا جو محض چند وفاقی ذمہ داریوں تک محدود ہو۔'' مسز نکول نے جواب میں کہا کہ ''اگر ایک بار پاکستان منظور کرلیا جائے تو پھر جناح

ہندوستان کے ساتھ مشترکہ مقاصد وضع کرنے کے لیے آمادہ ہوگا۔'' بریگیڈیئر لوکا تاثر یہ تھا کہ ''اگرچہ حکومت برطانیہ کے لیے پاکستان کے حق میں اعلان کرنا ناگوار ہے لیکن شاید یہ ضروری ہو چکا ہے۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ایک بار جناح کو پاکستان حاصل ہو گیا تو اس کے بعد ہندوستان کے ساتھ اس کا اتحاد ناممکن ہو جائے گا۔ وہ ایک بالکل علیحدہ ڈومینین چاہتا ہے لیکن مسلم اکثریت کے علاقوں کے حق خود ارادیت کی بنیاد پر پاکستان کا وجود میں آنا ایک ناقابل عمل تجویز ہے۔'' ایک اور رکن سورن سن نے بھی پاکستان کو نامعقول تجویز قرار دیا اور جناح کے معقول آدمی ہونے پر بھی شبہ ظاہر کیا لیکن ساتھ ہی پاکستان کو ضروری بھی قرار دیا۔ تاہم اس نے پاکستان کے ساتھ پورے برصغیر کی ایک ایسی مرکزی حکومت بھی تجویز کی جو اہم وفاقی امور کی حامل ہو۔ باٹملے نے بھی پاکستان کے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن دو وجوہات کی بنا پر پاکستان کو منظور کر لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ ایک تو یہ کہ وسیع پیمانے پر خونریزی کو روکنا مقصود تھا۔ دوسرے برطانوی تجارتی مفادات کے تحفظ کی خاطر کیونکہ اس کے بقول کانگرسی اکثریت کے صوبوں میں برطانوی مال کے بائیکاٹ کا رجحان پایا جاتا تھا جب کہ مسلمان انگریزوں کے ساتھ تجارت کرنا چاہتے تھے۔ وڈروواٹ کی رائے تھی کہ اگر آئین سازی میں مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا گیا تو وسیع پیمانے پر تشدد پھیل جائے گا۔ اس لیے جناح کو مسلم اکثریت کے علاقوں کی بنیاد پر پاکستان کی پیش کش کر دینی چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ پاکستان کے اندر آنے والے سکھ علاقوں کے متعلق سکھوں اور جناح کے مابین مصالحت ہو جائے گی۔ [7]

پارلیمانی وفد کے مذکورہ دورہ سے ہندوستانی مسئلے کے حل کے بارے میں کوئی ٹھوس پیش رفت نہ ہُوئی تاہم برطانوی حلقوں میں اس مسئلے کے بہت سے وہ پہلو اُجاگر ہوئے جو ابھی تک یا تو پوشیدہ تھے یا ان کے بارے میں غلط تاثر پایا جاتا تھا۔ پارلیمانی وفد نے اپنی آنکھوں سے انتخابات کی گہما گہمی کو دیکھا جس میں مسلم ہندوستان مسلم لیگ کی قیادت میں بالکل علیحدہ کھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ انگریزوں نے پہلی مرتبہ پاکستان کے بارے میں بھی اگرچہ بادل نخواستہ لیکن مثبت انداز میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ایک آئی۔سی۔ایس افسر پینڈرل مون، جس نے پندرہ سال تک پنجاب میں کئی ذمہ دار انتظامی حیثیتوں میں فرائض انجام دیئے تھے، سٹیفورڈ کرپس کے لیے ایک یادداشت قلم بند کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اب یہ پوری طرح واضح ہو چکا

ہے کہ پاکستان کے مسئلہ کا پوری دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ سامنا کرنا ہوگا۔ اس کے ساتھ فریب دہی کا اب معمولی سا امکان بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ امید کی جاتی تھی کہ مسلم اکثریت کے دو بڑے صوبوں یعنی بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت جناح کے انتہا پسندانہ مطالبات کی حمایت نہیں کرے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں صوبوں کے مسلمانوں کو تقسیم ہندوستان پر اصرار نہ ہو تو پھر اس (یعنی تقسیم) کو باآسانی رد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناح نے ان کی حمایت جیت لی ہے۔ بنگال میں پہلے ہی لیگ کی جانب فیصلہ کن جھکاؤ پیدا ہو چکا ہے۔ پنجاب میں مسلمان یونینسٹوں کی ایک ٹھوس جمعیت جو پہلے واضح طور پر جناح کی مخالف تھی اب بری طرح پھوٹ کا شکار ہو چکی ہے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد ٹوٹ کر جناح اور لیگ کے ساتھ مل گئی ہے......'' آگے چل کر مون نے تجویز کیا کہ ابھی تک سرکاری بیانات اور سرکاری خیالات میں ہندوستان کے اتحاد پر جو زور دیا جاتا رہا ہے، اب اس کا موقع نہیں رہا ہے۔ حکومت برطانیہ کو غیر جانب دار ہو جانا چاہیے۔ مون نے اپنی یادداشت کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی کہ مسلمانوں کی خواہشات کے خلاف اگر ہندوستان کو متحد رکھا گیا تب بھی قوت کو بروئے کار لانا پڑے گا اور اگر ہندوؤں کی منشا کے خلاف ہندوستان کو تقسیم کر دیا گیا تب بھی قوت استعمال کرنا پڑے گی جو کہ اس دوسری صورت میں کم درکار ہوگی۔

''مدراس، بمبئی، یوپی اور سی پی کے ہندو، پنجاب اور بنگال میں اپنے بھائیوں کے بھارت ماتا کی آغوش سے چھین لیے جانے پر آہ و بکا تو کریں گے لیکن ان کی خاطر جہاد کرنے کا نہ تو ان کا ارادہ ہے اور نہ ہی وہ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ اس لیے جناح کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لینا ایک درست فیصلہ ہوگا۔ اس کے بعد جناح معقولیت پر آمادہ ہو جائے گا جو کہ وہ ابھی تک نہیں ہوا ہے اور پھر وہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین قریبی اشتراک کا خیر مقدم کرے گا۔ اس کی پبلک تقریریں اور بعض نجی اطلاعات اس جانب نشاندہی کرتی ہیں۔ پنجاب کی مسلم لیگ میں حال میں جو اعتدال پسند اور معقول لوگ شامل ہوئے ہیں، وہ بھی اس اشتراک کی ضرورت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ موجودہ متحدہ ہندوستان کی حکومت تو ختم ہو جائے گی لیکن اس کا احیاء مشترکہ بورڈوں کی تشکیل، پنجسالہ اور دس سالہ معاہدوں اور ہندوستان۔ پاکستان کانفرنسوں کے ذریعے جلد ہی عمل میں آجائے گا۔ ہندوستان صرف اس لیے تقسیم ہوگا تا کہ وہ زیادہ مضبوطی کے

ساتھ متحد ہو سکے کیونکہ پھر وہ زیادہ آزادی میں رہتے ہوئے ایسا کرے گا۔ پاکستان کو برائے نام منظور کر کے دراصل قریب قریب ایک متحدہ ہندوستان ہی کی صورت کو وضع کیا جائے گا۔''
آخر میں اس نے لکھا کہ ''مطالبہ پاکستان سے ہندو اور ہم بلا وجہ خائف ہو رہے ہیں۔ اس کو تسلیم کر کے اس کا ڈنگ نکال دیجیے۔''[8] گویا وہ انگریز جو پاکستان کو قبول کرنے پر آمادہ ہوئے وہ بھی بالآخر ایک متحدہ ہندوستان ہی تشکیل دینا چاہتے تھے اور پاکستان کو محض ایک عارضی بندوبست قرار دیتے تھے تاکہ پاکستان کے نام پر پاکستان کا ''ڈنگ'' نکالا جا سکے۔

1946ء کے اوائل میں انتخابات کے نتائج منظر عام پر آنے شروع ہوئے تو انگریز حکمرانوں کی سوچ میں بھی تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے اور انڈیا آفس کے کارپرداز اور وائسرائے اور گورنر، پاکستان کو قبول کرنے کے پہلوؤں کا جائزہ لینے لگے۔ 11 رجنوری کو پیتھک لارنس نے ویول کو اپنے مراسلے میں لکھا کہ مسلم اکثریت کے حقیقی علاقوں کے بارے میں ضرورت پڑنے پر کیا تشریح ہوگی۔ اس کے متعلق جلد از جلد اپنی اصل تجاویز سے آگاہ کرو۔ 14 رجنوری کو ویول نے گورنر بنگال کیسی کے نام اپنے مراسلے میں لکھا کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ کون سے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے، میں استصواب کے امکان کو رد نہیں کرتا لیکن میرا خیال ہے کہ استصواب کے بغیر بھی ان کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ زیرِ غور علاقوں سے تعلق رکھنے والے ارکان اسمبلی کا خصوصی اجلاس طلب کیا جا سکتا ہے۔ یا یہ کہ ڈسٹرکٹ بورڈوں میں رائے شماری کرائی جا سکتی ہے۔

اسی طرح انگریزوں کے سرکاری حلقوں کے علاوہ غیر سرکاری حلقوں میں بھی بعض عناصر پاکستان کے حق میں دلائل دینے لگے تھے۔ کارل ہیتھ جو انڈیا کونسلٹیشن گروپ (India consultation group) نامی ایک آزاد خیال حلقے کا چیئرمین تھا، پیتھک لارنس کی جانب سے پاکستان کے بارے میں رائے طلب کیے جانے پر 14 رجنوری کو جواب میں لکھتا ہے کہ ''پاکستان مسلمانوں کے اس معقول خوف کا اظہار ہے کہ کہیں وہ ایک طاقتور وحدانی ریاست ہند میں تحلیل نہ ہو جائیں کہ جس میں ایک کے مقابلے میں ڈھائی ہندو کی نسبت سے ان کا وجود ہوگا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ اس جائز مسئلے پر ہمدردانہ غور کرے اور اسے بے تکلفانہ اور مؤثر انداز سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن ایسا کرتے وقت ایک کے مقابلے میں تین

کی اکثریت (یعنی ہندو سکھ، عیسائی، بدھ اور پارسی) کا یہ معقول دعویٰ بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ برطانیہ کے ماتحت استوار ہونے والے ہندوستانی اتحاد کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔'' اس کا حل اس نے یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا کے نام سے ایک بالکل ڈھیلے ڈھالے وفاق کی صورت میں پیش کیا جو صرف محدود پیمانے کے اختیارات کا حامل تھا۔ البتہ اس کے بقول دفاع اور امور خارجہ کا معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔''[9] چنانچہ انگریز سرکاری اور غیر سرکاری حلقے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو گھما پھرا کر ایک متحدہ ہندوستان کی صورت ہی میں تسلیم کرنا چاہتے تھے۔ کم از کم دفاع کو، جس کا امور خارجہ اور مواصلات لازمی جزو سمجھے جاتے ہیں، وہ ہر قیمت پر مشترک رکھنا چاہتے تھے۔ سوویت یونین اور کمیونسٹ چین کے خلاف محاصرے میں برصغیر کو جو اہمیت حاصل تھی اس کے پیش نظر برطانوی سامراجی حلقوں میں اول تو متحدہ ہندوستان ورنہ کم از کم مشترکہ دفاع کو لازمی سمجھا جا رہا تھا۔

فرانسس موڈی جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن برائے امور داخلہ رہنے کے بعد جنوری 1946ء میں سندھ کا گورنر بنا دیا گیا تھا، ان دنوں سرکاری حلقوں میں آئینی مسئلے پر چل رہی بحث میں حصہ لیتے ہوئے اپنے ایک نوٹ میں لکھتا ہے ''میری رائے میں ہندوستان میں ایک علاقائی بندوبست (جیسا کہ اقوام متحدہ میں مراد لیا جاتا ہے) استوار کرنا چاہیے جو ہمالیہ کے جنوب میں عدن سے لے کر سنگاپور تک کے تمام علاقے (بشمول افغانستان و نیپال) میں امن وسلامتی کا ذمہ دار ہو اور جس کے ماتحت انڈین اور برطانوی سپاہ پر مشتمل ایک مشترکہ فوج ہو۔ (''انڈین آرمی'' کے بجائے ہندوستانی و پاکستانی آرمی کے الفاظ استعمال کئے جا سکتے ہیں)۔ اس تجویز میں مشکل صرف اس سوال پر درپیش ہو گی کہ انڈیا کو ڈومینین کا درجہ حاصل ہونے کے بعد انڈین آرمی کا کنٹرول کس کو حاصل ہو گا۔ اس تجویز سے انڈیا کو بھی تحفظ حاصل ہو گا اور یہ وہ پہلو ہے جس کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اگر آئینی مسئلہ پاکستان کی صورت میں حل ہو تو یہ تجویز خانہ جنگی کے خلاف ضمانت مہیا کرے گی۔ خواہ کوئی بھی صورت ہو ایک ''علاقہ'' (اقوام متحدہ کے معنوں میں) جو انڈیا پر مبنی ہو، کے قیام کا بغور جائزہ لیا جانا چاہیے۔''[10] 14 رجنوری 1946ء کو برطانوی کابینہ کے فار ایسٹرن پلاننگ یونٹ نے بھی برصغیر کے مشترکہ دفاعی منصوبے کے بارے میں کابینہ

کے لیے ایک نوٹ تیار کیا جس میں کہا گیا کہ برصغیر فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے اہم علاقہ ہونے کی بدولت آزادی کے بعد بھی برطانوی دولت مشترکہ کا جزو رہنے پر مجبور ہوگا۔اس لیے اس کے اتحاد کو برقرار رکھنا چاہیے۔

حکومت ہند کے محکمہ خزانہ کی مواصلات ڈویژن کے ایک اسسٹنٹ فنانشل ایڈوائیزر مورس زنکن کا 1945ء کا لکھا ہوا ایک نوٹ برطانوی وزیر خزانہ سٹیفورڈ کرپس نے 16 رجنوری 1946ء کو انڈیا آفس کو ارسال کیا۔ اس میں دفاعی مالیات کے مختلف پہلوؤں سے پاکستان کے قیام کی تجویز کو ناقابل عمل ثابت کیا گیا تھا۔ متبادل صورتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ پاکستان و ہندوستان کا دفاع مشترک نہ ہونے کی صورت میں انڈیا کی شمال مغربی اور شمال مشرقی سرحدوں کے دفاع کی کل ذمہ داری اکیلے پاکستان کے کاندھوں پر آن پڑے گی جس کا وہ متحمل نہیں ہو سکے گا۔ اس نے انڈیا کے دفاعی اخراجات کا کل تخمینہ ایک ارب روپے لگایا۔جس میں سے سرحدوں پر ہونے کی وجہ سے اس کے خیال میں پاکستان کو اسی کروڑ روپے کا بوجھ اٹھانا تھا۔ ہندوستان کو بقیہ بیس کروڑ کے خرچ کے علاوہ ایک علیحدہ ریاست ہونے کے سبب اس سے کچھ زیادہ اخراجات کرنے تھے۔ اس کی رائے میں پاکستان کے اسی کروڑ روپے کے دفاعی اخراجات کے علاوہ کم از کم تیس کروڑ روپے ریاست کے دوسرے شعبوں کے لیے مخصوص کئے جانے ضروری تھے۔ اس طرح پاکستان کا کل سالانہ بجٹ ایک ارب دس کروڑ روپے کا بنتا تھا جب کہ اس کے مطابق پاکستان کے علاقوں سے حاصل ہونے والے کل ریونیو کی مقدار صرف ساٹھ کروڑ روپے تھی۔ان حالات میں پاکستان کی معیشت کا دیوالیہ ہونا ناگزیر تھا جو اپنے پہلے ہی سال کم از کم پچاس کروڑ روپے کے خسارے کا شکار ہوتی نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے پاکستان کی تجویز کو اقتصادی نقطۂ نگاہ سے ایک ناقابل عمل تجویز قرار دیا۔ دوسری متبادل صورت کے طور پر اس نے اس تجویز کو بھی ناقابل عمل قرار دیا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کا دفاع تو مشترکہ ہو لیکن کرنسی یا کسٹمز یونین جداگانہ ہوں۔ اس کی رائے میں قابل عمل صورت صرف یہ تھی کہ دونوں ملکوں کا دفاع، کرنسی اور کسٹمز یونین مشترکہ ہوں جس کے لیے کسی نہ کسی شکل میں مرکز کا وجود برقرار رکھا جائے جو مسلح افواج کو منظم کرے اور ان کی تنخواہوں کی ادائیگی کی خاطر جس قدر ضروری ہو ٹیکسوں کی وصولیابی کا کام کرے۔[11] چنانچہ برطانوی

سرکاری وغیر سرکاری حلقے اب اگر پاکستان کو تسلیم کرنے بھی لگے تھے تو کم از کم دفاع، کرنسی اور مالیات کا نظام ضرور مشترک رکھنا چاہتے تھے۔

کچھ ایسا ہی نقطۂ نظر کانگرسی حلقوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ 27/جنوری 1946ء کو جواہر لال نہرو نے سٹیفورڈ کرپس کے نام ایک تفصیلی خط تحریر کیا۔ اس نے لکھا ''حقیقت یہ ہے کہ پاکستان یا علیحدگی کے مسئلہ کو دفاع اور اس سے متعلقہ امور سے جدا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کسی بھی موقع پر اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج کی صورت حال میں جب کہ مشرق وسطیٰ میں گڑبڑ پنپ رہی ہے یہ اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیونکہ مناسب دفاع کے بغیر نہ تو پاکستان اور نہ ہی ہندوستان محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اگر دو الگ الگ ملک بن بھی جائیں تب بھی ان کو مشترکہ دفاع کے لیے سکیم وضع کرنی پڑے گی۔ دفاع میں امور خارجہ اور مواصلات بھی شامل ہوتے ہیں۔ دفاع کے نقطۂ نظر سے حقیقی پاکستان یعنی ایک آزاد خود مختار ریاست کے طور پر کبھی معرض وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ الگ ہونے کے باوجود وہ آزاد نہیں رہ سکتا۔''[12] دراصل ہندو بورژوا بھی برطانوی سامراجیوں کی طرح مشرق وسطیٰ میں عرب قوم پرستوں کی سامراج دشمن لہر اور ایرانی آذربائیجان میں کمیونسٹوں کے غلبہ پا جانے سے یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں برصغیر بھی اس لہر کی لپیٹ میں نہ آ جائے۔ اس لیے اب ہندو بورژوا بھی اگر برائے بحث پاکستان کو تسلیم کرنے لگا تھا تو وہ بھی اس بنیاد پر کہ دفاع مشترکہ ہوگا جس کے ساتھ امور خارجہ اور مواصلات بھی لازمی طور پر شامل ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے برطانیہ یہ بھی چاہتا تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستانی فوج میں انگریز فوجی بدستور خدمات انجام دیتے رہیں۔ اگرچہ یہ مشکل بات تھی کہ برطانیہ انگریز فوجیوں کیلئے ایک ایسی حکومت کے ماتحت خدمات انجام دینے پر آمادہ ہو جو برطانوی پارلیمنٹ کو جواب دہ نہیں تھی۔ لیکن بقول ویول ''اس کے بغیر عملاً کوئی اور چارہ کار بھی تو نہیں تھا۔''[13] کانگرس کے بعض حلقوں کی جانب سے بھی اِسی قسم کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کے گورنر کننگھم کے 23/جنوری کو ویول کے نام تحریر کردہ مراسلے کے مطابق صوبہ سرحد کے بعض مسلمان کانگرسی رہنماؤں نے کننگھم سے کہا کہ آزادی کے بعد سول اور ملٹری دونوں سروسز کے اندر انگریزوں کا ایک مضبوط عنصر موجود رہنا چاہیے۔ بقول کننگھم انہوں نے یہ بات اپنے مرکزی رہنماؤں کے اشارے پر کہی تھی۔[14]

انگریزوں کے نزدیک ہندوستانی فوج وہ قیمتی اثاثہ تھی جسے وہ سوویت یونین اور کمیونسٹ چین کی حصار بندی کے لیے اور مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ تک پھیلی ہوئی حریت پسند قوم پرستوں کی سامراج دشمن تحریکوں کے اثر سے برصغیر کو محفوظ رکھنے کی خاطر استعمال میں لانے کے لیے یکجا اور متحد رکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانی فوج کے وقار کی سربلندی کے بھی خواہاں تھے۔ جو جنگ عظیم کے دوران جاپانیوں سے بری طرح شکست کھانے کے نتیجے میں مجروح ہوا تھا۔ 19 رجنوری کو سردار پٹیل نے ویول کے ساتھ ملاقات کی۔ ویول نے پٹیل سے کہا کہ مرکزی اسمبلی کو چاہیے کہ وہ جنگ کے دوران ہندوستانی فوج کی خدمات کو سراہتے ہوئے ایک قرار داد منظور کرے جس میں اس کے کارناموں پر خراج تحسین پیش کیا جائے۔ لیکن یہ دھیان رہے کہ اس کی وجہ سے کوئی سیاسی مناقشہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ پٹیل نے اتفاق کیا کہ ایسی قرار داد ضرور منظور ہونی چاہیے۔ لیکن اس وقت اسمبلی کا مزاج ایسا ہے کہ اس سے سیاسی مناقشہ کو ہوا مل سکتی ہے۔ اس لیے یہ قرارداد پیش کرنے سے اجتناب برتنا چاہیے۔''[15] گویا ہندو بورژوا بھی جو کہ برطانیہ کے ماتحت تیار کردہ متحدہ برصغیر کی فوج کا خود کو حقیقی وارث سمجھتا تھا اور اس سامراجی اثاثہ کو یکجا و متحد رکھنا چاہتا تھا، اس ادارہ کے وقار کی سربلندی کا خواہاں تھا۔ لیکن چونکہ یہ فوج برطانوی سامراج کے لیے ساری دنیا میں خدمات انجام دیتی آئی تھی اور اس وقت بھی انڈونیشیا اور ملایا میں وہاں کے مقامی قوم پرستوں کے خلاف استعمال ہو رہی تھی، اس لیے کھل کر اس کی تعریف و توصیف میں کوئی قرار داد منظور نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ہندوستان کے عوام میں برطانوی سامراج کے خلاف شدید نفرت پائی جاتی تھی اور بڑے زور وشور سے یہ مطالبہ کیا جارہا تھا کہ انڈونیشیا اور ملایا سے ہندوستانی فوج کو واپس بلایا جائے۔ چنانچہ 21 رجنوری کو جب مرکزی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں محمد علی جناح، سرت چندر بوس اور چمن لال نے انڈونیشیا میں ہندوستانی افواج کے استعمال پر شدید احتجاج کیا اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا یعنی مسلم لیگ اور کانگرس دونوں نے اسمبلی میں عوام کے جذبات کا اظہار کیا۔

ہندو، مسلمان اور دوسری اقلیتیں برطانوی سامراج کے برصغیر سے انخلاء پر تو متفق تھیں لیکن اصل مسئلہ آزادی کے بعد مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ میں حائل ہندو غلبہ کا تھا جس کے توڑ کے لیے مسلمان ایک علیحدہ مملکت پاکستان کے

مطالبہ پر ڈٹ گئے ہوئے تھے۔ ہندو مسلم تضاد شدید تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ 23 رجنوری 1946ء کو بمبئی میں خونریز ہندو مسلم فساد ہوا جس میں گیارہ افراد ہلاک اور بیشتر زخمی ہوئے۔[16] 16 رجنوری کو گورنر پنجاب گلانسی نے ایک مراسلے میں ویول کو اپنے صوبے کی بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورت حال کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس نے لکھا کہ فرقوں کے مابین تناؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس نے مسلم لیگ کو الزام دیتے ہوئے لکھا کہ مسلم لیگی کارکن مسلمان ووٹروں کو دھمکیاں دے رہے ہیں کہ اگر کسی نے مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیا تو اس کا حقہ پانی بند کر دیا جائے گا۔ اسے نمازوں کے اجتماعات میں شامل ہونے سے روک دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ اگر وہ مر گیا تو اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہاں ''جے ہند'' کے نعروں کے جواب میں ''پاکستان'' کے نعرے گونج رہے ہیں۔''[17]

ایک جانب مسلمانوں کے مؤقف میں یہ پختگی پائی جاتی تھی تو دوسری طرف کانگرس بھی مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ نومنتخب مرکزی اسمبلی کا صدر (سپیکر) منتخب کرنے کا موقع آیا تو کانگرس کا یہ رویہ پھر ظاہر ہوا جیسا کہ 39-1937ء میں کانگرس کے اقتدار میں ظاہر ہوا تھا۔ اگرچہ یہ بات تو عیاں تھی کہ ایوان کی اکثریتی جماعت کی حیثیت سے کانگرس کا رکن ہی اس عہدے پر منتخب ہوگا۔ لیکن کانگرسی ارکان میں بعض اعتدال پسند ایسے بھی تھے جو مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں کے لیے بھی قابل قبول تھے اور اگر سب جماعتوں سے مشورہ کر لیا جاتا تو ایوان کی متفقہ رائے سے صدر اسمبلی منتخب ہو سکتا تھا۔ کانگرس کا اس قسم کا ایک رکن کشتش چندر نیوگی تھا جس کو صدر منتخب کرنے پر اسمبلی کے تمام گروپ بشمول سرکاری ارکان آمادہ تھے۔ لیکن کانگرس نے پٹیل کے زیر اثر گنیش واسودیو موالنکر کو امیدوار نامزد کر دیا جو بمبئی صوبائی اسمبلی کا سپیکر رہ چکا تھا اور اپنی جانب داری اور تعصب کے لیے مشہور تھا اور بقول آرتھر مور ''اس دوران اس نے مسلمانوں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں کیا تھا۔''[18] چنانچہ مسلم لیگ نے اس کے مدمقابل بمبئی کے ایک پارسی رکن مرکزی اسمبلی سر کاواس۔ جی جہانگیر کی حمایت کی جسے بعض دوسری اقلیتوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ رائے شماری ہوئی تو موالنکر سادہ اکثریت سے اسمبلی کا صدر منتخب ہوا۔ اسے تمام گروپوں کی حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ نئی اسمبلی میں پہلے قدم پر ہی کانگرس نے تنگ نظری کا یہ مظاہرہ کر دیا تھا کہ جس کے بعد جب 28 رجنوری کو وائسرائے

ویول نے اس اسمبلی میں خطاب کیا اور کہا کہ میں عنقریب نئی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دوں گا اور پھر ایک آئین ساز ادارہ وضع کیا جائے گا جو ہندوستان کا مستقبل کا آئین تیار کرے گا تو جناح نے اپنے ایک بیان میں شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ جب تک پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جاتا نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل بے معنی ہے اور یہ کہ برصغیر کو دو حصوں میں یعنی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا جائے اور دو آئین ساز ادارے وضع کئے جائیں۔ ایک ہندوستان کا آئین تیار کرے اور دوسرا پاکستان کا۔ چنانچہ ان حالات میں ہندوؤں کی یہ کوشش کہ پورے برصغیر پر وہ بلاشرکت غیرے حکومت کریں اور انگریزوں کی یہ خواہش کہ خواہ کسی صورت سے ہو برصغیر متحد رہنا چاہیے یا کم از کم مشترکہ دفاع کے تحت افواج متحد رہیں، پوری ہونے کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

وزیر ہند کی سربراہی میں وزارتی مشن کی تشکیل جس کی نظر میں پاکستان ناقابل عمل تھا

14 رجنوری 1946ء کو برطانوی کابینہ کی انڈیا و برما کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ انتخابات کے نتائج منظر عام پر آنے کے بعد ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں جو کشمکش شروع ہونے والی ہے اس کا کوئی مناسب حل دریافت کرنے کے لیے کابینہ کے تین وزیروں پر مشتمل ایک وفد ہندوستان بھیجا جائے۔ 22 رجنوری کو وزیراعظم ایٹلی کی زیر صدارت کابینہ کے اجلاس نے اس فیصلے کی توثیق کر دی اور وائسرائے ویول کو بھی اس سے آگاہ کر دیا گیا۔ وزیر تجارت سٹیفورڈ کرپس، وزیر ہند پیتھک لارنس اور وزیر بحریہ (فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی) اے۔ وی۔ الیگزینڈر کو وفد کے ارکان کے طور پر نامزد کیا گیا۔ طے پایا کہ فروری کے وسط میں اس کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا اور مارچ کے آخری ہفتے میں یہ وفد ہندوستان پہنچ جائے گا اس وقت تک پنجاب سمیت مسلم اکثریت کے صوبوں کے انتخابات کے نتائج کا اعلان ہو چکا ہوگا اور فریقین کی قوت صحیح طور پر سامنے آ چکی ہوگی۔ اس وزارتی مشن کا مطمع نظر بھی فریقین کے مابین کوئی ایسا تصفیہ کرانا تھا کہ جس سے برصغیر کا وہ اتحاد باقی و برقرار رہ جائے جسے برطانوی سامراج نے بڑی تگ ودو کے بعد بہت سے داخلی اور خارجی عوامل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے

انیسویں صدی کے وسط میں قائم کیا تھا۔ وزیر ہند اور وائسرائے کے سٹاف کے اعلیٰ ارکان مطالبہ پاکستان کا جائزہ لینے میں بھی مصروف تھے اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی صورت میں اس کے قابل تسلیم ہونے مگر ساتھ ہی نا قابل عمل ہونے کے بارے میں سفارشات تیار کر رہے تھے۔

6رفروری کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں جس کٹے پھٹے پاکستان پر اپنی رضا مندی ظاہر کی اس کا مغربی حصہ سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کے ملتان ڈویژن، راولپنڈی ڈویژن اور لاہور ڈویژن پر مشتمل تھا جب کہ لاہور ڈویژن کے اضلاع امرتسر اور گورداسپور کو اس میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ امرتسر کے بارے میں کہا گیا کہ چونکہ وہ سکھوں کا مذہبی مرکز ہے اس لیے پاکستان میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ گورداسپور جو اکاون فیصد مسلم آبادی کا ضلع تھا، اس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے ''جغرافیائی وجوہات'' کی بنا پر پاکستان کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا۔''[19] گویا دفاعی نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کو کشمیر کے ساتھ مربوط رکھنے کے لیے گورداسپور کے ضلع کے لیے مسلم اکثریت کے اصول کو نظر انداز کیا جا رہا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ شمال کی جانب سے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان پر اعتماد کرنے کے بجائے ہندوستان کو شمالی سرحدوں تک رسائی بہم پہنچائی جائے۔

ویول کے اس خاکہ پر تبصرہ کرتے ہوئے انڈیا آفس کے اسسٹنٹ سیکرٹری پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ جے۔ پی۔ گبسن نے لکھا کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جناح کلکتہ اور اس کے نواحی اضلاع اور تقریباً نصف پنجاب سے کس طرح دستبردار ہوگا اور یہ بھی کہ پنجابی اپنے صوبے کی قطع و برید کی کیسے اجازت دیں گے۔ اسسٹنٹ انڈر سیکرٹری پی۔ جے۔ پیٹرک نے لکھا کہ مالی، اقتصادی اور دفاعی نقطۂ نظر سے اس کے قابل عمل ہونے پر یقین نہیں آتا۔ ڈپٹی انڈر سیکرٹری ڈبلیو۔ ڈی۔ سی۔ کرافٹ نے لکھا کہ پاکستان جوگندر نگر کی بجلی سے محروم ہو جائے گا اور نائب وزیر ہند ڈی۔ ٹی مونٹیتھ نے لکھا کہ ''میری رائے میں درست طریقہ مختصراً یہ ہے کہ

''ا۔ ایک مناسب مرحلے پر جس کا تعین مشکل ہے، جناح پر یہ منکشف کیا جائے کہ اس کے چھ صوبوں کے بجائے ایک محدود علاقے پر مشتمل پاکستان کو منظور کیا جائے گا۔

ب۔ اس کو سمجھایا جائے کہ یہ علاقہ یا علاقوں کا الحاق قابل عمل نہیں ہے۔

ج۔ اس کو یہ سوچنے پر آمادہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق میں شامل ہو

جانا چاہیے جس کے اندر شامل یونٹوں کے لیے متفقہ طور پر زیادہ سے زیادہ اختیارات جو کہ وفاق کی لازمی ذمہ داریوں کے علاوہ ہوں، تفویض ہو سکتے ہیں۔"[20]

اسی طرح محکمہ جنگ نے بھی برصغیر کو یکجا رکھنے کی سفارش کی۔ ان تمام آراء کو ملحوظ رکھ کر وزیر ہند پیتھک لارنس نے 13 رفروری کو وزارتی مشن کے اراکین کے لیے ایک نوٹ تیار کیا جس میں جائزہ لیا گیا کہ آیا پاکستان زندہ رہنے کا متحمل ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس نے اقتصادی، دفاعی اور مالی پہلوؤں سے تجزیہ کیا۔ اقتصادی حوالے سے تجزیہ میں اس نے کہا کہ

1۔ پاکستان کے حامیوں نے اس کے معاشی پہلو کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں یا وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی آزادی کے مطالبہ کی تکمیل کی خاطر بہت بڑی معاشی قیمت ادا کرنی ہوگی۔

2۔ پاکستان بننے کا پہلا اور فوری اثر یہ ہوگا کہ موجودہ مرکزی محکمے اور سروسز تقسیم ہو جائیں گی جس سے بالائی اخراجات بہت بڑھ جائیں گے۔ ہندوستان میں موجود وسائل جو پہلے ہی زبوں حالی کا شکار ہیں تقسیم ہو جائیں گے۔ اس طرح دنیا میں آزاد تجارت کا حامل سب سے بڑا علاقہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ کسٹمز ایڈمنسٹریشن کا نیا محکمہ کھولنا پڑے گا۔ سرحدی عملہ رکھنے کی وجہ سے اخراجات میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔ کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے تجارت کے فروغ میں رُکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ پاکستان زیادہ تر زرعی علاقے پر مشتمل ہوگا اسے اپنے زرعی خام مال کی کھپت کے لیے صنعتیں قائم کرنا پڑیں گی۔ چنانچہ ہندو صنعت کاروں کے قائم کردہ ٹیکسٹائل کے مراکز سے اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بجائے پاکستان میں سندھ اور پنجاب کی کپاس سے نئے کارخانوں میں تیار شدہ کپڑا استعمال کیا جائے گا۔ اسی طرح یوپی اور بہار کی شوگر کی صنعت کے لیے شمال مغربی ہندوستان ایک قابل قدر منڈی ہے۔ اگر یہاں پاکستان بن گیا تو وہ جاوا سے سستی شوگر درآمد کرنے کو ترجیح دے گا۔

3۔ یہ سوال کہ کلکتہ کو مشرقی پاکستان کا حصہ بنایا جائے یا نہیں سنگین مسائل کو جنم دیتا ہے۔ اگر کلکتہ کو شامل نہ کیا گیا تو مشرقی پاکستان بے چارہ سا لگے گا اور پاکستان کی معیشت میں زراعت کا صنعت و تجارت و مالیات کے ساتھ کوئی توازن نہیں رہے گا۔ کلکتہ کی

پٹ سن کی صنعت کا اپنے خام مال کے سرچشمہ سے رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ اسی لیے مسلمانوں کی جانب سے مغربی بنگال کے دوسرے ہندو علاقوں کے حصول کے بارے میں اتنا اصرار نہیں ہے۔ جتنا کہ کلکتہ کے بارے میں ہے جسے وہ ضرور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ آبادی میں وہاں بہت کم ہیں اور وہاں کی اقتصادی سرگرمی میں بھی ان کا بہت کم حصہ ہے۔ کلکتہ پر مسلمانوں کا دعویٰ بہت کمزور ہے۔ جب کہ ہندوؤں کے دعویٰ کو اس حقیقت سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ وہاں کی یورپی تاجروں کی کمیونٹی کبھی بھی پاکستان کے حق میں نہیں ہوگی۔ کلکتہ کے پاکستان میں شامل ہونے کی صورت میں ہندوستان کو اپنی تمام تر درآمد کے لیے بمبئی پر انحصار کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں ہندوؤں کے کاروباری خاندانوں کو یہاں سے ہندوستان کی طرف نقل مکانی اختیار کرنا پڑے گی۔

4۔ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پنجاب کی خوشحالی کا زیادہ تر دارومدار فوج میں اس کی غالب اکثریت کی وجہ سے اور شمال مغربی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے انڈین آرمی کے افراد کی تنخواہ اور پنشن کے علاوہ پنجاب میں اٹھنے والے فوجی اخراجات کی وجہ سے ہے۔ شمال مغربی صوبوں کی آبادی پورے انڈیا کی آبادی کے دس فیصد سے بھی کم ہے۔ لیکن جب جنگ چھڑی تو انڈین آرمی میں پنجابیوں کی تعداد پچاس فیصد سے بھی زیادہ تھی۔ اگر شمال مغربی پاکستان نے فوج میں ماضی کی طرح اب بھی ایسی ہی پُرمنفعت ملازمتوں کا سلسلہ جاری رکھا تو اس کی قیمت ان کے اپنے ہی علاقے کو اٹھانی پڑے گی، پورے ہندوستان کی اعانت حاصل نہیں رہے گی۔

5۔ اگرچہ پانی کی تقسیم پر کوئی خاص دشواری پیدا نہیں ہوگی کیونکہ وادی سندھ کا تمام نظام پاکستان میں چلا جائے گا لیکن پھر بھی پنجاب اور سندھ میں آبپاشی کے بڑے منصوبے شروع کرنے پڑیں گے جو کہ مرکزی حکومت سے قرضہ لیے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکیں گے۔

6۔ انڈیا کی ترقی کا انحصار سروسز پر رہا ہے جنہوں نے صوبوں اور ریاستوں کی سرحدوں سے بالاتر ہو کر کام کیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ریلوے ہے جب کہ دوسری

مثالوں میں پوسٹ، ٹیلی گراف، بینکنگ، کرنسی، تجارتی قانون وغیرہ شامل ہیں۔انڈیا کی تقسیم ان تمام شعبوں کی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ڈال دے گی تاآنکہ عمومی خیرسگالی اور افہام و یکسانیت کی فضا قائم نہ ہو جائے۔ اس فضا کی عدم موجودگی میں جھگڑے اور مخالفت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ انڈیا کی تقسیم سے تلخ عداوت جنم لے گی اور یہ فرض کرنا بالکل غلط ہوگا کہ اس کا اظہار پاکستان اور باقی ماندہ انڈیا کے مابین مواصلات کے نظام میں اور اقتصادی لین دین میں نہیں ہوگا۔ اگر کراچی اور غالباً کلکتہ بھی انڈیا کے بڑے حصے سے علیحدہ کر دیے گئے تو اس سے شہری ہوابازی کے نظام پر بھی بہت بُرا اثر پڑے گا۔

7۔ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نتیجہ سے مفر نہیں ہوسکتا کہ جہاں تک لوگوں کی معاش کا تعلق ہے، انڈیا کی تقسیم انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ ایک ایسا ملک جہاں معیار زندگی بے حد پست ہے اور آبادی کے اعداد و شمار بھی تیزی سے بڑھ رہے ہیں، اس پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلاشبہ اگر پاکستان کے خلاف ان اقتصادی دلائل کا وزن اس سے متعلقہ افراد نے محسوس کر لیا تو وہ ہندو انڈیا کے ساتھ وفاق قائم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن بدقسمتی سے اس حقیقت کے باوجود کہ سنجیدہ اور حقیقت پسندانہ جائزہ لینے سے پاکستان کی تجویز مکروہ ثابت ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کو ہندو انڈیا کے ساتھ وفاقی یونین بنا کر رہنے کی خاطر اپنے لیے تسلی بخش شرائط کے حصول میں خسارے کی حیثیت قبول کرنی پڑے گی۔ چنانچہ وہ گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہیں کہ آیا تڑا مڑا ہوا چھوٹا سا پاکستان قبول کر لیں یا فیڈرل انڈیا میں ہندوؤں کے ماتحت اور محتاج حیثیت کو گوارا کریں۔ تاہم اگر موجودہ غیر حقیقت پسندانہ رویہ برقرار رہا تو دو کمزور ملک وجود میں آ جائیں گے جو اپنے عوام کی معاشی ضروریات کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔''

اس کے بعد پیتھک لارنس نے پاکستان کے دفاعی مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ۔

1۔ پاکستان میں ڈگ بوئی اور اٹک کے تیل کے کنوؤں کے علاوہ کوئی اور صنعت یا کارخانہ موجود نہیں ہے۔ اس کے مغربی حصے میں کراچی کے علاوہ کوئی اور بندرگاہ نہیں ہے۔

مشرقی حصے میں چٹا گانگ ایک بالکل الگ تھلگ سی بندرگاہ ہے جہاں صرف چھوٹی پٹڑی کی ریلوے لائن جاتی ہے۔ مغربی حصے میں لاہور کے علاوہ کوئی اور ریلوے مرکز موجود نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کی ساری ریلوے چھوٹی پٹڑی پر بنی ہوئی ہے۔ برہم پتر اور میگھنا کے آبی راستے متبادل ذریعہ آمدورفت مہیا کرتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی حصے کے درمیان براہ سیلون سمندری راستے کے سوا کوئی اور براہ راست رابطہ نہیں ہے اور یہ بھی دو تین ہفتے کی بحری مسافت پر مشتمل ہے بشرطیکہ بحر ہند پر کوئی دشمن طاقت غالب نہ ہو یا پھر ہندوستان کے اندر سے ریل کا راستہ ہے۔ بشرطیکہ ہندوستان یہ سہولت مہیا کرے۔

اس کے بعد پیتھک لارنس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی فوجی ذمہ داریوں کومختلف قرار دیا۔ اس کے مطابق مغربی پاکستان کی ذمہ داریاں یہ تھیں۔

ا۔ سول اقتدار کی مدد۔

ب۔ شمال مغربی سرحد کے قبائیلیوں کا کنٹرول۔

ج۔ افغانستان کے خلاف دفاع۔

د۔ روس کے خلاف دفاع یا ایران کے خلاف دفاع جس کی پشت پناہی روس کر رہا ہو۔

پہلی ذمہ داری کو پورا کرنے کی خاطر چار شہروں لاہور، ملتان، راولپنڈی اور پشاور میں بڑے گیریژن رکھنے ہوں گے۔ لاہور میں زیادہ بڑا گیریژن ہوگا۔ کیونکہ ہندوستان کے دو بڑے شہر امرتسر اور فیروزپور اس کی سرحد کے قریب واقع ہوں گے۔ جہاں تک دوسری ذمہ داری کا تعلق ہے تو پاکستان میں مسلمان حکومت کے قیام کے بعد شمال مغربی سرحد پر آباد ان کے ہم مذہب قبائل کی طرف سے گڑبڑ میں کمی واقع ہوجائے گی تاہم جب تک ان قبائل کو غیر مسلح نہیں بنادیا جاتا، صوبہ سرحد میں موجود مسلح افواج میں کمی نہیں کی جاسکتی۔ اس مقصد کے لیے کم ازکم دو ڈویژن فوج، ائیرفورس کے دو سکواڈرن اور ایک بمبار سکواڈرن کا ہونا لازمی ہے۔ تیسری ذمہ داری یعنی افغانستان کے خلاف دفاع کی خاطر کم ازکم ایک آرمرڈ اور تین انفنٹری ڈویژن، ایک آرمرڈ بریگیڈ اور دس ائیرفورس سکواڈرن درکار ہوں گے۔ اس کو بروئے کار لا کر

کابل یا قندھار یا دونوں پر قبضہ کر کے افغانستان کو بآسانی شکست دی جاسکتی ہے۔ جہاں تک چوتھی ذمہ داری کا تعلق ہے تو روس کی قوت اس قدر زیادہ ہے کہ اگر اس کی پشت پناہی سے افغانستان یا ایران حملہ کر دیں تو پاکستان طاقتور اتحادیوں کے بغیر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ بھی اس صورت میں کہ اتحادی طاقت کو بحر ہند پر کنٹرول حاصل ہو نیز یہ کہ ہندوستان بھی پوری طرح پاکستان کی مدد کرے۔ کیونکہ مغربی پاکستان کی چوڑائی کم ہے اور اس کے تمام اڈے افغانستان اور ایران میں موجود روسی اڈوں سے ہونے والے ہوائی حملوں کی زد میں ہوں گے۔ ہندوستان اس زد سے باہر محفوظ اڈے مہیا کر سکے گا۔ اس کے علاوہ کراچی اور ملتان کے مابین واحد ریل رابطے کے ٹوٹنے کی صورت میں ہندوستان بمبئی سے پاکستان کے اڈوں کے لیے بیرونی امداد کی ترسیل کا متبادل راستہ مہیا کرسکتا ہے۔ اگر ہندوستان نے پاکستان کی مدد نہ کی اور اس کا فعال اتحادی نہ بنا تو یہ ہندوستان کے لیے خودکشی کے مترادف ہوگا کیونکہ اگر پاکستان شکست کھا گیا اور دشمن کے اڈے پاکستان کے اندر بن گئے تو شمال مغرب کی طرف سے ہندوستان کا دفاع بہت مشکل ہو جائے گا۔

مشرقی پاکستان کی دفاعی ذمہ داریاں گنواتے ہوئے اس نے لکھا کہ ان میں :

ا۔ سول اقتدار کی مدد۔

ب۔ شمال مشرقی سرحد کے قبائیلیوں کا کنٹرول۔

ج۔ چین کے خلاف دفاع۔

شامل ہیں۔ پہلی ذمہ داری کے لیے ڈگ بوئی، سلہٹ، ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں ایک ایک بٹالین کا ہونا ضروری ہے۔ دوسری ذمہ داری کے لیے آسام رائفلز کی پانچ بٹالین درکار ہوں گی۔ جہاں تک تیسری ذمہ داری کا تعلق ہے تو اگرچہ چین اتنا طاقتور تو نہیں جتنا کہ روس ہے۔ لیکن مستقبل میں وہ ایک طاقت بن سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ہوائی حملے کے لحاظ سے چوڑائی کی کمی ہے۔ کوئی اچھی بندرگاہ نہیں ہے، ذرائع آمدورفت پسماندہ ہیں اور سوائے ڈگ بوئی کے تیل کے کنوؤں اور چائے کی صنعت کے علاوہ کوئی اور صنعت نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان الگ تھلگ رہ کر کسی طاقتور دشمن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کا ہندوستان کے ساتھ اتحاد لازمی اور برما کے ساتھ اتحاد بے حد ضروری ہے۔ یہ ان دونوں ممالک کے لیے بھی ضروری ہوگا بالخصوص

ہندوستان کے لیے کیونکہ اگر مشرقی پاکستان دشمن کے ہاتھوں میں چلا گیا تو کلکتہ کے لیے اور بنگال و بہار کے صنعتی علاقوں کے لیے سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

آخر میں پیتھک لارنس نے تمام دفاعی ذمہ داریوں کو یکجا کر کے مجموعی ضروریات کا تخمینہ یوں لگایا کہ اگر روس اور چین کے خطرے کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو پاکستان کو جو کل فوج درکار ہو گی اس میں ایک آرمرڈ ڈویژن، چھ انفنٹری ڈویژن، ایک آرمرڈ بریگیڈ، بارہ بٹالینیں، بارہ سکواڈرن ایئر فورس اور ایک دفاعی انفنٹری ڈویژن بطور ریزرو شامل ہو گی۔ (نیوی کا تخمینہ ابھی نہیں لگایا گیا تھا۔) ان افواج کے لیے افرادی قوت بکثرت مہیا ہو جائے گی۔ بھرتی پنجابی مسلمانوں اور پٹھانوں میں سے ہی کی جائے گی کیونکہ دوسری عالمی جنگ کے دوران ثابت ہو چکا ہے کہ سندھی، بلوچی اور بنگالی اچھے سپاہی نہیں ہیں۔ پنجابی مسلمان اور پٹھان صرف تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ہیں اس لیے افسروں اور ٹیکنیشنوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چند سال کے لیے یہ ضرورت برطانیہ کو پوری کرنا ہو گی چونکہ پاکستان میں صنعت نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے ہتھیاروں کی فراہمی ہندوستان یا برطانیہ یا امریکہ سے درآمد کر کے کی جائے گی۔ جہاں تک مغربی حصے کے روس سے اور مشرقی حصے کے چین سے دفاع کا تعلق ہے تو یہ بغیر طاقتور اتحادیوں کے ناممکن ہو گا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کو بھی اس کا فعال اتحادی بننا ہو گا۔ ایسا کرنا خود اس کے مفاد میں ہو گا۔ کیونکہ مغربی یا مشرقی پاکستان پر کسی طاقتور مخالف قوت کا قبضہ ہو جانے کی صورت میں ہندوستان کا اپنا دفاع سنگین صورت حال سے دو چار ہو جائے گا۔ اس کے بعد مالیاتی جائزہ لیتے ہوئے پیتھک لارنس نے لکھا کہ پاکستان کا دفاعی بجٹ پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہو گا جب کہ اس کی مالی حالت یہ ہے کہ اگر ریونیو کی وصول یابی مؤثر طریقے سے کی جائے اور ملک کے معاشرتی اور معاشی شعبوں میں نہ ہونے کے برابر ترقی کی جائے تو بھی صرف نصف کے قریب دفاعی بجٹ کو پورا کیا جا سکتا ہے۔[21]

پیتھک لارنس نے وزارتی مشن کے ارکان کے لیے لکھے گئے اپنے اس اہم نوٹ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان معاشی، اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے زندہ نہیں رہ سکے گا۔ تقسیم کے نتیجے میں پورے برصغیر کے لوگوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا اور ان کی معاشی ترقی بری طرح متاثر ہو گی۔ اس نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو ناگزیر قرار دیا۔ کلکتہ کے

معاملے میں ہندو بورژوا اور یورپی تاجر متفق تھے کہ اسے پاکستان کو نہیں دیا جائے گا۔ پنجاب میں تقسیم کی لکیر کو اس نے لاہور اور امرتسر کے درمیان سے اور لاہور اور فیروز پور کے درمیان سے گزارا تھا۔ مسلمانوں کے پاس دو ہی راستے تھے کہ یا تو وہ تڑا مڑا ہوا چھوٹا سا پاکستان لے لیں یا وفاقی انڈیا میں ہندوؤں کے ماتحت محتاج حیثیت کو گوارا کر لیں۔ چونکہ اس کی رائے میں پاکستان کا زندہ رہنا مشکل تھا اس لیے دوسری صورت ہی اس کے نزدیک ایک بہتر صورت تھی۔ یہ بھی اس نے طے کر دیا تھا کہ انڈیا خواہ تقسیم ہو یا متحد رہے، روس، چین اور افغانستان کے ساتھ اس کی ازلی دشمنی ہو گی جب کہ برطانیہ اور امریکہ اس کے اتحادی ہوں گے۔ تقسیم کی صورت میں بھی پاکستان اور ہندوستان کو مشترکہ دفاع کی پالیسی اختیار کرنا ہو گی۔ گویا برطانوی سامراج برصغیر کو سوویت یونین اور چین کے خلاف ہر صورت سے متحد رکھنا چاہتا تھا اور کچھ نہیں تو دفاع کو ضرور مشترک رکھنا چاہتا تھا۔

14 رفروری کو پیتھک لارنس نے ایک نوٹ برطانوی کابینہ کے ارکان کے لیے جاری کیا۔ اس میں مسلمانوں کے مسئلے کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اگر 1942ء کی کرپس تجاویز پر عملدرآمد کیا جائے تو پھر پنجاب اور بنگال میں استصواب کرانا پڑے گا۔ وائسرائے کا خیال ہے کہ استصواب کی صورت میں پنجاب خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا کیونکہ سکھ پاکستان کے سخت مخالف ہیں۔ کرپس تجاویز پر عمل کی دوسری صورت یہ ہے کہ اسمبلی کے ارکان کی رائے حاصل کر لی جائے۔ لیکن اس میں بددیانتی کا احتمال ہے۔ پھر اس نے کرپس کی تجاویز پر مسلم لیگ اور ہندوؤں کے اختلافی نکتہ ہائے نظر کا تجزیہ کیا اور کہا کہ اگر بالفرض کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین ان تجاویز کے عملدرآمد پر سمجھوتہ نہیں ہوتا تو یہ دو متبادل راستے رہ جاتے ہیں۔

1۔ ایک آل انڈیا آئین ساز ادارہ کے ذریعے ایک آل انڈیا یونین کا آئین وضع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کوشش کی ناکامی کی صورت ہی میں پاکستان کو تسلیم کیا جائے۔ یا

2۔ اس کوشش کی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اعلان کیا جائے کہ وائسرائے کی تجاویز کے مطابق حقیقتاً مسلم اکثریت کے علاقوں کو حق خود اختیاری دے دیا جائے لیکن غیر مُسلم اکثریت والے علاقوں کو پاکستان میں رہنے پر مجبور نہ کیا

جائے۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے الگ الگ آئین ساز ادارے وضع ہو سکتے ہیں۔[22]

گویا کرپس تجاویز اور اس کے علاوہ ایسی تمام کوششیں کر دیکھی جائیں جن کے ذریعے برصغیر کو یکجا اور متحد رکھا جا سکتا ہو۔ مگر جب یہ تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور کوئی راستہ نہ رہے تو پھر ایک کٹے پھٹے پاکستان کو منظور کر کے جان چھڑائی جائے۔ لیکن اس میں وقت درکار تھا اور وقت انگریزوں کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ درحقیقت برصغیر کو متحد رکھنے کی خاطر ہی برطانوی سامراج کا برصغیر میں قیام طول پکڑ رہا تھا۔ ورنہ تو عالمی جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی انگریز یہاں سے جان چھڑا کر بھاگنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قیمت پر نہیں کہ برصغیر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور یہاں انتشار اور انارکی پھیل جائے جس سے سوویت یونین اور چین کے کمیونسٹ فائدہ اٹھالیں۔ وہ اسے سوویت یونین اور چین کے خلاف سامراجی حصار میں ایک مضبوط قلعہ بندی کے طور پر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ لیکن تاریخی طور پر یہاں ایک ہزار سال سے موجود ہندو مسلم تضاد ایک متحدہ ہندوستان کی صورت میں حل ہونے میں نہیں آ رہا تھا اور اس لیے یہاں انگریزوں کے قیام میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی دیوالیہ شدہ برطانوی سامراج کی گرفت بھی تیزی سے ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ یہاں تک کہ مسلح افواج کا نظم و نسق بھی درہم برہم ہو گیا تھا۔ انگریز افسر اس لیے اضطراب اور عدم اطمینان کا شکار تھے کہ بے سود اور لمبی جنگ کی تھکاوٹ کے بعد وہ جلد از جلد واپس برطانیہ لوٹنا چاہتے تھے جب کہ ہندوستانی افسر اور سپاہی اس دیوالیہ شدہ سامراجی طاقت کے کھوکھلے پن سے واقف ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے۔

باب: 8

بحریہ کے ہندوستانی عملے کی بغاوت

شاہی فضائیہ کے عملے کی ہڑتال

اس دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے برطانوی سامراج کی بنیادیں ہلا دیں۔ ہوا یہ کہ آزاد ہندفوج کے افسروں کے خلاف مقدموں کی سماعت کے دوران ہندوستان کے طول وعرض میں بدامنی اور کشیدگی کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اس سے قدرتی طور پر ہندوستان کی افواج بھی متاثر ہوئی تھیں۔ جب جنوری 1946ء کے پہلے ہفتے میں برطانوی کمانڈر انچیف نے رائے عامہ کے دباؤ کے تحت ان افسروں کو رہا کر دیا تو ہندوستان میں مقیم برطانوی فوجی افسروں اور سپاہیوں نے بہت ذلت محسوس کی۔[1] ویسے بھی وہ جنگ کے دوران طویل عرصے تک اپنے گھروں سے باہر رہنے کے باعث تھک چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو یہ تحریک شروع کی کہ انہیں فوج سے فارغ کر کے گھروں کو واپس بھیجا جائے اور پھر انہوں نے ہندوستانی چھوٹے بڑے فوجیوں کے خلاف ایسا توہین آمیز رویہ اختیار کیا کہ ان کے اور ہندوستانی فوجیوں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوگیا۔ برطانوی شاہی فضائیہ نے جوتمام تر برطانوی عملہ پر مشتمل تھی، جنوری کے تیسرے ہفتے کے دوران سب سے پہلے کانپور اور ڈم ڈم کے ہوائی اڈوں پر ''ہڑتال'' یا پُرامن بغاوت کر دی۔ 22 رجنوری کو کراچی ہوائی اڈہ پر موجود شاہی فضائیہ کے دوہزار افراد نے ہڑتال کر دی۔ 29 رجنوری کو لاہور ہوائی اڈہ پر موجود شاہی فضائیہ کا عملہ بھی ہڑتال پر چلا گیا۔ اس ہڑتال کی بازگشت دنیا بھر کے برطانوی اڈوں میں ہوئی اور اس کا دائرہ دور دور تک پھیل گیا۔ سیلون میں کولمبو کے فضائی اڈہ کٹونائیکے میں ہڑتال ہوگئی۔ قاہرہ کے

نواح میں واقع المزا (Almaza) کے بڑے ہوائی اڈے کے سینکڑوں ملازموں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ فلسطین میں لیڈا کا ہوائی اڈہ بھی متاثر ہوا جو مشرق بعید اور برطانیہ کے مابین فضائی مواصلات میں اہم حیثیت کا حامل تھا۔ ادھر سنگاپور کے فضائی اڈے پر شاہی فضائیہ کے چار ہزار افراد ہڑتال پر چلے گئے۔ مجموعی طور پر بارہ فضائی اڈوں پر یہ ہڑتال ہوئی۔ ہڑتالیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ انہیں جلد سے جلد فارغ کر کے گھروں کو واپس بھیجا جائے۔ نیز ان کو ہوائی اڈوں پر حالیہ لاگو کئے گئے سخت ڈسپلن کے قوانین، طویل اوقات کار، نامناسب ویلفیئر اور خراب کھانے کے خلاف بھی سخت شکایات تھیں۔ 26 رجنوری کو ائر مارشل سر کیتھ پارک جب سنگاپور کے ہوائی اڈے پر ہڑتالیوں کو اطمینان دلانے کے لیے گیا تو وہاں نعرے لگائے گئے کہ ''ہمیں بحری جہاز مہیا کیے جائیں، برطانیہ واپسی کے لیے نہ کہ جاوا کے لیے۔''[2]

بحریہ کے ہندوستانی عملے کی بغاوت اور اس کی حمایت میں مُلک گیر ہنگامے

فروری کے پہلے ہفتے میں ہڑتال پر قابو پالیا گیا لیکن اس کے دوران خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔ پھر بعض برطانوی افسروں کی فرعونیت کے باعث ہندوستان کی فضائی اور بحری فوج کے اندر یکایک کشیدگی پیدا ہوگئی۔ رائل انڈین ایئر فورس کے ملازموں نے مطالبہ کر دیا کہ انہیں رائل ائیر فورس کے سٹاف کے برابر تنخواہ دی جائے۔ اس مسئلے پر 11 سے 15 رفروری تک لاہور میں رائل انڈین ائیر فورس کے دوسو ایئر مینوں نے بھوک ہڑتال کی۔[3] 18 رفروری کو بمبئی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ایک بحری جنگی جہاز ''تلوار'' کے ہندوستانی عملہ نے اس بناء پر ''ہڑتال'' کر دی کہ انہیں حسب خواہش خوراک نہیں ملتی۔ ان کے ساتھ نسلی امتیاز برتا جاتا ہے اور انگریز اعلیٰ افسران کی بے عزتی کرتے ہیں۔ جب جہاز کے برطانوی افسروں نے انضباطی کاروائی کے ذریعے اس ''ہڑتال'' کو ختم کرنے کی کوشش کی تو 19 رفروری کو بغاوت ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شعلے بندرگاہ میں لنگر انداز چوبیس بحری جنگی جہازوں میں پھیل گئے۔ بحری فوج کے سینکڑوں ہندوستانی سپاہی اپنے اسلحہ سمیت جہازوں سے نکل کر بمبئی شہر میں آ گئے اور انہوں نے یورپی علاقے پر دھاوا بول دیا۔ باغی سپاہیوں نے برطانوی افسروں کے گھروں کی کھڑکیاں توڑ دیں اور ان کی موٹریں جلا دیں۔ انہوں نے ایک عمارت پر سے امریکی جھنڈا اتار کر اسے

جلا دیا اور سامراج مردہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے۔ اس دوران جنگی جہازوں میں بھی خون خرابہ اور نعرے بازی کا سلسلہ جاری رہا۔ جہازوں پر کانگرس اور مسلم لیگ کے جھنڈے لہرائے گئے اور پرجوش نعروں سے ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی فوری آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔'' [4]

20رفروری کو بمبئی کے علاقے کے سارے جنگی جہاز اس بغاوت کی لپیٹ میں آ گئے اور بمبئی شہر میں کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت باغیوں کے حق میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ ہر طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آتی تھیں اور سب سے بڑے جنگی جہاز ''نربدا'' کی توپوں کا رخ بمبئی کی یورپین کلب اور ''تاج محل'' کی عمارتوں کی طرف موڑ دیا گیا۔ جہاں برطانوی افسر ہر شام دادِ عیش دیا کرتے تھے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے 21رفروری کو قریبی چھاؤنیوں سے بری فوج کی بھاری جمعیت کو بمبئی بھیجا گیا۔ برطانوی بحری اور ہوائی فوج نے بھی بمبئی کا رخ کیا۔ دو دن تک چھوٹے بڑے پیمانے پر لڑائی ہوتی رہی اور بالآخر 23رفروری کو باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ دریں اثنا بمبئی شہر میں مزدوروں اور دوسرے عوام نے زبردست ہنگامے کئے۔ بہت خون خرابہ ہوا۔ مظاہرین اور بری فوج کے درمیان تصادم ہوئے۔ فریقین نے بہت گولیاں چلائیں جن سے 228افراد مارے گئے اور 1046 زخمی ہوئے- نقصانات کے تخمینے کے مطابق 9 بینک، 30دوکانیں، 10ڈاک خانے، 10پولیس چوکیاں اور 64 سرکاری غلہ گودام یا لوٹے گئے یا تباہ کر دیئے گئے۔ 1200 سٹریٹ لیمپ توڑ ڈالے گئے اور سالویشن آرمی کی بلڈنگ کو نقصان پہنچایا گیا۔[5] بحریہ کے ہندوستانی فوجیوں اور عوام الناس کی برطانوی سامراج کے خلاف یہ مسلح جدوجہد صرف بمبئی تک ہی محدود نہیں رہی تھی۔ اس کے شعلے فوراً ہی ہندوستان کی دوسری بندرگاہوں میں پہنچ گئے تھے۔ کراچی کی بندرگاہ میں اس بغاوت کی شدت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کچلنے کے لیے توپخانے کا استعمال کرنا پڑا تھا۔ گولہ باری سے ایک جنگی جہاز بالکل تباہ ہو گیا۔ سرکاری بیان کے مطابق اس جہاز میں پانچ باغی مارے گئے اور 26 زخمی ہوئے جب کہ پولیس فائرنگ میں آٹھ افراد مارے گئے تھے اور 18 زخمی ہوئے تھے۔[6]

ہندوستانی بحریہ کی اس چار روزہ بغاوت سے ایک بات بالکل واضح ہو گئی کہ برطانوی سامراج اپنے عالمی مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے ہندوستانی افواج پر مزید انحصار نہیں کر

سکتا تھا۔ اس نے ہندوستانی فوج کی مدد سے ہی پہلے ہندوستان کو فتح کیا تھا اور پھر ایک عالمگیر سلطنت کی تشکیل کی تھی۔ اس نے ڈیڑھ دو سو سال تک اسی فوج کی مدد سے برصغیر کے طول وعرض میں امن وامان کا ماحول پیدا کر کے استحصال کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔لیکن جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہندوستانی فوج میں کچھ قومی غیرت وحمیت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پورے ملک کا سیاسی شعور بہت بلند ہو گیا تھا۔ ہندوستانی فوج اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ جنگی ضروریات کے تحت فوج میں غیر معمولی توسیع کرنے کے لیے پنجاب اور سرحد کے ''مارشل علاقوں'' کے علاوہ ہندوستان کے وسطی اور جنوبی علاقوں سے بھی بھرتی کی گئی تھی۔ چونکہ ان علاقوں کے سپاہیوں میں غیر مشروط ڈسپلن اور وفاداری کی روایت نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے روایتی علاقوں سے بھرتی شدہ سپاہیوں کو بھی کسی حد تک اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔ ''فیلڈ مارشل'' محمد ایوب خان لکھتا ہے کہ ''انگریز اور ہندوستانی افسر ایک دوسرے سے جو بغض رکھتے تھے وہ کئی طریقوں سے ظاہر ہوتا تھا اور بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر دیکھنے میں آتا تھا۔ مثلاً کھانے پینے پر کیونکہ انگریز افسر ہمیں ہمارا من بھاتا کھانا نہیں دیتے تھے۔ خاص طور پر سالن جو صرف پیر، جمعرات اور اتوار کے روز ہمیں ملا کرتا تھا اسی طرح موسیقی پر جھگڑا تھا کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ میس میں مغربی گانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بھی بجائے جائیں۔ ایک موقع پر کچھ ہندو اور سکھ افسروں نے انگریز افسروں کا بائیکاٹ کرنے کے لیے ایک جلسہ کر ڈالا۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا نہیں کرنا چاہیے۔''[7]

ایوب خان جیسے عناصر کی فراخدلانہ صلح پسندی اور ان کی برطانوی سامراج سے غیر متزلزل وفاداری کے باوجود ہندوستانی افسروں اور انگریز افسروں کے درمیان کشیدگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس پرخاش کا سب سے پہلا اجتماعی مظاہرہ جنگ کے دوران سنگاپور میں ہوا جب کہ 20 ہزار ہندوستانی جنگی قیدیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف آزاد ہند فوج کی تشکیل پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ دوسرا مظاہرہ اکتوبر 1945ء میں انڈونیشیا میں ہوا جب کہ ہندوستانی فوج نے انڈونیشی حریت پسندوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اس کی سامراج دشمنی کا تیسرا مظاہرہ فروری 1946ء میں ہندوستانی بحریہ کی خوف ناک بغاوت کی صورت میں ہوا۔

بغاوت کو کچلنے کے لیے کانگرسی رہنماؤں کا برطانوی سامراج کے ساتھ تعاون

اگر کانگرس پارٹی کے ''اعتدال پسند'' قائدین اس بغاوت کو کچلنے کے لیے برطانوی سامراج سے اشتراک عمل نہ کرتے تو معلوم نہیں یہ کیا رنگ لاتی۔ کانگرسی لیڈروں نے اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کمیونسٹ پارٹی اس بغاوت میں بہت ملوث ہو گئی تھی۔[8] بمبئ اور دوسرے شہروں میں باغیوں کی حمایت میں جو عوامی ہنگامے اور مظاہرے ہوئے تھے ان میں لال جھنڈوں کی بہتات تھی اور کئی جگہ انقلاب کے نعرے بھی سنائی دیئے تھے۔ 24رفروری کو ویول نے وزیراعظم ایٹلی کو اس بغاوت کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کانگرس کی اعلیٰ قیادت نے نہ تو اس بغاوت کو ہوا دی ہے اور نہ ہی اس کی خواہش کی ہے۔ گاندھی نے تشدد کی مذمت میں اچھا بیان دیا ہے۔ تاہم میرا خیال ہے کانگرس کے بعض چھوٹے کارکنوں اور غالباً کمیونسٹ شرپسندوں کا اس میں اچھا خاصا ہاتھ تھا۔''[9] 22ر مارچ کو ویول نے شاہ برطانیہ جارج ششم کے نام اپنے مراسلے میں بحریہ کی ہڑتال کے بارے میں لکھا کہ ''اس کے بھڑکانے میں کمیونسٹوں اور بائیں بازو کے کانگرسیوں کا ہاتھ تھا۔''[10]

ابھی بحریہ کی ہڑتال کو ختم ہوئے ایک ہی روز گزرا تھا کہ 25رفروری کو مدراس میں مشتعل مظاہرین کے ہجوم نے سخت گڑبڑ پھیلائی اور ایک ریل گاڑی ہند۔ سیلون میل کو روک کر اس پر پتھراؤ کیا کھڑکیاں توڑ ڈالیں اور فرسٹ کلاس کے مسافروں کو زچ کیا۔ لندن ٹائمز کے مطابق مُقامی رائے عامہ نے کانگرس پارٹی کے قائدین کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کیا ہے کہ اس ہنگامے کی اصل ذمہ داری کمیونسٹوں پر عائد ہوتی ہے۔ یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ کاروائی باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کی گئی کیونکہ پٹریوں پر سیمنٹ کے بڑے بلاک رکھ کر رکاوٹ ڈالی گئی تھی، سگنل اکھاڑ دیئے گئے تھے اور مواصلات کے نظام کو شدید نقصان پہنچایا گیا تھا۔[11] ادھر فروری کے وسط میں پوسٹل اور ریلوے کارکنوں کی جانب سے ملک گیر ہڑتال کی دھمکیاں بھی دی جارہی تھیں۔ خوراک کی قلت کے پیش نظر جو کہ پہلے ہی سنگین صورت اختیار کئے ہوئے تھی، ریلوے کی ہڑتال کا خوف وائسرائے اور دیگر انگریز حکام کو پریشان کر رہا

تھا۔[12] ادھر آزاد ہند فوج کے کیپٹن عبدالرشید کو سات سال قید بامشقت سنائے جانے پر مسلم لیگ کی طرف سے پورے ملک میں ایجی ٹیشن ہو رہا تھا اور 11 رفروری سے کلکتہ میں پرتشدد مظاہرے ہو رہے تھے۔[13] پورا ملک ہنگاموں، ہڑتالوں اور مظاہروں کی لپیٹ میں تھا۔

ان حالات میں کانگرس کے قائدین کی پریشانی بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جن کو ہندوستان کے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں آتی نظر آرہی تھی۔ چنانچہ جن افواج اور ریاستی اداروں کے ذریعے اس نے حکومت کا کاروبار چلانا تھا وہ ان کے ڈسپلن میں بگاڑ اور معاشرے کے نظم وضبط میں خرابی کی اجازت نہیں دے سکتے تھے اور پھر ہندو بورژوا یہ کس طرح برداشت کر سکتا تھا کہ کمیونسٹوں کو کھل کھیلنے کا موقع دے دے جن کے ساتھ کانگرس کے بائیں بازو کے کارکن بھی شامل ہو گئے تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل جو ایک قدامت پسند اور متعصب ہندو تھا اور جس کا کانگرس کے انتہا پسند اور حکومت مخالف رہنماؤں میں شمار ہوتا تھا، 19 رجنوری کو وائسرائے ویول سے ملاقات کے بعد اور کانگرس کی انتخابی کامیابیوں کے پیش نظر حکومت کے ساتھ اپنے رویے میں اعتدال پسند اور صلح جو ہو گیا ہوا تھا۔ کانگرس تنظیم زیادہ تر اس کے زیر اثر تھی اور اسے کانگرس کا ''مرد آہن'' بھی سمجھا جاتا تھا۔ کانگرس میں بائیں بازو کا چھوٹا سا گروہ بھی مسز ارونا آصف علی کی قیادت میں سرگرم تھا اور بمبئی میں بحریہ کی ہڑتال کی پرجوش حمایت کر رہا تھا۔ پٹیل نے اس گروہ کی ایک نہ چلنے دی اور ہڑتال ختم کرانے کے لیے انگریزوں کی بھرپور مدد کی۔ وی۔ پی مینن لکھتا ہے کہ ''یہ ولبھ بھائی پٹیل کی تمام تر کوششیں تھیں جن کی بدولت 23 رفروری کو بحریہ کے عملے نے ہتھیار ڈالے۔''[14] 21 رفروری کو بمبئی صوبائی کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ اگر ہندوستانی بحریہ کے سپاہی اپنے مطالبات منوانے کے لیے عدم تشدد کا راستہ اختیار کریں تو ان کی حمایت کی جا سکتی ہے۔ 24 رفروری کو پٹیل نے بمبئی میں ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے رائل انڈین نیوی کے سپاہیوں سے اپیل کی کہ ''وہ متحمل اور پُرامن رہیں'' اور لوگوں سے درخواست کی کہ ''وہ ایسی کوئی حرکت نہ کریں کہ جس سے شہر کا امن وامان غارت ہو۔ مزید یہ کہ ''افراتفری کو روکنے اور شر پسند عناصر کو قابو میں کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے جو ہمیشہ اس قسم کے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ ہڑتال کی دعوت دینے، کارخانوں میں کام بند کرانے اور سکولوں وکالجوں کو بند کرانے کی کوئی کوشش نہیں ہونی چاہیے۔''[15]

گورنر بمبئ جے۔ کولول 27/فروری کو اپنے مراسلے میں ویول کو اس ہڑتال کی پوری روئیداد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ''کانگرسی رہنماؤں نے اس بغاوت سے اپنی مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا اور لوگوں سے امن وامان برقرار رکھنے کی درخواست کی۔ ولبھ بھائی پٹیل نے اپنے ان خیالات کے بارے میں جمعرات (21/فروری) کو ایک پیغام کے ذریعے مجھے آگاہ کیا اور خونریزی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنے کے لیے اپنے تعاون کی پیش کش کی۔ مسز ارونا آصف علی اس شر و فساد سے فائدہ اٹھانے کے حق میں تھی لیکن ولبھ بھائی پٹیل نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔'' مسلم لیگ کی اعتدال پسند قیادت نے بھی اس موقع پر کانگرس اور حکومت کا ساتھ دیا۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ مراسلے میں کولول نے لکھا کہ ''22/فروری کو بمبئ کی صوبائی مسلم لیگ کے سربراہ آئی آئی چندریگر اور بمبئ صوبائی کانگرس کمیٹی کے سیکرٹری ایس۔ کے پاٹل نے گڑبڑ پر قابو پانے کی خاطر اپنی تشویش کا یقین دلایا اور پولیس کی مدد کے لیے اپنے رضا کار بھیجنے کی پیش کش کی۔'' کولول آگے چل کر لکھتا ہے کہ ''بائیں بازو کے کانگرسیوں کی دعوت پر جواہر لعل نہرو بمبئ پہنچا لیکن وہاں پہنچ کر اس نے بھی پٹیل کی حمایت کی۔ بمبئ میں جلسے جلوسوں پر پابندی عائد تھی۔ کانگرسی رہنماؤں نے اجازت طلب کی کہ اگر انہیں جلسہ منعقد کرنے کا موقع فراہم کیا جائے تو وہ تشدد کی مذمت اور حالیہ گڑبڑ پھیلانے کے ذمہ دار افراد کی تادیب کریں گے۔ چنانچہ حکومت کی اجازت سے 26/فروری کو جلسہ عام منعقد ہوا جس میں نہرو اور پٹیل دونوں نے اپنی تقریروں میں گڑبڑ اور تشدد کو احمقانہ فعل قرار دیا اور اس سے اجتناب برتنے کی درخواست کی۔''[16] پٹیل نے اپنے خطاب میں کمیونسٹوں کو اس ہنگامہ آرائی کا ذمہ دار قرار دیا اور کہا کہ ''کمیونسٹ پارٹی لوگوں کو گمراہ کر رہی ہے اور ان کے جذبہ حب الوطنی سے کھیل رہی ہے۔ یہ لوگ اپنی پارٹی کی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، جسے حالیہ برسوں میں شدید دھچکا پہنچا ہے۔''[17] 28/فروری کے سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اپنے اداریئے میں اس بغاوت میں کمیونسٹوں کے ملوث ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس بات کی قوی شہادت موجود ہے کہ اس میں ایسی خفیہ سازش کا ہاتھ ہے جو اس ڈھانچے کو تباہ کرنا چاہتی ہے کہ جس پر دنیا کی بیشتر حکومتیں قائم ہیں۔''

ابوالکلام آزاد جسے ہندو بورژوازی نے ''شوبوائے'' کے طور پر کانگرس کا صدر بنایا ہوا

تھا، بحریہ کے ہندوستانی عملے کی ہڑتال اوران کی حمایت میں شدید عوامی ردعمل کے بارے میں لکھتا ہے''میں اس بارے میں بالکل واضح تھا کہ یہ وقت کسی عوامی تحریک یا براہ راست اقدام (ڈائریکٹ ایکشن) کے لیے مناسب نہیں تھا۔ اس وقت ہم کو حالات و واقعات کے بہاؤ پر نظر رکھنا تھی اور حکومت برطانیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنا تھی۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ انڈین نیوی کے افسروں نے یہ حرکت کر کے غلطی کی ہے۔'' وہ مزید لکھتا ہے کہ''مسز آصف علی بحریہ کے افسروں کی تحریک کے حق میں ان کی سرگرم حامی بن گئی تھی۔ وہ میری حمایت حاصل کرنے کے لیے دہلی آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ ان افسروں نے عقل مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ ان کو میری یہی نصیحت ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر ہڑتال ختم کر دیں۔ بمبئ کانگرس نے ٹیلی فون پر میرا مشورہ طلب کیا تو انہیں بھی میں نے اسی مضمون کا تار ارسال کیا۔ سردار ولبھ پٹیل جو اس وقت بمبئ میں تھا اس نے بھی مجھ سے صلاح ومشورہ کیا۔ اس کو بھی میں نے کہا کہ بحریہ کے افسروں نے جو اقدامات اٹھائے ہیں وہ غلط ہیں اور انہیں کام پر واپس لوٹ جانا چاہیے۔ سردار پٹیل نے پوچھا کہ اگر حکومت ان کو کام پر واپس آنے کا موقع نہ دے تو پھر کیا کیا جائے۔ میں نے جواب میں کہا کہ صورت حال کا میرا اندازہ یہ ہے کہ حکومت ان کو کام پر واپسی کی اجازت دے دے گی اگر حکومت نے کوئی مشکل پیدا کی تو پھر کوئی مناسب کاروائی کی جا سکتی ہے۔'' اس کے بعد ابوالکلام آزاد لکھتا ہے کہ اس نے اپنا پشاور کا دورہ ملتوی کیا اور کمانڈر انچیف آکن لیک سے ملاقات کر کے اسے یہ یقین دہانی کرائی کہ بحریہ کے افسروں کے اس اقدام کو کانگرس کی حمایت حاصل نہیں ہے۔ تاہم کانگرس یہ ضرور چاہتی ہے کہ ان افسروں کے خلاف انتقامی کاروائی نہ کی جائے۔ آکن لیک نے اسے یقین دلایا کہ جو افسر غیر مشروط طور پر ڈیوٹی پر لوٹ آئیں گے ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ اس ملاقات کے بعد آزاد نے بیان جاری کیا جس میں ان افسروں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آجائیں ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی جائے گی۔''[18] 2 / مارچ کو آزاد نے ہنگامے اور ہڑتالیں کرنے والوں سے پُرامن رہنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ''اب ان کا کوئی موقع محل نہیں ہے۔''[19] اسی طرح پٹیل، نہرو اور آزاد نے ہندو بورژوا کے مفاد کی نمائندہ کانگرس پارٹی کی جانب سے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے برطانوی سامراج سے اشتراک عمل کیا اور ہندوستانی فوج کی مسلح سامراج دشمن تحریک

کو ناکام بنا دیا۔ یہی لیڈر چار ماہ پیشتر آزاد ہند فوج کے نام پر جنوب مشرقی ایشیا کے محاذ پر بغاوت کے مرتکب ہندوستانی فوجیوں کی حمایت میں جلسے جلوس اور تقریریں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ جو کہ بقول آر۔سی۔ موجمدار، زبوں حال کانگرس نے محض ''الیکشن سٹنٹ'' کے طور پر ایسا کیا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ سبھاش چندر بوس اور جاپان کے تعاون سے قائم کردہ اس کی آزاد ہند فوج کے مخالف رہے تھے۔ اب جب کہ ہندوستان کی مسند اقتدار ان کو اپنے لیے خالی ہوتی نظر آ رہی تھی، وہ کسی گڑبڑ یا انارکی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

آئین سٹیفنز لکھتا ہے کہ ''کانگرس پارٹی نے فروری 1946ء کے اوآخر میں ہندوستانی افواج کے نظم و ضبط کو درہم برہم کرنے کا پراپیگنڈا یکا یک کم کر دیا تھا۔ اس فیصلہ کا محرک سردار پٹیل تھا جس کے کنٹرول میں کانگرس کی تنظیم کی باگ ڈور تھی۔ وجہ یہ تھی کہ سردار پٹیل اور اس کے بعض رفقاء نے (جنوری 1946ء میں) وائسرائے لارڈ ویول کے ساتھ بات چیت کے دوران یہ رائے قائم کی تھی کہ برطانیہ کم از کم کانگرس کے نقطۂ نظر سے بالآخر سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور وہ اپنے مفادات کے تحفظ اور فروغ کے لیے ہندوستان سے دستبردار ہونے کی فی الحقیقت تیاری کر رہا تھا۔ سردار پٹیل حقیقت پسند تھا۔ اس لیے وہ برطانیہ کی ہندوستان سے دستبرداری کی وجوہ کی قدر کرتا تھا۔ اس نے جب یہ رائے قائم کر لی تو اس کے بعد اسے انگریزوں کی نیت کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ متحدہ ہندوستان کی مؤثر فوجی تنظیم بہت جلد کانگرس کے قبضے میں آ جائے گی۔ اس وقت اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ذہن میں پاکستان کے قیام کا کوئی خیال نہیں آتا تھا۔ انہیں خیال تھا تو صرف یہ کہ ہندوؤں کے غلبہ کے تحت قوم پرست ہندوستان کی اتنی بڑی اور اچھی فوج ان کے اختیار میں ہو گی۔ یہ منظم و مستعد فوج انہیں آزاد ہند فوج کے چند بزدل افسروں سے زیادہ عزیز تھی اور وہ بغاوت کی حوصلہ افزائی کر کے اس کے نظم و ضبط کو مزید خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سردار پٹیل یہ احساس لے کر بمبئی پہنچا اور اس امر کی قوی شہادتیں موجود ہیں کہ اس نے بحریہ کی بغاوت کو ختم کرنے میں مثبت کردار ادا کیا تھا۔ جب بحریہ کے فوجی بغاوت کر رہے تھے اور بمبئی کے بازاروں میں ہنگامے ہو رہے تھے، اس وقت شہر میں کانگرس کے ہیڈ کوارٹرز میں بھی گرما گرم بحث ہوئی۔ مسز ارونا آصف علی اور ''بائیں بازو'' کے دوسرے عناصر کو ہزیمت اٹھانا پڑی اور سردار پٹیل کے

قدامت پسند گروپ کی فتح ہوئی۔ اس کے بعد جناح کی مسلم لیگ اور کانگرس کے مضبوط ترین گروپ کے درمیان کئی باتوں پر شدید اختلاف کے باوجود اس بات پر اتفاق رہا تھا کہ فوج کے نظم وضبط کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں کو اپنے اپنے نصب العین کی تکمیل کے لیے فوج کی ضرورت تھی۔"[20] چنانچہ اب کانگرس کے "اعتدال پسند" قائدین کو ویتنام اور ملایا میں کمیونسٹوں کی سرکوبی کے لیے ہندوستانی گورکھا فوج کے استعمال پر بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وزیراعظم ایٹلی کی لیبر حکومت نے ان "اعتدال پسندوں" سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ بے بنیاد نہیں تھیں۔

حکومت برطانیہ کی پریشانی اور وزارتی مشن کی روانگی کا اعلان

تاہم برطانوی سامراج پر ہندوستانی بحریہ کی بغاوت کا فوری اثر ہوا۔ ویسٹ منسٹر میں چاروں طرف خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اگرچہ کابینہ کے تین وزراء پر مشتمل ایک وفد کو مارچ کے آخر میں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا جا چکا تھا اور یہ تینوں وزراء اپنے مشن کے لیے "ہوم ورک" میں مصروف بھی تھے جس کی تفصیل اوپر دی جا چکی ہے۔ لیکن ابھی اس کے بارے میں عام اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ وزیراعظم ایٹلی نے بغاوت کی اطلاع سنتے ہی اسی دن یعنی 19رفروری 1946ء کو ایوان عام میں اعلان کیا کہ عنقریب ایک وزارتی مشن ہندوستان جائے گا اور مختلف پارٹیوں کے لیڈروں کے ساتھ صلاح مشورے کے ذریعے ہندوستان کے آئینی مسئلے کے حل کی کوشش کرے گا۔ وزیر ہند پیتھک لارنس نے دارالامراء میں بھی یہی اعلان کیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ اپنے لیے آئینی ڈھانچے کی بنیاد کا فیصلہ کرنا خود ہندوستانیوں کا کام ہے برطانیہ اور ہندوستان کے مابین ایک واضح میثاق ضرور طے پائے گا۔"[21] گویا اس میثاق کے لیے ہندوستان کو ایک اکائی تصور کیا گیا تھا۔ درحقیقت لیبر حکومت ہندوستان کے حصے بخرے کرنے کی حامی نہیں تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسا حل تلاش کیا جائے جس سے ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی وحدت بھی قائم رہے اور مسلم لیگ اور کانگرس دونوں اسے قبول بھی کر لیں۔ وزارتی مشن کے بارے میں اعلان کا آزاد اور گاندھی نے خیر مقدم کیا۔ گاندھی نے اپنے ملک کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس مشن کی نیت پر شبہ نہ کریں۔[22] جناح نے اپنا مطالبہ دہراتے ہوئے کہا کہ وزارتی مشن کو باور کرایا جائے گا کہ

برصغیر کے آئینی مسئلے کا واحد حل اس کی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہے۔لیکن وزارتی مشن کچھ اور ہی خاکہ بنانے میں مصروف تھا۔

برصغیر کے اتحاد اور مشترکہ دفاع کے بارے میں وزارتی مشن کا ہوم ورک

23رفروری کو پیتھک لارنس نے وزارتی مشن کے ارکان کے لیے ایک نوٹ لکھا جو اس میثاق پر مشتمل تھا جو برطانیہ اور یونین آف انڈیا کے مابین طے پانا تھا۔اس میں یونین آف انڈیا کو ایک ملک تصور کیا گیا تھا اور اس کے دفاع کے بارے میں تجویز کیا گیا تھا کہ کسی اول درجے کی طاقت کی جانب سے حملے کی صورت میں برطانیہ اس کے دفاع کی ذمہ داری انجام دینے کا پابند ہوگا۔[23] یہاں اول درجے کی طاقت سے مراد سوویت یونین تھا جس کے گرد مضبوط حصار قائم کرنے کی خاطر انگریز برصغیر کو ایک یونین آف انڈیا کی صورت میں متحد رکھنا چاہتے تھے۔اس معاملے میں کانگرس پارٹی اور انگریزوں کے مابین مکمل اتفاق رائے اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔اسی بناء پر بحریہ کی بغاوت کے مسئلے پر کانگرس نے انگریز حکومت کا ساتھ دیا تھا۔جن دنوں یہ بغاوت پنپ رہی تھی انہی دنوں برطانوی اخبار ''ڈیلی میل'' کے نامہ نگار مقیم نئی دہلی جان فشر نے لکھا کہ ''کمانڈر انچیف اور کانگرس کے مابین ہندوستان کے دفاع کے بارے میں خفیہ مذاکرات ہو رہے ہیں۔دو عوامل نے کانگرس میں تشویش پیدا کی ہے۔ایک تو مشرق وسطیٰ میں روس کی سرگرمی ہے جو ہندوستان کو الگ تھلک کر دینے کا خطرہ پیدا کر سکتی ہے۔دوسرے پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا امکان ہے۔اگر پاکستان وجود میں آ گیا تو مرکزی ہندوستان کے اردگرد افلاس زدہ مسلم صوبے ہوں گے جو ہندوستان کا دفاع نہیں کر سکیں گے۔چنانچہ ایک مشترکہ دفاعی منصوبے کی ضرورت ہے جو آج کل تیار ہو رہا ہے...... انگریز چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا آئینی مسئلہ اس طرح حل ہو کہ ان کے مفادات محفوظ رہیں۔چنانچہ انتخابات ہونے یا نہ ہونے کی ہر دو صورتوں میں ایک متحدہ ہندوستان ان کا منتہائے مقصود ہے۔اس معاملے میں کانگرس اور برطانیہ کے مابین مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔مسلم لیگ کی تھوڑی سی شکست بھی پاکستان کے خلاف مؤثر ہتھیار ثابت ہوگی۔''[24] چنانچہ برطانوی حکومت نے وزارتی سطح کا اعلیٰ ترین وفد ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ بھی اسی مقصد کے لیے کیا کہ ایک متحدہ وفاقی

ہندوستان کی کوئی صورت نکالی جائے جس پر دونوں بڑی پارٹیوں کا اتفاق رائے ہو سکے۔

24رفروری کو وزیراعظم ایٹلی اور وزارتی مشن کے ارکان کی میٹنگ ہوئی۔ اس میں پالیسی وضع کی گئی کہ مشن ہندوستان جا کر فریقین کے خیالات سے آگاہی حاصل کرے اور پاکستان کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہ کرے، نہ حق میں اور نہ ہی مخالفت میں کوئی تجویز پیش کرے۔ ساتھ ہی انڈیا آفس سے کہا گیا کہ وہ کنفیڈرل حل کے امکان کا جائزہ لے۔ اس میں شامل ریاستوں کی خودمختاری کو تسلیم کیا جائے اور کنفیڈریشن کی سطح کے فیصلوں میں ان کو برابر کا شریک بنایا جائے۔ پاکستان، ہندوستان اور بعض بڑی دیسی ریاستوں کو اس کنفیڈریشن کے یونٹوں کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ آپس میں ایک معاہدے کے ذریعے کنفیڈرل معاملات کی حدود کا تعین کر سکتے ہیں [25] اور پھر وزارت ہند کے اعلیٰ حکام نے ان خطوط پر منصوبہ وضع کرنا شروع کر دیا۔ یکم مارچ کو پارلیمانی نائب وزیر ہند مسٹر ہینڈرسن نے وزیر ہند پیتھک لارنس کے نام ایک نوٹ لکھا جس میں برصغیر کے متحد یا منقسم ہونے کے مضمرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس نے لکھا ''...... میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سب سے بہترین حل یہی ہے کہ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھا جائے۔ ہندوستان کو دو یا زائد سیاسی اکائیوں میں بانٹ دینا وقت کی سوئیوں کو پیچھے کی طرف گھمانے کے مترادف ہوگا...... مسلم اقلیت کی فلاح و بہبود کا بہترین بندوبست متحدہ ہندوستان یا وفاق میں ہی ممکن ہے جس میں صوبوں کو خواہ ان کی جتنی بھی تعداد ہو، وسیع خوداختیاری حاصل ہو۔'' ہینڈرسن نے تجویز کیا کہ ''اگر مسلم لیگ متحدہ ہندوستان کی کسی بھی صورت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو تو اقتدار، کانگرس، سکھوں اور اتحاد کے ساتھ تعاون کرنے والے مسلمانوں اور دوسرے عناصر کو منتقل کر دیا جائے۔ مسلم لیگ کے بغیر ان پارٹیوں کے افراد پر مشتمل ایگزیکٹو کونسل تشکیل دے دی جائے۔ اگر جناح اس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور مسلم علاقوں میں شدید گڑبڑ پھیل جائے تو اس صورت حال کو برطانوی افواج کی مدد سے یا اس کے بغیر نمٹ لیا جائے۔ یہ قدم بالکل منطقی اور مربوط ہوگا کہ ہم جسے اکثریتی پارٹی سمجھتے ہیں اسے اقتدار منتقل کر رہے ہوں گے۔ ہم مسلم انتہا پسندی کے لیے کوئی اخلاقی ذمہ داری نہیں رکھتے اور بلاشبہ ہم زیادہ دیر تک غیر جانب دار نہیں رہ سکتے۔ اگر مسلمانوں کی جانب سے برطانوی باشندوں اور برطانوی مفادات کے تحفظ اور بہتری کو خطرہ لاحق ہو تو پھر ہم پر اس

مسلم بغاوت یا مسلمانوں کی پیدا کردہ گڑبڑ سے نبٹنے کی ذمہ داری عائد ہو جائے گی۔ پر امن تصفیے کی ناکامی کی صورت میں ہمیں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔'' ایک دوسرے متبادل کے طور پر اس نے صرف مسلم علاقوں میں استصواب کی تجویز کو قبول کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی بشرطیکہ فریقین کو یہ قابل قبول ہو جس کی بہت کم امید تھی۔ تاہم پہلی تجویز کو اختیار کرنے سے پیشتر اس نے مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان پر راضی کرنے کی خاطر ایک اور کوشش کرنے کے لیے ایک اور متبادل پیش کیا۔ اس کے مطابق شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، پنجاب اور بلوچستان پر مشتمل علاقے کی گروپنگ کی گئی، اس طرح شمال مشرق میں بنگال اور آسام (یا اس کے حصے) ملا کر گروپنگ کی گئی اور ان دونوں گروپوں کی باقی ماندہ ہندوستان کے گروپ کے ساتھ ملا کر ایک کنفیڈریشن وضع کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ گویا ایک طرح سے مطالبہ پاکستان کو بھی جگہ دے دی گئی تاکہ مسلم لیگ مطمئن ہو جائے اور ہندوستان کو متحد بھی رکھا گیا تاکہ کانگرس بھی مطمئن ہو جائے اور خود انگریزوں کے مقصد کی بھی تکمیل ہو جائے۔ گروپنگ کی یہی اسکیم بعدازاں وزارتی مشن نے اختیار کی تھی جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا۔ آخر میں ہینڈرسن نے لکھا کہ دوسرے اور تیسرے متبادل کی ناکامی کی صورت میں سب سے پہلے متبادل کو اختیار کرنے کا مضبوط جواز مہیا ہو جائے گا۔ جس میں مسلمانوں سے جبراً متحدہ ہندوستان کو قبول کرانے کی تجویز دی گئی تھی۔ [26]

3/مارچ کو ویول نے پیتھک لارنس کو اپنے مراسلے میں لکھا کہ ''یہاں وزارتی مشن کو مذاکرات میں سب سے اولیں اور اہم مسئلہ پاکستان کا درپیش ہوگا۔ حکومت برطانیہ کو اس کے بارے میں واضح پالیسی وضع کرنی چاہیے یہ فیصلہ ہونا چاہئے کہ:

(ا) ہندوستان کا اتحاد ہندوستان اور پوری دنیا کے امن اور عمومی معیشت کے لئے اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی مکمل تقسیم یعنی جس میں دفاع اور دوسرے اہم امور پر کسی نہ کسی شکل میں مرکزی فیڈریشن کا وجود نہ ہو، کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ فیصلہ قرین عقل معلوم ہوتا ہے لیکن حکومت برطانیہ کو اس کے نتیجے میں ہندوستان بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں آباد مسلمانوں پر پڑنے والے اثرات کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔

(ب) اگر مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان کی صورت پر بھی آمادہ کرنا ممکن نہ ہو تو پھر ہندوستان

کے مسلم اکثریتی علاقوں میں ان کو آزادی دینے کے لئے تیار ہونا ہوگا بجائے اس کے
کہ ہندوستان میں خانہ جنگی بھڑک اُٹھے اور دوسرے مسلم ممالک دشمن ہو جائیں۔

(ج) اگر (ب) کے حق میں فیصلہ ہو تو پھر معلوم ہونا چاہئے کہ تقسیم کس طرح ہوگی اور اس
کے دفاع اور معیشت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔"[27]

گویا ویول کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ ہندوستان کو کسی طرح متحد رکھا جائے۔ وہ تقسیم کے صرف اس صورت میں حق میں تھا کہ ہندوستان کو خانہ جنگی کا خطرہ لاحق ہو جائے اور دوسرے مسلم ممالک یہاں کے مسلمانوں کے حق میں برطانیہ کے مخالف ہونے شروع ہو جائیں لیکن انڈیا آفس اور برطانوی کابینہ کی رائے تھی کہ مسلم اقلیت کو متحدہ ہندوستان میں تحفظ فراہم کرنے سے کام چل جائے گا۔

8/ مارچ کو کابینہ نے وزارتی مشن کے لئے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جس میں مشن کو اختیار دیا گیا کہ وہ حکومت برطانیہ کی جانب سے ہندوستان کو آزادی اور سیلف گورنمنٹ دینے کے بارے میں کوئی آئینی حل پارلیمنٹ کے لئے تجویز کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں

ا۔ یا تو آئینی طور پر یا کسی عہد نامہ کی شق کے ذریعے مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے تحفظ کی کوئی صورت مہیا کی گئی ہو۔

ب۔ ہندوستان اور بحر ہند کے علاقے کے دفاع کا تسلی بخش بندوبست کیا گیا ہو۔

ج۔ اقتدار اعلیٰ ہندوستان کو نہ سونپا جائے۔

د۔ ہندوستان اور برطانیہ کے مابین موجودہ حکومت کے مالی امور کو خوش اسلوبی سے اختتام تک پہنچانے کا طریقہ وضع کیا گیا ہو۔[28]

گویا برطانوی کابینہ متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے اقلیتوں کو تحفظ مہیا کر کے اقلیتی مسئلہ حل کرنا چاہتی تھی۔ متحدہ ہندوستان اور بحر ہند کے پورے علاقے کا استحکام سوویت یونین کے خلاف مغربی سامراج کے حصار میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے نزدیک اس معاملے میں دو ہی فریق تھے، ایک ہندوستان اور ایک برطانیہ۔ تمام معاملات انہی کے مابین طے پانا تھے۔

11/ مارچ کو پیتھک لارنس نے انڈیا آفس کی جانب سے ایک یادداشت دفتر خارجہ

کوارسال کی جس میں برطانیہ اور ہندوستان کے مابین طے پانے والے عہدنامے (میثاق) کی شرائط کے بارے میں مشورہ طلب کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ ''اس میں اقلیتوں کے تحفظ کے بارے میں جو شقیں شامل کی جائیں وہ حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کے مابین نزاع کا سبب نہیں بنی چاہئیں۔ حکومت برطانیہ پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہونی چاہیے کہ اقلیتوں کی خاطر اسے سوائے سفارتی نوعیت کے کوئی اور مداخلت کرنی پڑے۔ اس حالت میں آزردہ فریق کے لیے اقوام متحدہ یا بین الاقوامی عدالت انصاف کا راستہ کھلا ہوگا۔''[29] مطلب یہ تھا کہ اقلیتوں کی خاطر حکومت برطانیہ ہندوستان میں فوجی مداخلت نہیں کرے گی۔ ان حالات میں محروم اقلیتوں کو انصاف حاصل کرنے کے لیے اقوام متحدہ یا بین الاقوامی عدالت انصاف کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا۔ تاہم برطانیہ کی یہ پوری کوشش تھی کہ خواہ کتنا ہی ڈھیلا ڈھالا اتحاد کیوں نہ ہو، ایک متحدہ ہندوستان کسی طور پر برقرار رہ جائے تو غنیمت ہوگا۔

12/مارچ کو پیتھک لارنس نے برطانوی کابینہ کے وزراء کے لیے ایک نوٹ تیار کیا جس میں کنفیڈریشن کی تجویز کے اثرات و مضمرات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ مسلم اکثریت کے دو علاقوں اور بقیہ ہندوستان پر مشتمل ایک علاقہ کی آزاد ریاستیں وضع کی جائیں جو آپس میں ایک کنفیڈریشن بنانے میں کامیاب ہوسکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ کنفیڈریشن اگرچہ ایک آزاد وخودمختار پاکستان کی نسبت کچھ سودمند تو ثابت ہوگی۔ لیکن امور خارجہ اور دفاع میں یہ بہتر ثابت نہ ہوگی۔ امید کی جاتی ہے کہ جب آئین ساز ادارہ تفصیلی کام شروع کرے گا تو حقائق کی منطق کی بنیاد پر وہ کنفیڈریشن کے بجائے ایک زیادہ مربوط اور ہم آہنگ نظام وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔[30] چنانچہ انگریزوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ دفاع کا تھا جس کی خاطر وہ برصغیر کو متحد رکھنا چاہتے تھے اور یہ دفاع تھا سوویت یونین کے خلاف، ابھرتے ہوئے کمیونسٹ چین کے خلاف اور برصغیر کے گردونواح میں اور بعض مقامات پر اس کے اندر چل رہی سامراج دشمن مسلح تحریکوں اور بغاوتوں کے خلاف اور فرقہ وارانہ فسادات، داخلی انتشار اور طوائف الملوکی کو قابو میں رکھنے کی خاطر جس سے کمیونسٹ عناصر فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس لیے پاکستان اور تقسیم ہند تو دور کی بات تھی وہ کنفیڈریشن کو بھی دفاعی نقطۂ نگاہ سے موزوں نہ سمجھتے تھے اور یہاں ایک مربوط و متحد ہندوستان کی صورت میں مضبوط دفاعی

انتظام چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔

وزارتی مشن کے مجوزہ دورۂ ہندوستان کے پیش نظر وزارت ہند نے وزارت دفاع کی وساطت سے چیفس آف سٹاف سے بہت سی آراء طلب کیں جو ہندوستان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے لئے ضروری تھیں۔ جواب میں 13/مارچ کو وزارت دفاع نے چیفس آف سٹاف کی آراء سے وزارت ہند کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ" دولت مشترکہ کے دفاع میں ہندوستان فوجی اعتبار سے اس کا جزو لاینفک اور قریبی اتحادی ہے۔ اس کی افرادی قوت، جغرافیائی حیثیت اور پنہاں صنعتی اہلیت ہمارے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ جغرافیائی اہمیت کی وضاحت میں بتایا گیا کہ ہندوستان کے ہوائی اڈے اور مغربی ومشرقی ساحلوں پر واقع بندرگاہیں خلیج فارس، بحر ہند اور جنوب مشرقی ایشیا میں برطانوی افواج کے استعمال میں آئیں گی۔ اس کے شمال مغرب کے ہوائی اڈے یورال اور مغربی سائبیریا کے صنعتی علاقوں سے قریب ترین ہیں۔ آگے چل کر لکھا گیا کہ" چیفس آف سٹاف کی رائے میں ہندوستانی افواج ماسوائے روس کے اپنے کسی بھی ہمسائے کی جانب سے حملے کے جواب میں اپنی سرحدوں کا دفاع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ روس کی جانب سے حملے کی صورت میں ہم ایک اور عالمی جنگ میں ملوث ہو جائیں گے۔ چنانچہ ہندوستان کے دفاع کے بارے میں پالیسی ہمیں اپنی عالمی جنگی حکمت عملی اور اپنے اتحادیوں کو پیش نظر رکھ کر کرنا ہوگی۔ ہندوستان پر کسی اول درجے کی طاقت کی جانب سے حملے کی صورت میں اس کے فضائی دفاع کے لیے برطانوی امداد بہت ضروری ہوگی اور اس کے لیے زمانہ امن میں تیاری کرنا ہوگی۔" آگے چل کر لکھا گیا کہ "ہندوستان میں فرقہ وارانہ گڑبڑ ایک عام معمول بنی رہی ہے اور مستقبل میں بھی اس کی توقع ہے۔ اگر ہندوستان انارکی کی صورت حال سے دوچار ہو گیا تو بڑی آسانی سے تخریبی پراپیگنڈہ کا نشانہ بن جائے گا جو کسی دشمن طاقت کی جانب سے یہاں کے بے چین لوگوں میں پھیلایا جائے گا اور یہ ہندوستان پر حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ ایک مطمئن اور سیاسی طور پر مستحکم ہندوستان کا وجود ہمارے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے تاکہ ایک فوجی اڈے کی حیثیت سے اور افرادی قوت و پنہاں جنگی صنعتی اہلیت کے سرچشمے کی حیثیت سے اس کے تحفظ کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس لیے اگرچہ ہم اس میں ملوث ہونے کے خواہاں نہیں ہیں لیکن یہاں قانون اور ضابطے کی

عملداری ہمارے مفاد میں ہے۔ اگرچہ ہندوستانی افواج فرقہ وارانہ گڑبڑ کو ایک حد تک قابو میں کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں لیکن یہاں برطانوی افواج کی موجودگی اس لیے ضروری ہو گی کہ کہیں یہ صورت حال بڑھ کر خانہ جنگی کا رنگ نہ اختیار کر لے۔'' اس سوال کے جواب میں کہ ہندوستان دو یا زائد حصوں میں تقسیم کیا جائے یا نہیں، چیفس آف سٹاف نے جواب دیا کہ ''ایسا کرنے سے ہندوستان کا دفاعی مسئلہ شدت اختیار کر جائے گا۔ پورے ملک کے لیے ایک واحد مشترکہ دفاعی اتھارٹی کے بغیر ہندوستان کا دفاع خطرے میں پڑ جائے گا۔ حالیہ جنگ میں اس بات کی اہمیت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ سطح تک کمان کو متحد رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہماری رائے میں جغرافیائی ہندوستان کے دفاع کے لیے مربوط نظام از حد ضروری ہے اور یہ کہ یہاں ایک واحد مشترکہ دفاعی اتھارٹی ہونی چاہیے، جس کے ساتھ حکومت برطانیہ معاملات طے کرے۔''[31] برطانوی چیفس آف سٹاف کے ان خیالات سے صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ برطانیہ کیوں برصغیر کو متحد رکھنے پر تلا ہوا تھا اور اس اتحاد کے ساتھ اس کی کون سی عالمی سامراجی ضروریات وابستہ تھیں۔

13 رمارچ کی شام کو وزیراعظم ایٹلی اور ہندوستان کے دورے پر جانے والے وزیروں اور اُن کے معاونین کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس میں وزارتی مشن کے لائحہ عمل اور ہندوستان کے مستقبل کے لیے تجاویز پر تبادلۂ خیال ہوا۔ چیفس آف سٹاف کی مذکورہ رپورٹ بھی زیرِغور آئی۔ وزیروں نے اس رپورٹ کے ساتھ اتفاق کیا تاہم ہندوستان کے داخلی امن کی بحالی کی خاطر برطانوی افواج کے استعمال کے بارے میں ان کی رائے ذرا مختلف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اسے ہند اور برطانیہ کے مابین طے پانے والے میثاق کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے البتہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے دفاع کی خاطر کچھ عرصے کے لیے وہاں برطانوی افواج مہیا کرنے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔[32] 13 رمارچ ہی کو حال میں ہندوستان کا دورہ کر کے واپس جانے والے پارلیمانی وفد کی جانب سے اس کے ایک رکن آر۔ سارن سن نے وزیر ہند پیتھک لارنس کو رپورٹ پیش کی۔ اس میں بعض ارکان کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کو اس بنا پر نہیں کہ یہ درست اور قابل قبول حل ہے بلکہ ایک تلخ خانہ جنگی کے مقابلے میں ایک کمتر برائی کے طور پر تسلیم کر لینا چاہیے۔ بعض ارکان اس بارے میں اس لیے خاموش رہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس

جھگڑے کی وجہ سے امن عامہ برقرار رکھنے کی خاطر برطانیہ کو غیر معینہ مدت کے لیے یہاں رکنا پڑ جائے۔ خود سارن سن کی رائے یہ تھی کہ کسی معاہدہ یا میثاق کے ذریعے دفاع اور امور خارجہ کسی مشترکہ اتھارٹی کو تفویض کر دیئے جائیں اور پاکستان و ہندوستان کو ان شعبوں پر کلی اختیار حاصل نہ ہو۔ اسی طرح مواصلات اور مالیاتی پالیسی کو کسی معاہدہ یا میثاق کے ماتحت رکھا جائے۔[33] چنانچہ برطانوی حکومت کے مختلف محکموں نے وزارتی مشن کے ہوم ورک کے لیے جو رپورٹیں تیار کیں ان سب کا لب لباب یہ تھا کہ اول تو برصغیر کو ہر قیمت پر متحد رکھا جائے اور اگر تقسیم بالکل ناگزیر ہو جائے تو ہندوستان و پاکستان کی کنفیڈریشن کے ذریعے یا ان کے باہمی معاہدوں یا میثاقوں کے ذریعے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات و مالیات کو متحد رکھا جائے۔ وزارتی مشن کے ارکان یہی خاکہ لے کر 24/مارچ 1946ء کو نئی دہلی پہنچے۔

دارالعوام میں 15/مارچ کو حزب اختلاف کنزرویٹو پارٹی کے ایک رہنما آر۔ اے بٹلر نے وزارتی مشن سے متعلق تحریک التوا پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے کہا ''جو بھی فیصلہ ہو، یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کا اتحاد گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے طویل صبر اور تعمیری تدبر کے نتیجے میں قائم ہوا ہے۔ چنانچہ جو بھی بندوبست کیا جائے، یہ امید کی جاتی ہے کہ کوئی ایسا حتمی حل نہیں کیا جائے گا جس میں ہندوستان کے کسی مرکزی رابطے کا خیال نہ رکھا گیا ہو جو کہ کل ہند اہمیت کے مسائل کے حل میں مدد ثابت ہو سکتا ہے۔'' اس کی تائید کرتے ہوئے جواب میں وزیر اعظم ایٹلی نے تقریر کرتے ہوئے کہا ''ہمیں احساس ہونا چاہیے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایک عظیم کام انجام دیا ہے۔ ہم نے ہندوستان کو متحد کیا ہے اور اسے وہ احساس قومیت دیا ہے جس سے یہ گزشتہ صدیوں سے عاری تھا...... جب میں ہندوستان کی بات کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہے کہ میں ایسے ملک کی بات کرتا ہوں جو مختلف نسلوں، مذہبوں اور زبانوں کے گروہوں پر مشتمل ہے۔ ہمیں اقلیتوں کے حقوق کا پورا احساس ہے اور اقلیتوں کو خوف سے آزاد ہو کر رہنا چاہیے۔ لیکن کسی اقلیت کو وہ حق استرداد نہیں دیا جا سکتا جو اکثریت کی ترقی میں رکاوٹ بن جائے۔''[34] گویا خواہ وہ کنزرویٹو تھے خواہ لیبر، وہ ہندوستان کو جسے انہوں نے گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے دوران اپنی سامراجی ضرورت کی خاطر متحد کیا تھا، اب اپنے مفاد میں اور ہندو اکثریت کے مفاد میں متحد چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ جناح

نے ایٹلی کے اس بیان پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ نہرو اور آزاد نے ایٹلی کے بیان کی تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ لوگوں کی طرف سے اس کی ستائش کی جائے گی۔[35]

ان حالات میں برصغیر کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے اختلافات اس قدر پیچیدہ صورت اختیار کر چکے تھے کہ ملک کے کسی حلقے میں بھی وفد کی کامیابی کی توقع نہیں کی جاتی تھی۔ برطانوی حکومت اور کانگرس کے سُر تو آپس میں خوب مل رہے تھے۔ لیکن مسلم لیگ ان دونوں کی مخالفت کر رہی تھی۔ کانگرس کی قیادت ایک قومی نظریے پر پختگی سے قائم تھی اور ہندوستان کی تقسیم پر کسی صورت آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ گاندھی نے تو ہندوستان کی تقسیم کے خلاف مذہبی فتویٰ بھی دے دیا تھا۔ وہ بار بار اعلان کرتا تھا کہ بھارت ماتا کی تقسیم میری لاش پر ہو گی۔ دوسری طرف مسلمانوں نے انتخابات میں اپنا قطعی فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اپنے لیے علیحدہ مملکت حاصل کریں گے۔ تاریخی ہندو مسلم تضاد کے پرامن حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی بلاشبہ انگریزوں نے ماضی میں پانچ ہزار میل کے فاصلے سے برصغیر کے وسیع وعریض علاقے پر سامراجی اقتدار برقرار رکھنے کے لیے ڈیڑھ دو سو سال تک ہندو مسلم تضاد سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے اصول پر عمل کئے بغیر اتنے زیادہ لوگوں کو اتنی دیر تک محکوم نہیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن یہ تضاد سراسر انگریزوں کا پیدا کردہ نہیں تھا بلکہ اس کی جڑیں تقریباً ایک ہزار سال کی تاریخ میں پھیلی ہوئی تھیں اور اب اس فرقہ وارانہ تضاد نے برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیوں اور کانگرس کی ہندو قیادت کی کوتاہ اندیشی وہٹ دھرمی کے باعث اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ اسے محض پند ونصائح یا لعن طعن سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی تضاد معاندانہ اور لاینحل ہو جائے تو اس کے حل کے لیے یکا یک دھماکہ ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ فطرت کے تضادات بھی اسی طرح حل ہوتے ہیں۔ زلزلوں، طوفانوں اور بجلیوں وغیرہ کے پس پردہ یہی سائنسی وجوہ ہوتی ہیں۔

جزوسوم

وزارتی مشن منصوبہ:
برصغیر کو متحد رکھنے کی آخری کوشش

باب: 9

مشن کی آمد، حالات کا جائزہ اور ابتدائی پیشکش

اعلیٰ سرکاری حکام اور تمام فرقوں کے نمائندوں کے ساتھ ابتدائی بات چیت

23 رمارچ 1946ء کو تین رکنی وزارتی مشن کراچی کے ہوائی اڈے پر اترا تو اخباری نمائندوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس کے رکن سٹیفورڈ کرپس نے کہا ''مشن یہاں اس لیے نہیں آیا کہ یہاں موجود ایک دوسرے کے خلاف پائے جانے والے دعوؤں کے متعلق کوئی فیصلہ صادر کرے بلکہ اس کا مقصد ہندوستانیوں کو اقتدار منتقل کرنے کا طریقہ وضع کرنا ہے۔''[1] انگریزوں کی یہی مشکل تھی کہ برصغیر کے فرقوں اور بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین تضادات کا مناسب حل متحدہ برصغیر کی صورت میں ہوتا ہوا نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ اپنے داخلی اور عالمی تقاضوں کے تحت جلد از جلد یہاں کے اقتدار سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ لیکن فرقہ وارانہ تضادات کو حل کئے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ انارکی پھیل جانے اور کمیونسٹوں کے غلبہ پا جانے کا خطرہ نظر آتا تھا۔ ہندو مسلم تضاد ہر سطح پر اس قدر نمایاں طور پر ابھر چکا تھا کہ اس سے آنکھیں چرانا ممکن نہیں رہا تھا۔

24 رمارچ کو مشن دہلی پہنچا اور 26 رمارچ کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ 13 رکنی کونسل کے آٹھ ہندوستانی ارکان میں تین مسلم ارکان تھے جن میں سے دو نے پاکستان کی حمایت کی اور جناح اور مسلم لیگ کے موقف کو درست قرار دیا۔ تین ہندو ارکان تھے، تینوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ واحد اچھوت رکن ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبید کر نے پاکستان کی حمایت کی جب کہ واحد سکھ رکن جوگندر سنگھ نے مخالفت کی۔[2] گویا ہندوستان

کے آئینی مسئلے پر کونسل میں ہم آہنگی کے بجائے فرقہ وارانہ تفریق نمایاں طور پر ظاہر ہوئی۔ تاہم انگریز ارکان کونسل اور ارکان مشن بشمول وائسرائے کی یہ کوشش تھی کہ کوئی بین بین حل ہو جائے اور برصغیر کا اتحاد برقرار رہ جائے۔ اسی روز وائسرائے کے ساتھ بات چیت کے دوران مشن کے ارکان نے وائسرائے کو یہ تاثر دیا تھا کہ مسلم لیگ کا کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد ہو چکا ہے۔"[3]

28/مارچ کو مشن کے ارکان کی صوبائی گورنروں کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ بعض گورنروں نے ذکر کیا کہ ملک میں کمیونسٹ بھی کافی مضبوط ہیں اور کانگرس کے بائیں بازو کے افراد کا جھکاؤ کمیونسٹوں کی جانب ہو رہا ہے۔ بمبئی کے گورنر کے مطابق وہاں کا صاحب جائیداد ہندو بورژوا صورت حال سے خائف ہو رہا تھا۔[4] گویا انگریزوں کو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں چلے جانے کا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ دونوں جماعتوں کی قیادت اعتدال پسند تھی اور انتہا پسندوں کے خلاف حکومت کے ساتھ تعاون کرتی تھی۔ بحریہ کی ہڑتال میں ان رہنماؤں کا رویہ واضح ہو گیا تھا۔ اس لیے انگریز اس اعتدال پسند قیادت کے مابین ایسا سمجھوتہ چاہتے تھے کہ جس کے تحت یہ برصغیر متحد رہے اور داخلی و خارجی کمیونسٹ خطرے کا مداوا ہو سکے اور کچھ نہ ہو تو کم از کم دفاع اور فوجی کمان ضرور مشترکہ ہونی چاہیے۔ 28/مارچ کو چیف آف سٹاف آرتھر سمتھ اور جناح کے مابین ملاقات میں یہ معاملہ زیر غور آیا۔ جناح نے دریافت کیا کہ اگر پاکستان اور ہندوستان بنے تو پھر ہندوستانی فوج کی کیا صورت ہو گی۔ سمتھ نے تجویز کیا کہ تقسیم ہند کی صورت میں دفاع مشترکہ ہو گا۔ ایک مشترکہ کمانڈر انچیف ہو گا۔ دونوں حکومتوں کی ایک نمائندہ باڈی تشکیل دی جائے گی۔ یہ کمانڈر انچیف اس باڈی کو جواب دہ ہو گا۔ جناح نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کی علیحدہ فوج ہونی چاہیے البتہ دونوں کے مابین دفاعی اتحاد کا معاہدہ ہونا چاہیے۔ سمتھ نے کہا کہ فوج کے دو حصوں میں بٹ جانے کی صورت میں برطانوی افسر مستعفی ہو جائیں گے۔ پھر آپ خود ہی اپنی افواج کا کاروبار چلائیں گے۔ بقول سمتھ "یہ سن کر جناح ہل گیا۔" آگے چل کر سمتھ لکھتا ہے کہ اگر دفاعِ ہند کو ایک اکائی مان لیا جائے تو پاکستان کا کیس دھڑام سے ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔[5] 30/مارچ کو جناح اور وزارتی مشن کے رکن سٹیفورڈ کرپس کی ملاقات ہوئی۔ جناح نے کہا کہ "ہم مجموعی طور پر ہند کے خیر خواہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ شمال مغربی سرحدی صوبے کے دفاع کے لیے ہندوستان

کے ساتھ کوئی معاملہ طے ہونا چاہیے۔ کم از کم بیس پچیس سال کے لیے دونوں ملکوں کے مابین ایک معاہدہ ہونا چاہیے۔"[6]

انگریز شمال سے خطرے کے مقابلے میں برصغیر کو ایک دفاعی وحدت کی صورت میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آزاد و خود مختار مگر کمزور پاکستان جسے انگریز فوجی افسروں کا تعاون بھی حاصل نہ ہو، جناح کے لیے قابل قبول نہ ہوگا اور وہ اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ ادھر جناح مشترکہ دفاع کے لیے تو تیار تھے۔ مگر دو آزاد ممالک کے مابین معاہدے کی صورت میں جب کہ انگریز یہ چاہتے تھے کہ اگر وہ پاکستان کے مطالبے سے دستبردار نہ ہوں تو پھر دفاعی وحدت کے دائرے میں رہتے ہوئے پاکستان کی کسی صورت کو قبول کرلیا جائے۔ اس سلسلے میں صوبائی گورنروں نے وزارتی مشن کو اپنی آراء سے آگاہ کیا۔

بنگال کے گورنر ایف بروز نے مشن کے نام اپنے نوٹ میں تین حل تجویز کئے۔

ا۔ ایک وفاق ہو جس میں مسلمانوں اور ریاستوں کو ایسی رعائتیں دی گئی ہوں کہ زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں۔ مرکز کے پاس صرف دفاع، مواصلات اور ریونیو کے ایسے شعبے جیسے کسٹمز، ایکسپورٹ ڈیوٹی اور انکم ٹیکس کا کچھ حصہ ہو، رہنے چاہئیں۔

ب۔ دو یا دو سے زائد وفاق ہوں۔ ایک ہندوؤں کے لیے اور ایک مسلمانوں کے لیے اور اگر ریاستیں چاہیں تو ایک ان کے لیے۔ مسلمانوں کے وفاق میں مغربی بنگال اور پنجاب کے غیر مسلم علاقوں کو شامل نہ کیا جائے۔

ج۔ اس میں (ا) اور (ب) کے امتزاج سے نظام وضع کیا جائے جس میں پاکستان کی صورت بھی شامل ہو، دو یا تین آئین ساز اسمبلیاں ہوں جو الگ الگ وفاقوں کا آئین بنائیں اور پھر ایک گرینڈ آئین ساز اسمبلی ہو جو دفاع اور مواصلات جیسے مرکزی امور کی نگرانی کرے۔

بروز نے مزید لکھا کہ اگر ان تینوں میں سے کسی ایک پر بھی سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ہندو جو مخالفت کریں گے وہ اپنی جگہ پر، مسلمانوں نے علم بغاوت بلند کر دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ مسلم بغاوت کی صورت میں زیادہ مشکل کا سامنا بنگال میں ہوگا۔ جہاں یہ بھی امکان ہے

کہ معاملہ مسلح بغاوت تک پہنچ جائے۔ اس نے لکھا کہ اس مرتبہ تعطل پڑنے کا لازمی نتیجہ تحریک کی صورت میں نکلے گا۔ اس کی رائے تھی کہ اگر ہماری جانب سے پاکستان کے حل کی حمایت کی وجہ سے تعطل پیدا ہوا تو ہمیں چاہیے کہ ہم اس فیصلے پر ثابت قدم رہیں اور اس پر عملدرآمد کریں جو کہ بنگال میں تو ہو جائے گا۔ البتہ اس کے ردعمل میں یو پی، بہار اور اڑیسہ میں حالات ابتر ہو جائیں گے۔[7] بروز نے تمام تر کوشش ایک متحدہ برصغیر کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کوئی حل تلاش کرنے کے لیے کی۔ لیکن بنگال کی مخصوص صورت حال کے پیش نظر جہاں انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران انگریزوں کو فرائضی اور وہابی تحریکوں کی صورت میں مسلمانوں کی مسلح جدوجہد کا سامنا کرنا پڑا تھا، بروز کا خیال تھا کہ بالکل تعطل پڑ جانے اور حالات کے بے قابو ہونے کے خطرے کے پیش نظر پاکستان کا حل اختیار کرنا پڑے گا۔

یو۔ پی کے گورنر ایف۔ وائلی نے مشن کے لیے جو نوٹ لکھا اس میں وہ مسلمانوں کو پاکستان کی رعایت دینے کے لیے کسی بھی صورت میں تیار نہیں تھا۔ اس نے لکھا کہ ''ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے، سٹریٹجی کے اعتبار سے اور معاشی لحاظ سے ایک ملک ہے۔ جدید دنیا کا تمام تر رجحان بڑی سے بڑی سیاسی وحدتوں کو وجود میں لانے کا ہے نہ کہ چھوٹی چھوٹی بلقانیائی ☆ ریاستوں میں بٹ جانے کا۔ صنعتی فروغ کی وجہ سے غالباً ہمیشہ کے لیے چھوٹی ریاست سیاسی منظر سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس لیے اگر برطانیہ نے ہند کی تقسیم کی اجازت دے دی تو یہ اول درجے کا رجعتی اقدام ہوگا۔'' اس نے تجویز کیا کہ برطانوی حکومت کو چاہیے کہ وہ ایک اعلان جاری کر دے جس میں کہا جائے کہ برطانوی حکومت اصولی طور پر تقسیم کے حق میں نہیں ہے تاہم حکومت برطانیہ اس اصول کو ہند پر زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتی اور اگر ہندوستانیوں کے

☆ بلقان، مشرقی یورپ میں بحیرہ ایڈریاٹک، بحیرہ اگین اور بحیرہ اسود سے گھرے ہوئے جزیرہ نُما کا نام ہے۔ موجودہ یونان، یوگوسلاویہ، البانیہ، بلغاریہ، رومانیہ، اور ہنگری پر مشتمل ہے۔ تاریخ میں مختلف سلطنتوں نے اس علاقے کو عارضی طور پر یکجا کر کے زیرنگیں رکھا لیکن جلد یا بدیر چھوٹی اور باہم متحارب ریاستوں میں بٹ جاتا رہا۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی ایک بڑا خطہ کچھ عرصہ سیاسی طور پر یک جا رہنے کے بعد پھر سے چھوٹے متحارب ملکوں میں بٹ جانے کے عمل سے دوچار ہوتا ہے تو اسے عموماً Balkanise ہونا کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اسے ''بلقانیایہ جانا'' کہا جا سکتا ہے۔

مابین تقسیم کی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو حکومت برطانیہ اسے قبول کر لے گی۔ علاوہ ازیں حکومت برطانیہ بہت جلد مرکز میں سیاسی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے اگر مسلم لیگ اس میں شمولیت پر آمادہ نہیں ہے تو اس کے بغیر ہی یہ حکومت تشکیل دے دی جائے گی۔ اس نے تجویز کیا کہ ایک رائل کمیشن وضع کیا جائے جو لسانی، ثقافتی اور مذہبی بنیادوں پر صوبوں اور ریاستوں کی نئی حد بندی کرے۔ اس دوران آئین ساز اسمبلی جسے نئی مرکزی حکومت فوری تشکیل دے گی، کوئی ایسا حل وضع کرنے میں کامیاب ہو جائے جو مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو قابل قبول ہو تو پھر حکومت برطانیہ اسے قبول کر لے گی۔ رائل کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ریاستوں سے کہا جائے گا کہ وہ آزاد ریاست ہائے متحدہ ہندوستان میں شامل ہو جائیں۔ اس نے آخر میں لکھا کہ اس اعلان کا فائدہ یہ ہوگا کہ برطانیہ کی نیک نیتی کا مظاہرہ ہو جائے گا اور نہ صرف ہندوانڈیا میں بلکہ ساری دنیا میں بالخصوص امریکہ اور روس میں برطانیہ کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے۔ مسلمانوں میں بھی اعتماد بحال ہو جائے گا جب انہیں پاکستان کے بجائے کوئی مناسب متبادل پیش کر دیا جائے گا جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل دو یا تین وفاقی یونٹ قائم کرنے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔[8] بروز اور وائلی کے نکتہ ہائے نظر میں فرق کے باوجود ہر صورت میں برصغیر کے اتحاد کو برقرار رکھنے پر زور دیا گیا تھا۔

آسام کے گورنر اے۔ جی۔ کلو نے وزارتی مشن کے لیے ایک تفصیلی نوٹ لکھا جس میں کہا گیا کہ ''ہمارا پہلا مقصد تو ہندوستان کو متحد رکھنا ہوگا۔ انگلستان نے ہندوستان کو فائدہ بھی پہنچایا ہے اور نقصان بھی۔ اگر میزانیہ دیکھا جائے تو جمع کے کھاتے میں سب سے بڑا انعام اس میں یکجائی پیدا کرنا ہے جو اگرچہ ابھی جزوی طور پر ہوئی ہے۔ اس سے اس کو بے پناہ فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے نمبر پر داخلی امن یا معاشی فائدے نہیں ہیں جو اگرچہ زیادہ اہم ہوتے ہیں بلکہ مختلف قوموں اور ثقافتوں کا افکار کے ایک ایسے ڈھانچے میں انضمام ہے جن کے مابین تناؤ ہی قوت کا سرچشمہ ہے۔ ہندوستان کا صدیوں کے تاریک جمود سے نکل کر ترقی کی جانب بڑھنے کا عمل جس کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے، مذہبوں اور ثقافتوں کی آویزش پر مبنی رہا ہے، جس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کیا گیا ہے۔ اب اگر اسی بنیاد پر اسے تقسیم کر دیا گیا، بشرطیکہ ایسا ممکن ہوا تو، پھر ایک ایسے ہندوستان کے وجود میں آنے کی امیدیں

غیر معینہ عرصے کے لیے دب جائیں گی کہ جہاں ذہن انسانی ترقی کے لیے آزاد ہو اور جہاں غیر مراعات یافتہ کو بھی بہتر زندگی گزارنے کا موقع میسر ہو۔ تقسیم کے خلاف اور بھی اتنے بے شمار دلائل ہیں کہ یہاں ان سب کا تذکرہ نہیں ہوسکتا جب کہ ان میں سے بہت سے تو جانے پہچانے بھی ہیں۔ یہ کہنا کافی ہوگا کہ بحیثیت مجموعی بھی اور اس کے علاوہ تقسیم سے پیدا شدہ عملی مسائل کے لئے بھی یہ بے حد ضروری ہے کہ ہم اپنا پورا وزن اتحاد کے پلڑے میں ڈالیں۔''[9] برصغیر کے اتحاد کے متعلق کانگرس کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا جو کلوو اور دوسرے انگریزوں نے وزارتی مشن کے سامنے پیش کیا۔

3/اپریل کو وزارتی مشن کے ارکان اور وائسرائے نے کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد کے ساتھ ملاقات کی۔ آصف علی بحیثیت مترجم اس کے ہمراہ تھا۔ آزاد نے مشن کے سامنے تجاویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ آئین ساز ادارہ وضع کیا جائے اور عبوری دور کے لیے مرکزی حکومت تشکیل دی جائے۔ جس کی ایگزیکٹو کونسل پندرہ ارکان پر مشتمل ہو۔ ان میں گیارہ ارکان گیارہ صوبوں کے نمائندہ ہوں جب کہ بقیہ چار ارکان اقلیتوں سے لیے جائیں۔ فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے لیے اس نے تجویز کیا کہ ہندوستان کا آئین وفاقی ہونا چاہیے۔ جس میں صوبوں کو خودمختاری دی گئی ہو۔ وفاقی محکموں کی دو فہرستیں وضع کی جائیں جس میں ایک کو لازمی اور دوسری کو اختیاری قرار دیا جائے۔ لازمی محکموں کی فہرست میں دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور ایسے محکمے جو ہندوستان پر بحیثیت کل حکومت قائم رکھنے کے لیے ضروری ہوں شامل ہونے چاہئیں۔ اختیاری محکموں میں صوبہ کو اختیار ہوگا کہ وہ انہیں اپنے پاس رکھے یا مرکزی حکومت کو دے دے۔ اس طرح مسلم اکثریت کے صوبے صرف لازمی محکموں کی فہرست کی پابندی قبول کر کے باقی معاملات میں مکمل خودمختاری حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کے بارے میں اس نے کہا کہ اس کے لیے مسلم اکثریت والے علاقوں میں استصواب کرانا چاہیے۔ بنگال کا مغربی علاقہ جو ہندو اکثریت پر مشتمل ہے اور پنجاب کا مشرقی حصہ جو ہندو سکھ اکثریت پر مشتمل ہے نکال دیئے جائیں تو باقی ماندہ علاقہ مجوزہ پاکستان کے علیحدہ وجود کے لئے کافی نہیں ہے۔ اتنی بات کرنے کے بعد آزاد نے کہا کہ یہ تو کانگرس کے صدر کی حیثیت سے میں نے کانگرس کا مؤقف بیان کیا ہے۔ اب میں اپنی ذاتی حیثیت میں کچھ خیالات پیش کرنا

چاہتا ہوں۔ پھر اس نے پاکستان کے خلاف یہ دلیل پیش کی کہ ''پاکستان کے قیام کے بعد باقی ماندہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان مشکل میں پھنس جائیں گے۔ وہ ہندو راج کے ماتحت آ جائیں گے۔ یو پی، جو ایک ہزار سال سے مسلمانوں کا ثقافتی مرکز رہا ہے، وہاں مسلمان صرف سترہ فیصد ہیں۔ ان کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے کوئی متبادل قوت موجود نہ ہوگی۔ چنانچہ یہ ساڑھے تین کروڑ مسلمان ایک ہندو حکومت کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وفاقی حکومت قائم ہونی چاہیے جس میں مسلمان مل کر اپنا پورا دباؤ ڈال سکیں۔ نیز صوبے بھی خود مختار ہوں۔''[10] گویا یہ بات اس نے بھی تسلیم کی کہ ہندو راج میں مسلمانوں کا کوئی مقام نہیں ہوگا۔ لیکن اسے سب سے زیادہ فکر تھی تو یو پی کے مسلمانوں کی اور ان کی ہزار سالہ ثقافت کی جس کی خاطر وہ بنگال، سندھ، بلوچستان اور سرحد کی مسلم اکثریت کو اپنی آزادی تیاگ دینے اور ہندو راج کی غلامی قبول کر لینے کی تلقین کر رہا تھا۔ مسلم اکثریت کے مطالبہ پاکستان کو رد کرتے ہوئے کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی (12 تا 15 اپریل) کے اختتام پر آزاد نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے کہا ''میں اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کی اصطلاح ہی میری طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ دنیا کے کچھ حصے پاک ہیں اور کچھ حصے ناپاک ہیں۔ پاک اور ناپاک کی یہ علاقائی تقسیم ویسے ہی غیر اسلامی ہے اور روح اسلام کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کی کسی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا پیغمبر ﷺ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔'' مزید یہ کہ پاکستان کی سکیم شکست خوردگی کی علامت ہے اور یہ بالکل اسی طرح ابھری ہے جیسے یہودی اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتراف ہوگا کہ ہندوستانی مسلمان پورے ہندوستان کی سطح پر اپنا وجود برقرار رکھنے کے قابل نہیں رہے اور اس کے ایک کونے میں محدود ہو جانا چاہتے ہیں جو ان کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہودیوں کی علیحدہ وطن کی خواہش کے ساتھ ہمدردی کی جا سکتی ہے کیونکہ وہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی علاقے میں بھی انتظامیہ میں ان کی کوئی آواز نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی صورت حال بالکل مختلف ہے۔ وہ نو کروڑ ہیں اور تعداد و معیار کے اعتبار سے ہندوستانی زندگی میں اہم عنصر کی حیثیت سے وہ پالیسی اور انتظامیہ کے تمام مسائل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں......''[11] آزاد کا یہ بیان وزارتی مشن کے

سامنے اس کے بیانات کی روشنی میں خود ہی رد ہوجاتا ہے۔ کانگرس کے متحدہ ہندوستان میں پالیسی اور انتظامیہ کے مسئلے پر مسلمان کس حد تک اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس کا اندازہ یہاں سے ہی لگایا جاسکتا ہے کہ مشن کے ارکان کے سامنے آزاد نے کانگرس کا نقطۂ نظر علیحدہ پیش کیا اور پھر مسلمانوں کا اپنی دانست میں کیس اپنی ذاتی حیثیت میں علیحدہ سے پیش کیا۔ مسلمانوں کے ''مفاد'' کے حوالے سے پاکستان کے خلاف دلیل بھی اس نے ذاتی حیثیت میں پیش کی، کانگرس کے صدر کی حیثیت سے اسے مسلمانوں کا کیس پیش کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ کانگرس کی اصل باگ ڈور گاندھی کے ہاتھ میں تھی جو ہندو بورژوا کے مفاد کی خاطر کسی دوسری قومیت کا نہ تو بطور قومیت علیحدہ وجود تسلیم کرنے پر تیار تھا اور نہ ہی کوئی رعایت دینے پر آمادہ تھا۔ آزاد سے ملاقات کے بعد اسی روز شام کو وائسرائے اور وزارتی مشن کے ارکان نے گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔

گاندھی نے ان سے کہا کہ جناح کا پاکستان ایک ایسا گناہ ہے جس کا میں کبھی ارتکاب نہیں کروں گا۔ دو قومی نظریے کے متعلق اس نے کہا کہ یہ بالکل غلط اور انتہائی خطرناک ہے۔ مسلم آبادی کے ایک قلیل حصے کو چھوڑ کر باقی تمام نومسلم ہیں اور ہندوستانی نژاد لوگوں کی اولاد ہیں۔ چنانچہ اس نے یہ مؤقف اختیار کیا یہاں نہ تو دو ملک بن سکتے ہیں اور نہ ہی دو آئین ساز ادارے وجود میں آسکتے ہیں۔ ایک ہی آئین ساز ادارہ بننا چاہیے خواہ مسلم لیگ اس کا بائیکاٹ ہی کیوں نہ کر دے۔ عبوری دور کے لیے آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے پہلے جناح کو دعوت دیں۔ وہ منتخب نمائندوں میں سے اپنی حکومت کے اراکین چن لیں جن کا سرکاری طور پر وائسرائے کی جانب سے بطور رکن ایگزیکٹو کونسل تقرری کا اعلان ہو جائے۔ اگر جناح ایسا نہ کریں تو پھر حکومت کی تشکیل کی دعوت کانگرس کو دے دی جائے۔ پیتھک لارنس نے اس سے کہا کہ مرکزی اسمبلی میں تو ہندوؤں کی اکثریت ہے، جناح کی حکومت کو اسمبلی کا اعتماد کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس حساب سے تو کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دینی پڑے گی۔ گاندھی نے کہا کہ مشن کو صورت حال کی جن مشکلات کا سامنا ہے ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔[12] مطلب یہ تھا کہ بہرصورت انگریز کانگرس کو ہی اقتدار منتقل کریں۔

4/اپریل کو مشن کے ارکان بشمول وائسرائے نے جناح کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح نے اپنا مؤقف پیش کرتے ہوئے کہا کہ چندر گپت کے زمانے سے لے کر آج تک ہندوستان

میں کبھی ایک متحدہ حکومت وجود میں نہیں آئی۔ مسلم مغل سلطنت کو اگرچہ اس کے بڑے حصے پر غلبہ حاصل تھا لیکن پھر بھی مرہٹے اور راجپوت اس میں شامل نہیں تھے۔ جب انگریز یہاں آئے تو انہوں نے بتدریج ہندوستان کے بڑے حصے پر اپنی حکمرانی قائم کی لیکن پھر بھی ایک تہائی ہندوستان کو مجتمع کر سکے۔ بڑی ریاستیں اور خودمختار ریاستیں تو اب بھی آئینی اور قانونی لحاظ سے گویا پاکستان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعداد میں ہندوستان کئی ہیں جن کو انگریزوں نے یکجا کر کے رکھا ہوا ہے۔ ہندوستان کے اندر موجود اختلافات یورپ کے ملکوں کے مابین اختلافات کے مقابلے میں کہیں زیادہ گہرے اور بنیادی ہیں۔ آئرلینڈ بھی اس کی مثال نہیں ہے۔ مسلمانوں کا نظریۂ زندگی ہندوؤں سے بالکل جداگانہ ہے۔ وہ اپنے ہیرو مختلف صفات کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی ثقافت مختلف ہے جو کہ عربی و فارسی پر مبنی ہے نہ کہ سنسکرت پر۔ ان کے رہن سہن کے طریقے الگ الگ ہیں ایک ہندو مسلمان کے ساتھ ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ دھوتا ہے۔ کوئی ہندو مسلمان کو اپنی بلڈنگ میں کمرہ دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہندو معاشرہ اور فلسفہ دنیا سے الگ تھلگ واقع ہوا ہے۔ مسلمان اور ہندو گزشتہ ہزار سال سے ہندوستان میں رہ رہے ہیں لیکن اگر آپ ہندوستان کے کسی شہر میں جائیں تو آپ کو ان کے گھر الگ الگ نظر آئیں گے۔ ان کے نام الگ ہیں۔ ان کے کیلنڈر جدا ہیں۔ ہندو گائے کو پوجتے ہیں اور اب بھی بعض ریاستوں میں گائے کے ذبیحہ پر دس سال قید کی سزا کا حکم نافذ ہے۔ مشترکہ عوامل کے بغیر کوئی قوم وجود میں نہیں آ سکتی۔ آپ کس طرح دس کروڑ مسلمانوں اور پچیس کروڑ ہندوؤں کو اکٹھا رکھ سکتے ہیں جب کہ ان کا طرز زندگی بالکل جدا ہے۔ یہاں کوئی حکومت نہیں چل سکے گی اور اگر کوئی حکومت ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو انجام تباہی ہوگا۔ کوئی حکومت چلانے کے لیے ایک ایسے غالب عنصر کی ضرورت ہوتی ہے جو مؤثر ''فولادی فریم'' مہیا کر سکے۔ اس وقت یہ فریم انگریزوں نے مہیا کر رکھا ہے جو تمام کلیدی آسامیوں پر تعینات ہیں۔ انگریز سول سروس، پولیس اور فوج میں کلیدی آسامیوں پر انگریزوں کو تعینات کیے بغیر کبھی بھی انتظامیہ نہیں چلا سکتے تھے۔ ان آسامیوں پر ہندوستانیوں کی تقرری کے معاملے میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ اس میں رکاوٹ پہلے ہی پیدا ہو چکی ہے۔ جہاں کہیں ہندو تعینات ہیں وہ ہندوؤں سے اور جہاں مسلمان تعینات ہیں وہ مسلمانوں سے ہمدردی اور لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ کو

آزاد ہندوستان کے لیے بھی ایک ''فولادی فریم'' درکار ہوگا۔ مجھے متحدہ ہندوستان میں ایسا کوئی فریم نظر نہیں آتا۔ سالہا سال کے تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ہر حصے میں ایک غالب فرقہ موجود ہو جو وہاں ''فولادی فریم'' مہیا کر سکے۔ اگر تین مسلمانوں اور ایک ہندو کا تناسب کہیں موجود ہو تو وہاں ''فولادی فریم'' مہیا ہو جاتا ہے۔ اگر ''فولادی فریم'' موجود نہ ہو تو پھر سول سروس، پولیس اور فوج، نہ تو کابینہ کی وفادار رہتی ہیں اور نہ ہی اسمبلی کی۔ اس طرح ریاست کی بقا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ خوش قسمتی سے ہند میں مسلمانوں کے اپنے وطن موجود ہیں اس لیے اسے تقسیم کر ڈالنا چاہیے۔ ہندوستان کا اپنا فولادی فریم ہوگا اور پاکستان کا اپنا۔ اس موقع پر وائسرائے ویول نے جناح کو یاد دلایا کہ ایک مرتبہ انہوں نے اس امر سے اتفاق کر لیا تھا کہ عملی معاشی وجوہات کے پیش نظر اگر ممکن ہو تو ایک متحدہ ہندوستان کا وجود خوش آئند ہے۔ جناح نے کہا غالباً میں نے کہا ہوگا کہ اگر ایسا ہو تو یہ ایک آئیڈیل بات ہوگی لیکن یہ اتنا ہی ناقابل عمل آئیڈیل ہے جتنا کہ عالمی وفاق کا قیام۔ سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ یورپ کا وفاق تو اس سے مختلف ہے۔ وہاں خودمختار ریاستیں ایک دوسرے کے قریب آ رہی ہیں۔ جب کہ ہندوستان میں تو حکومتی ادارے پہلے ہی سے موجود ہیں۔ جناح نے کہا کہ یہ اتحاد عوام کا اتحاد نہیں ہے، اسے برطانوی حکومت نے مسلط کیا ہوا ہے۔ تاہم جناح نے کہا کہ پاکستان اور ہندوستان وجود میں آنے کے بعد بالکل الگ تھلگ نہیں ہوں گے۔ ان کے مابین معاہدے اور سمجھوتے طے پائیں گے۔ ایک مرتبہ پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ معاملات طے ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد جناح اور مشن کے ارکان کے مابین دفاع اور داخلی سلامتی کے حوالے سے ہندوستان کے اتحاد یا تقسیم پر بحث ہوئی۔ مشن کے ارکان کا اصرار تھا کہ کم از کم دفاع اور امور خارجہ ضرور مشترکہ رہنے چاہئیں۔ جن کے لیے مشترکہ سیکرٹریٹ ہو اور مشترکہ جائنٹ چیفس آف سٹاف ہو۔ جناح نے کہا کہ یہ تو طے شدہ بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ دفاعی نظام ہونا چاہیے لیکن وہ کسی ایسے نظام کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے جس سے پاکستان کی خودمختاری پر حرف آتا ہو۔ دفاعی معاہدہ ہو سکتا ہے۔ خارجہ پالیسی پر باہم صلاح و مشورہ ہو سکتا ہے۔ مواصلات کا نظام بھی طے ہو سکتا ہے۔ آخر میں وائسرائے اور مشن کے ارکان نے جناح سے پاکستان کی حد بندی کے متعلق سوالات کیے۔ جناح

نے پانچ صوبوں کا مطالبہ کیا۔ تاہم انہوں نے کہا کہ ان کی سرحدوں میں تھوڑا بہت ردوبدل ہوسکتا ہے۔ ''میں ہندوؤں کو ان کی مرضی کے خلاف پاکستان میں شامل کئے جانے پر مجبور نہیں کر رہا ہوں۔ لیکن اس کی سرحدوں میں اتنی وسعت ضرور ہو کہ یہ ملک معاشی اعتبار سے زندہ رہنے کے قابل ہو۔'' اس کے لیے جناح نے کلکتہ کی بندرگاہ کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ اگرچہ ہندو اکثریت کا شہر ہے لیکن آپ محض سروں کی گنتی نہ کریں، یہ بھی دیکھیں کہ معاشی زندگی سے اس کا کتنا گہرا تعلق ہے۔ کلکتہ کے بغیر پاکستان ایسے ہی ہے جیسے کسی کو دل کے بغیر زندہ رہنے کے لیے کہا جائے۔'' مشن نے تجویز کیا کہ کلکتہ کو آزاد بندرگاہ کا درجہ بھی دیا جاسکتا ہے جہاں سے دونوں ملکوں کی درآمد و برآمد بغیر ڈیوٹی کے ہوسکتی ہے۔ جناح نے اس تجویز کو رد کر دیا۔[13]

جناح کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے آر۔ سی موجمدار نے لکھا ہے کہ ''اس سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں جناح کی تشخیص بڑی حد تک سچائی پر مبنی تھی...... جناح کا نقطۂ نظر بہرصورت گاندھی یا نہرو کے مقابلے میں کہیں زیادہ حقیقت پسندانہ تھا۔ صرف ایک اختلافی نکتہ جس سے جناح ہمیشہ عقل مندی اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے کترا جاتا تھا، یہ تھا کہ آیا ہندوستان کی جغرافیائی وحدت کے پیش نظر یا اس حقیقت کے پیش نظر کہ اگر پاکستان بن گیا تب بھی بڑی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اسی ملک میں مل کر رہنا پڑے گا جہاں وہ اب رہ رہے ہیں، کیا ایک پرخلوص کوشش نہیں ہونی چاہیے کہ دونوں قومیں باہمی رضامندی سے طے کردہ آئین کے تحت ایک ہی حکومت کے اندر رہنے لگیں؟ اگر کینیڈا جہاں انگریزوں اور فرانسیسیوں جیسی باہم متحارب اقوام اور سوئٹیزرلینڈ جو تین مختلف اقوام کا مصنوعی اتحاد ہے، سیاسی یکجہتی کا فارمولا وضع کر سکتے ہیں تو پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کے معاملے میں یہ کیوں لازم ہو گیا ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے جب کہ وہ کم وبیش سات سو برس سے ایک ہی ملک کی قدرتی حدود میں مل کر رہ رہے ہیں؟ نہ تو جناح نے اور نہ ہی کانگرس کی اعلیٰ قیادت یعنی گاندھی اور جواہر لعل نہرو نے اس سوال کا ایمانداری سے سامنا کیا۔ اس سوال کو اٹھانا جناح کے تو مفاد ہی میں نہیں تھا اور کانگرسی رہنماؤں نے اس سوال کو ویسے ہی خارج کر دیا تھا کیونکہ وہ دوقومی نظریئے کی سچائی کو مانتے ہی نہیں تھے۔ یہی بڑی وجہ تھی کہ ماضی میں (اور مستقبل میں بھی) ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کی تمام کوشش ناکام ہوئیں۔''[14] جناح کے مذکورہ بیان پر موجمدار کا یہ تبصرہ جو کہ ایک

لبرل بنگالی ہندو مؤرخ ہے اسی خلوص کی روایت پر مبنی ہے جو دوسرے اور تیسرے عشرے کے دوران بنگال کے ایک عظیم محب وطن رہنما سی۔آر۔ داس نے مسلمانوں کے علیحدہ قومی وجود کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں بے شمار رعائتیں دینے کا اعلان کر کے قائم کی تھی۔

5/اپریل کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے سکھ رہنماؤں کے ساتھ ملاقات کی۔ ان میں اکالی رہنماؤں ماسٹر تارا سنگھ، سردار گیانی کرتار سنگھ اور سردار ہرنام سنگھ نے اکٹھے ملاقات کی جب کہ سردار بلدیو سنگھ نے علیحدہ ملاقات کی جو اس وقت پنجاب کی یونینسٹ۔ کانگرس۔ سکھ کولیشن حکومت میں وزیر ترقیات تھا۔ ان تمام کا مؤقف پاکستان کے خلاف تھا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ ہم متحدہ ہندوستان چاہتے ہیں لیکن اگر پاکستان کو تسلیم کر لیا گیا تو پھر علیحدہ سکھ ریاست بھی قائم ہونی چاہیے جسے پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی کے ساتھ الحاق کا اختیار حاصل ہو۔ کرتار سنگھ نے اسی بات کو سکھوں کے علیحدہ صوبے کی صورت میں پیش کیا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ اس صوبے میں کن علاقوں کو شامل کرتا ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ اس میں لاہور ڈویژن اور جالندھر ڈویژن اور ان کے ہمراہ انبالہ ڈویژن کے اضلاع حصار، کرنال اور شملہ، علاوہ ازیں منٹگمری اور لائل پور کے اضلاع شامل ہوں گے۔ ہرنام سنگھ نے اعداد وشمار کی مدد سے ثابت کیا کہ پنجاب کے وسطی اضلاع میں اگرچہ مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن زمین کی مال گزاری کا بڑا حصہ سکھوں کی جانب سے ادا کیا جاتا ہے اس لیے ان اضلاع پر سکھوں کا حق ہے۔ اس نے کہا کہ ہند کی تقسیم ہماری مرضی کے خلاف ہوگی اور اس صورت میں ہمارے پاس سکھ ریاست کے سوا اور کوئی تحفظ باقی نہیں رہے گا۔ اس نے بعض اضلاع کی مثالیں دے کر یہ الزام بھی عائد کیا کہ 1941ء کی مردم شماری میں بوگس اندراجات کے ذریعے مسلمانوں کی آبادی کو زیادہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہاں بہت سے مسلمان کشمیر سے اور پشتو بولنے والے علاقوں سے بھی آ کر آباد ہوئے ہیں۔ اس لیے اس کے بقول ''آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں کے مطالبے میں کوئی جان نہیں ہے اور سارا مطالبہ پاکستان ہی مشکوک ہے۔'' بلدیو سنگھ نے کہا کہ اگر پنجاب کو تقسیم کیا گیا تو سکھوں کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔ جب اس سے خالصتان کی حدود کے بارے میں دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس میں ملتان اور راولپنڈی ڈویژن چھوڑ کر سارا پنجاب شامل ہے اور دریائے چناب کے ساتھ اس کے سرحد بنتی ہے۔ تاہم

بلدیو سنگھ نے کہا کہ ہم پوری شدومد سے متحدہ ہندوستان کے حامی ہیں۔ ہند کی تقسیم کو غیر دانشمندانہ تصور کرتے ہیں۔ سرحدوں پر واقع چھوٹی ریاستیں بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر ہوں گی اور ہند کے لیے خطرہ ثابت ہوں گی۔ اس کی رائے میں بہترین حل متحدہ ہندوستان ہی ہے جس میں مجالس ہائے قانون ساز میں فرقہ وارانہ تناسب سے ویٹیج دے کر اقلیتوں کو تحفظات فراہم کر دیئے جائیں۔ اس نے مزید کہا کہ تقسیم ہند کی صورت میں پاکستانی فوج میں سکھ خود کو محفوظ نہیں سمجھیں گے۔ منقسم ہندوستان میں کوئی بااعتماد فوج نہیں بن سکے گی۔ ہم جناح کے وعدوں پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ پاکستان لینے کی خاطر وہ ہم سے ہر وعدہ کر لے گا لیکن اقتدار میں آنے کے بعد یقین نہیں کہ ان وعدوں کا پاس کیا جائے گا۔[15] اس طرح ان سکھ رہنماؤں نے علیحدہ سکھ ریاست کے مطالبے پر زیادہ زور دینے کے بجائے اپنا سارا زور پاکستان اور تقسیم ہند کے خلاف صرف کر دیا۔ وہ ہندوستان کے دو یا زیادہ حصوں میں منقسم ہونے کے بجائے متحدہ ہندوستان کے حق میں وکالت کرتے رہے۔ وزارتی مشن کے ساتھ سکھ رہنماؤں کی ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے خشونت سنگھ لکھتا ہے کہ ''جس انداز میں سکھ نمائندوں نے سکھ ریاست کے مطالبے کو بیان کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ لازمی طور پر اس کے حصول کے خواہاں ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پاکستان کے خلاف دلیل میں ایک نکتے کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح اس مطالبے کو سنجیدگی سے زیرِ غور لانے کا موقع ہاتھ سے گنوا دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزارتی مشن کے ارکان نے سکھستان یا آزاد پنجاب یا خالصتان کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا اور اس تصور کو اور سکھوں کے لیے ویٹیج کے فزوں تر مطالبے کو انہوں نے یہی سمجھا کہ اسے (انڈین نیشنل کانگرس کی طرف سے) مسلم امنگوں کی راہ میں مزاحم ہونے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔''[16]

دو متبادل حل (ا) متحدہ ہندوستان (ب) کٹا پھٹا پاکستان

وزارتی مشن نے کانگرس، مسلم لیگ اور سکھوں کا مؤقف معلوم کرنے کے بعد اچھوتوں کے نمائندوں اور رائے عامہ کے بعض لبرل رہنماؤں کے ساتھ بھی ملاقاتیں کیں۔ تمام فریقین کے مطالبوں کو پیش نظر رکھ کر 8/اپریل کو سیٹفورڈ کرپس نے ایک مسودہ مرتب کیا جس میں دو متبادل حل تجویز کئے گئے تھے۔ پہلے متبادل (الف) کے طور پر جو خاکہ وضع کیا گیا اس کے

مطابق ایک ''یونین آف آل انڈیا'' تجویز کی گئی جس کے اندر الگ الگ حصے وسیع تر علاقائی اور مقامی خودمختاری کے حامل قرار دیئے گئے۔ ان میں تین حصے رکھے گئے تھے۔ ایک ہندو اکثریت کا، دوسرا مسلم اکثریت کا اور تیسرا ریاستوں کا۔ تینوں پر مشتمل یونین گورنمنٹ میں دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکموں کو لازمی حیثیت دی گئی جب کہ باقی محکموں کو اختیاری قرار دیا گیا تھا۔ یونین گورنمنٹ میں تینوں حصوں کے برابر تعداد میں نمائندے رکھے گئے۔ طریق کار یہ تجویز کیا گیا کہ پہلے ہر حصے کے نمائندے اپنے الگ اجلاس منعقد کر کے اپنے گروپ کا آئین تشکیل دیں۔ اس کے بعد تینوں گروپوں کے نمائندوں کا مشترکہ اجلاس گرینڈ آئین ساز اسمبلی برائے یونین آف آل انڈیا کے نام سے منعقد کیا جائے جس میں یونین گورنمنٹ کی ہیئت کے بارے میں فیصلہ کیا جائے اور مجموعی طور پر آئین کی منظوری دی جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس اسمبلی کو تینوں الگ الگ اسمبلیوں کے فیصلوں میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح ایک متحدہ ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کیا گیا تھا۔ دوسرے متبادل (ب) میں برطانوی ہند کو دو حصوں یعنی ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کر دیا گیا۔ ریاستوں کو ان دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنے کا اختیار دیا گیا۔ پاکستان کی بنیاد مسلم اکثریت کے اضلاع پر رکھی گئی۔ شمال مغرب میں سندھ، بلوچستان اور سرحد کے تمام اضلاع مسلم اکثریت کے تھے اس لیے یہ صوبے پورے کے پورے پاکستان میں شامل کر دیئے گئے۔ پنجاب کے انبالہ اور جالندھر ڈویژن غیر مسلم اکثریت کی بنا پر ہندوستان میں شامل کر دیئے گئے۔ لاہور ڈویژن میں سے ضلع امرتسر جو غیر مسلم اکثریت کا ضلع تھا اور ضلع گورداسپور جہاں اکاون فیصد مسلم آبادی تھی کہا گیا کہ سکھوں کو فریق بنا کر اس پر کوئی سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں باؤنڈری کمیشن کی تجویز پیش کی گئی۔ لاہور ڈویژن کے باقی اضلاع یعنی سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لاہور اور شیخوپورہ کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ علاوہ ازیں ملتان اور راولپنڈی ڈویژن مکمل طور پر پاکستان میں شامل کیے گئے تھے۔ مشرقی حصہ میں صوبہ آسام سے صرف ضلع سلہٹ کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ مغربی بنگال کا ہندو اکثریت کا علاقہ ہندوستان کو اور مشرقی بنگال کا مسلم اکثریت کا علاقہ پاکستان کو دیا گیا تھا۔ اب جھگڑا کلکتہ کا تھا جس کے بغیر مشرقی پاکستان کا تصور محال تھا۔ یہ غیر مسلم اکثریت کا

شہر تھا اس لیے اس کا فیصلہ فریقین کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا۔کلکتہ کے متعلق فیصلہ نہ ہو سکنے کی صورت میں ایک تیسری بیرونی اتھارٹی (یعنی انگریزوں) پر چھوڑا گیا کہ وہ ان تین صورتوں میں کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے گی:

1۔ مشرقی پاکستان میں شامل کیا جائے۔

2۔ ہندوستان میں شامل کیا جائے۔

3۔ آزاد علاقہ قرار دیا جائے جس پر پاکستان اور ہندوستان کا مشترکہ کنٹرول اور مشترکہ انتظامیہ ہو۔

پاکستان کی سرحدوں کے تعین کی تفصیل بیان کرنے کے بعد مسودے میں کہا گیا کہ تقسیم ہند کی صورت میں اس کے دفاع کے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ دونوں ملکوں کے مابین ایک معاہدہ طے پانا از حد ضروری ہوگا کہ جس میں مواصلات، دفاع اور امور خارجہ شامل ہوں۔ اس معاہدہ کو تقسیم ہند کے ساتھ مشروط کرنا ہوگا اور اس کے بارے میں پہلے سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اس قسم کا دفاعی معاہدہ اس وقت تک عملاً کارآمد نہیں ہوسکتا جب تک کوئی مشترکہ نظام نہ وضع کیا جائے جو مشترکہ دفاع کے حقیقی منصوبوں پر عملدرآمد کروانے اور ضرورت پڑنے پر دفاع کرنے کا کام انجام دے سکے۔ چنانچہ مذکورہ معاہدہ میں اس نظام کو وضع کرنے کی شق کو شامل کرنا ہوگا جس کی مدد سے دوران امن مشترکہ فیصلے اور منصوبہ بندی ہو سکے اور دوران جنگ مشترکہ اقدام اٹھایا جا سکے [17] کرپس کے اس مسودے پر وزارتی مشن کے ایک دوسرے رکن اے۔ وی الیگزنیڈر نے اپنے نوٹ میں لکھا کہ ہند اور بحر ہند کے علاقے کے دفاع کا خاطر خواہ بندوبست ہونا ضروری ہے۔ اس نے ہند کے چیفس آف سٹاف کی ایک رپورٹ کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کو خواہ کتنا ہی وسیع علاقہ کیوں نہ دے دیا جائے۔ بیرونی دفاع کے اعتبار سے یہ ملک ناقابل عمل ثابت ہوگا۔ چنانچہ اس نے لکھا کہ مذکورہ دوسرے متبادل میں بہت محدود قسم کے پاکستان کی اجازت دی جاسکتی ہے۔[18] گویا مشن نے تمام فریقین کے مؤقف سننے کے بعد ہندوستان کے مستقبل کے متعلق جو دو متبادل حل تجویز کئے، ان کے مطابق پہلی ترجیح تو یہ تھی کہ برصغیر کی وحدت کو ایک ملک کی صورت میں قائم رکھا جائے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو کم از کم دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کو ضرور مشترکہ رکھا

جائے۔ اس سے برطانوی سامراج کا مقصد سوویت یونین کے گرد حصار میں برصغیر کو ایک مضبوط بُرج کے طور پر برقرار رکھنا تھا۔

عالمی سطح پر اینگلو امریکی بلاک نے سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کا آغاز کر دیا ہوا تھا۔ وزارتی مشن کے عازم ہندوستان ہونے سے پہلے ہی 5 / مارچ کو برطانوی جنگ باز رہنما ونسٹن چرچل امریکہ میں فولٹن کے مقام پر صدر ٹرومین کی موجودگی میں سوویت یونین کے خلاف ٹکراؤ اور مخاصمت کا کھلا اعلان کر چکا تھا۔ ان حالات میں ہندوستان کی تقسیم کی تجویز جس کے نتیجے میں افواج کی تقسیم ناگزیر تھی، انگریزوں کے لیے کسی صورت قابل قبول نہیں تھی۔ تاہم مشن کے ساتھ اپنے انٹرویو میں جناح نے آزاد ملکوں کی حیثیت سے ہندوستان اور پاکستان کے مابین مشترکہ دفاع کے معاہدوں کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔ اس بنیاد پر مشن کے دو معاونین سر ڈبلیو کرافٹ اور ایف۔ ٹرنبل نے اس مشترکہ دفاع کا خاکہ تیار کیا۔ اس میں تجویز کیا گیا تھا کہ کسی بھی تیسرے فریق کے خلاف دونوں ملکوں کے باہمی دفاع کے لیے ایک چار رکنی کونسل تشکیل دی جائے گی جس میں دونوں ملکوں کے دو دو نمائندے ہوں گے۔ کونسل کا صدر ان کے علاوہ ہوگا جو ایک ایک سال کے لیے علی الترتیب دونوں ملکوں سے بنایا جائے گا۔ دونوں ملک اپنی فوجوں کی تعداد مشترکہ ضروریات کے پیش نظر طے کریں گے۔ دونوں ملکوں کی افواج کو ملا کر ان میں سے تین قابل ترین افراد کو چیفس آف سٹاف مقرر کیا جائے گا۔ دونوں ملکوں کے الگ الگ جنرل آفیسرز کمانڈنگ ہوں گے جن کے اوپر کمانڈر ان چیف ہوگا۔ جو دونوں افواج کو کنٹرول کر سکے گا۔ خارجہ امور کے لیے بھی مذکورہ بالا کونسل ہی ذمہ دار ہوگی۔ مواصلات کے لیے کل ہند سطح پر ایک کارپوریشن وضع کر دی جائے گی۔

اس خاکے کے ہمراہ ڈبلیو کرافٹ اور ٹرنبل نے مشن کے لیے ایک نوٹ بھی منسلک کیا۔ اس میں انہوں نے مشترکہ دفاع کی تجویز کے قابل عمل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں جائزہ لیا اور ثابت کیا کہ دونوں حکومتوں کے مابین ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ انہوں نے کہا کہ مثال کے طور پر شمال مغربی سرحد پر افغانستان کی جانب سے حملہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کا فیصلہ حکومت پاکستان کی جانب سے ہوگا۔ تاہم اگر یہ صورت حال ایک مقامی مسئلے سے بڑی نوعیت کی ہوئی تو پھر بلاشبہ ہندوستان کی صلاح بھی لی جائے گی۔ اب یہ تو درست ہے

کہ برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک کے مابین اسی قسم کے تعلقات پائے جاتے ہیں۔ مگر جناح جس مفروضہ پر پاکستان کا جواز پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہم آہنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس امر کی کوئی یقین دہانی حاصل نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اور پاکستان باہمی مفاہمت کے ساتھ خارجہ امور کا کاروبار چلا سکیں گے اور خاص طور پر ان حالات میں کہ پاکستان کا رجحان مشرق وسطیٰ کے مسلمان ملکوں کی جانب دوستی استوار کرنے کا ہوگا جب کہ ہندوستان کا رجحان روس اور چین کی جانب اور انڈونیشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کی برطانوی نوآبادیات کے قوم پرست عناصر کی حمایت میں ہوگا۔ چنانچہ دو خود مختار حکومتوں کی حیثیت سے کسی درپیش صورت حال میں ان کا ایک دوسرے کی رضامندی حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ اس کی یہی صورت ممکن ہے کہ معاہدے کے مطابق دونوں ملکوں کے مابین ایک ایسا نظام (مشینری) وضع کیا جائے جو خود فیصلے کر سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مذکورہ خاکے میں جو کونسل تجویز کی ہے وہ بااختیار ہونی چاہیے۔ وہ نہ صرف دفاع کے بارے میں اختیار رکھتی ہو بلکہ خارجہ امور کے سلسلے میں بھی بااختیار ادارہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ شمال مغربی سرحد پر مسئلے کی ابتدا ایک عام گڑبڑ سے ہو جسے امن عامہ کا مسئلہ سمجھا جائے لیکن پھر جلد ہی وہ بڑھ کر خارجی امور کا مسئلہ بن جائے۔ اگر روسی افغانستان میں گھس آئیں اور افغانوں کو قبائلی شورش کے لیے اکسائیں تو پھر یہ مرکزی ادارہ اسی صورت میں مؤثر کردار ادا کر سکے گا کہ اسے امور خارجہ میں بھی بااختیار بنایا جائے۔ انہوں نے دو ملکوں کی تقسیم کی صورت میں برطانوی حکومت کے اس علاقے کے دفاع میں کردار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ ''عام خیال پایا جاتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی اپنے بیرونی دفاع کے معاملے میں برطانوی حکومت سے امداد کے طلب گار ہوں گے۔ لیکن ہندوستان کے لیے یہ بات کہنا غلط فہمی ہوگی۔ کئی برس سے برطانوی دولت مشترکہ اور ہندوستان کے درمیان سیلون، برما، ملایا اور انڈونیشیا کے مسائل اور مشرقی اور جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے مسائل پر اختلافات رہے ہیں۔ ہندوستان میں بعض طاقتور عناصر روس کی جانب دیکھتے ہیں اس لیے یہ یقین کر لینا بے حد مشکل ہوگا کہ روس کے ساتھ ٹکراؤ کی صورت میں ہندوستان آیا برطانوی دولت مشترکہ کا ساتھ دے گا یا غیر جانب دار رہے گا یا روس نواز ہو جائے گا۔ اس لیے برطانیہ کے چیفس آف سٹاف کو پاکستان کے

معاملے کا جائزہ صرف اس مفروضے پرنہیں لینا چاہیے کہ ہندوستان صرف مجموعی حیثیت میں ہی حق (یعنی برطانیہ) کا ساتھ دے گا۔ بلکہ متبادل مفروضہ یہ بھی ہونا چاہیے کہ پاکستان کے رویے کا تو ہمیں معقول حد تک یقین ہے جب کہ ہندوستان کے بارے میں امکان ہے کہ اس کا رویہ معاندانہ ہو گا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس علاقے میں ہمارے دفاعی مفادات پاکستان کے ساتھ قریبی فوجی تعلقات کے ذریعے پورے ہو سکتے ہیں جو اگرچہ اپنی اصل میں ایک غیر پسندیدہ شے ہے لیکن کم از کم ہم اس پر کچھ انحصار تو کر سکتے ہیں۔ بہ نسبت اس کے کہ کل ہند کے ساتھ یہ تعلقات استوار کئے جائیں جس کا غالب رجحان غیر جانبداری یا مخالفت کی جانب پایا جاتا ہے۔''[19]

یاد رہے کہ برطانوی چیفس آف سٹاف کی جانب سے وزارتی مشن کو جو تجویز دی گئی تھی اس میں تقسیم ہند کی مخالفت کی گئی تھی۔ ڈبلیو کرافٹ اور ٹرنبل کے مذکورہ نوٹ میں پاکستان کو ناپسندیدہ شے قرار دینے کے باوجود پہلی مرتبہ اس کے وجود میں آنے کو برطانوی مفادات کے حوالے سے جائز قرار دینے کی گنجائش پیدا کی گئی اور یہ بھی اس صورت میں جب کہ متحدہ ہندوستان کو برقرار رکھنے یا پاکستان و ہندوستان کے مابین مشترکہ دفاع کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جائیں، جس کا خاکہ بنا کر انہوں نے وزارتی مشن کو پیش کیا تھا۔ اس کے ہمراہ منسلک نوٹ میں انہوں نے برطانیہ کے لیے ہندوستان کی نسبت پاکستان کو زیادہ بااعتماد دوست ثابت کرنے کی جو کوشش کی، وزارتی مشن کے ارکان نے اسے کوئی اہمیت نہ دی اور بدستور ایک متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے ہندو مسلم مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش میں لگے رہے۔ تاہم مذکورہ نوٹ سے یہ ایک بار پھر واضح ہوا کہ برطانوی سامراج برصغیر کا جو حل بھی کرنا چاہتا تھا اس کا محور شمال سے سوویت یونین کا خطرہ تھا۔ اس حوالے سے برصغیر کے اتحاد یا تقسیم کے مابین موازنہ کرتے ہوئے اب بھی وہ اتحاد کے پلڑے میں زیادہ وزن ڈالتے تھے اور تمام تر کوششیں اسی کے لیے کی جا رہی تھیں۔

10 اپریل کو مشن کے ارکان اور ان کے معاونین اور وائسرائے کے اجلاس کے دوران ڈبلیو کرافٹ نے مذکورہ نوٹ میں تحریر کردہ اپنا نقطۂ نظر وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سیٹفورڈ کرپس کے مسودے میں تجویز کردہ متبادل ''ب'' جس میں تقسیم ہند اور

پاکستان و ہندوستان کی تشکیل کا منصوبہ پیش کیا گیا ہے، دفاعی لحاظ سے ایک نا قابل عمل متبادل ہے۔ وائسرائے ویول نے بھی اس کی تائید کی۔ کافی بحث مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ متبادل ''الف'' اور ''ب'' کو دونوں بڑی پارٹیوں کے سامنے پیش کرنے کے بارے میں حکومت برطانیہ سے دریافت کیا جائے کہ پوری کابینہ کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے؟ چنانچہ 11/اپریل کو وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے ایک مراسلہ وزیراعظم ایٹلی کے نام روانہ کیا گیا جس میں کرپس کے مسودے میں تجویز کردہ دونوں متبادل یعنی سکیم الف جو متحدہ ہندوستان پر مبنی تھی اور سکیم ب جو منقسم ہندوستان یعنی پاکستان و ہندوستان کی تخلیق پر مبنی تھی، بیان کی گئیں اور کہا گیا کہ ''تمام فریقین کے ساتھ ملاقاتیں کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تصفیے کی یہی دو صورتیں ہیں جو ممکن ہوسکتی ہیں۔ مراسلے میں کہا گیا کہ چونکہ ہمیں دی گئی ہدایت میں کہا گیا تھا کہ جو بھی تصفیہ ہو اس میں دفاع ہند کو مناسب طور پر ملحوظ رکھا جائے۔ سکیم ب میں دفاع مؤثر نہیں ہوگا اور نہ ہی خارجہ امور پر کوئی مشترکہ کنٹرول رہ سکے گا اس لیے ہم آپ سے پوچھ رہے ہیں کہ سکیم ب پر فریقین کو سمجھوتہ کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی جائے یا نہیں کیونکہ اگر وہ اس سکیم پر متفق ہو گئے تو ہم بھی اس کے پابند ہو جائیں گے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ہندوستان میں افراتفری پھیلنے کا خدشہ موجود رہے گا اور دفاع کی کوئی بھی سکیم کارآمد نہیں ہو سکے گی۔ اس لیے اگر سکیم ب ہی تصفیے کا واحد راستہ نظر آئے تو پھر امید ہے کہ اسے طے کرانے پر آپ ہم سے اتفاق کریں گے۔ ویسے ہم اپنی طرف سے سکیم الف کے خطوط پر سمجھوتہ کروانے کی بھرپور کوشش کریں گے لیکن یہ ممکن ہوتا نظر نہیں آتا۔''[20]

11/اپریل کو برطانوی کابینہ نے اپنے اجلاس میں اس مسئلے پر غور کے بعد بادل نخواستہ وزارتی مشن کی مذکورہ رائے کے ساتھ اتفاق کرلیا اور 13/اپریل کو وزارتی وفد کے نام ایک مراسلے میں وزیراعظم ایٹلی نے لکھا کہ ''ایک ڈھیلی ڈھالی آل انڈیا فیڈریشن پر مبنی تصفیہ سکیم ب کی نسبت کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔ اگرچہ ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس تصفیے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ سکیم ب والا متبادل اپنی تمام خامیوں کے باوجود جو کہ ذیل میں گنوائی گئی ہیں بالکل کوئی تصفیہ نہ ہونے کی صورت سے بہرحال بہتر ہوگا ورنہ وسیع پیمانے پر گڑبڑ اور انتشار پھیلنے کا خطرہ ہے سکیم ب کی خامیاں مندرجہ ذیل ہیں۔ پاکستان ہندوستان کے دروازوں پر واقع ہوگا۔

مغرب میں پشاور سے سمندر تک اور مشرق میں ہمالیہ سے سمندر تک ہندوستان کی جانب راہ کھولنے یا بند کرنے کی ذمہ داری اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ ہندوستان پر جن ہوائی اڈوں سے حملہ کیا جائے گا وہ سوویت وسط ایشیا اور مغربی چین میں واقع ہیں۔ ہندوستان کے مغرب اور مشرق میں ان اڈوں سے ہندوستان کے بڑے شہروں تک پہنچنے کے لیے قریب ترین اور آسان ترین راستے پاکستان کے علاقوں کے اوپر سے ہو کر گزرتے ہیں۔ اسی طرح جوابی اقدام کے لیے بنائے گئے ہوائی اڈے بھی زیادہ تر پاکستان ہی میں واقع ہوں گے چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے دفاع کے لیے پاکستان کا علاقہ بے حد اہمیت کا حامل ہوگا۔

''سکیم ب ہندوستانی فوج کی ہم آہنگی کو تباہ کر دے گی جو اس وقت کل ہند کے دفاع کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری طرح مضبوط اور کیل کانٹے سے لیس ہے۔ اس سکیم کے نتیجے میں ایک پاکستانی فوج بن جائے گی، ایک ہندوستانی فوج بن جائے گی اور بہت سی ہندوستانی ریاستوں کی اپنی اپنی فوجیں علیحدہ ہوں گی۔ ان میں سے ہر ایک کمزور ہو گی۔ ہر ایک کا اپنا تربیتی معیار ہوگا۔ ہر ایک کے پاس موجود ہتھیاروں کی نوعیت مختلف ہوگی اور ہر ایک کا جنگی حکمت عملی کا نظریہ جدا ہوگا۔ اگر یہ دفاع ہند کے لیے اشتراک بھی کریں گے تو ان کے مابین ہم آہنگی کا فقدان ہوگا تا آنکہ یہ تمام کسی ایک مرکزی اتھارٹی کے زیر ہدایت کام کرنے پر تیار ہوں۔

''مؤثر نقل و حمل کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے مابین مواصلات کے نظام میں تعاون درکار ہوگا کہ وہ اسی مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک مرکزی کنٹرول کی ضرورت ہوگی۔

''پاکستان کے اندر صنعتی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کراچی ایک طویل اور غیر محفوظ ریلوے لائن کے دوسرے سرے پر واقع ہے۔ اسی طرح چٹا گانگ بھی غیر محفوظ حالت میں ہے۔ جنگ لڑنے کے لیے پاکستان کو ہندوستان سے بعض جنگی پرزوں کے حصول اور بعض پرزوں کی درآمد اور ان کی نقل و حمل کے لیے ہندوستان پر انحصار کرنا پڑے گا۔ ایک مرکزی اتھارٹی کے بغیر یہ ممکن نہیں ہوگا۔

''پاکستان بننے کی صورت میں اس کا مغربی حصہ اپنے تعلقات میں زیادہ تر اتحاد

ہندوستان کے بجائے مشرق وسطیٰ کے مسلمان ممالک کے ساتھ قائم کرے گا خواہ یہ ملک کتنے ہی کمزور، غیر مستحکم اور غیر محفوظ کیوں نہ ہوں۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ پاکستان خود کو بعض ایسی جنگوں میں ملوث کرلے جو نہ تو ہندوستان اور نہ ہی کل برصغیر کے لیے کسی اہمیت کی حامل ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کے خوف سے برصغیر کے اہم مقامات کو خطرے سے دوچار کردے اور وہ پہاڑی ہندوستانی سرحد کے قدرتی میدان جنگ میں مزاحمت نہ کر سکے۔

''مختصراً یہ کہ سکیم ب کو صرف اس صورت میں اختیار کیا جائے جب بصورت دیگر کسی تصفیے پر پہنچنے میں مکمل ناکامی ہو جائے اور نتیجتاً گڑ بڑ پھیلنے کا اندیشہ نظر آتا ہو۔ تاہم ہندوستان کو اس تقسیم کی وجہ سے شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ اس لیے اگر سکیم ب کو اختیار کیا جائے تو پھر ایک مرکزی دفاعی کونسل کی کسی صورت پر اتفاق رائے کرانے کی پوری کوشش کی جائے جس میں صرف پاکستان، ہندوستان اور ہندوستانی ریاستیں ہی شامل نہ ہوں بلکہ اس میں برما اور سیلون بھی شامل ہوں۔''[21]

وزیراعظم ایٹلی کے اس مراسلے سے صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ برطانوی سامراج کیوں ہر قیمت پر برصغیر کو متحد رکھنے پر تلا ہوا تھا۔ اگرچہ سوویت یونین بڑی طاقتوں کے اجلاسوں میں بارہا وضاحت کر چکا تھا کہ وہ صرف مشرقی یورپ کے علاقے کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتا ہے اور اس کی وجہ وہ اس حقیقت کو قرار دیتا تھا کہ ماضی میں اس کے خلاف ہر بار اس جانب سے یلغار کی جاتی رہی ہے اور اس کے عوام بھاری جانی و مالی نقصان اٹھاتے رہے ہیں۔ لیکن چونکہ سوویت یونین فاشسٹوں کو بدترین شکست سے دوچار کرنے کے بعد جنگ کی خون آشامیوں سے سرخرو ہو کر عظیم الشان فاتح کی حیثیت سے ابھرا تھا۔ اس لیے محض اس کا وجود ہی یورپ کے زوال پذیر سامراجیوں پر لرزہ طاری کر رہا تھا جن کا ٹھیکیدار بن کر امریکی سامراج اب میدان میں اُتر آیا تھا۔ اگرچہ عالمی جنگ نے برطانیہ کو کہیں کا نہ چھوڑا تھا لیکن وہ اپنی شرق تا غرب پھیلی سلطنت سے بوریا بستر سمیٹتے ہوئے بھی اس بات کی فکر میں تھا کہ یہاں اس کے تجارتی و اقتصادی مفادات محفوظ رہیں اور سوویت یونین کو برصغیر کے راستے ''دنیا پر غلبہ'' حاصل کرنے سے باز رکھنے کے لیے برصغیر میں اس کا وضع کردہ دفاعی نظام جوں کا توں برقرار رکھا جائے اور اس کی خاطر برصغیر کو ایک وحدت میں رکھا جائے۔ اپنی ٹوٹی ہوئی ساکھ کو بچانے اور

عالمی طاقت کی حیثیت سے اپنا بھرم رکھنے کی خاطر برطانیہ نے جدید سامراجی طاقت امریکہ کی انگلی پکڑ کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ امریکہ اس بڈھے سامراج کو سہارا دینے کے بجائے اس کے اثاثوں پر خود قبضہ کرنے کی فکر میں تھا۔ امریکہ نے برطانیہ سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے ہندوستان میں ہوائی اڈے مہیا کئے جائیں۔ لیکن یہاں کے مقامی ردعمل کے پیش نظر برطانوی وزیر ہند پیتھک لارنس کا خیال تھا کہ" اگر اقوام متحدہ کی علاقائی سلامتی کے منصوبے کے تحت یہ بندوبست کیا جائے تو مناسب ہوگا۔"[22] تاہم انگریزوں کی جانب سے امریکیوں کی ہم نوائی میں سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ چرچل اور ٹرومین بڑھکیں لگا رہے تھے لیکن اندر سے کس قدر خائف تھے اس کا اندازہ ایٹلی کے مذکورہ مراسلے سے ہوتا ہے۔ برصغیر میں ان کو لینے کے دینے پڑے ہوئے تھے۔ شمال مغرب میں سوویت یونین اور شمال مشرق میں ابھرتا ہوا چینی انقلاب اور جنوب مشرقی ایشیا میں ویتنام، انڈونیشیا، ملایا اور برما میں جاری سامراج دشمن انقلابی مسلح تحریکیں ان کی راتوں کی نیند حرام کئے ہوئے تھیں۔ ادھر سارے جتن کرنے کے باوجود برصغیر کو متحد رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا جس کی منظم متحدہ فوج پر برطانوی سامراج نے ہمیشہ انحصار کیا تھا۔ انگریزوں کی اولین خواہش تو یہ تھی کہ کسی طور برصغیر کے متحدہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے یعنی سکیم الف کے تحت ہندو مسلم تضاد کا کوئی تصفیہ ہو جائے لیکن اگر یہ ناممکن ہو جائے اور کسی سمجھوتے کی عدم موجودگی کی وجہ سے ملک بدامنی اور خلفشار کا شکار ہوتا ہوا معلوم دے تو پھر تقسیم ہند یعنی سکیم ب کے تحت ہندوستان اور محدود پاکستان تشکیل دے دیئے جائیں مگر اس صورت میں دفاع کو بہرحال ایک مرکزی کونسل کے تحت مشترک رکھا جائے جس میں سیلون اور برما بھی شامل کر لیے جائیں۔ اس بندوبست کے باوجود وہ سکیم ب کی کڑوی گولی کو نگلنے کے لیے محض اس لیے آمادہ ہوئے تھے کہ بصورت دیگر جس بدامنی اور خلفشار کے پھیلنے سے گھبرا رہے تھے اس سے کمیونسٹوں کے فائدہ اٹھا جانے کا خطرہ تھا۔ انہیں نہ صرف شمال سے کمیونزم کا خطرہ نظر آتا تھا۔ بلکہ وہ ہندوستان کے اندر بھی کمیونسٹوں کے اثر ونفوذ کے خوف میں مبتلا تھے۔ فروری میں بمبئی اور کراچی میں نیوی کے ہندوستانی عملہ کی ہڑتال اور پھر اس کی حمایت میں ملک گیر پرتشدد ہنگاموں کے پس پردہ کمیونسٹوں کے ہاتھ کی وجہ سے پہلے ہی سخت تشویش پائی جاتی تھی۔ چنانچہ جب وزارتی مشن

مختلف فرقوں سے صلاح ومشورہ میں مصروف تھا تو حکومت ہند کے بعض ارکان داخلی امن کو درپیش خطرات کا جائزہ مرتب کر رہے تھے۔

15 اپریل کو ممبر داخلہ سر جے تھارن نے وائسرائے اور مشن کے ارکان کے لیے ایک نوٹ تحریر کیا جس میں اس امر کا جائزہ لیا گیا تھا کہ اگر مشن فریقین کے مابین کوئی سمجھوتہ کرانے میں ناکام رہا تو کیا ہوگا؟ نوٹ میں کہا گیا تھا کہ ایسی صورت میں ملک گیر فسادات اور ہنگامے پھوٹ پڑیں گے۔ مسلح افواج، پولیس اور انتظامیہ تفریق و انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ خانہ جنگی کی سی صورت پیدا ہو جائے گی جس سے کمیونسٹ پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ ملک گیر ہڑتالیں کرائیں گے۔ مواصلات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا جس کے عملے میں پہلے ہی معاشی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ آزاد ہند فوج کے سابقہ فوجی بھی گڑبڑ پھیلانے والوں میں شریک ہو جائیں گے اور ممکن ہے وہ جدید ہتھیاروں کا بھی استعمال کریں۔[23] ممبر داخلہ کے اس نوٹ سے اتفاق کرتے ہوئے وائسرائے کے ذاتی معاون جارج ایبل نے 7 اپریل کو اپنے نوٹ میں مزید لکھا کہ ''اس وقت ہندوستان کے شہروں میں اس قسم کی ہنگامہ آرائی کا موڈ پایا جاتا ہے اور غنڈہ عناصر بھی قابو سے باہر ہیں۔ ان حالات میں کمیونسٹوں کو گڑبڑ پیدا کرنے کا ایک پرمسرت موقع مل جائے گا۔''[24] انگریز حکام کی طرح دیسی ریاستوں کے رجعت پسند حکمران بھی کمیونسٹ خطرے سے بہت خائف تھے۔ 9 اپریل کو ریاست ٹراونکور (کیرالا) کے دیوان سی۔ پی۔ رام سوامی آیار نے وائسرائے ویول کے ساتھ ملاقات میں کمیونسٹ خطرے سے آگاہ کیا اور ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں رائے دی۔[25]

اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت ہندوستان کے کمیونسٹ کس درجے کی گڑبڑ کا باعث ہو سکتے تھے اور کیا وہ واقعی اس پوزیشن میں تھے کہ کوئی بہت بڑا خطرہ ثابت ہو سکتے! لیکن جہاں تک انگریز حکام کا تعلق تھا تو وہ عام حالات میں تو نہیں البتہ انتشار کی کیفیت میں ان کو ایک بڑا خطرہ ضرور گردانتے تھے چنانچہ خارجہ طور پر بھی اور داخلی طور پر بھی کمیونسٹ قوتوں کے مبینہ خطرات کے پیش نظر انگریز برصغیر کی وحدت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی اولین خواہش تو یہ تھی کہ انہوں نے ڈیڑھ سو برس میں جس برصغیر کو انتظامی لحاظ سے یک جا کیا تھا وہ ان کے بعد بھی متحد رہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے اور تقسیم ناگزیر ہو جائے تو کم از کم اس کی فوجی

وحدت بہرصورت برقرار رکھی جائے۔لیکن صورت حال کی ستم ظریفی یہ تھی کہ گاندھی اور کانگرسی مسلسل یہ الزام لگانے میں مصروف تھے کہ پاکستان کا مسئلہ انگریزوں نے پیدا کیا ہے، وہ ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو بروئے کار لا کر ہندوستان کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ 13/اپریل کو سیٹفورڈ کرپس کے معاون وڈرو وائٹ کے ساتھ ملاقات کے دوران گاندھی نے پھر یہ الزام دھرایا کہ ''پاکستان انگریزوں کی پیداوار ہے۔'' اس ملاقات میں گاندھی نے یہ بھی کہا کہ ''ہندوستان میں مسائل کے حل کے لیے خون کی ہولی ہو کر رہے گی۔ میں اپنی طرف سے کانگرس کو عدم تشدد کی تلقین تو کروں گا لیکن اسے کوئی نہیں مانے گا۔ خانہ جنگی کی صورت میں کانگرس سے صرف اس قدر ہی توقع ہوسکتی ہے کہ وہ شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دانت کے بدلے میں ایک دانت توڑے نہ کہ ایک کے بدلے سو دانت توڑے جیسا کہ انگریز کرتے ہیں۔''[26] عدم تشدد کا علمبردار یہ مہاتما خود اعتراف کر رہا تھا کہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ تضاد خون کی ہولی کھیلے بغیر حل نہیں ہوسکتا اور کانگرس اس میں اپنا پرتشدد کردار ادا کر کے رہے گی۔ ان تشدد آمیز عزائم کی صورت میں یہ کس طرح توقع کی جاسکتی تھی کہ برصغیر کا اتحاد برقرار رہے گا اور یہ کہ اس کو پارہ پارہ کرنے کی ذمہ داری انگریزوں پر عائد ہوتی تھی جن کے اندرونی اور عالمی تقاضے برصغیر کے اتحاد کے طالب تھے۔

مسلم لیگی ارکانِ اسمبلی کے دہلی کنونشن کی قرار دادِ پاکستان اور مذہبی جماعتوں کی مخالفت

ہندو مسلم تضاد جو پہلے ہی شدید تھا، حالیہ انتخابات میں باقاعدہ لہر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ ایک طرف گاندھی، نہرو، پٹیل اور دوسرے کانگرسی رہنما ناقابل مفاہمت پرتشدد نعرے بلند کر رہے تھے تو دوسری طرف مسلم لیگ بھی پہلی مرتبہ بے پناہ وسیع کامیابی کے حصول کے بعد سخت گیر رویے اور تشدد آمیز نعروں کو اختیار کر رہی تھی۔ 7 سے 9/اپریل تک دہلی میں جناح کی زیر صدارت مسلم لیگ کی طرف سے کامیاب ہونے والے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کا کنونشن منعقد ہوا، جو ان اسمبلیوں کی کل مسلم نشستوں کا نوے فیصد تھے۔ مقصد اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا کہ وزارتی مشن پر عیاں ہو جائے کہ اسمبلیوں کے کم و بیش تمام مسلم

ارکان بیک آواز ہو کر مطالبہ پاکستان کی غیر متزلزل حمایت کرتے ہیں۔ افتتاحی تقریر کے دوران جناح نے کہا کہ ''انگریز اس بات سے خائف ہیں کہ اگر کانگرس کے مطالبات تسلیم نہ کئے گئے یا پاکستان کے لیے حمایت ظاہر کی گئی تو خون خرابہ ہوگا اور برطانوی تجارت مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔ جناح نے کہا کہ یہ محض دھمکیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس مرتبہ مسلم انڈیا بھی خاموش یا غیر جانب دار نہیں رہے گا۔ یہ اپنا کردار ادا کرے گا اور تمام خطرات کا سامنا کرے گا۔ کانگرس کی جانب سے انگریزوں کو تجارتی مراعات دینے کے جو بڑے بڑے وعدے کئے جا رہے ہیں ان کی خاطر انگریز مسلمانوں کو بیچ ڈالنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کو خوش کن اور پرکشش ترجیحی تجارتی پیش کشوں پر نہیں جانا چاہیے۔ کانگرس کو عادت ہے کہ وہ بڑے بڑے وعدے کر لیتی ہے لیکن اتنی تنگ نظر ہے کہ کبھی ان کو پورا نہیں کرتی اور حالات کو اپنے موافق بنانے کے لیے کئے گئے عہد و پیمان سے بعد میں پھر جاتی ہے۔ کیا انگریز ہندوستان میں اپنے کاروبار، تجارت اور منڈیوں کے فروغ کے لیے دی گئی موہوم امیدوں اور وعدوں کی خاطر دس کروڑ مسلمانوں اور دوسری چھوٹی اقلیتوں کا سودا کر دیں گے؟''۔ جناح نے مزید کہا کہ ''ہم کبھی متحدہ آئین ساز اسمبلی کو منظور نہیں کریں گے۔ ایسا کرنا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف ہوگا۔ جب تک پاکستان کو ناگزیر شرط کے طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا ہم کسی عبوری انتظام کو بھی تسلیم نہیں کریں گے۔'' اس سہ روزہ کنونشن میں جو متفقہ قرار داد منظور کی گئی اس میں کہا گیا کہ برصغیر کے شمال مشرق میں بنگال اور آسام اور شمال مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے خطے، جو پاکستانی خطے ہیں اور یہاں مسلم اکثریت آباد ہے، ان خطوں پر مشتمل ایک آزاد و خودمختار ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے اور یہ کہ قیام پاکستان کے کام کو بلاتاخیر پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غیر مبہم ضمانت دی جائے۔ پاکستان اور ہندوستان کے عوام اپنے لیے دو جداگانہ آئین ساز اسمبلیاں تشکیل دیں جو ان کے لیے آئین وضع کریں۔ پاکستان اور ہندوستان کے اندر آباد اقلیتوں کو مسلم لیگ کی طرف سے لاہور میں 23 رمارچ 1940ء کو منظور کردہ قرار داد کے مطابق تحفظات مہیا کئے جائیں۔ مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل میں تعاون اور شمولیت کے لیے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا تسلیم کیا جانا اور اس کا عمل میں آنا ایک ناگزیر شرط کے طور پر قبول کیا جائے۔

کنونشن کے آخری کھلے اجلاس میں برصغیر کے طول وعرض سے آئے ہوئے مسلم ارکان اسمبلی نے حصول پاکستان کی خاطر کسی بھی خطرے، آزمائش یا قربانی سے دریغ نہ کرنے کا باقاعدہ حلف اٹھایا۔ بعض نمایاں ارکان نے اس اجلاس سے خطاب بھی کیا اور اپنی تقریروں میں جوش، ولولے، بیباکی اور جرأت کے ساتھ کانگرس اور حکومت برطانیہ کو ہدف تنقید بنایا۔ ان مقررین میں حسین شہید سہروردی (بنگال)، چودھری خلیق الزمان (یو، پی)، غلام حسین ہدایت اللہ (سندھ)، محمد سعد اللہ (آسام)، سید رؤف شاہ (سی پی)، افتخار حسین ممدوٹ (پنجاب)، آئی آئی چندریگر (بمبئی)، خان عبدالقیوم خان (سرحد)، محمد اسمٰعیل خان (مدراس)، بیگم عزیز رسول (یوپی)، سردار شوکت حیات خان (پنجاب)، ملک فیروز خان نون (پنجاب)، بیگم شاہنواز (پنجاب)، راجہ غضنفر علی خان (پنجاب) اور عبدالہاشم (بنگال) شامل تھے۔ یاد رہے کہ ان میں سے بیشتر مسلم لیگ میں اس وقت داخل ہوئے جب جنگ عظیم کے خاتمے پر برطانوی سلطنت کا زوال نوشتۂ دیوار ہو گیا اور ہندوستان سے انگریزوں کا بوریا بستر سمٹتا ہوا صاف نظر آنے لگا اور ادھر مسلمان عوام الناس میں مطالبہ پاکستان کی پرجوش لہر چل پڑی جس کا 46-1945ء کی انتخابی مہم میں بڑے پیمانے پر کھل کر اظہار ہوا۔ یہ اسی عوامی لہر کا اعجاز تھا کہ مذکورہ کنونشن میں فیروز خان نون جیسے پشتینی سامراج نواز جاگیردار نے اپنی تقریر میں کہا ''روس نے سان فرانسسکو میں اعلان کیا ہے کہ آئندہ سے ایشیا کی مظلوم اقوام کی آزادی اس کی ذمہ داری ٹھہری ہے۔ ہمیں دفاع کے مسئلے کا سامنا ہے۔ دفاع کس کے خلاف؟ اگر ہندو ہمیں آزادی دیں گے تو وہ ہمارے دوست ہوں گے۔ اگر انگریز ہمیں آزادی دیں گے تو وہ ہمارے دوست ہوں گے۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی ہمیں آزادی نہ دے گا تو پھر روس ہمارا دوست ہوگا۔ میں ان کو متنبہ کر رہا ہوں کہ پنجاب کے بڑے زمینداروں میں بھی جذبات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ کمیونزم پھیل رہا ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے اگر مجھے اپنی دولت کی ایک ایک پائی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے اور مسلمانوں کی نجات اور آزادی کے لیے یہی واحد راستہ ہوا تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔'' اور اس نے مزید کہا کہ ''اگر برطانیہ نے اکھنڈ ہندوستان سے کاروبار کے مفاد کی خاطر ہماری آزادی کا سودا کر دیا اور ہم پر اکھنڈ حکومت ٹھونس دی گئی تو مسلمان جو تباہی و بربادی لائیں گے اس کے

سامنے ہلاکو خان اور چنگیز خان کی تباہ کاریاں بھی ماند پڑ جائیں گی اور اس کی تمام تر ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوگی۔"[27]

آخر میں جناح نے اپنی اختتامی تقریر میں کہا "ہم کس لیے لڑ رہے ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ یہ تھیوکریسی کے لیے نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کسی تھیوکریٹک ریاست کے قیام کے لیے ہے۔ مذہب اپنی جگہ پر ہے اور مذہب ہمیں عزیز ہے۔ جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں تو تمام دنیوی اشیا بے وقعت ہو جاتی ہیں لیکن بعض دوسری چیزیں بے حد اہمیت کی حامل ہیں۔ ان میں ہماری معاشرتی زندگی اور معاشی زندگی ہے اور سیاسی اقتدار حاصل کیے بغیر آپ کس طرح اپنے عقیدے اور معاشی زندگی کا تحفظ کر سکتے ہیں؟"[28] بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی مستند انگلش اردو ڈکشنری میں تھیوکریسی کے دو مطالب دیئے ہیں (1) "حکومت الٰہی، جس میں وحیٔ الٰہی کے مطابق حکومت کی جائے۔ (2) دینی حکومت، مذہبی حکومت جس میں پیشوایان دین نائب الٰہی کی حیثیت سے حکومت کرتے ہیں۔" اسی طرح تھیوکریٹک کا مطلب دیا ہے "حکومت الٰہی یا دینی حکومت کا"[29] جناح نے بھی اپنے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے معاشرتی و معاشی زندگی اور سیاسی اقتدار کو دنیوی اشیا کی حیثیت سے دین سے جدا کیا ہے اور ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے کہ ان کے بغیر عقیدے کا بھی تحفظ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جناح کے نزدیک حصول پاکستان کی جدوجہد کسی دینی یا مذہبی حکومت کے قیام کے لیے نہیں تھی اور نہ ہی اس میں ملاؤں کے اقتدار کی کوئی گنجائش تھی۔ اس کا مقصد برصغیر کے دس کروڑ مسلمان عوام الناس کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کی ترقی و ترویج تھا۔ مذہبی جماعتوں کو چونکہ مسلم عوام الناس کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں تھا اور نہ ہی انہیں جناح کے "ناپاکستان" میں اپنے اقتدار کا کوئی مستقبل نظر آتا تھا، وہ اپنے کاروبار دین فروشی کی منڈی کے طور پر متحدہ برصغیر کو برقرار رکھنے کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ کے مذکورہ کنونشن کے چھ روز بعد یعنی 16 راپریل کو برصغیر کی سرکردہ مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں نے وزارتی مشن کے ساتھ ملاقات کر کے پاکستان کے خلاف اور متحدہ ہندوستان کے حق میں اپنا مؤقف پیش کیا۔ ان رہنماؤں میں جمعیت العلمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی، آل انڈیا مومن کانفرنس کے صدر ظہیر الدین، آل انڈیا مجلس احرار کے صدر حسام الدین، آل پارٹیز شیعہ کانفرنس کے صدر حسین

بھائی لال جی اور آل انڈیا مسلم مجلس کے صدر عبدالمجید خواجہ شامل تھے۔ انہوں نے معمولی ردو بدل کے ساتھ وہی مؤقف اختیار کیا جو گاندھی اور کانگرس نے اختیار کر رکھا تھا۔ [30]

سکیم (ا) اور (ب) کے بارے میں مشن اور جناح کے مابین تبادلۂ خیال

وزیراعظم ایٹلی کی جانب سے سکیم ب کو بھی بطور متبادل پیش کئے جانے کی اجازت پا کر مشن کے ارکان نے دونوں بڑی جماعتوں کی قیادت کے ساتھ سکیم الف اور ب کو زیر بحث لانے اور ان کی آراء طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں پہلے جناح کے ساتھ 16 اپریل کو ملاقات کی گئی۔ ملاقات کے آغاز میں جناح کو صاف الفاظ میں بتا دیا گیا کہ جس قسم کے وسیع اور آزاد و خودمختار پاکستان کا وہ مطالبہ کر رہے ہیں، اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ جناح نے مسلم فرقے کی جانب سے جو کیس پیش کیا ہے، اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے دو متبادل حل تجویز کئے جا سکتے ہیں۔ پھر اُنہیں سکیم الف اور ب کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔ ان کے مطابق اُن پر واضح کیا گیا کہ وہ جن چھ صوبوں پر مشتمل پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے سکیم الف کے تحت پانچ صوبے پورے طور پر اور صوبہ آسام کا ضلع سلہٹ اُنہیں دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک گروپ کی شکل میں جو کہ مکمل طور پر آزاد اور خودمختار نہیں ہوگا بلکہ اس کے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبے ہندو اکثریت کے صوبوں کے گروپ کے ساتھ مشترکہ ہوں گے اور ایک یونین حکومت کے ماتحت ہوں گے۔ دوسری صورت میں اگر مکمل طور پر آزاد و خودمختار ملک کی حیثیت سے پاکستان چاہیے تو پھر سکیم ب کے تحت یہ پانچ صوبے پورے کے پورے پاکستان کو نہیں دیے جا سکتے، اس میں غیر مسلم اکثریت کے اضلاع پر مشتمل مشرقی پنجاب (بشمول مسلم اکثریت کا ضلع گورداسپور) اور مغربی بنگال (بشمول کلکتہ) کو شامل نہیں کیا جا سکتا۔ آسام کا مسلم اکثریت کا ضلع سلہٹ البتہ اس میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ اگر بڑے علاقے پر مشتمل پاکستان چاہیے تو پھر کچھ نہ کچھ خودمختاری قربان کرنا ہوگی (یعنی سکیم الف) اور اگر مکمل خودمختاری درکار ہے تو پھر کچھ علاقوں کی قربانی دینا ہوگی۔ (یعنی سکیم ب)۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ سکیم ب کے مطابق خودمختار پاکستان اور خودمختار ہندوستان کو آپس میں مشترکہ دفاعی معاہدہ کرنا ہوگا۔ سکیم الف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ آل انڈیا یونین

حکومت کی تشکیل میں پاکستان گروپ اور ہندوستان گروپ کی مساوی نمائندگی ہو گی۔ دیسی ریاستیں گروپ کی سطح پر یا مرکز کی سطح پر شامل ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس صورت میں بھی مرکز میں فرقہ وارانہ توازن کو برقرار رکھا جائے گا۔ جناح نے پوچھا کہ یونین ایگزیکٹو کس طرح وضع ہو گی۔ مشن کے رکن سٹیفورڈ کرپس نے جواب دیا کہ یونین میں شامل دونوں فیڈریشنیں (گروپ) اس ایگزیکٹو کے ارکان منتخب کریں گی۔ جناح نے پوچھا کہ ایگزیکٹو میں مساوی نمائندگی کے ہوتے ہوئے کسی معاملے پر اختلاف کی صورت میں فیصلہ کس طرح ہو گا۔ کرپس نے جواب دیا کہ یونین کی اپنی کوئی پارلیمنٹ نہیں ہو گی اس لیے ایسے معاملات کو دونوں فیڈریشنوں کے مابین سمجھوتے کے ذریعے طے کیا جائے گا۔ جناح نے کہا کہ مجھے شبہ ہے کہ عملاً یہ بندوبست چل سکے گا۔ دفاع سے متعلق امور روزمرہ ہی طے کرنے پڑتے ہیں۔ اس لیے جو کچھ آپ نے کہا ہے، اس میں مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کی بنیاد پر یونین کی تجویز پر غور ہو سکتا ہے۔ مشن کی جانب سے پیتھک لارنس نے زور دے کر کہا کہ یونین کی سکیم کی اصل روح اس کے دونوں اجزائے ترکیبی کے مابین مساوات ہے۔ جس سے اس کی نوعیت اس مرکز سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے کہ جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو۔ جہاں تک مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کا تعلق ہے تو یہ بھی اس طرح سے مان لیا گیا ہے کہ مطلوبہ وسیع علاقوں پر مسلمانوں کو کلی طور پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا سوائے چند اہم شعبوں کے جو مرکزی یونین کو دیئے جائیں گے اور یونین کی سطح پر بھی وہ ہندوؤں کے ساتھ ایسے روابط رکھیں گے جیسے ملکوں کے مابین ہوتے ہیں اور جہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس ملک میں باشندوں کی تعداد کتنی ہے۔ جناح نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ایک مرکزی حکومت کے نظام میں اکثریتی اور اقلیتی گروہوں کے درمیان مساوات کبھی قائم نہیں رہ سکتی اس لیے بہتر یہی ہو گا کہ نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر علیحدگی اختیار کی جائے۔ پیتھک لارنس نے کہا تو پھر گویا آپ سکیم ب کی جانب مائل ہیں۔ چلیے اس پر اپنی رائے دیں۔ جناح نے کہا کہ ایک مرتبہ پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا جائے تو پھر پاکستان میں شامل کیے جانے والے علاقوں کے بارے میں بات چیت ہو سکتی ہے ہمارا مطالبہ چھ صوبوں کے لیے ہے لیکن ہم ان کے علاقے پر گفتگو کے لیے تیار ہیں۔ تاہم جناح نے زور دے کر کہا کہ وہ کلکتہ کو پاکستان سے محض اس لیے جدا کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے کہ وہاں پانچ یا چھ

لاکھ ہندو آباد ہیں جن میں سے بیشتر اچھوت ہیں جنہیں مزدوری کے لیے وہاں لایا گیا ہے اور جو پاکستان میں خوشی سے شامل ہو جائیں گے۔ جناح نے اصرار کے ساتھ کہا کہ ہم کسی حالت میں کلکتہ چھوڑنا قبول نہیں کریں گے۔ اس کے بعد جناح اور مشن کے مابین علاقوں کے ردوبدل پر بحث ہوتی رہی۔ مشن نے آگاہ کیا کہ ابھی یہ ساری سکیم کانگرس کے ساتھ زیر بحث لانا ہے۔ ہم صرف جناح سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ علاقوں کے ردوبدل میں کہاں تک رعایت دینے کو تیار ہیں؟ جناح نے یہ بتانے سے انکار کیا اور کہا کہ ہمیں ایسا پاکستان حاصل کرنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا جو معاشی، سیاسی اور حکمت عملی کے لحاظ سے پوری طرح قابل عمل ہوگا۔ جناح نے کہا کہ جتنا زیادہ کانگرس کو پاکستان کے علاقوں میں کمی بیشی کرنے کی اجازت دی جائے گی اتنا ہی متفقہ تصفیہ کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔"[31]

مشن اور جناح کی اس ملاقات سے ظاہر ہوا کہ ابھی جناح سکیم الف کو اختیار کرنے کے بجائے خودمختار پاکستان کے حصول پر اپنا اصرار بدستور جاری رکھے ہوئے تھے اور اس کے لیے پنجاب، بنگال اور آسام کے غیر مسلم اکثریت کے علاقوں کو چھوڑنے کے لیے بات چیت پر بھی تیار تھے لیکن اس حد تک نہیں کہ جو سکیم ب کے مطابق چھوڑے گئے تھے کہ اس میں مشرقی پنجاب کا اکاون فیصد مسلم آبادی کا ضلع گورداسپور بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جناح نہ صرف یہ کہ مسلم اکثریت کا کوئی ضلع نہیں چھوڑنا چاہتے تھے بلکہ بعض ملحقہ غیر مسلم اکثریت کے اضلاع بالخصوص کلکتہ کو لازمی طور پر پاکستان میں شامل کرنا چاہتے تھے کہ وہ کلکتہ کے بغیر پاکستان کو اقتصادی اعتبار سے قابل عمل نہیں سمجھتے تھے اور اس سے پہلے بھی ایک موقع پر مشن کے سامنے واضح کر چکے تھے کہ کلکتہ کے بغیر پاکستان ایسے ہی ہے جیسے دل کے بغیر کوئی شخص۔

ویول کے 21رفروری1946ء کے روزنامچے کے مطابق آغا خان نے بھی اس کے ساتھ ملاقات میں یہ بتایا تھا کہ جناح امرتسر انبالہ وغیرہ شمال مغرب میں اور بنگال و آسام کے ہندو اضلاع چھوڑنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن وہ کلکتہ نہیں چھوڑیں گے۔"[32] چنانچہ اب پھر انہوں نے مشن کو یہ عندیہ دے دیا کہ اگر سکیم ب کے دامن میں وسعت پیدا کر کے اس میں کلکتہ کے لیے گنجائش پیدا کر دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے اور پنجاب، آسام اور بنگال کے بقیہ غیر مسلم علاقوں کے لیے اصرار نہیں کریں گے۔ تاہم وہ یہ چاہتے تھے کہ کانگرس کے ساتھ

سودے بازی چھ صوبوں سے شروع ہوا اور پھر منقسم بنگال میں کلکتہ شامل کئے جانے پر آ کر سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن مشن کے ارکان کلکتہ کے یورپی تاجروں اور ہندو بورژوا کے نمائندہ کانگرسی رہنماؤں کی جانب سے کلکتہ کے پاکستان کو دیئے جانے پر شدید مخالفت سے آگاہ تھے اس لیے انہوں نے جناح کے ساتھ مذکورہ ملاقات کو ناکام قرار دیا۔

17 /اپریل کو سیٹفورڈ کرپس نے جناح کے ساتھ ایک اور ملاقات کی۔ جناح بدستور مطالبہ پاکستان پر ثابت قدم رہے۔ انہوں نے دفاع کو ایک مرکز کے ماتحت رکھنے کی برطانوی تجویز کے بجائے دونوں ملکوں (یعنی ہندوستان و پاکستان) کے مابین دفاعی معاہدے پر رضامندی ظاہر کی۔ جناح نے اس امر کے ساتھ اتفاق کیا کہ دونوں ملکوں کی خارجہ پالیسی مشترکہ ہونی چاہیے کہ حالات کا تقاضہ انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن خواہ مرکزی اسمبلی یا ایگزیکٹو میں مساوی نمائندگی بھی دے دی جائے تب بھی ایک مرکز پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح جناح نے سکیم الف اور ب دونوں ناقابل قبول قرار دے دی تھیں۔ وہ سکیم ب پر سمجھوتے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ کلکتہ پاکستان کو دے دیا جاتا۔ کیونکہ کلکتہ کے بغیر پاکستان کو لینے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے سمجھا گیا کہ انہوں نے سکیم ب بھی رد کر دی ہے۔ جناح نے مزید واضح کر دیا تھا کہ کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ ہونا ممکن معلوم نہیں ہوتا اس لیے انگریزوں کو چاہیے کہ وہ وہ خود ہی کسی ایوارڈ کا اعلان کر دیں۔

اس دوران مشن کے ارکان نے 17 /اپریل کو آزاد کے ساتھ بھی ملاقات کی لیکن اسے صرف اتنا ہی بتایا کہ بعض تجاویز جناح کے سامنے رکھی گئی ہیں جن کا مقصد کانگرس کے ساتھ اس کی مفاہمت کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ لیکن جب تک ان کی جانب سے حتمی جواب نہ مل جائے ان کے متعلق کچھ بات کرنا بے سود ہوگا۔ آزاد کانگرس کا برائے نام صدر تھا اور اس کی حیثیت محض کٹھ پتلی کی تھی۔ کانگرس کی اصل باگ ڈور گاندھی کے ہاتھ میں تھی حالانکہ وہ بظاہر اس کا باقاعدہ ممبر بھی نہیں تھا۔ اس کے بعد اہمیت نہرو اور پٹیل کو حاصل تھی۔ اسی لیے کرپس نے جناح کے ساتھ مذکورہ ملاقات کرنے کے بعد گاندھی کے ساتھ ملاقات کی اور اسے جناح کے ساتھ ہوئے مذاکرات کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ کرپس نے تجویز کیا کہ گاندھی کو جناح کے ساتھ ملاقات کرنی چاہئے۔ گاندھی نے کہا کہ یہ ملاقات بے سود ثابت ہوگی۔ ہاں البتہ اگر آپ جناح

کو آل انڈیا یونین پر غور کرنے کے لئے آمادہ کرلیں تو اس کے ساتھ نہرو کی ملاقات ہوسکتی ہے۔ چنانچہ 18راپریل کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے اجلاس میں طے کیا کہ 25راپریل کو جناح اور نہرو کے مابین ملاقات کرائی جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر نہرو جناح ملاقات ناکام بھی رہی جیسا کہ کافی امکان ہے تو یہ بہرصورت کہا جاسکے گا کہ مفاہمت کی پوری کوشش کی گئی۔ تاہم اس کے بعد ہمیں خود ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا اور اسے اعلان یا ایوارڈ کی صورت میں سامنے لانا ہوگا۔

اس اجلاس کے بعد مشن کے ارکان تینوں وزراء اپنے عملے کے ہمراہ ایسٹر منانے کے لیے کشمیر چلے گئے۔ وہاں سے 22راپریل کو انہوں نے وائسرائے کو بذریعہ تار ایک اور منصوبہ اختیار کرنے کے بارے میں تجویز ارسال کی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے منتخب ارکان میں سے ایک آل انڈیا کمیشن تشکیل دیا جائے۔ اس کمیشن میں مختلف پارٹیوں کے ارکان کی تعداد کے مابین وہی تناسب ہونا چاہیے جو اسمبلیوں میں مختلف پارٹیوں کے مابین پایا جاتا ہے۔ کمیشن کا کام یہ ہوگا کہ جو بھی آئین وضع کیا جائے اس میں اقلیتوں کے تحفظ کی دفعات کا تعین کرے اور یہ فیصلہ بھی کرے کہ آیا برصغیر میں دو خودمختار ریاستیں وجود میں آنی چاہئیں یا نہیں؟ اگر کمیشن ایک ماہ کے اندر اندر اس بارے میں فیصلہ نہ کرسکے تو پھر یہ طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا کہ سندھ، سرحد، پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے مسلمان ارکان اپنا علیحدہ اجلاس منعقد کریں اور جس صوبے کے 75فیصد مسلمان ارکان علیحدگی کے حق میں ووٹ دیں اسے علیحدہ کر دیا جائے ان صوبوں کے غیر مسلم اکثریت والے اضلاع سے تعلق رکھنے والے اراکین اسمبلی کی تعداد کا 75 فیصد اگر صوبے کی علیحدگی کا ساتھ دینے کے بجائے بقیہ ہندوستان کے ساتھ رہنے کے حق میں ہوں تو ان اضلاع کو علیحدہ ہونے والے صوبے سے الگ کر کے بقیہ ہندوستان کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔ جب اسمبلیوں کے ارکان فیصلہ کرلیں تو پھر اس فیصلے کی مطابقت سے ایک یا دو مجالس ہائے آئین ساز وضع کر دی جائیں۔ مشن کے ارکان نے یہ منصوبہ پنجاب کے ایک مسلم لیگی نواب مشتاق احمد گورمانی کی ایما پر بطور تجویز اختیار کیا اور سرکاری ریکارڈ میں اسے ''گورمانی پلان'' لکھا گیا۔[33]

24راپریل کو مشن کے ارکان کشمیر سے واپس دہلی آ گئے اور اسی روز کرپس نے جناح

کے ساتھ ملاقات کر کے مذکورہ پلان پیش کیا۔ جناح نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ موقف اختیار کیا کہ اگر کانگرس اس تجویز کو قبول کر لے تو پھر مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے سامنے بھی ان تجاویز کو رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد کرپس نے نہرو کے ساتھ ملاقات کی اور اس نئی تجویز کے بارے میں کانگرس کا نقطۂ نظر دریافت کیا۔ نہرو نے جواب دیا کہ کانگرس کا اس تجویز کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[34] اس طرح یہ تجویز فی الحال خود بخود ختم ہو گئی۔

جناح کی متحدہ ہند پر مبنی سکیم (ا) پر مذاکرات کے لیے آمادگی

اب مشن کے پاس پھر سے سکیم الف اور ب رہ گئی تھیں۔ 25/اپریل کو کرپس نے جناح کے ساتھ ملاقات کی اور ایک بار پھر ان دونوں سکیموں کا اعادہ کیا۔ سکیم الف یہ کہ اس میں مسلم اکثریت اور غیر مسلم اکثریت کے صوبوں کے دو گروپ تشکیل دے کر انہیں ایک مرکز کے ماتحت کر دیا گیا تھا جب کہ سکیم ب میں ایک خود مختار مگر مختصر پاکستان تشکیل دیا گیا تھا۔ اس سے پیشتر کی ملاقاتوں میں جناح سکیم ب کے مختصر پاکستان میں کلکتہ کی شمولیت پر اصرار کرتے رہے تھے۔ لیکن ہندو بورژوا اور کلکتہ کے یورپی تاجر اس کے سخت خلاف تھے۔ اس لیے مشن یہ واضح کر چکا تھا کہ کلکتہ پاکستان میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اب 25/اپریل کو جب کرپس نے دونوں سکیمیں سامنے رکھ کر جناح کا موقف دریافت کیا تو ''جناح نے کہا کہ سکیم ب قطعی طور پر نا قابل قبول ہے جب کہ سکیم الف پر غور ہو سکتا ہے بشرطیکہ کانگرس اسے قبول کرے اور اگر اس بارے میں یقین دہانی کرا دی جائے تو پھر یہ سکیم مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھی جا سکتی ہے۔'' انہوں نے کرپس کو یقین دلایا کہ ''وہ اس سکیم کو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کرتے وقت اسے رد کرنے کی سفارش نہیں کریں گے بلکہ اسے ایک ایسی تجویز کے طور پر پیش کریں گے کہ جس پر غور ہو سکتا ہے اور کارروائی کے دوران اس پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کریں گے۔''[35]

یہ پہلا موقع تھا کہ جناح خود مختار پاکستان کے مطالبے سے کچھ انحراف کرتے ہوئے اور متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے کسی حل کی جانب مائل ہوئے تھے۔ سکیم ب کے مطابق جو خود مختار پاکستان دیا جا رہا تھا وہ وہی تھا جو کہ بعد ازاں وجود میں آیا۔ لیکن

1946ء کے وسط میں یہ جناح کو ''قطعی طور پر نا قابل قبول'' تھا کیونکہ اس میں کلکتہ شامل نہیں تھا جسے وہ پاکستان کے معاشی طور پر زندہ رہنے کے لیے جز ولاینفک سمجھتے تھے۔ اس کی اہمیت محض بندرگاہ کی حیثیت سے ہی نہیں تھی کہ بندرگاہ کا مقصد چٹاگانگ کو ترقی دے کر بھی پورا کیا جا سکتا تھا۔ کلکتہ کی اصل افادیت اس کی صنعتی اور تجارتی حیثیت میں تھی اور جناح اسے مسلمان بورژوازی اور درمیانے طبقے کے فروغ اور ترقی کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس کی خاطر جناح نے پاکستان کو ایک خود مختار ملک کے بجائے متحدہ ہند کے اندر صوبوں کے ایک گروپ کی حیثیت سے قبول کرنا بھی گوارا کر لیا اور سکیم الف پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس سے پیشتر بھی منقسم بنگال و پنجاب پر مبنی پاکستان (سکیم ب) 1944ء میں سی۔ راجگو پال اچاریہ نے مدراس کی کانگرس کمیٹی کی جانب سے تجویز کیا تھا اور پھر یہی سی۔آر۔ فارمولا، جناح۔ گاندھی مذاکرات کی بنیاد بنا تھا۔ اگرچہ ان مذاکرات کی ناکامی کا ایک سبب گاندھی کا وہ منافقانہ رویہ تھا کہ اس نے پاکستان کی تشکیل کا وعدہ برصغیر کی آزادی کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد پر اٹھا رکھا تھا جو قابل اعتبار نہیں تھا۔ لیکن جناح نے بھی اسے کٹا پھٹا پاکستان قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ بعد میں جناح مسلسل اپنے مطالبہ پاکستان میں پورے چھ صوبوں کو شامل کرتے رہے تھے۔ اگرچہ بنگال آسام اور پنجاب کی سرحدوں میں رد و بدل پر بھی آمادگی ظاہر کرتے رہے تھے مگر اس حد تک نہیں کہ جس حد تک کانگرس اور انگریز چاہتے تھے۔ مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے کنونشن منعقدہ دہلی (7 تا 9/ اپریل) میں متفقہ طور پر منظور کردہ قرارداد میں بھی مکمل چھ صوبوں پر مشتمل پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب وزارتی مشن کی جانب سے دوٹوک الفاظ میں واضح کر دیا گیا کہ مسلم لیگ کا مطلوبہ پاکستان کبھی نہیں دیا جائے گا۔ مکمل چھ صوبے لینے ہیں تو گروپ کی صورت میں مل سکتے ہیں خود مختار ملک کی صورت میں نہیں، مکمل خود مختار ملک چاہیے تو وہ پاکستان ملے گا جسے کٹا پھٹا قرار دیا جاتا ہے۔ بڑے علاقے کی خاطر کچھ خود مختاری کی قربانی دو یا خود مختاری کی خاطر کچھ علاقوں کی قربانی دو تو جناح نے بڑے علاقے بالخصوص کلکتہ کی خاطر کچھ خود مختاری کی قربانی دے کر سکیم الف پر غور کرنے کے لیے رضامندی ظاہر کر دی اور اس پاکستان کو قبول کرنے سے گریز کیا جو حقیقتاً بعد ازاں وجود میں آیا۔

سکیم الف کے مطابق برصغیر میں ایک تین سطحی وفاقی یونین کا قیام عمل میں لایا جانا تھا۔

پہلی سطح پر صوبے تھے۔ دوسری سطح پر مسلم اکثریت اور غیر مسلم اکثریت کے صوبوں کے دو گروپ وضع کیے گئے تھے، جنہیں پاکستان گروپ اور ہندوستان گروپ کا نام دیا گیا تھا اور ان کے اوپر تیسری سطح تھی جسے یونین حکومت کا نام دیا گیا تھا۔ دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبے یونین حکومت کی تحویل میں دیئے گئے تھے جب کہ بقیہ شعبے گروپوں اور صوبوں کے لیے چھوڑ دیئے گئے تھے اور گروپ اور صوبوں کے مابین ان کی تقسیم ہر گروپ میں شامل صوبوں کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی تھی۔ گروپوں کو اپنے اندرونی معاملات میں مکمل طور پر بااختیار بنانے کے لیے ہر گروپ کی ایک وفاقی قانون ساز اسمبلی وضع کی گئی تھی۔ البتہ مرکز میں یونین حکومت کے لیے صرف ایگزیکٹو رکھی گئی تھی جس کے ارکان دونوں گروپوں سے مساوی تعداد میں لیے گئے تھے اور یہ کہا گیا تھا کہ اس سکیم میں دیسی ریاستوں کی شمولیت کے بعد بھی مرکزی ایگزیکٹو میں فرقہ وارانہ برابری کو برقرار رکھا جائے گا۔ مرکز میں اسمبلی نہیں رکھی گئی تھی مرکز میں پیدا ہونے والے اختلافی امور دونوں گروپوں کے مابین سمجھوتے سے طے کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی۔[36] یہ سکیم الف کی وہ صورت تھی جو 16/اپریل کو جناح کے ساتھ ملاقات میں مشن کے ارکان اور وائسرائے نے رکھی تھی اور اسی سکیم پر غور کرنے کے لیے 25/اپریل کو کرپس کے ساتھ ملاقات میں جناح نے رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ بعد میں مشن کے ارکان نے اس سے انحراف کی جو صورتیں اختیار کیں ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

سکیم (ا) کے بارے میں صدر کانگرس آزاد کا گرم جوش مؤقف پھر انحراف مگر پھر مذاکرات کی دعوت منظور

26/اپریل کی صبح کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے اجلاس میں جناح کی جانب سے سکیم الف پر غور کے لیے راغب ہو جانے کے پیش نظر اب اس سکیم پر غور کے لیے کانگرس کو رضامند کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کیا۔ مشکل یہ تھی کہ کانگرس اپنی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی (12 تا 15/اپریل) میں اس سکیم میں مجوزہ صوبوں کی گروپنگ کو رد کر چکی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے کنونشن (7 تا 9/اپریل) نے مطالبہ پاکستان کے بارے میں سخت گیر مؤقف اختیار کر کے اور کانگرس ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس

(12 تا 15 / اپریل) میں مضبوط مرکز کی بنیاد پر متحدہ وفاق قائم کرنے اور مسلمانوں کو کسی قسم کی رعایت نہ دینے کا سخت مؤقف اختیار کر کے وزارتی مشن کے ساتھ کسی بھی سودے بازی سے پہلے اپنی انتہائی پوزیشنوں کا اعلان کر دیا تھا۔ جناح نے اپنی انتہائی پوزیشن سے انحراف کرتے ہوئے سکیم الف کو غور وفکر کے لیے قبول کر لیا۔ کانگرس کے صدر آزاد نے کانگرس کی انتہائی پوزیشن سے انحراف کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی حقیقت محض کٹھ پتلی کی سی تھی اس لیے وہاں اس کی ایک نہ چلی۔

26 / اپریل کی صبح کو اپنے اجلاس میں مشن کے ارکان اور وائسرائے کا خیال تھا کہ سکیم الف پر کانگرس کو مائل کرنے کے لیے آزاد کے بجائے گاندھی سے بات کی جائے کیونکہ ان کی رائے میں گاندھی کو خودمختار پاکستان سے تو سخت چڑ تھی لیکن وہ اس سے کم کسی تجویز کو زیر غور لانے کے لیے آمادہ تھا اور اب موقع تھا کہ جناح پہلی بار خودمختار پاکستان سے کم پر بات کرنے کو راضی ہوئے تھے۔ اسی روز کرپس نے پہلے آزاد اور پھر گاندھی سے ملاقات کرنا تھی۔ چنانچہ مشن کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ آزاد کو کچھ نہ بتایا جائے، صرف گاندھی کو جناح کے مؤقف میں نرم روی کے متعلق آگاہ کیا جائے اور اس کے ذریعے کانگرس کو سکیم الف پر غور کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن جب کچھ ہی دیر بعد کرپس نے آزاد کے ساتھ ملاقات کی تو ''آزاد نے خود اپنے طور پر تین سطحی آئین کا سوال اٹھا دیا۔ آزاد نے کانگرس کی اس پُرزور خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کسی تصفیے پر پہنچنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ میرے خیال میں میں ورکنگ کمیٹی کو ایک ایسے وفاق کے لیے راضی کر سکتا ہوں جو دو حصوں میں منقسم ہو اور ہر حصہ اختیاری شعبوں میں اپنے لیے علیحدہ قانون سازی کا اختیار رکھتا ہو۔ اس نے سر سٹیفورڈ (کرپس) سے کہا کہ آپ مسٹر جناح کو بتا سکتے ہیں کہ آپ نے اپنی تجویز پر کانگرس کے صدر کے ساتھ بات چیت کر لی ہے اور یہ کہ آپ پُراعتماد ہیں کہ کانگرس اس حد تک ساتھ دے گی۔ سر سٹیفورڈ نے دریافت کیا کہ اگر مسٹر جناح نے مجھ سے پوچھا کہ آیا کانگرس اس بنیاد پر بات چیت کرنے کے لیے تیار ہے کہ دو فیڈریشنوں کی علیحدہ قانون ساز اسمبلیاں ہوں اور ان کے اوپر ایک یونین قانون ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو ہو جو لازمی شعبوں سے سروکار رکھتی ہو، تو کیا میں مسٹر جناح کو حوصلہ افزا جواب دے سکتا ہوں۔ مولانا نے جواب

میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ میں ورکنگ کمیٹی کو مسلم لیگ کے نمائندوں اور وزارتی وفد کے ساتھ اس امکان کی بنیاد پر مذاکرات کے لیے آمادہ کرلوں گا جس میں کانگرس اس پوزیشن سے شروع کرے گی جس کا میں نے ابھی اظہار کیا ہے اور مسلم لیگ اس پوزیشن سے شروع کرے گی جس میں سطحِ دوئم (یعنی گروپ کی سطح) پر دو قانون ساز اسمبلیاں تجویز کی گئی ہیں۔"[37] یہاں آزاد نے جس مؤقف پر اپنی ورکنگ کمیٹی کو لانے کے بارے میں اظہار کیا تھا اور جسے کانگرس کے لیے مذاکرات شروع کرنے کی پوزیشن سے تعبیر کیا تھا وہ بھی یہی تھا کہ برصغیر کے ایک وفاق کو مزید دو حصوں میں بانٹ دیا جائے گا اور ہر ایک حصہ (یا گروپ) اختیاری شعبوں میں قانون سازی کا کام خود کرے گا۔ آزاد نے برصغیر کو دو گروپوں میں منقسم کرنے اور انہیں اختیاری شعبوں کے لیے قانون ساز اسمبلیاں وضع کرنے کا اختیار دیا جانا نہ صرف خود تسلیم کیا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

ویول لکھتا ہے کہ "آزاد نے کرپس کو تجویز پیش کی کہ کانگرس کے چار نمائندوں، مسلم لیگ کے چار نمائندوں اور وزارتی وفد کے ارکان کے مابین تین سطحی حل پر مذاکرات منعقد ہونے چاہئیں۔" اور پھر آزاد کے مطالبے پر ہی طے پایا کہ یہ مذاکرات شملہ میں منعقد ہوں گے۔ لیکن جب 27/اپریل کو مشن کی جانب سے کانگرس اور مسلم لیگ کو ایک ہی مضمون کا باقاعدہ دعوت نامہ جاری کیا گیا جس میں تین سطحی حل پر مبنی سکیم الف کا خاکہ بیان کیا گیا اور اس بنیاد پر کانگرس اور مسلم لیگ کو وزارتی مشن اور وائسرائے کے ساتھ شملہ میں سہ فریقی مذاکرات کی دعوت دی گئی تھی تو اس کے جواب میں آزاد نے لکھا کہ کانگرس نے کبھی بھی ہندوستان کو مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں کے مابین تقسیم کیا جانا تسلیم نہیں کیا۔ البتہ وہ یہ ضرور تسلیم کرتی ہے کہ بعض صوبے اپنے اختیاری شعبوں میں سے بعض شعبے مرکزی حکومت کو تفویض کر دیں گے جب کہ بعض دوسرے صوبے صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات جیسے لازمی شعبے ہی مرکز کی تحویل میں دے دیں گے۔" دعوت نامے کے اندر صوبوں کے اختیارات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ انہیں "بقیہ اختیارات اعلیٰ حاصل ہوں گے۔" اس میں آزاد کو لفظ "اعلیٰ" پر اعتراض ہوا۔ آزاد نے لکھا کہ اگر مذکورہ دونوں اعتراضات رفع کر دیئے جائیں تو پھر میں اس تجویز کو کانگرس ورکنگ کمیٹی کے سامنے رکھوں گا اور امید ہے کہ دعوت قبول کر لی جائے گی۔[38]

آزاد نے گزشتہ روز کرپس کے ساتھ ملاقات کے دوران جو کچھ کہا تھا اس خط میں اس سے صریحاً انحراف کی وجہ یہ تھی کہ اس کی حیثیت کانگرس میں محض ایک شوبوائے کی تھی۔ اسے ہندو بورژوا نے اپنے سیکولرازم کے منافقانہ نعرے کے لیے جواز مہیا کرنے کی خاطر کانگرس کے صدر کے عہدے پر کٹھ پتلی کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ذاتی طور پر گروپنگ سکیم کا حامی تھا اور آخر تک اس کا حامی رہا لیکن وہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کو اس پر غور کرنے کے لیے بھی مائل نہ کر سکا۔ کانگرس پر اصل کنٹرول گاندھی، نہرو اور پٹیل کو حاصل تھا۔ ورکنگ کمیٹی گاندھی کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ آزاد نے 26/اپریل کو کرپس کے ساتھ ملاقات کے دوران کانگرس ورکنگ کمیٹی پر اثر انداز ہونے کے بارے میں جو یقین دھانی کرائی تھی اور جس کی بنیاد پر سہ فریقی کانفرنس طے پائی تھی، اس یقین دھانی کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اسی روز (یعنی 26/اپریل کو) آزاد نے اعلان کر دیا کہ وہ کانگرس کی صدارت کے عہدے سے نہرو کے حق میں دستبردار ہو رہا ہے جس کی معیاد 16/مئی کو ختم ہو رہی تھی۔

27/اپریل کو آزاد کی جانب سے جو خط سہ فریقی کانفرنس کے سلسلے میں مشن کی دعوت کے جواب میں لکھا گیا اس میں آزاد اپنی گزشتہ روز کی پوزیشن سے قلابازی کھا چکا تھا۔ اس کے خط میں کانگرس ہائی کمان بول رہی تھی۔ مشن کی جانب سے 28/اپریل کو اس کا جواب دیا گیا کہ دعوت نامے میں جو سکیم تجویز کی گئی ہے وہ محض مشن کی جانب سے تصفیے کی مجوزہ بنیاد ہے، کانفرنس میں شرکت کے لیے اسے قبول کرنا شرط نہیں ہے۔ اسی روز اس کے جواب میں آزاد کی جانب سے خط میں کانگرس کا یہ مؤقف پھر دہرایا گیا کہ ''ہم فیڈرل یونین کے اندر رہتے ہوئے صوبوں کے گروپ تشکیل دینا انتہائی غلط سمجھتے ہیں اور وہ بھی مذہبی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر۔'' اور مزید کہا گیا کہ ''فیڈرل یونین کے اندر کوئی بھی سب فیڈریشن مرکز کو کمزور کر دے گی اور یہ بہت غلط ہو گا۔ اس لیے ہم اس قسم کی کسی صورتحال کی حمایت نہیں کریں گے۔'' اس کے ساتھ کانگرس نے اپنا یہ مؤقف بھی دہرایا کہ ایک مضبوط وفاق ہو اور صوبائی یونٹ اس کے دائرے میں خودمختار ہوں۔ اس خط میں کانفرنس میں شرکت کی دعوت قبول کرتے ہوئے آزاد کی جانب سے کانگرس کے چار رکنی وفد کے جن ناموں سے مشن کو آگاہ کیا گیا۔ ان میں خود اس کے علاوہ جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور خان عبدالغفار خان شامل تھے۔ گویا دو مسلمان اور دو ہندو۔ مقصد

یہ فریب دینا تھا کہ کانگرس مسلمانوں کی بھی برابر کی نمائندہ ہے۔ حالیہ انتخابات میں مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی تقریباً سو فیصد کامیابی کے بعد کانگرس کی جانب سے یہ ایک صریحاً شرارت تھی۔ آزاد لکھتا ہے کہ ''ورکنگ کمیٹی نے مجھے اختیار دیا کہ وزارتی مشن کے ساتھ مذاکرات کے لیے نمائندوں کا تقرر کروں۔ چنانچہ میں نے جواہر لال اور سردار پٹیل کو اپنے ہمراہ کانگرس کی نمائندگی کے لیے نامزد کیا۔''[39] سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبدالغفار خان کا نام وفد میں کہاں سے آیا؟ یہ غالباً اس ''ہائی کمان'' کی جانب سے آیا جسے آزاد سمیت سب کانگرسی اپنا باپو کہتے تھے۔ ان حالات میں جب کہ جناح پہلی مرتبہ اپنے مطالبہ پاکستان سے انحراف برتتے ہوئے ایک متحدہ ہندوستان کے ڈھانچے میں مسلمانوں کے لیے صرف ایک علیحدہ گروپ پر بات کرنے کے لیے راضی ہوئے تھے، اس قسم کی اشتعال انگیزی کا صاف مطلب یہ تھا کہ کانگرس مسلمانوں کو سوائے منافقت کے اور کچھ بھی دینے کے لیے تیار نہیں تھی۔

جناح نے شملہ مذاکرات کی دعوت قبول کرتے ہوئے 29/اپریل کو مشن کے نام اپنے مراسلے میں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ارکان کی جانب سے مطالبہ پاکستان کا نام لیے بغیر ان کے اس مؤقف کے متعلق باور کرایا کہ جو ''انہوں نے 1940ء کی قرارداد لاہور میں اختیار کیا اور پھر مسلم لیگ کے اجلاسوں میں مسلسل اس کی توثیق کی جاتی رہی اور حال میں 19/اپریل کو منعقدہ مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے کنونشن نے بھی اس کا اعادہ کیا۔'' مشن کو یہ مزید بتانے کے لیے کہ مسلم لیگ جس خودمختار پاکستان سے کم تر (یعنی گروپ) پر گفتگو کے لیے راضی ہوئی ہے اس کے لیے وہ مسلمان عوام الناس کے سامنے کس قدر پابند ہو چکی ہوئی ہے، مذکورہ مراسلے کے ہمراہ 9/اپریل کے کنونشن کی منظور کردہ قرارداد بھی نتھی کر کے بھیج دی گئی۔ شملہ مذاکرات کے لیے مسلم لیگ کے چار رکنی وفد میں جناح کے ساتھ نواب محمد اسمٰعیل خان، نوابزادہ لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر شامل تھے۔

باب: 10

شملہ مذاکرات 1946ء

کانگرس مضبوط مرکز اور مسلم لیگ صوبوں کی گروپنگ پر مبنی ڈھیلا ڈھالا وفاق چاہتی تھی

5رمئی کی صبح کو شملہ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی وزارتی مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ کانفرنس کی پہلی نشست ہوئی۔ مشن کی جانب سے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے وزیر ہند پیتھک لارنس نے کہا کہ مشن کے ارکان کی رائے میں بعض لازمی شعبہ جات میں ہندوستان کی مرکزی یونین کا ہونا ضروری ہے۔ تاہم ان کا خیال ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے صوبوں کی گروپنگ سے ہی بہترین امید پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کے بعد گروپنگ سکیم پر بحث شروع ہوئی۔ کانگرس کے نمائندوں نے زور دیا کہ یونین حکومت کے پاس دفاع، امور خارجہ اور مواصلات ہی کافی نہیں، اس کے پاس مالیات اور اس کے ذیلی شعبے بھی ہونے ضروری ہیں۔ جناح کا کہنا تھا کہ دفاعی بجٹ دونوں گروپوں کی حکومتیں آپس میں سمجھوتے کے ذریعے طے کرسکتی ہیں۔ اس کے بعد یہ بحث اس نکتہ پر آ گئی کہ یونین حکومت صرف ایگزیکٹو پر مشتمل ہوگی یا اس کی کوئی قانون ساز اسمبلی بھی ہوگی؟ کرپس نے کہا کہ یہ اسمبلی ہونی چاہیے اور اس میں دونوں گروپوں سے مساوی تعداد میں نمائندے لیے جانے چاہئیں۔ جناح نے کہا کہ بحث مباحثے کے لیے گروپوں کی قانون ساز اسمبلیاں ہی کافی ہیں۔ یونین حکومت کی ایگزیکٹو دفاعی اخراجات کے لیے ان اسمبلیوں سے جو مطالبہ بھی کرے گی یہ اس پر معقول رویہ اختیار کریں گی۔ پیتھک لارنس نے بھی مرکز میں اسمبلی کے قیام کی حمایت کی۔ نہرو نے کہا کہ

ایک بے معنی اور کھوکھلے مرکز کو جس کے پاس کوئی اختیارات نہ ہوں، قبول نہیں کیا جا سکتا۔ مرکز میں قانون ساز ادارہ اور ایک مالیاتی نظام موجود ہونا ضروری ہیں۔ مرکز اگرچہ محدود ہو گا لیکن اسے مضبوط اور مستعد ہونا چاہیے۔ نہرو کی رائے یہ تھی کہ مرکز کی قانون ساز اسمبلی کا براہ راست انتخاب ہونا چاہیے لیکن بعض لوگوں (یعنی مسلمانوں) کی تشویش کو رفع کرنے کی خاطر ایک دوسرا ایوان بالواسطہ طور پر منتخب شدہ ہونا چاہیے۔[1] گویا نہرو مرکز میں دو ایوانوں یعنی ایوان زیریں اور ایوان بالا کے قیام کا مطالبہ کر رہا تھا جب کہ جناح مرکز میں ایک ایوان قائم کرنے کے حق میں بھی نہ تھے۔ مشن کے ارکان نے 16 راپریل کی ملاقات میں جناح کو جو گروپنگ سکیم پیش کی تھی اس میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ مرکز میں کوئی اسمبلی نہیں ہو گی صرف ایگزیکٹو ہو گی۔ لیکن اب کرپس اور پیتھک لارنس دونوں کی جانب سے مرکز میں اسمبلی کی حمایت کی جا رہی تھی۔

اسی نکتے پر صبح کا اجلاس برخاست ہو گیا۔ شام کے اجلاس میں پھر یہی مسئلہ اٹھایا گیا۔ کانگرس اور مشن کے ارکان کی جانب سے مرکز میں اسمبلی کے حق میں دلائل دیئے گئے۔ سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی کہ خارجہ پالیسی کے معاملات کو مرکز میں اسمبلی کے بغیر کیسے طے کیا جائے گا اور یہ کہ وزیر خارجہ کس کو جواب دہ ہو گا۔ جناح کا جواب یہ تھا کہ وہ دونوں گروپوں کی اسمبلیوں کو جواب دہ ہو گا اور دونوں گروپوں کے مابین خارجہ امور پر افہام و تفہیم کی وہی صورت پیدا کی جائے گی جو اس وقت دولت مشترکہ کے ملکوں کے مابین پائی جاتی ہے۔ مشن کے ارکان کا جواب تھا کہ دولت مشترکہ کے ممالک کے مابین کوئی یکساں خارجہ پالیسی موجود نہیں ہے۔ تاہم جناح نے کہا کہ وہ یونین میں مرکزی اسمبلی کے قطعی طور پر خلاف ہیں۔ اس کے بعد یونین ایگزیکٹو کے بارے میں بحث ہوئی جس میں جناح نے مؤقف اختیار کیا کہ اس کے ارکان میں دونوں گروپوں سے مساوی تعداد لی جائے گی اور گروپوں کی اسمبلیاں انہیں منتخب کر کے بھیجیں گی۔ پیتھک لارنس نے جناح کے ساتھ اتفاق کیا۔ مزید گفتگو کے دوران جناح نے بالآخر مرکز میں اسمبلی کے قیام پر اتفاق کر لیا۔ اس کے ارکان کے انتخاب کے بارے میں انہوں نے کہا کہ اگر مرکز میں اسمبلی قائم ہوئی تو اس کے ارکان دونوں گروپوں سے مساوی تعداد میں لیے جائیں اور بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ ان کا انتخاب گروپوں کی اسمبلیاں عمل میں

لائیں۔ نہرو نے کہا کہ مرکزی اسمبلی میں گروپوں کی نمائندگی کے تناسب پر محتاط جائزے کی ضرورت ہے۔ ویول نے کہا کہ ہمیں ہندوستانی صورتحال کے غیر معمولی خدوخال کو بھی ملحوظ رکھنا ہو گا۔ اس کے بعد نہرو نے اسمبلی میں گروپوں کی مساوی نمائندگی کی تجویز پر مزید کوئی اعتراض وارد نہ کیا اور نہ ہی ''محتاط جائزے کی ضرورت'' پر زور دیا۔ جہاں تک صوبوں کی گروپنگ کا تعلق تھا تو اس پر کانگرس نے اگرچہ 28/اپریل کے آزاد کے خط کے ذریعے اس کی مخالفت کی تھی لیکن صبح کے اور پھر شام کے مذکورہ اجلاسوں میں کانگرسی نمائندوں نے گروپنگ پر کوئی اعتراض وارد نہ کیا بلکہ اس بنیاد پر یونین کی اسمبلی اور ایگزیکٹو کی تشکیل کے معاملات زیر غور رہے۔

اگلے روز صبح کو اجلاس شروع ہونے سے پیشتر ہی آزاد کی جانب سے مشن کے ارکان کو ایک خط موصول ہوا جس میں کانگرس نے اس بنیاد کو تباہ کر دیا جس پر ان مذاکرات کا آغاز ہوا تھا۔ خط میں کہا گیا کہ ''ہمارے سامنے بنیادی مسئلہ ہندوستان کی آزادی اور یہاں سے برطانیہ کا اخراج ہے۔ باقی معاملات اس کے ذیل میں آتے ہیں اور ان پر مناسب طور سے بات چیت اور کوئی فیصلہ آئین ساز اسمبلی ہی میں ہوسکتا ہے۔ یہ اسمبلی آزاد ہندوستانی قوم کے ارادوں کی آئینہ دار ہوگی اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گی۔ یہ پہلے سے بنے کسی بندوبست کی پابند نہیں ہوگی۔'' مزید کہا گیا کہ ''ہماری کل کی بات چیت میں بار بار صوبوں کے 'گروپوں' کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے جو کہ باہم مل کر کام کریں گے اور یہ بھی تجویز کیا گیا کہ اس قسم کے گروپ کی اپنی قانون ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو بھی ہوگی۔ گروپنگ کا یہ طریقۂ کار ہمارے مابین ابھی تک زیر بحث نہیں آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بات چیت اسی مفروضے پر ہو رہی ہے۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم صوبوں کے گروپ یا فیڈریشن کے یونٹوں کی سطح پر قانون ساز ادارے یا ایگزیکٹو کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں۔ یہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم سب فیڈریشن (ماتحت وفاق) تو ضرور ہی بن جاتی ہے اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ہم اسے قبول نہیں کرتے۔ اس کے نتیجے میں تین سطحوں پر ایگزیکٹو اور قانون ساز ادارے وجود میں آجائیں گے۔ یہ نظام بے ڈھنگا، جامد اور بے جوڑ ہوگا اور مستقل اختلاف کا شاخسانہ ثابت ہوگا۔ ہمارے علم میں نہیں ہے کہ کسی بھی اور ملک میں یہ نظام رائج ہے۔ ہماری پختہ رائے کے مطابق تقسیم ہند کی کوئی تجاویز اس کانفرنس میں زیر بحث لانے کے دائرہ میں شامل نہیں ہیں۔ اگر ان تجاویز کو پیش کیا

جانا ہے تو انہیں صرف آئین ساز اسمبلی میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے جو موجودہ حکمران قوت کے اثر سے بالکل آزاد ہو گی۔ ہم ایک اور نکتے کی وضاحت بھی کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم ایگزیکٹو یا قانون ساز اسمبلی میں گروپوں کے مابین برابری (پیریٹی) کی تجویز کو قبول نہیں کرتے۔ ہمیں احساس ہے کہ مختلف گروپوں اور فرقوں کے ذہنوں میں موجود شکوک اور خدشات کو دور کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے ایسے غیر حقیقت پسندانہ طریقے اختیار نہیں کئے جا سکتے جو جمہوریت کے بنیادی اصولوں ہی کے خلاف جاتے ہوں کہ انہی اصولوں پر ہم اپنے آئین کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔''[2]

یاد رہے یہ اسی ابوالکلام آزاد کا خط تھا جس نے 26ر اپریل کو کرپس کے ساتھ ملاقات میں اس سے کہا تھا۔ ''میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کو ایک ایسے وفاق کے لیے راضی کر سکتا ہوں جو دو حصوں میں منقسم ہو اور ہر حصہ اختیاری شعبوں میں اپنے لیے علیحدہ قانون سازی کا اختیار رکھتا ہو۔'' لیکن گروپنگ سکیم کا حامی آزاد اپنے ہندو آقاؤں کو اس سکیم کے لیے راضی نہ کر سکا۔ وہ مشن کے نام 27 اور 28ر اپریل کے مراسلوں ہی میں قلابازی کھا گیا ہوا تھا۔ تاہم شملہ کانفرنس کے پہلے روز (5ر مئی) کے صبح و شام کے اجلاسوں میں گروپنگ کے حوالے سے یونین (مرکز) کا آئینی ڈھانچہ زیر بحث رہا اور آزاد، نہرو، پٹیل اور غفار خان اس میں شریک رہے لیکن اگلے روز صبح کے اجلاس سے پہلے ہی مذکورہ مراسلہ بھیج کر 5ر مئی کے اجلاسوں کی تمام تر گفتگو کو رد کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کانفرنس میں شامل کانگرسی رہنماؤں سے زیادہ فیصلہ کن حیثیت کانفرنس میں براہ راست نہ شامل مہاتما گاندھی کو حاصل تھی جو شملہ میں موجود تھا اور کانفرنس سے باہر بیٹھ کر کانگرسی رہنماؤں کی ڈوریاں ہلاتا تھا۔ آزاد لکھتا ہے کہ ''گاندھی جی مذاکراتی وفد کے باقاعدہ رکن نہ تھے لیکن مشن نے ان کو بھی شملہ آنے کی دعوت دی تھی تاکہ صلاح و مشورہ کے لیے وہ وہاں دستیاب رہیں۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی اور وہ منورولا میں ٹھہرے۔ ہم ورکنگ کمیٹی کے غیر رسمی اجلاس وہیں منعقد کرتے تھے تاکہ گاندھی جی بھی ان میں شریک ہو سکیں۔''[3] چنانچہ آزاد کی جانب سے 6ر مئی کی صبح کو مشن کے نام مراسلے میں ورکنگ کمیٹی کے جن خیالات سے آگاہ کیا گیا تھا ان پر گاندھی کی مہر بھی لگی ہوئی تھی۔ تنگ نظر ہندو بورژوا کے یہ نمائندے متحدہ ہند کے ڈھانچے میں مسلمانوں کو کوئی سیاسی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

6رمئی کو جب کانفرنس کی صبح کی نشست کا آغاز ہوا تو کانگرس کا وفد گروپنگ سکیم کے خلاف سخت گیر مئوقف اختیار کر چکا تھا۔ نہرو نے نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ گروپ کی ایگزیکٹو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین ایک غیر ضروری ادارہ بن جائے گی اور انتظامی امور میں خلل اندازی کا باعث بنے گی۔ اس نے مزید کہا کہ ویسے بھی صنعت کاری اور ترقی صرف کل ہند بنیادوں پر ہی ممکن ہے۔ اس نے کہا کہ کانگرس کی رائے میں سب سے پہلا کام ہند۔ برطانیہ تعلقات کے مسئلے کو عملاً حل کرنے کا ہے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ بعد میں بھی حل ہوسکتا ہے۔ کانگرس ہندوستان کے حصے بخرے کرنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرنا نہیں چاہتی۔ یونین آف انڈیا کے پاس خواہ محکموں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو، اسے مضبوط اور نامیاتی ہونا چاہیے۔ صوبوں کو آپس میں صحت اور تعلیم جیسے محکموں میں باہمی تعاون کی اجازت ہوگی لیکن اس کے لیے ان کو گروپ ایگزیکٹو بنانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس نے لیگ سے اپیل کی کہ وہ آئین ساز ادارے میں شامل ہو جائے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ کوئی جبر نہیں ہوگا۔ جناح نے جواب میں کہا کہ ''ہم اس دعوت کو قبول نہیں کر سکتے۔ تاہم اگر کانگرس اور مسلم لیگ اس امر پر متفق ہو جائیں کہ مسلمان صوبے آپس میں مل کر ایک گروپ بنالیں گے اور اپنی علیحدہ قانون ساز اسمبلی اور ایگزیکٹو تشکیل کر سکیں گے تو پھر بلا شبہ کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اگر کانگرس گروپوں کو تسلیم کر لے تو مسلم لیگ بھی یونین کو تسلیم کر لے گی۔ اس کا نظام تصفیہ طلب رہ جائے گا۔'' لیکن کانگرس نے اتفاق نہ کیا۔ صبح کا اجلاس یہیں ختم ہو گیا۔

شام کے اجلاس میں نہرو نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ ''گروپنگ کا سوال اس وقت پیدا ہوگا۔ جب آئین بن چکا ہوگا۔ سب سے پہلے یونین کے کردار کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد صوبے یونین کے آئین میں دیئے گئے حق خوداختیاری کو استعمال کر سکتے ہیں اور صوبائی نمائندے آل انڈیا آئین ساز ادارے میں گروپنگ کی تجاویز لے کر آ سکتے ہیں۔ اب یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ آل انڈیا آئین ساز ادارہ ان معاملات کا کیا فیصلہ کرے گا۔ آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں نئی قوتیں برسرعمل ہوں گی۔ پرانی سیاسی جماعتیں یہ یقین دہانی نہیں کرا سکتیں کہ ہندوستان اس وقت کیا اقدام اختیار کرے گا۔'' کرپس نے کہا کہ صوبوں کو آئین ساز

ادارے کے جز و کی حیثیت سے مل بیٹھنے اور گروپ بنا لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ نہرو نے کہا کہ ''جب کانگرس صوبوں کی خوداختیاری کی بات کرتی ہے تو اس کا مطلب اندرونی خود اختیاری ہوتا ہے۔ یہ ایک بالکل ہی دوسری بات ہو جاتی ہے کہ خوداختیاری کو آئین ساز ادارے کا ایک نیا جز و تشکیل دینے کے لیے استعمال کیا جائے جو کہ اس کی صوبائی حدود سے باہر ہے۔ بعض صوبے گروپ بنانا پسند کریں گے بعض نہیں کریں گے۔ بعض صوبے اس مسئلے پر تقسیم ہو جائیں گے۔ پنجاب کے سکھ اور ہندو جو وہاں ایک بڑی اقلیت ہیں، شمال مغربی صوبوں کے گروپ میں پنجاب کی شمولیت کے خلاف ہوں گے۔'' اس کے بعد مشن کے ارکان اور وائسرائے نہرو کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ آئین ساز ادارے سے پہلے اگر بڑی پارٹیوں کے مابین گروپنگ کے بارے میں کوئی تصفیہ ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ آئین ساز ادارہ انتشار کا شکار ہو جائے گا جس کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ لیکن نہرو اور آزاد نے گروپنگ کی بنیاد پر کوئی تصفیہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جناح نے کہا کہ ''میں تو اس فارمولے کی بنیاد پر چل رہا تھا جو دعوت نامے میں پیش کیا گیا تھا۔ مکمل تقسیم سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ صوبوں کو گروپ بنانے کا اختیار دیا جائے۔ وہ اپنا آئین ساز ادارہ وضع کر دیں جو قانوناً نہ سہی لیکن بالفعل مقتدر اعلیٰ کا درجہ رکھتا ہو۔ گروپوں کے آئین ساز ادارے سوائے ان تین شعبوں کے جو یونین کو دیئے جائیں گے باقی تمام معاملات طے کریں جن میں صوبوں کے آئین بھی شامل ہوں۔'' آگے چل کر یونین کی میعاد کے بارے میں جناح نے رائے پیش کی کہ شروع میں یہ پانچ سال ہونی چاہیے۔ اے۔ وی۔ الیگزینڈر نے کہا کہ یہ کم ہے، پندرہ سال ہونی چاہیے۔ اس موقع پر سردار پٹیل نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ یہیں سے گروپنگ سکیم کے پس پردہ عزائم بے نقاب ہوجاتے ہیں۔ جناح نے جواب میں کہا کہ میں یونین کے بالکل خاتمے کے حق میں نہیں ہوں لیکن اگر تجربے کی روشنی میں اس کا چلنا مشکل ہو جائے تو کوئی آئینی وسیلہ ایسا ہونا چاہیے جس کے ذریعے اسے ختم کیا جاسکتا ہو۔ کرپس نے کہا کہ ایسی ہی شق گروپوں کے بارے میں بھی ہونی چاہیے۔ اس موقع پر اجلاس 8رمئی سہ پہر تک کے لیے ملتوی ہو گیا۔[4]

ہندو بورژوا کی تنگ نظری اور مذاکرات کی ناکامی

ابھی تک کانفرنس کے دو روز اور چار اجلاس ہو چکے تھے لیکن دونوں پارٹیوں کے مابین اختلافات کی خلیج کم ہونے کے بجائے وسیع تر ہوئی تھی۔ اگرچہ مسلم لیگ مسلمانوں کے لیے آزاد و خودمختار ملک پاکستان کے مطالبے سے انحراف کر کے متحدہ ہند میں رہتے ہوئے مسلم اکثریت کے صوبوں کا علیحدہ گروپ بنانے پر راضی ہو گئی تھی اور اسی بنیاد پر ان مذاکرات میں شریک ہوئی تھی لیکن کانگرس نے اپنے مؤقف میں ذرا سی لچک بھی پیدا نہ کی تھی۔ تنگ نظر ہندو بورژوا متحدہ ہند کے اندر مسلمانوں کے لیے الگ سے کوئی گنجائش پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ان کو نہ تو مرکز میں مساوی نمائندگی دینے کے لیے آمادہ تھا اور نہ ان کے صوبوں کو گروپ بنا کر انہیں معاشی و معاشرتی ترقی کی راہ پر چلنے کی اجازت دینا چاہتا تھا۔ وہ ایک مضبوط مرکز کے تحت پورے برصغیر پر بلاشرکت غیرے حکومت کرنے کا وہ حق حاصل کرنا چاہتا تھا جو گزشتہ کم وبیش ایک سو برس سے انگریزوں کو حاصل تھا۔ جناح پہلے تو قانون سازی کا حق صرف گروپوں تک رکھنے اور مرکز میں صرف ایگزیکٹو بنانے کے حامی تھے۔ مگر دوران گفتگو وہ مرکز میں بھی مجلس قانون ساز تشکیل دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن کانگرس جناح کی کسی لچک کو خاطر میں نہ لائی اور بدستور مضبوط مرکز کے اپنے تصور کے ساتھ چمٹی رہی۔

مشن کے ارکان اور وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ گروپنگ سکیم کے بارے میں گاندھی کو قائل کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ وہ 8رمئی کے اجلاس میں دونوں جماعتوں سے یہ سکیم قبول کر لینے کی درخواست کرنے جا رہے تھے۔ چنانچہ 6رمئی کو شام کا اجلاس ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد انہوں نے گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ اس ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے ویول لکھتا ہے کہ پہلے اس نے گاندھی کے ساتھ گفتگو کی اور پھر مشن کے ارکان بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن ان سب کو اس وقت بہت مایوسی ہوئی جب گاندھی نے صاف کہہ دیا کہ ''یہ سکیم تو پاکستان سے بھی بدتر ہے۔'' اور یہ کہ وہ اس کے لیے کانگرس سے سفارش نہیں کرسکتا۔ گاندھی نے ان سے کہا کہ آپ یا تو مکمل طور پر کانگرس کا نقطۂ نظر تسلیم کر لیں یا پھر مکمل طور پر مسلم لیگ کا مؤقف مان لیں، لیکن کوئی درمیانی راہ اختیار نہیں کی جاسکتی۔ بقول ویول ''معلوم ہوتا تھا کہ

گاندھی نے خانہ جنگی کے امکانات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ میرا خیال ہے اس نے پٹیل کا یہ نظریہ اختیار کر لیا تھا کہ اگر ہم ڈٹے رہیں تو مسلمان نہیں لڑیں گے۔''[5] ہندو بورژوا کی اسی ہٹ دھرمی اور تنگ نظری کی وجہ سے برصغیر کو متحد رکھنے کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ جب کہ انگریزوں کی پوری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طور برصغیر میں ان کی قائم کردہ سیاسی وحدت برقرار رہ جائے تا کہ ان کے عالمی مفادات کا تحفظ ہو سکے اور اب تو جناح بھی آزاد و خود مختار پاکستان سے کم تر حل کے لیے ''درمیانی راہ'' اختیار کرنے پر آمادہ تھے۔

انگریز اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک اور کوشش کرنے کے لیے 7رمئی کی شام کو کرپس نے گاندھی کے ساتھ اور ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات کی۔ کرپس نے ملاقات کے بعد آ کر وائسرائے اور مشن کے دوسرے ارکان کو اطلاع دی کہ گاندھی مجوزہ تجاویز کے خاکے کو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا ہے اور اس نے کہا ہے کہ ان تجاویز کو ایک خط کی شکل میں دونوں پارٹیوں کو بھیج دیا جائے اور 8رمئی کے مجوزہ اجلاس کو چوبیس گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ ویول کا اس پر تاثر یہ تھا کہ اگرچہ کرپس چالاک آدمی ہے لیکن گاندھی نے اسے بیوقوف بنا دیا ہے۔ اسی شام کو جناح نے بھی ویول سے ملاقات میں کانگرس پر مکمل بے اعتمادی کا اظہار کیا تھا۔ ویول نے جناح کو ان نتائج سے آگاہ کیا تھا جو تصفیے کے حصول میں ناکامی سے پیدا ہو سکتے تھے اور ان میں ہندوستانی فوج کا دو حصوں میں بٹ جانا اور پنجاب کی تقسیم شامل تھے۔ جناح نے جواب میں کہا کہ ''آپ جو مناسب اور جائز سمجھیں کر ڈالیں، ہم پر زیادہ دباؤ مت ڈالیں۔''[6] یعنی تصفیہ نہ ہونے کی صورت میں انگریزوں کی جانب سے جس ایوارڈ کے اجراء کا ویول نے اشارہ دیا اور جناح پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی وہ منقسم پنجاب اور منقسم افواج ہندوستان پر مبنی پاکستان پر مشتمل تھا اور جناح نے اسے قبول کرنے میں ایک بار پھر تامل کا اظہار کر دیا تھا۔ جناح یا تو خود مختار بڑا پاکستان چاہتے تھے اور یا پھر متحدہ ڈھانچے میں رہتے ہوئے بڑے پاکستان کے احاطے میں آنے والے علاقے پر مبنی گروپ پر سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ انگریزوں کو پہلی صورت قابل قبول نہ تھی البتہ وہ دوسری صورت پر تصفیہ کرانے کے لیے پوری طرح کوشاں تھے۔ جب کہ کانگرس کو دونوں صورتیں ہی ناقابل قبول تھیں۔

8رمئی کو ویول نے ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ ملاقات کی جو کانگرس کے انتہا پسندوں

میں شمار کیا جاتا تھا۔ ویول لکھتا ہے کہ ''وہ (پٹیل) شروع میں کسی بھی سمجھوتے کا سختی سے مخالف تھا سوائے اس کے کہ جو مکمل طور پر ہندو غلبہ پر مبنی ہو۔ اس نے کہا کہ جلد یا بدیر مسلمانوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہی ہوں گے اور بہتر ہوگا اگر یہ لڑائی ابھی کر لی جائے اور یہ قصہ ختم کر دیا جائے۔ میں نے جس قدر ممکن تھا زور دے کر اسے سمجھایا کہ اگر اس وقت ہندوستان کو گڑبڑ کی نذر کر دیا گیا تو اس کے کیا نتائج نکلیں گے اور یہ کہ اس وقت خانہ جنگی کو ہوا دینا جب کہ عقل سلیم سے کام لے کر اسے درگزر کیا جا سکتا ہے، محض دیوانہ پن ہوگا۔''[7] لیکن یہ معاملہ سمجھنے سمجھانے یا عقل سلیم کا نہیں تھا، ہندو بورژوا کے مفادات کا تھا جو اس کی نمائندہ کانگرس پارٹی کی رائے میں پورے برصغیر کو ہندو غلبہ کے ماتحت رکھ کر ہی پورے ہو سکتے تھے۔

گاندھی کی تجویز کے مطابق 8رمئی کو مشن کی جانب سے گروپنگ کی مجوزہ سکیم تحریری شکل میں خط کے ذریعے دونوں پارٹیوں کو ارسال کر دی گئی اور 8رمئی سہ پہر کا اجلاس 9رمئی سہ پہر تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس سکیم کا متن یہ تھا:

1۔ آل انڈیا یونین کی ایک حکومت اور قانون ساز اسمبلی ہوگی جس کی تحویل میں امور خارجہ، دفاع، مواصلات، بنیادی حقوق کے شعبے ہوں گے اور اسے ان شعبوں کے لیے درکار ذرائع آمدنی کے لازمی اختیارات حاصل ہوں گے۔

2۔ بقیہ تمام اختیارات صوبوں کے سپرد ہوں گے۔

3۔ صوبوں کے گروپ بھی بنائے جا سکیں گے اور انہیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ صوبائی شعبوں میں جن کو چاہیں گروپ کی سطح پر مشترک رکھیں۔

4۔ گروپ اپنی ایگزیکٹو اور قانون ساز اسمبلی تشکیل دے سکیں گے۔

5۔ یونین کی قانون ساز اسمبلی میں مسلم اکثریتی صوبوں اور ہندو اکثریتی صوبوں سے برابر کی تعداد میں نمائندے لیے جائیں گے خواہ یہ صوبے باہم مل کر گروپ تشکیل دیں یا نہ دیں۔ علاوہ ازیں ریاستوں کے نمائندے بھی اس میں شامل ہوں گے۔

6۔ یونین کی حکومت کی تشکیل میں بھی وہی تناسب ملحوظ خاطر رکھا جائے گا جو قانون ساز اسمبلی میں رکھا گیا ہے۔

7- یونین اور گروپوں کے آئینوں کے اندر یہ شق رکھی جائے گی کہ کوئی صوبہ اپنی قانون

ساز اسمبلی کی کثرت رائے سے ابتدائی دس برس کے بعد آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکتا ہے اور اسے ایسا ہر دس سال بعد کرنے کا حق ہوگا۔ نظر ثانی کے لیے ویسا ہی ادارہ تشکیل دیا جائے گا جیسا کہ ابتدا میں آئین ساز اسمبلی تشکیل دی جائے گی اور اس میں ووٹنگ کا طریقہ بھی وہی رہے گا اور اسے آئین میں کسی بھی قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

8۔ مذکورہ بالا بنیادوں پر آئین کی تشکیل کے لیے آئین سازی کا نظام درج ذیل طریقے سے وضع کیا جائے گا۔

ا۔ ہر صوبائی اسمبلی سے اس میں موجود پارٹیوں کی قوت کے تناسب سے نمائندے چنے جائیں گے جن کی کل تعداد اسمبلی کے ارکان کا دسواں حصہ ہوگی۔

ب۔ ریاستوں سے نمائندے ان کی آبادی کی بنیاد پر اسی تناسب سے لیے جائیں گے جس پر برطانوی ہند سے لیے جائیں گے۔

ج۔ اس طرح وضع ہونے والی آئین ساز اسمبلی کا نئی دہلی میں جلد از جلد اجلاس منعقد کیا جائے گا۔

د۔ ابتدائی اجلاس میں صرف عمومی نوعیت کے معاملات طے کرنے کے بعد یہ اسمبلی تین حصوں میں بٹ جائے گی۔ ایک حصہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا نمائندہ ہوگا۔ دوسرا مسلم اکثریت کے صوبوں کا نمائندہ ہوگا اور تیسرا حصہ ریاستوں کا نمائندہ ہوگا۔

ہ۔ پہلے دو حصوں کا الگ الگ اجلاس ہوگا۔ جس میں اپنے گروپ کے صوبوں کے آئین وضع کئے جائیں گے اور پھر وہ چاہیں تو گروپ کا آئین بھی تشکیل دے سکتے ہیں۔

و۔ جب یہ سب طے ہو جائے تو پھر ہر صوبے کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ چاہے تو اپنے ابتدائی گروپ سے نکل کر دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے یا دونوں گروپوں سے خود کو باہر رکھے۔

ز۔ اس کے بعد تینوں حصے پھر یکجا ہو کر اجلاس منعقد کریں گے اور مذکورہ بالا 1 تا 7 نمبر پیراگرافوں کے خطوط پر یونین کا آئین وضع کریں گے۔

ح۔ یونین کے آئین میں کوئی ایسا بڑا نکتہ جس سے فرقہ وارانہ مسئلہ متاثر ہوتا ہو،

اسمبلی کی طرف سے اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک دونوں بڑے فرقوں کی اکثریت اُس کی حمایت نہ کر دے۔"[8]

گاندھی، جس سے گزشتہ شام ملاقات کے بعد کرپس نے آ کر کہا تھا کہ وہ مجوزہ تجاویز کو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا ہے، کانگرس کے نام بھیجے گئے خط کو جس میں یہ تجاویز مرقوم تھیں دیکھ کر مشتعل ہو گیا اور اس سے پہلے کہ کانگرس کی جانب سے سرکاری طور پر کوئی جواب بھیجا جاتا 8رمئی ہی کو گاندھی نے کرپس کو ایک مراسلہ بھیج کر اپنے ردعمل کا اظہار کر دیا۔ اس نے لکھا کہ "کانگرس کے چاروں نمائندوں کے مابین ان تجاویز پر گرما گرم بحث ہوئی ہے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اگر وہ ان تجاویز سے اتفاق کر لیں تو وہ ان کے پابند ہو جائیں گے اور کانگرس بھی ان کی تردید نہ کرنے کی صورت میں ان کی پابند تصور کی جائے گی۔ یہی صورت مسلم لیگ کی ہو گی۔ جو کچھ گزشتہ رات آپ نے مجھے بتایا تھا اس کی بنیاد پر میں نے ان کو بتایا ہے کہ وہ کسی شے کے بھی پابند نہیں ہوں گے۔ آئین ساز اسمبلی اس معاملے میں آزاد ہو گی کہ وہ ان میں سے کسی بھی تجویز کو رد کر دے اور دونوں وفدوں کے ارکان بھی آئین ساز اسمبلی میں ان تجاویز میں اضافے یا ترمیم کرنے کے برابر مجاز ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان تجاویز کی حیثیت محض پھندے کی سی ہے۔ جس کے ذریعے دونوں جماعتوں کو مسودے میں مذکور آئین ساز اسمبلی میں کھینچ کر لایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اس امر کی تصدیق کر سکتے ہیں اور اس سلسلے میں بیان جاری کرنے کے مجاز ہیں تو بہت بڑی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔

"جہاں تک (مجوزہ سکیم کے) حسن و قبح کا تعلق ہے تو چھ ہندو اکثریتی صوبوں اور پانچ مسلم اکثریتی صوبوں کے مابین برابری کا اصول (یعنی پیریٹی) ایک ایسا امر مانع ہے جس کو درگزر نہیں کیا جا سکتا۔ مسلم اکثریت کے صوبے نو کروڑ کے لگ بھگ آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ ان کے مقابلے میں ہندو اکثریت کے صوبے انیس کروڑ کی آبادی کے نمائندہ ہیں۔ واقعتاً یہ تجویز تو پاکستان سے بھی بدتر ہے۔ اس کی بجائے میری تجویز یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی آبادی کی بنیاد پر تشکیل پانی چاہیے اور ایگزیکٹو وضع کرنے کی بھی یہی بنیاد ہونی چاہیے۔ اگر آپ اسے ناواجب سمجھتے ہیں تو پھر ایک غیر جانبدار غیر برطانوی ٹریبونل مقرر کیا جانا چاہیے جو اس پر ایوارڈ دے جیسا کہ کسی بھی ایسے اختلافی مسئلے پر دیا جاتا ہے جس پر کسی بھی طور سے تصفیہ

نہ ہو رہا ہو۔ اگر یہ دو نکتے صاف ہو جائیں تو میرا راستہ بھی صاف ہو جاتا ہے۔"[9] گاندھی کا یہ خط، جسے ٹاٹا گروپ کا ایک کارندہ سدھیر گھوش لے کر کرپس کے پاس آیا تھا، واضح طور پر تنگ نظر ہندو بورژوا کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا کہ جس نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوئی گنجائش پیدا نہ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

9رمئی کو کرپس نے اس خط کے جواب میں گاندھی کو لکھا کہ "جہاں تک آپ کے دریافت کردہ پہلے نکتے کا تعلق ہے تو میرے خیال میں اس کا مطمع نظر یہ ہے کہ: اگر کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندے نئے آئین کے لیے کسی اصول پر متفق ہو جاتے ہیں تو پھر معتبر ہونے کے ناطے یہ لوگ بھرپور کوشش کریں گے کہ آئین ساز اسمبلی وہی کچھ منظور کرے جس پر یہ پہلے ہی متفق ہو چکے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے اس میں کمی واقع کرنا اپنے قول سے پھرنے کے مترادف ہوگا۔ جہاں تک دوسرے نکتے یعنی مرکز میں برابری کا تعلق ہے تو مجھے آپ کی تکلیف کا پورا احساس ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ "یہ پاکستان سے بھی بدتر ہے"۔ اگر اس مسئلے کو لیگ کی رضامندی کے ساتھ کسی قسم کی بین الاقوامی ثالثی کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہو تو اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہے۔"[10] اس طرح کرپس نے گاندھی کا "راستہ صاف" کر دیا یعنی اس کے نزدیک بھی ان مذاکرات کا مقصد دونوں جماعتوں کو متفقہ آئین وضع کرنے کے لیے ایک متحدہ آئین ساز اسمبلی کے اندر لے کر آنا ہی تھا جس کی کہ جناح شدت کے ساتھ مخالفت کرتے آئے تھے۔ اسی طرح وہ مرکزی اسمبلی میں ہندو اور مسلم گروپوں کے نمائندوں کی برابر تعداد کے مسئلے پر ثالثی کے لیے بھی آمادہ تھا۔ گویا 8رمئی کو مشن نے دونوں پارٹیوں کو تحریری طور پر جو سکیم پیش کی تھی اور جس کو تصفیے کی بنیاد بنا کر 9رمئی سہ پہر کا اجلاس ہونا قرار پایا تھا۔ اجلاس کے انعقاد سے پہلے ہی مشن کے اہم رکن کرپس نے اس سکیم سے واضح انحراف کرنے پر گاندھی کے ساتھ اتفاق کر لیا تھا۔ کرپس کی جانب سے، مسلم لیگ سے بالا بالا، گاندھی اور کانگرس کے ساتھ یہ ساز باز، مسلم لیگ کے ساتھ صریح منافقت اور دو عملی کا ثبوت تھا۔ درحقیقت مشن کے ارکان کی جانب سے شروع ہی سے گاندھی اور کانگرس کے ساتھ بے حد فراخدلانہ اور دوستانہ رویئے کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ 8رمئی کو مشن کی جانب سے مجوزہ سکیم میں پہلے ہی اس سکیم سے انحراف برتا جا چکا تھا جو 27راپریل کو تجویز کی گئی تھی اور جس کی بنیاد پر شملہ مذاکرات شروع ہوئے تھے۔

جناح نے 8رمئی کو مشن کی جانب سے موصولہ مراسلہ کا جواب دیتے ہُوئے اسی روز مشن کے نام اپنے خط میں اس انحراف پر احتجاج کیا اور لکھا کہ ''پہلے آپ نے ایک فارمولا پیش کیا جس کی بنیاد پر مذاکرات شروع ہوئے۔ 5اور 6رمئی کی طویل بات چیت میں کانگرس نے تین شعبوں کی حامل یونین (مرکز) کو بالکل رد کر دیا، اب آپ نے بات چیت کے لیے ایک نئی سکیم پیش کر دی ہے۔ جس میں یونین حکومت کے شعبوں کی تعداد کو بڑھا کر اس میں ''بنیادی حقوق'' نامی ایک نیا شعبہ شامل کر دیا گیا ہے اور یہ بھی وضاحت نہیں کی گئی کہ آیا یونین حکومت ٹیکسوں کے ذریعے اپنے ذرائع آمدنی کا انتظام کرنے کا اختیار رکھے گی یا نہیں اور یہ بھی کہ اس میں ایک متحدہ آئین ساز اسمبلی کا ذکر کیا گیا ہے جس کو ہم کبھی تسلیم نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہم آئین سازی کا نظام وضع کرنے کے مجوزہ طریق کار سے اتفاق کرتے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کے تجویز کردہ اس خاکے پر گفت وشنید بے کار ثابت ہوگی جس میں آپ ابتدائی فارمولے سے مکمل انحراف کر چکے ہیں۔ تاہم اگر آپ پھر بھی چاہیں تو ہم کل کے اجلاس میں شریک ہو جائیں گے۔''[11] لیکن جناح کو معلوم نہ تھا کہ اس دوران گاندھی اور کرپس نے اس نئے تجویز کردہ خاکے سے بھی انحراف کی راہیں نکال لی ہوئی تھیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ 9رمئی کو مشن کی جانب سے پیتھک لارنس نے جناح کو جواب دیتے ہوئے لکھا کہ ہم نے جو تجاویز پہلے پیش کی تھیں ان کی کوئی حتمی حیثیت نہ تھی اور نہ ہی دونوں جماعتوں کو ان تجاویز کا پابند کیا گیا تھا وہ تو محض ہماری جانب سے مذاکرات کی ایک بنیاد کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ ان مذاکرات کا مقصد تصفیے پر پہنچنے کے لیے ہر امکان کو تلاش کرنا ہے۔ ہم کل کے اجلاس میں آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔''[12]

9رمئی کی صبح کو سٹیفورڈ کرپس کے ذاتی معاون میجر وڈرو وائٹ نے جناح کے ساتھ ملاقات کی اور ایک نوٹ کے ذریعے مشن کو اس ملاقات کے خلاصے سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ ''جناح کو اس امر پر تشویش لاحق ہے کہ مشن کے نئے ''مجوزہ نکات'' میں ابتدائی فارمولے سے جو انحراف برتا گیا ہے تو ایسا کانگرس کی ایما پر کیا گیا ہے۔ وہ یونین حکومت کے قیام کے وعدے پر قائم ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے بہت بڑی رعایت دی ہے۔ وہ جن باتوں پر اصرار کرتا ہے ان میں ایک تو یہ ہے کہ ایک کی بجائے تین آئین ساز اسمبلیاں ہونی چاہئیں۔ یہ

تینوں صرف یونین کا آئین بنانے کے لیے جمع ہوسکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلم اکثریتی علاقوں کی وضاحت کی جانی چاہیے اور پھر ان کا گروپ بنا دینا چاہیے تا کہ وہ اپنی آئین ساز اسمبلی قائم کر سکیں۔ تیسرے یہ کہ جب مسلم گروپ کا آئین وضع ہو جائے تو اس گروپ کا کوئی بھی صوبہ جسے یہ آئین ناپسند ہو اس گروپ سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ چوتھے یہ کہ آئین ساز اسمبلی میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہونی چاہیے تا کہ مسلمانوں کو اپنے گروپ میں مناسب نمائندگی حاصل ہو سکے۔ پانچویں یہ کہ اگر مذکورہ چاروں باتوں پر مشن اس کا ساتھ دے تو وہ بھی یونین حکومت کے قیام کے اپنے وعدے پر قائم رہے گا۔ لیکن کانگرس کی جانب سے اس قدر ردوبدل اور قطع و برید کی جارہی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ انتشار اور پھوٹ پیدا کر کے مسلم اکثریتی صوبوں کے یکجا ہونے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہے۔''[13] وڈرو وائٹ کے اس نوٹ سے ظاہر ہے کہ جناح 9رمئی کی صبح کو بھی گروپنگ سکیم کے اسی تصور پر قائم تھے جس پر 25راپریل کو کرپس نے انہیں قائل کیا تھا اور جس کے بارے میں 26راپریل کو آزاد نے کرپس سے کہا تھا کہ ''وہ اپنی ورکنگ کمیٹی کو اس امر پر قائل کر لے گا کہ ہندوستان کے وفاق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اختیاری شعبوں میں علیحدہ قانون سازی کے مجاز ہوں گے۔'' لیکن 9رمئی کی صبح کو آزاد کی جانب سے مشن کے 8رمئی کے مجوزہ نکات کے بارے میں کانگرس کے سرکاری ردعمل پر مبنی جو جواب بھیجا گیا اس سے پتہ چلتا ہے کہ کانگرس 26راپریل کے آزاد کے مؤقف سے اب تک کس قدر انحراف کر چکی تھی اور متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے مسلم لیگ کے ساتھ کسی تصفیے پر پہنچنے کے لیے کانگرسی لیڈروں میں تدبر اور معاملہ فہمی کا کس قدر فقدان تھا۔ گاندھی نے 8رمئی کو مشن کے نام اپنے مراسلہ میں جو غیر مصالحانہ اور تنگ نظر مؤقف اختیار کیا تھا کانگرس کا سرکاری مؤقف اسی تنگ نظری کا آئینہ دار تھا۔ آزاد کے اس خط میں کہا گیا کہ ''ہم صوبوں کی سب فیڈریشنوں یا گروپوں کو جیسا کہ تجویز کیا گیا ہے، منظور نہیں کرتے اور ایگزیکٹو اور اسمبلیوں میں پیریٹی کے بھی سخت خلاف ہیں کہ یہ بالکل غیر مساوی گروہوں کے مابین ہو گی...... آپ کی پیش کردہ تجاویز ہمارے خیال میں آئین ساز اسمبلی کے آزادانہ اختیارات کو محدود کر دیں گی...... ایک ہی معقول طریقہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آئین ساز اسمبلی ہی کو آئین تشکیل کرنے کی کامل آزادی دے دی جائے۔ البتہ اسے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے

بارے میں بعض شرائط کا پابند کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہم اس پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ کوئی بھی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ متعلقہ فریقین کی رضامندی سے طے کیا جائے یا اگر کہیں فریقین کی رضامندی حاصل نہ ہو سکے تو وہاں ثالثی کی راہ اختیار کی جا سکتی ہے۔'' اس کے بعد مجوزہ خاکہ کے بعض نکات پر علیحدہ بحث کرتے ہوئے اس خط میں کہا گیا کہ ''ہماری رائے میں فیڈرل یونین کے اختیارات میں واشگاف الفاظ میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ وہ اپنے طور پر ریونیو جمع کرنے کی مجاز ہوگی۔ کسٹمز اور کرنسی بھی ہر صورت میں مرکز کے شعبے ہوں گے اور بغور جائزہ لینے سے اگر کچھ اور شعبے بھی ان سے متعلقہ ہوں گے تو وہ بھی مرکز کی تحویل میں دے دیئے جائیں گے۔ ایک اور شعبہ جو لازمی اور ناگزیر طور پر مرکز کا شعبہ ہوگا وہ منصوبہ بندی ہے۔'' آگے چل کر ایگزیکٹو اور قانون ساز اسمبلی میں پیریٹی کے اصول کو ایک بار پھر رد کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''یہ بالکل غیر منصفانہ ہوگی اور گڑ بڑ پیدا کرے گی۔ اس طرح کی شق کے اندر بذاتہی جھگڑے کا بیج اور آزادانہ ترقی کی تباہی مضمر ہے۔ اگر اس معاملہ یا اسی طرح کسی اور معاملہ پر سمجھوتہ نہ ہو جائے تو ہم اسے ثالثی پر چھوڑ سکتے ہیں۔'' مزید یہ بھی کہا گیا کہ ''ہم اس امکان کو بھی رد کرنا نہیں چاہتے کہ صوبے اگر چاہیں تو اپنے گروپ بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ آئین ساز اسمبلی کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ آئین کی تحریر و تشکیل فیڈرل یونین کے اختیارات سے شروع ہونی چاہیے۔'' آخر میں کہا گیا کہ اگر مجوزہ سکیم میں مذکورہ نقائص کو دور کر دیا جائے تو ہم کانگرس سے اس کی منظوری کی سفارش کریں گے۔ بصورت دیگر ہمیں یہ ناقابل قبول ہے۔''[14]

گویا ان حالات میں جب کہ جناح مطالبہ پاکستان سے انحراف کر کے دو قدم کانگرس کی جانب بڑھے تھے اور متحدہ ہند کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے صرف مسلم گروپ پر اکتفا کرنے پر رضامند ہوئے تھے تو کانگرس نے مصالحانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے اپنی شرائط میں اضافہ کر دیا اور سخت گیری اختیار کر لی۔ مرکز کے شعبوں میں مزید اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ نئے نئے مسائل اٹھا دیئے جب کہ اصل مسئلہ جو کہ فرقہ وارانہ تضاد کا تھا اسے حالیہ انتخاب میں ابھرنے والی مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت کے ساتھ تصفیے کے ذریعے حل کرنے کے بجائے ایک ایسی آئین ساز اسمبلی کے حوالے کرنے کا مطالبہ دہرایا گیا جس کی غالب ہندو اکثریت کبھی بھی مسلمانوں کو انصاف نہیں دے سکتی تھی اور اسی کے پیش نظر جناح اس اسمبلی میں

جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اگرچہ مشن نے ابتدا میں تجویز کردہ گروپنگ کے فارمولے سے انحراف برتتے ہوئے مرکز میں بنیادی حقوق کے نام سے ایک شعبے کا اضافہ کیا تھا اور اس طرح کانگرس کو راضی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کانگرس نے اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ وہ نہ تو مسلمانوں کا الگ گروپ کہ جس کی اپنی اسمبلی اور ایگزیکٹو ہو، قبول کرتی تھی اور نہ ہی وہ مرکز کی اسمبلی اور ایگزیکٹو میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین پیریٹی کی قائل تھی۔ مزید یہ کہ مرکز میں دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے شعبوں پر اکتفا کرنے کے بجائے اب وہ مالیات کرنسی، کسٹمز، منصوبہ بندی اور بعض دیگر شعبوں کو بھی شامل کر کے مضبوط مرکز کے قیام کی خواہاں تھی۔ حالانکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ 12 تا 15 اپریل 1946ء میں کانگرس نے جو آئینی ڈھانچہ تجویز کیا تھا اس میں مرکز کے لازمی شعبہ جات میں صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کو رکھا گیا تھا۔ اس اجلاس کا احوال لکھتے ہوئے آزاد نے لکھا ہے کہ ''سردار پٹیل نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مرکزی حکومت خود کو صرف تین محکموں تک محدود رکھے گی۔ اس نے کہا کہ بعض دوسرے شعبے مثلاً کرنسی اور مالیات کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مرکز کے دائرہ اختیار میں ہونا چاہیے۔ اس کے خیال میں تجارت اور صنعت صرف کل ہند بنیادوں پر ہی ترقی پا سکتی تھی اور تجارتی پالیسی پر بھی یہی بات صادق آتی تھی۔ مجھے اس کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دینا پڑا۔ گاندھی جی نے خود ہی میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کر ڈالی اور سردار پٹیل کو جواب دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے کہ صوبائی حکومتیں کرنسی یا کسٹمز جیسے معاملات میں مرکز سے اختلاف کریں گی۔ یہ ان کے اپنے مفاد میں ہوگا کہ وہ ان امور میں متحدہ پالیسی اختیار کریں۔ اس لیے اس امر پر اصرار کرنا ضروری نہیں ہے کہ کرنسی اور مالیات کو مرکز کے لازمی شعبہ جات میں شامل کیا جائے۔''[15] لیکن بعد ازاں جناح کے رویئے کو نرم دیکھ کر کانگرس نے پینترا بدلا تھا اور مرکز کے شعبوں کی فہرست میں کرنسی، کسٹمز، مالیات، منصوبہ بندی اور دوسرے شعبوں کی شمولیت پر اصرار شروع کر دیا تھا۔ مسلم لیگ جس نے آزاد و خودمختار پاکستان کے قیام کے نعرے پر مسلم عوام الناس کی بھاری اکثریت کا ووٹ حاصل کیا تھا، تصفیے کی خاطر اپنے اس مطالبے سے انحراف کر کے متحدہ ہند میں مسلم صوبوں کا گروپ قبول کرنے

پر آمادہ ہوگئی تھی اور جناح جنہوں نے پہلے تو صرف ایگزیکٹو تک محدود یونین حکومت کو قبول کیا تھا۔ پھر نئے مجوزہ خاکے میں پیریٹی کی بنیاد پر تجویز کردہ یونین کی قانون ساز اسمبلی کو قبول کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ تاہم انہیں یہ مجوزہ خاکہ بعض دوسری وجوہات کی بنا پر قابل قبول نہیں تھا جس کا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

9رمئی دوپہر کو ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات کی جس میں ویول نے جناح کو دھمکی دی کہ اگر آپ نے بدستور بے لچک رویہ اختیار کئے رکھا تو ہم کانگرس کی جانب جھکنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جناح نے کہا کہ میری جانب سے اس قدر رعایت بھی بہت زیادہ ہے کہ میں ہندوستان کی ایک یونین (متحدہ ہند) پر رضامند ہو گیا ہوں، اس پر بھی میرے حامیوں کی جانب سے تنقید کی جارہی ہے۔ ویول نے نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے بارے میں جناح سے رائے لی تو انہوں نے کہا کہ اس پر بعد میں غور ہونا چاہیے۔ ویول نے کہا کہ نئی کونسل کی تشکیل ناگزیر ہے۔ اگر جناح تعاون نہیں کریں گے تب ان کے بغیر بھی اس کی تشکیل کر دی جائے گی۔ ادھر 9رمئی کی صبح ہی کو کرپس نے آزاد اور نہرو کے ساتھ ملاقات کی۔ ان دونوں نے کہا کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کی جانب سے دو باتوں پر دباؤ کا سامنا ہے۔ ایک تو مرکز کی ایگزیکٹو اور اسمبلی میں پیریٹی اور دوسرے صوبوں کا فرقہ وارانہ بنیاد پر گروپوں میں تقسیم ہونا۔ انہوں نے کہا کہ کانگرس کو خاص طور سے اس بات کا خدشہ ہے کہ ہندو۔ مسلم پیریٹی کو اصول ہی نہ سمجھ لیا جائے اور پھر اس کا اطلاق سرکاری ملازمتوں اور فوج میں بھی نہ ہونے لگ جائے۔"[16] یہ تھی ہندو بورژوا کی تنگ نظری جو ہندو مسلم تضاد کے حل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کے طور پر حائل ہوگئی تھی۔ مسلمان جو مختلف تاریخی وجوہ کی بنا پر جدید تعلیم کے میدان میں ہندوؤں سے کم وبیش ایک سو سال پیچھے رہ گئے تھے اور جس کے نتیجے میں ملازمتوں میں بھی ان کے مابین اتنا ہی بعد پیدا ہو گیا ہوا تھا، اب صرف ہندو مسلم پیریٹی کے اصول کے تحت ہی اس بُعد کو پاٹ سکتے تھے۔ ہندو مسلم تضاد کے حل کی یہی ایک صورت تھی لیکن ہندو بورژوا کسی صورت بھی مسلمانوں کو یہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کی ہم سری کے قابل ہو سکیں۔

چنانچہ شملہ میں 9رمئی کی سہ پہر کو جب دونوں پارٹیوں کے وفود مشن کے ساتھ اپنے اگلے اجلاس کے لیے جمع ہوئے تو زیر غور خاکے کو دونوں ہی مسترد کر چکے تھے۔ اجلاس میں

فریقین کے مابین کچھ دیر کی لاحاصل بحث کے بعد نہرو نے تجویز پیش کی کہ لیگ اور کانگرس کے نمائندوں کو ایک متفقہ امپائر کی موجودگی میں مل بیٹھنا چاہیے اور کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اگر کوئی تصفیہ نہ ہو پائے تو پھر امپائر جو بھی فیصلہ صادر کر دے، دونوں فریقین کے نزدیک یہ فیصلہ حتمی ہونا چاہیے۔ جناح نے کہا کہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے ہمراہ مل بیٹھنے پر تیار ہوں کہ دیکھوں کہ آیا یہ تجویز قابل قبول ہے۔ اگر ہے تو سوال یہ ہے کہ امپائر کون ہوگا۔ اس کے بعد نہرو اور جناح کو کانفرنس روم میں چھوڑ کر باقی شرکاء باہر لان میں چلے گئے تاکہ یہ دونوں اس تجویز کا جائزہ لے کر کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ کچھ دیر تک دونوں میں بات چیت ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تاہم کانفرنس کے شرکاء کو جمع کر کے انہوں نے درخواست کی کہ انہیں باہمی صلاح ومشورہ کے لیے دو روز کی مہلت دی جائے۔ چنانچہ کانفرنس کا اجلاس 11 رمئی سہ پہر تک ملتوی کر دیا گیا۔

10 رمئی کو نہرو نے جناح کو مراسلہ بھیجا کہ ''امپائر کے موزوں انتخاب کے لیے انگریز ہندو، مسلم یا سکھ کو خارج از امکان قرار دے دینا چاہیے۔ اس طرح ایک محدود دائرہ بچتا ہے جس کے اندر امپائر تلاش کرنا ہے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ممکنہ امپائروں کی ایک فہرست تیار کی ہے۔ ایسے ہی آپ نے بھی اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کوئی فہرست تیار کی ہوگی۔ ہم دونوں اپنی ایک ملاقات رکھ لیتے ہیں۔ جس میں دونوں فہرستوں کا جائزہ لے کر کسی موزوں شخص کو بطور امپائر چن لیتے ہیں۔'' 10 رمئی کو جناح نے مذکورہ مراسلے کے جواب میں نہرو کو لکھا کہ ''ہم نے کل کی وائسریگل لاج کی ملاقات میں امپائر کے علاوہ آپ کی تجویز کا مزید جائزہ لینے کا بھی فیصلہ کیا تھا تاکہ اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورے کے بعد اس کے تمام اثرات کے بعد پر غور کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ کی تجویز کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے کل صبح دس بجے کے بعد جب آپ کے لیے موزوں ہو، مجھے آپ سے ملاقات کر کے خوشی حاصل ہوگی۔'' اس کے جواب میں نہرو نے 11 رمئی کی صبح کو جناح کو لکھ بھیجا کہ ''میں تو اس خیال میں رہا کہ امپائر بنانے کی تجویز پر ہم دونوں متفق ہو چکے ہیں اور اب صرف اس کا نام تجویز کرنے کا کام باقی رہ گیا ہے۔ کانفرنس میں ہمارے درمیان اس پر اتفاق ہونے کے بعد ہی ہم دونوں کے مابین بات چیت ہوئی تھی...... آج سہ پہر کو کانفرنس میں ہم سے یہ

توقع کی جائے گی کہ امپائر کے نام سے آگاہ کیا جائے یا کم از کم اس سلسلے میں اپنی تجاویز ہی کو پیش کیا جائے۔'' جناح نے اسی وقت اس کے جواب میں لکھا کہ ''وائسر یگل لاج کی ملاقات میں جو کہ پندرہ یا بیس منٹ سے زیادہ دیر تک جاری نہیں رہی تھی، میں نے آپ کی تجویز کے مختلف پہلوؤں اور اثرات کی نشاندہی کی تھی اور پھر ہمارے درمیان تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی لیکن میرے اور آپ کے درمیان سوائے اس کے اور کسی معاملہ پر اتفاق رائے نہیں ہوا تھا کہ آپ...... اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلیں اور میں اپنے ساتھیوں سے اور پھر ہماری ملاقات اگلے روز اس پر مزید گفت وشنید تک کے لیے ملتوی ہوگئی تھی۔''[17] ان مراسلوں کے تبادلے کے بعد 11 رمئی کو صبح ساڑھے دس بجے نہرو اور جناح کے مابین ملاقات ہوئی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

چنانچہ سہ پہر کے اجلاس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے وفود اور وزارتی مشن کے ارکان کے مابین بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے اب کوئی بنیاد باقی نہیں رہ گئی تھی۔ جناح کا مؤقف تھا کہ بعض بنیادی شرائط پر کوئی ثالثی نہیں ہوسکتی اور ان میں اولین تقسیم ہند ہے جو کہ ایک طے شدہ امر ہے جس پر مسلمانان ہند انتخابات میں فیصلہ دے چکے ہیں۔ اگر ثالث اس کے خلاف فیصلہ دے گا تو اس کو لاگو کرنے میں بے شمار مشکلات پیدا ہوں گی۔ چنانچہ جب تک مسلم لیگ کو یہ معلوم نہ ہوجائے کہ صوبوں کی گروپ بندی کی جائے گی اور یہ کہ کون سے صوبے ان گروپوں میں شامل ہوں گے، اس وقت تک وہ ثالثی پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جناح نے کہا کہ تصویر کے تمام رخ دیکھ کر ہی ہم تین شعبوں (یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات) میں پاکستان کا اقتدار اعلیٰ یونین (مرکز) کو دینے پر آمادہ ہوں گے۔ اس کے بعد باقی شعبوں میں گروپ کی صورت میں ایک مقتدر پاکستان کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ اس گروپ کی اپنی ایگزیکٹو اور مجلس قانون ساز ہوگی۔ ان امور کو طے شدہ سمجھ کر پھر باقی امور میں ثالثی پر غور ہوسکتا ہے۔ کانگرس کی جانب سے نہرو نے مخالفت میں مؤقف پیش کیا اور کہا کہ اس کا مطلب تو بنیادی اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ اس نے کہا کہ جناح کے نزدیک مجوزہ منصوبہ کی روح گروپ ہیں جب کہ کانگرس مضبوط مرکز کو سب سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ حکومت کا تین سطحوں پر چلنا قابل عمل نہیں ہوگا۔ البتہ صوبے باہمی تعاون کے لیے گروپ بنا سکتے ہیں۔

ہم ان گروپوں کو ایگزیکٹو اور مجلس قانون ساز کا حامل بنانے کے خلاف ہیں تاہم اس معاملے پر ثالثی ہوسکتی ہے۔ جناح نے کہا کہ گروپوں کے کردار پر کوئی ثالثی نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح مرکز کے پاس رکھے گئے شعبوں کی تعداد پر بھی کانگرس نے اختلاف کیا۔ نہرو نے کہا کہ ہماری رائے میں مجوزہ تین شعبوں کے علاوہ کرنسی، کسٹمز اور منصوبہ بندی بھی مرکز کی تحویل میں ہونے چاہیں۔ نہرو نے مزید زور دے کر کہا کہ کانگرس کم سے کم اگر کسی بات پر متفق ہوسکتی ہے تو اس پر کہ مجوزہ تین شعبوں کے علاوہ مرکز کے پاس براہ راست ٹیکسیشن کے ذریعے ریونیو جمع کرنے کا اختیار، کرنسی اور منصوبہ بندی بھی ہونے چاہئیں۔ جناح نے کہا کہ میں مرکز کو مجوزہ تین سے زیادہ شعبے دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ مرکز کی مالیات کا طریقۂ کار آئین ساز اسمبلی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کے بعد آئین ساز اسمبلی اور مرکزی (یونین) اسمبلی میں نمائندگی کے مسئلے پر بھی فریقین کے مابین واضح اختلاف رونما ہوا۔ جناح نے کہا کہ دونوں گروپوں کی علیحدہ آئین ساز اسمبلیاں ہوں گی اور پھر وہ برابری (پیریٹی) کی بنیاد پر مل کر ایک یونین کا آئین وضع کریں گی۔ نہرو نے کہا کہ اس طرح تو یونین کا آئین بن ہی نہیں سکے گا۔ کانگرس مرکزی اسمبلی میں برابری کے اصول کو تسلیم نہیں کرتی۔ اگر کسی فرقہ کو کوئی مسئلہ درپیش ہوگا تو اس کو برابری (پیریٹی) کے بغیر ہی تحفظات مہیا کرنے کی دفعات شامل کی جاسکتی ہیں۔ مسلم لیگ کے نمائندوں نے کہا کہ ہم یونین کے آئین میں پیریٹی چاہتے ہیں۔ فیڈریشن کے دو غیر مساوی حصوں کے مابین پیریٹی کی مثالیں موجود ہیں۔ ان بنیادی اختلافات کی موجودگی میں کانفرنس تعطل کا شکار ہوگئی۔ وزارتی مشن کی جانب سے دونوں جماعتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی جانب سے قابل تفہیم موٴقف پر مبنی نکات لکھ کر اگلے روز کے اجلاس سے پہلے پیش کریں تاکہ اگر مزید مذاکرات کا کوئی امکان ہو تو اسے دیکھا جاسکے۔[18] اس اجلاس میں ہندو مسلم تضاد اپنی شدت کے ساتھ کھل کر سامنے آ گیا تھا اور مذاکرات عملاً ناکام ہو گئے تھے۔ مسلمان متحدہ ہند میں رہنے کے لیے جن تحفظات کا مطالبہ کر رہے تھے اور جو کسی حد تک مجوزہ گروپنگ سکیم میں پورے ہوتے تھے، ہندو بورژوا انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہندو بورژوا غیر مساویانہ بنیادوں پر جس مضبوط مرکز کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو مغلوب کر کے رکھنا چاہتا تھا، اسے مسلمان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جناح مکمل آزاد و خودمختار پاکستان سے دستبردار ہو کر اس سے کم پر سمجھوتہ کرنے کے لیے

آمادہ ہو گئے تھے لیکن گاندھی اور دوسرے کانگرسی رہنما اس کے لیے تیار نہ تھے۔

12 رمئی کو جناح نے مسلم لیگ کی جانب سے کم از کم شرائط سے مشن کو تحریری طور پر آگاہ کر دیا۔ ان میں کہا گیا تھا۔

1۔ چھ مسلم صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام کو ملا کر ایک گروپ بنا دیا جائے جو تمام معاملات میں خود مختار ہو سوائے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے، جن کو مسلم صوبوں کے گروپ (جسے پاکستان گروپ کہا جائے گا) اور ہندو صوبوں کے گروپ کی آئین ساز اسمبلیاں مل کر طے کیا کریں گی۔

2۔ ان چھ مسلم صوبوں کی ایک علیحدہ آئین ساز اسمبلی ہو گی جو ان کے گروپ کا بھی آئین تیار کرے گی اور صوبوں کا بھی اور یہ بھی طے کرے گی کہ کون سے شعبے صوبوں کے پاس رہیں گے اور کون سے مرکز (یعنی وفاقِ پاکستان) کے پاس ہوں گے۔

3۔ آئین ساز ادارے کے لیے نمائندوں کا انتخاب اس طرح کیا جائے گا کہ پاکستان گروپ کے ہر صوبے کے مختلف فرقوں کی اپنی آبادی کے تناسب سے درست طور پر نمائندگی ہو جائے۔

4۔ جب پاکستان وفاقی حکومت اور صوبوں کا آئین بن جائے تو پھر کسی بھی صوبے کو اس گروپ سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل ہو گا بشرطیکہ ریفرنڈم کے ذریعے اس صوبے کے عوام اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیں۔

5۔ آئین ساز اسمبلیوں کے مشترکہ اجلاس میں اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ آیا یونین کی مجلس قانون ساز ہو گی یا نہیں؟ یونین کی مالیات کا مسئلہ بھی اسی مشترکہ اجلاس کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے لیکن یہ طے ہے کہ اسے براہ راست ٹیکس لاگو کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہو گا۔

6۔ یونین کی ایگزیکٹو میں اور اگر قانون ساز اسمبلی ہو تو اس میں بھی دونوں گروپوں کی مساویانہ نمائندگی ہو گی۔

7۔ یونین کے آئین میں کوئی بھی ایسا بڑا نکتہ جس سے فرقہ وارانہ معاملہ اثر انداز ہوتا ہو۔ اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک ہندو گروپ کی آئین ساز اسمبلی کی

اکثریت اور پاکستان گروپ کی آئین ساز اسمبلی کی اکثریت علیحدہ علیحدہ طور پر اس کے حق میں نہ ہو۔

8۔ یونین میں کوئی اختلافی نوعیت کا مسئلہ خواہ قانون سازی کا ہو، ایگزیکٹو کا ہو یا انتظامیہ کا ہو، تین چوتھائی کی اکثریت سے منظور کیا جائے گا۔

9۔ گروپ اور صوبوں کے دساتیر میں مختلف فرقوں کے مذہب، ثقافت اور دیگر امور کے لیے تحفظات اور بنیادی حقوق مہیا کئے جائیں گے۔

10۔ یونین کے آئین میں یہ شق بھی رکھی جائے گی جس کے تحت صوبے کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ اپنی مجلس قانون ساز کے اکثریتی ووٹ کے ذریعے آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے اور ابتدائی دس برس گزرنے کے بعد اسے علیحدگی اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

آخر میں یہ تشریح بھی کی گئی کہ یہ تمام نکات باہم مربوط ہیں اور انہیں کلی طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔ ادھر 12 مئی کو کانگرس نے مسلم لیگ کی مذکورہ کم از کم شرائط پر اپنا اختلافی نوٹ اور اپنی جانب سے کم از کم شرائط سے مشن کو آگاہ کر دیا۔ مسلم لیگ کی ایک ایک شرط سے اختلاف کرتے ہوئے کانگرس کی جانب سے لکھا گیا کہ:

1۔ پورے ہندوستان کے لیے ایک ہی آئین ساز اسمبلی ہونی چاہیے۔ بعد میں اگر صوبے گروپ بنا کر رہنا چاہیں گے تو پھر ان کے گروپ کی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ہوسکتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے لیے آئین وضع کر سکیں۔

2۔ گروپوں کی نوعیت کیا ہوگی، اس کا فیصلہ آئین ساز اسمبلی کے اجلاس پر چھوڑ دینا چاہیے۔

3۔ انتخابات ایک شخص ایک ووٹ کی بنیاد پر ہوں گے۔

4۔ کسی گروپ میں شمولیت کے بعد صوبے کو اس سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ہوگی۔

5۔ ہم اسے بے حد اہم قرار دیتے ہیں کہ فیڈرل یونین (مرکز) کی قانون ساز اسمبلی بھی ہونی چاہیے۔ یونین کو بذات خود ریونیو جمع کرنے کا اختیار بھی حاصل ہونا چاہیے۔

6۔ ہم اس بات کے سختی سے مخالف ہیں کہ یونین کی ایگزیکٹو یا قانون ساز اسمبلی میں گروپوں کے مابین برابری (پیریٹی) روا رکھی جائے۔

7۔ یہ تجویز اپنی نوعیت کے لحاظ سے اس قدر عامیانہ ہے کہ کوئی حکومت یا قانون ساز اسمبلی چل ہی نہیں سکتی۔

8۔ ہم پوری طرح اس بات کے حق میں ہیں کہ آئین میں بنیادی حقوق اور مذہب، ثقافت اور اس طرح کے معاملات سے متعلق تحفظات مہیا کیے جائیں۔

9۔ یونین کے آئین میں ایسی دفعات ضرور موجود ہوں گی کہ جن کے ذریعے اس پر نظر ثانی کی جا سکے گی۔

مسلم لیگ کی تجاویز پر تنقید کے ساتھ کانگرس کی جانب سے جو علیحدہ تجاویز پیش کی گئیں ان میں بھی کہا گیا تھا کہ آل انڈیا فیڈرل گورنمنٹ اور مرکزی قانون ساز اسمبلی کی تحویل میں دفاع، امور خارجہ، مواصلات، بنیادی حقوق، کرنسی، کسٹمز اور منصوبہ بندی اور ان محکموں سے قریبی تعلق رکھنے والے شعبے ہوں گے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کو بذات خود اپنے مالی ذرائع رکھنے اور ریونیو جمع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ مرکزی حکومت کو آئین کے تعطل اور سنگین ہنگامی حالات عامہ کی صورت سے نمٹنے کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔ یعنی خزانہ اور داخلہ کے محکمے بھی مرکز کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔ بقیہ اختیارات صوبوں کو دیئے گئے تھے۔ صوبوں کے ایسے گروپوں کے لیے گنجائش رکھی گئی تھی جس میں صوبے آپس میں تعاون کریں اور باہم مشورے سے یکساں صوبائی آئین وضع کریں لیکن ایسے بااختیار گروپ کہ جن کی ایگزیکٹو اور مجلس قانون ساز گروپ کی سطح پر موجود ہو، ان تجاویز میں شامل نہیں تھے۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے مجوزہ فارمولوں سے صاف عیاں تھا کہ تصفیے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

چنانچہ 12رمئی کی شام کو جب فریقین شملہ کانفرنس کے آخری اجلاس کے لیے جمع ہوئے تو موضوع زیر بحث یہ تھا کہ کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ داری کس پر ڈالی جائے۔ فیصلہ ہوا کہ کسی بھی فریق کو ذمہ دار نہ گردانا جائے۔ مشن نے اپنے اگلے لائحہ عمل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ فریقین کسی تصفیے پر نہیں پہنچ پائے ہیں اس لیے اب چند روز میں مشن خود ایک اعلان جاری کرے گا جس میں ہندوستان کے مستقبل کے آئین کا پورا خاکہ پیش کر دیا جائے گا۔ گزشتہ سال کی شملہ کانفرنس کی طرح اس کانفرنس کی ناکامی بھی اس بات کا ثبوت تھی کہ متحدہ ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندو مسلم تضاد کے حل کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ہندو بورژوا

مسلمانوں کے ساتھ وسعت نظری اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنے کو تیار نہ تھا اور مسلمان کسی ایسے حل پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھے جس میں ان کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ترقی کی راہیں مسدود کر دی گئی ہوں۔

فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ

اس وقت جب کہ شملہ میں مذاکرات کے ذریعے ہندو مسلم تضاد کو حل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں، انگریز حکمرانوں کو ہمہ وقت یہ خدشہ لاحق تھا کہ ہندو مسلم فسادات نہ بھڑک اٹھیں۔ انگریز پرامن حالات میں برصغیر سے رخصت ہو جانے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے کہ وہ بعد از جنگ صورت حال میں اب یہاں کسی فوجی سرگرمی میں الجھنا نہیں چاہتے تھے اور یہاں اپنے مفادات کو بھی پرامن اور محفوظ حالات میں رکھ کر جانا چاہتے تھے۔ حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی سے مسلم عوام الناس کا پاکستان کے بارے میں جو جوش وخروش سامنے آیا تھا، اس کے پیش نظر مسلم لیگی قیادت کے لیے کسی ایسے سمجھوتے کو قبول کر لینا مشکل ہو چکا تھا جس میں مسلم مفادات پوری طرح محفوظ نہ ہوں۔ انگریز حکام جنہیں عموماً ہندو درمیانے طبقے کی ایجی ٹیشن کی فکر لاحق ہوتی تھی، اب مسلمان درمیانے طبقے کی جانب سے بھی ایجی ٹیشن کا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ مسلمانان ہند نہ صرف اپنے مسائل کی وجہ سے ایجی ٹیشن پر مائل تھے بلکہ اینگلو امریکی سامراج کی جانب سے مشرق وسطیٰ میں صیہونیت کی سرپرستی اور انڈونیشیا کے حُریت پسندوں کے خلاف ہندوستانی افواج کے استعمال پر بھی برانگیختہ تھے۔ اپریل 1946ء کے اواخر میں ''اینگلو امریکن کمیٹی برائے انکوائری بسلسلہ مسائل یورپی یہودی اور فلسطین'' کی رپورٹ شائع ہونے والی تھی۔ اس کی سفارشات میں کہا گیا تھا کہ ''(1) فاشسٹ ملامت کے شکار ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں فوری داخلے کے اجازت نامے جاری کر دیئے جائیں۔ (2) جب تک یہودیوں اور عربوں کی عداوت کا خاتمہ نہیں ہوتا، حکومت فلسطین بدستور مینڈیٹ کے تحت رہے گی۔ (3) یہ کہ فلسطین نہ تو عرب ریاست ہوگی اور نہ ہی یہودی ریاست اور (4) یہ کہ کمیٹی فلسطین میں ہر سال کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ یہودی مہاجرین کی آمد کی تعداد کا تعین نہیں کر سکتی، یہ کام حکومت فلسطین کا ہے۔''

اس رپورٹ کے سلسلے میں رائے دیتے ہوئے وائسرائے ہند ویول نے نائب وزیر ہند ہینڈرسن کو 25 اپریل کو اپنے ایک مراسلے میں لکھا کہ ''میری رائے میں اس رپورٹ کے خلاف عربوں کا شدید ردعمل ہو گا۔ ہندوستان کے مسلمان ان سے ہمدردی کا اظہار کریں گے اور سخت الفاظ میں احتجاج کریں گے۔ پاکستان کے متعلق ان کا رویہ سخت گیر ہو جائے گا اور مذاکرات کے لیے مشکل پیدا ہو جائے گی۔ جناح اس کو خود مختار مسلم ریاست کی ضرورت پر زور دینے کے لیے استعمال کرے گا۔ اس کے کس درجہ سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کا انحصار وزارتی مشن کے مذاکرات کے نتیجہ پر ہو گا۔ اگر مسلمانوں نے کسی بھی مجوزہ آئینی سکیم کے خلاف مزاحمت کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر فلسطین کے معاملے میں ان کا غم و غصہ جلتی پر تیل کا کام کرے گا۔''[19] لیکن ویول کا مشورہ قبول نہ کیا گیا اور یہ رپورٹ شائع کر دی گئی۔ جناح نے اس کی شدید مذمت کی۔ حسب توقع اس کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں میں شدید ردعمل ہوا۔ مسلم لیگ کی اپیل پر 10 مئی کو ''یوم فلسطین'' منایا گیا۔ گورنر بنگال ایف۔ بروز نے 6 مئی کو وزیراعظم ایٹلی کے نام اپنے مراسلے میں اپنے صوبے کے مسلمانوں کی جانب سے شدید ردعمل کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا کہ ''یہاں پر تمام مسلم اخبارات یہ لائن لے رہے ہیں کہ یہ رپورٹ تعصب پر مبنی ہے اور ایک بیکار دستاویز ہے اور یہ کہ ان سفارشات پر عملدرآمد پورے عالم اسلام میں دھماکہ خیز ثابت ہو گا۔ روس سے امداد طلب کرنے کے کھلے اشارے کئے جا رہے ہیں اور میرے خیال میں اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔''[20]

ابھی شملہ میں کانفرنس جاری تھی کہ اس کی ناکامی کے امکان کے پیش نظر جو کہ بہت واضح تھا، مشن کی طرف سے گروپنگ کے جس منصوبے کا بالآخر اعلان کیا جانا تھا اس کی نقلیں ویول کی جانب سے تمام گورنروں کو ارسال کی گئی تھیں۔ 9 مئی کو گورنر بنگال ایف بروز نے ویول کو اس مجوزہ آئینی سکیم پر اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے مراسلے میں لکھا کہ ''اگر یہ سکیم مسلمانوں کے لیے گوارا نہ ہوئی تو بنگال میں تشدد آمیز غم و غصہ کا اظہار ہو گا اور کلکتہ میں بھی گڑبڑ ہو گی۔ (جہاں ہم اس سے نپٹ سکیں گے)۔ مشرقی بنگال کے بیشتر اضلاع میں سرکاری عملے اور املاک کو اور ہندو فرقے کے لوگوں کو برے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اگر جناح نے محاذ آرائی چاہی تو وزارت استعفیٰ دے جائے گی اور مجھے متوقع تحریک کا مقابلہ اقلیتی

وزارت کی مدد سے کرنا پڑے گا جو زیادہ ''فارورڈ'' ہندوؤں پر مشتمل ہو گی جو بڑی خوشی سے اس موقع سے فائدہ اٹھائیں گے۔ فلسطین رپورٹ کے پیش نظر اس وقت مسلمانوں کی جانب سے چلائی گئی کوئی بھی تحریک شدت سے برطانیہ دشمن ہو گی اور ممکن ہے مشرقی بنگال میں حالات قابو میں نہ رہ سکیں۔ خوراک کی صورت حال پر بلا شبہ اس کا بہت بُرا اثر پڑے گا کیونکہ لوٹ مار کرنے والوں کا پہلا نشانہ ہمارے سٹورز ہوں گے اور جو رسد ابھی خرید کی جانی ہے وہ بھی زیر زمین چلی جائے گی۔''[21] گویا مسلم اکثریت کے سب سے بڑے صوبے بنگال میں مسلمان عوام الناس کا ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کے خلاف تضاد دھماکہ خیز نقطۂ پر پہنچا ہوا تھا۔

کم و بیش یہی صورت حال مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں میں بھی تھی۔ پنجاب میں ایک اور پہلو بھی نمایاں تھا۔ یہاں غیر مسلم فریق اور بالخصوص سکھ بھی تشدد پر تلے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہاں زیادہ سنگین صورت حال پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ 2رمئی کو گورنر پنجاب ایوان جینکنز نے ویول کو لکھا ''پنجاب میں سیاسی اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حصار، کرت پور (ضلع جالندھر)، امرتسر اور ملتان میں سنگین نوعیت کے فرقہ وارانہ واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ تمام فرقے وسیع پیمانے پر ہنگامہ آرائی کے لیے تیاری کر رہے ہیں اور ''رضا کاروں'' کا جابجا چرچا ہو رہا ہے جو دراصل ہر فرقے کی نجی فوج کے مترادف ہیں۔'' آخر میں اس نے لکھا کہ اگر نئی شملہ کانفرنس میں جلد کوئی تصفیہ نہ ہوا تو وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کا اندیشہ ہے۔[22] اس کے بعد 9رمئی کو گورنر پنجاب ایوان جینکنز نے ایک اور مراسلے میں مجوزہ مشن منصوبے پر اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہوئے ویول کو لکھا کہ ''اگر کانگرس نے اسے قبول کر لیا تب بھی تعلیم یافتہ پنجابی ہندو اسے حقارت سے رد کر دیں گے اور پارٹی ڈسپلن اور نجی رائے عامہ کے مابین ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا۔ کانگرس کی جڑیں پنجاب میں زیادہ گہری نہیں ہیں اس لیے مجھے کوئی حیرت نہ ہو گی کہ یہاں فوری اور واضح طور پر ہندو مہاسبھا کا احیا ہو جائے گا۔ مجوزہ حل پر سکھوں میں بہت زیادہ بے چینی پھیلے گی۔ سکھ ایک سخت گیر اور شورش پسند قوم ہیں جن کی 1920ء کے عشرے کی مذہبی ایجی ٹیشن نے اس وقت کی پنجاب حکومت کو ہلا کر رکھ دیا تھا حالانکہ وہ موجودہ حکومت سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم تھی۔''[23] اس وقت حکومت کی ایک بڑی کمزوری یہ بھی تھی کہ فوج پر سے اعتماد اُٹھ گیا تھا اور اندیشہ تھا کہ ہندوستانی سپاہ گڑبڑ کنٹرول

کرنے کے بجائے خودسرکشی کی راہ نہ اختیار کر جائے۔[24] ان خطرات سے بچنے کے لیے ہی انگریزوں نے بھرپور کوشش کی تھی کہ کسی طرح دونوں بڑے فرقوں کی نمائندہ تنظیموں کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی تصفیہ ہوجائے لیکن 12 رمئی کو شملہ کانفرنس ناکام ہوکر ختم ہوگئی۔

کمانڈر انچیف کی طرف سے دفاعی بنیادوں پر تقسیم ہند کی مخالفت

11 رمئی کو انڈیا کی مسلح افواج کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل کلاڈ۔آ کن لیک نے دفاعی لحاظ سے اس پہلو کا تجزیہ کیا کہ اگر انڈیا دو ملکوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور پاکستان کو برطانوی دولت مشترکہ میں آسٹریلیا اور کینیڈا کی طرح رُکن ملک کی حیثیت سے شامل کر لیا جاتا ہے جب کہ ہندوستان کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا ، بلکہ اس کے ساتھ عمومی سفارتی تعلقات قائم کیے جاتے ہیں ،تو کیا اس صورت میں پاکستان برطانوی سامراج کے دفاعی تقاضے پُورے کر سکے گا؟ یہ تجزیاتی رپورٹ 12 رمئی کو وزارتِ ہند کے پرنسپل سٹاف افسر جنرل مین کو ارسال کی گئی۔

آ کن لیک نے سب سے پہلے بحرِ ہند کے علاقے میں برطانوی سامراج کے سٹریٹجک مفادات کو گنوایا جو حسبِ ذیل تھے:

"1۔ ایران اور عراق سے تیل کی ترسیل۔

2۔ بحیرۂ احمر پر کنٹرول جو بحر ہند میں مغرب کی طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے۔

3۔ سنگاپور اور آبنائے ملاکا پر کنٹرول جو بحر ہند میں مشرق کی جانب سے داخلے کا راستہ ہے۔

4۔ عرب، عراق، بحیرہ عرب، انڈیا، برما اور ملایا کے فضائی راستوں کے استعمال کی استعداد۔

5۔ سیلون (لنکا) پر کنٹرول جسے بحری اور فضائی اڈے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور ٹھہرنے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔"

ہندوستان کے دولت مشترکہ سے باہر رہنے کے مضمرات کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے لکھا کہ "اگر ہندوستان نے غیر دوستانہ رویہ اختیار کر لیا، وہ روس، چین یا جاپان جیسی کسی طاقت کے زیر اثر آ گیا جو کہ برطانوی دولت مشترکہ کے دشمن ہیں تو پھر بحر ہند میں ہماری سٹریٹجک پوزیشن کمزور ہو جائے گی اور نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے ساتھ مواصلات کا نظام بالکل غیر محفوظ

ہو جائے گا...... ہندوستان کی جانب سے پاکستان کو فتح کرنے اور اپنے اندر جذب کرنے کی فطری خواہش رکھنے اور یوں انڈیا کی وحدت کو بحال کرنے کے پیش نظر ہندوستان روس کا حلیف بننے کی طرف مائل ہوسکتا ہے۔ روس جسے اقتدار کی سیاست اور غنڈہ گردی کے ہتھکنڈوں کا چسکا لگ چکا ہے، ہندوستان کے اس قسم کے رجحان کا پورا فائدہ اٹھائے گا۔ روسی غلبے کے زیر اثر ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کی سلامتی کے لیے وبال جان بن جائے گا اور اُسے بہت جلد منتشر کر ڈالنے کا سامان پیدا کر دے گا۔''

اس نے لکھا کہ ''تھیوری کی حد تک تو شاید یہ درست معلوم ہو کہ برطانوی غلبے کے زیر اثر پاکستان، ایک آزاد ہندوستان کے معاندانہ عزائم کا توڑ ثابت ہو سکے گا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہو گا...... پاکستان کے پاس خام مال کے اہم وسائل، صنعتی پیداوار، افرادی قوت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مطلوبہ جگہ نہیں ہو گی جو کہ روس جیسی طاقت کی اعانت اور اسلحے سے لیس ہندوستان کے خلاف جنگی کارروائیوں کے لیے درکار ہو گی'' آگے چل کر اس نے لکھا کہ ''متحد انڈیا ان تمام کوائف کا حامل ہے جیسا کہ آزاد ہندوستان بھی حامل ہو گا، لیکن پاکستان ان کوائف کا حامل کبھی نہیں ہو سکتا خواہ شمال مشرقی انڈیا بھی اس میں شامل کر دیا جائے۔'' چنانچہ اُس نے لکھا کہ ''پاکستان وہ ذرائع مہیا نہیں کر سکے گا کہ جن کی مدد سے برطانوی دولت مشترکہ ایک آزاد ہندوستان پر غلبہ قائم کر سکے یا اُسے سزا دے سکے اور اُسے بیرونی معاندانہ اثرات سے آزاد رکھ سکے تا کہ بحر ہند کے خطے میں ہمارے مواصلات کے نظام کو محفوظ رکھا جا سکے۔''

اُس نے مستقبل میں پاکستان اور ہندوستان کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہندوستان اور پاکستان کی علیحدگی کے نتیجے میں ہندو کی مسلمان کے ساتھ بنیادی دشمنی میں کمی ہونے کے بجائے الٹا اضافہ ہو گا۔ شمال مشرقی انڈیا میں پاکستان زون قائم کرنے کی اگر کوئی کوشش ہوئی کہ جس میں ہندو اکثریت کا شہر کلکتہ بھی لازماً شامل ہو گا تو پھر ہندوؤں کی جانب سے سخت مزاحمت یقیناً ہو گی۔ اگر ہندوؤں نے وقتی طور پر اس زون کے قیام کو مان بھی لیا تو وہ فوراً ہی اس کی تباہی کے منصوبوں کی تیاری میں مصروف ہو جائیں گے تا کہ اسے دوبارہ ہندوستان میں شامل کیا جا سکے۔ کلکتہ اور خلیج بنگال کے بغیر ہندوستان ناقابل عمل ہو گا اور جونہی ہندوؤں کو اس کا احساس ہو گا، ہندوستان اور پاکستان کے مابین جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ ان

حالات میں برطانوی حکومت اپنے دولت مشترکہ کے اتحادی پاکستان کی اعانت کرنے پر مجبور ہوگی تاکہ پاکستان کی اس زون کو برقرار رکھا جا سکے۔ یوں اس مسئلے پر برطانیہ عالمی جنگ میں بھی ملوث ہوسکتا ہے۔'' آگے چل کر اُس نے لکھا کہ شمال مشرقی پاکستان کا دفاع ویسے ہی قابل عمل نہیں ہو سکے گا۔ ''یہ علاقہ فوج اور فضائیہ کی ضروریات پوری نہیں کرسکتا۔ بحری مواصلات مسلسل ہندوستان کے حملوں کی زد میں ہوگی اس لیے قابل اعتماد نہیں ہوگی۔'' اس کی رائے تھی کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان جھگڑے کی صورت میں برما اور چین بھی ہندوستان کا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ شمال مشرقی پاکستان کو تین اطراف سے حملوں کا سامنا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے دفاع کی خاطر برطانیہ کے خزانے پر بہت بھاری بوجھ پڑ جائے گا۔

اس کے بعد اُس نے شمال مغربی پاکستان کے دفاعی پہلوؤں کا تجزیہ کیا۔ اُس نے لکھا کہ ''یہ علاقہ سوائے اناج کے اور کسی معاملے میں خودکفیل نہیں ہے۔ اس کے پاس نہ تو خام مال ہے اور نہ صنعتی استعداد ہے۔ چنانچہ اسے جنگی ساز و سامان کئی سال تک باہر سے بھیجنا پڑے گا۔ اس کی فقط ایک کراچی کی بندرگاہ ہے جہاں سے اندرون ملک اور بیرون ملک رسل ورسائل ہوتی ہے۔ اس کو جانے والے راستے ہوائی حملوں کی زد میں ہیں اور قابل اعتبار نہیں ہیں۔ پاکستان آئندہ کئی سال تک خود اپنے دفاع کی خاطر بری اور فضائی افواج کے لیے افسر اور ٹیکنیشین تیار نہیں کر سکے گا......''

شمال کی جانب سے خطرے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''اگر شمال مغربی پاکستان نے کشمیر پر غلبہ حاصل کر لیا تو پھر اسے شمال سے اتنا خطرہ نہیں رہے گا کیونکہ اسے کوہ ہمالیہ کا تحفظ مل جائے گا۔ تاہم محدود طور پر خطرہ موجود رہے گا جو سنکیانگ کے اڈوں سے فضائی حملوں کی صورت میں ہوگا۔''

اُس کی رائے تھی کہ راجپوتانہ اور سندھ کے ریگستانی علاقے پاکستان کے لیے مؤثر دفاع مہیا کریں گے۔ اسی طرح مکران کا بنجر ساحلی علاقہ بھی بیرونی حملے کے لیے موزوں نہیں ہو گا۔ چنانچہ پاکستان کو بیرونی حملے کا سب سے زیادہ خطرہ شمال مغرب اور جنوب مشرق سے ہو گا۔ اُس نے پاکستان کے ذرائع نقل وحمل کو کمزور قرار دیا۔ اُس نے لکھا کہ ''نقل وحمل کے کم و بیش تمام راستے دریائے سندھ اور پنجاب کے دریاؤں کو نوے درجے کے زاویے پر عبور کرتے

ہیں، ان پر بہت کم پُل ہیں اور وہ بھی فضائی حملوں کی زد میں ہوں گے۔ جدید جنگ میں یہ بہت بڑی کمزوری ثابت ہوں گے حالانکہ دریا عموماً دفاعی لائن کا کام دیتے ہیں۔''

شمال مغرب کی جانب سے حملے کے خطرے کا مزید جائزہ لیتے ہوئے اُس نے لکھا کہ ''حملہ آور رُوس ہوگا جسے ایران اور افغانستان کی حمایت حاصل ہوگی جو ممکن ہے، بادل ناخواستہ اُس کا ساتھ دیں گے لیکن وہ پوری طرح سوویت یونین کے دباؤ میں آ چکے ہوں گے۔ انڈیا کا روسی جارحیت سے دفاع ایک پرانا مسئلہ ہے۔ اس کے خلاف مزاحمت کے مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا مسلسل جائزہ لیا جاتا رہا ہے اور اب بھی لیا جا رہا ہے۔ جن حالات میں اب ہمیں اس مسئلے کا سامنا ہے اس میں ایک نیا پہلو شامل ہو جائے گا اور وہ یہ کہ اب ایک آزاد و خودمختار مسلم ملک پاکستان اپنے بارڈر کا دفاع کر رہا ہوگا جب کہ اس سے پہلے برطانیہ ہوتا تھا جو غیر مسلم تھا اور افغانستان اور ایران میں اسے ناپسندیدگی، بداعتمادی اور خوف کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ وابستگی کی یہ تبدیلی اگرچہ پاکستان کی مغربی سرحدوں کے دفاع میں خاصی حد تک سہولت پیدا کرے گی لیکن بہلانے پھسلانے اور سرایت کر جانے کی جو قوت سوویت یونین کو حاصل ہے اُس کے پیش نظر اس کو دفاعی مسئلے کا مستقل حل قرار دینا دانشمندی نہیں ہوگا۔''

اس نے خیال ظاہر کیا کہ اگرچہ شمال مغربی پاکستان پر رُوس کی طرف سے کوئی بڑا زمینی حملہ شمالی افغانستان کی جانب سے کوہ ہندوکش کے دروں اور خیبر اور کرم کی گھاٹیوں کے راستے سے قریباً ناممکن ہے مگر قندھار کی جانب سے کوئٹہ اور درہ بولان پر اس قسم کا بڑا حملہ کیا جا سکتا ہے اور کوئٹہ کو باقی ماندہ ملک سے بآسانی کاٹا جا سکتا ہے کیونکہ یہ فقط ایک ریلوے لائن کے ذریعے پورے ملک سے جڑا ہوا ہے۔ اس نے اس حملے کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا اور نتیجہ نکالا کہ ''پاکستان نے جس سرحد کی نگرانی اور دفاع کرنا ہے اُس کی پشاور سے قلات تک کل لمبائی پانچ سو میل ہے۔ چنانچہ یہ فرض کر لینا چاہیے کہ رُوس کے سوچے سمجھے حملے کے خلاف برطانیہ کی طرف سے پاکستان کو مغربی سرحد کے دفاع کے لیے کم از کم طیاروں کے پندرہ سکواڈرن اور دس ڈویژن فوج مہیا کرنا پڑے گی۔ کیونکہ پاکستان از خود اپنے وسائل کی مدد سے جو فوج تیار کرے گا، خواہ وہ کتنی مستعد کیوں نہ ہو، ضرورت سے تھوڑی رہے گی۔''

اُس نے پیش بینی کرتے ہوئے لکھا کہ یہ فوج خواہ پاکستان مہیا کرے یا برطانیہ، اس

کے لیے رسد کی ترسیل کا واحد ذریعہ کراچی کی بندرگاہ ہوگی جو فقط ایک ریلوے لائن کے ذریعے اُس علاقے سے جڑی ہوئی ہے جہاں تمام تر سرگرمی ہو رہی ہو گی۔ اس سے جڑے ہوئے خشکی کے تمام راستے شمال مغرب اور جنوب کی طرف سے فضائی حملوں کی زد میں ہیں۔ بحری راستوں سے بھی صرف آبدوز کی مدد سے رابطہ ہو سکے گا کیونکہ سطح سمندر پر خلیج فارس کے اڈوں سے فضائی حملے متوقع ہوں گے۔ ان حالات میں تقریباً یہ تمام اڈے رُوس کے کنٹرول میں ہوں گے۔ اس ضمن میں اُس نے دوسری عالمی جنگ میں اپنے بعض تجربوں سے مثالیں بھی دیں۔

ہندوستان اور مغربی پاکستان کے درمیان جنگ کے دفاعی پہلوؤں کا بھی اُس نے تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا اور پاکستان کی دفاعی پوزیشن کو کمزور قرار دیا۔ اس نے لکھا کہ وسطی یا مشرقی پنجاب سے لے کر جنوب میں سمندر تک تمام تر سرحد کھلے میدانی علاقے سے گزرے گی۔ اگر دونوں ملکوں کے درمیان پنجاب کا کوئی دریا مثلاً راوی یا ستلج یا جمنا سرحد بن بھی جائے تب بھی یہ حقیقی طور پر قابل دفاع سرحد ثابت نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ اُس نے اس امر کو قرار دیا کہ ''ہندوستان کے اندرون کی جانب سے پاکستان کی سرحد تک نقل وحمل کے تمام راستے بہت بہتر ہیں اور اس قابل ہیں کہ وہ شمالی سیکٹر میں اپنی افواج کی کفالت کر سکے۔ اسے مغرب یا راجپوتانہ سیکٹر میں نسبتاً دشواری ہوگی جہاں میٹر گیج کی لائن ہے تاہم یہاں وہ ہلکی گشتی افواج کی کفالت کر سکتا ہے جو جنوب مغربی پنجاب کے مکئی اُگانے والے علاقے پر حملہ کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوں گی۔'' چنانچہ اُس نے لکھا کہ ''پاکستان کو جالندھر سے بٹھنڈہ تک ایک سو میل کی سرحد پر بڑے پیمانے پر بری فوج کے حملے کا سامنا ہوگا جبکہ بٹھنڈا سے کوٹری تک کے پانچ سو میل کی سرحد پر نسبتاً ہلکی افواج کے حملے کا اندیشہ ہوگا۔''

اُس نے ہندوستان اور پاکستان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''خشکی پر ہندوستان کی جانب سے پاکستان پر کتنا بڑا حملہ کیا جائے گا، اُس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ اُس نے اپنی صنعتوں، وسائل اور خام مال کو کس قدر ترقی دی ہے۔ اُس کی یہ ترقی یقینا پاکستان کی نسبت بہت زیادہ ہوگی۔ اس کا انحصار اس بات پر بھی ہوگا کہ اُسے اپنے سمندر پار اتحادی مثلاً روس سے کس قدر افراد اور جنگی سازوسامان کی امداد حاصل ہوتی ہے۔ ہندوستان کو وسیع پیمانے پر جنگی کارروائیوں کے اڈے کی حیثیت سے، خواہ یہ سمندر پر ہوں، خشکی پر ہوں یا فضا میں ہوں،

پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ برتر حیثیت حاصل ہو گی...... درحقیقت ہندوستان جدید جنگ کے لیے ایک مستعد اڈہ ہو گا جو کہ پاکستان کبھی بھی نہیں ہو سکے گا۔'' اُس نے ہندوستان کی روز افزوں ترقی کی پیش بینی کرتے ہوئے اندازہ لگایا کہ ''یہ بات یقینی ہے کہ اگر ہندوستان نے روس کی ظاہری امداد کے بغیر بھی پاکستان پر حملہ کر دیا تو پاکستان کی سلامتی کو برقرار رکھنے کی خاطر برطانیہ کی طرف سے اسے وسیع پیمانے پر فضائی اور بری افواج مہیا کرنا پڑ جائیں گی۔'' اور ایک بار پھر اُس نے اس کمزوری کا اعادہ کیا کہ ''ان تمام افواج کی کفالت کے لیے فقط کراچی کی ایک بندرگاہ مہیا ہو گی جو ناقابل اعتبار راستوں کے ذریعے لاہور اور بٹھنڈہ سے جڑی ہوئی ہے۔''

اُس نے اس امکان کا بھی جائزہ لیا کہ ''اگر شمال مغرب کی طرف سے روس نے اور جنوب مشرق کی طرف سے ہندوستان نے بیک وقت پاکستان پر حملہ کر دیا تو اس صورت میں برطانیہ کی جانب سے پاکستان کے دفاع کی خاطر اتنی بڑی تعداد میں فضائی اور بری افواج مہیا کرنا پڑیں گی جتنی کہ شمالی افریقہ میں محور کی افواج (فسطائی افواج) کی پسپائی سے پہلے ہمیں مشرق وسطیٰ میں مہیا کرنا پڑی تھیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اتنی بڑی فوج کو تنہا کراچی کی بندرگاہ سنبھال سکے گی......''

اپنے اس تفصیلی تجزیے کی روشنی میں آکن لیک نے آخر میں یہ نتیجہ برآمد کیا۔ ''اگر ہم بحر ہند کے خطے میں سمندر اور فضا میں اپنی آزادانہ نقل و حمل کی طاقت برقرار رکھنا چاہتے ہیں جو کہ میں سمجھتا ہوں ہمارے لیے برطانوی دولت مشترکہ کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی خاطر انتہائی ضروری ہو گی، تو ہم اس مقصد کو فقط انڈیا کو متحد رکھ کر ہی حاصل کر سکتے ہیں جو بخوشی دولت مشترکہ کا رکن بننے پر بھی تیار ہو گا اور اپنے وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے دولت مشترکہ کے دفاع میں حصہ لینے کے لیے بھی تیار ہو گا۔''[25]

کمانڈر انچیف آکن لیک کے نزدیک مشرقی و مغربی پاکستان کا وجود دفاعی اعتبار سے بالکل ناقابل عمل تھا۔ یہ پاکستان دولت مشترکہ کا دفاع تو کُجا خود اپنا دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ روس جیسی طاقت کے خلاف تو کُجا ہندوستان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا تھا۔ اُس نے اس تفصیلی تجزیے میں اپنی تمام تر فوجی مہارت اور تجربے کا زور تقسیم ہند اور پاکستان کے ناقابل

عمل ثابت کرنے پر صرف کر دیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ برصغیر ہند کو متحد رکھا جائے۔اس کے خیال میں اعتدال پسند کانگرسی رہنما دولت مشترکہ کا رکن بننے اور برطانوی سامراج سے تعاون کرنے پر آمادہ تھے۔اس کا یہ خیال بے بنیاد نہیں تھا جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوا۔آ کن لیک کا یہ تجزیہ ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے جو ابھی تک اس غلط پروپیگنڈے کا شکار ہیں کہ برطانوی سامراج قیام پاکستان میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ تھی کہ برطانوی سامراج کی اولین ترجیح برصغیر کو متحد رکھنا تھی۔

باب: 11

وزارتی مشن منصوبہ

منصوبہ کا اعلان، مطالبہ پاکستان نامنظور۔ متحدہ ہند کے دائرے میں حل کی تجویز

اس دوران وزارتی مشن کے ارکان اور وائسرائے اس خدشہ کے پیش نظر کہ دونوں فرقوں کے مابین کوئی تصفیہ نہیں ہو سکے گا اور حکومت برطانیہ کو خود ہی اس مسئلے کے حل کا کوئی اعلان کرنا پڑے گا، ایک سکیم وضع کرنے میں مصروف رہے اور اس سلسلے میں ان کے آپس میں کئی اجلاس ہوئے۔ اس سکیم پر گورنروں اور کمانڈر انچیف ہند کی رائے بھی لی گئی اور پھر 12 رمئی کو شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اس کا مسودہ حتمی منظوری کے لیے لندن بھیجا گیا جہاں 14 رمئی کو وزیراعظم ایٹلی کی زیر صدارت برطانوی کابینہ نے اس کی منظوری دے دی۔ 16 رمئی کو وزیراعظم ایٹلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں اور وزارتی مشن کی جانب سے دہلی میں اس سکیم کا متن جاری کر دیا گیا جو ''وزارتی مشن منصوبہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ شملہ کانفرنس میں مشن کی تجویز کردہ صوبوں کی فرقہ وارانہ گروپنگ کا جو خاکہ زیر بحث آیا تھا اور جس کے ساتھ جناح نے اصولی اتفاق کر لیا تھا، اب مشن کے اعلان کردہ منصوبے میں اسی خاکہ کو زیادہ سے زیادہ کانگرس کے نقطہ نظر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس اعلان کے ابتدائی گیارہ پیراگرافوں میں تقسیم ہند اور آزاد وخود مختار پاکستان کی تشکیل کی مخالفت میں دلائل جمع کئے گئے تھے اور بعدازاں مجوزہ منصوبے کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔ تقسیم ہند اور مطالبہ پاکستان پر بحث کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''اگرچہ مسلم لیگ کے حامیوں کے سوا ہر طرف سے متحدہ

ہند کی ہمہ گیر خواہش کا اظہار کیا گیا ہے لیکن پھر بھی ہم نے تقسیم ہند کے امکان کا بڑے غور سے اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے کیونکہ ہم مسلمانوں کی اس جائز اور شدید تشویش سے متاثر ہوئے ہیں کہ کہیں ان پر ہندو اکثریت کی دائمی حکمرانی قائم نہ ہو جائے۔ یہ احساس مسلمانوں کے اندر اس قدر شدت کے ساتھ جاگزیں ہو چکا ہے کہ اسے محض کاغذی تحفظات کی مدد سے دور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہم نے سب سے پہلے مسلم لیگ کی آزاد و خودمختار ریاست پاکستان کے مطالبہ کا جائزہ لیا ہے۔'' اس جائزہ میں پاکستان کے لیے مطلوبہ چھ صوبوں یعنی پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام کی مسلم اور غیر مسلم آبادی کے اعداد و شمار پیش کئے گئے جن کے مطابق شمال مغربی علاقہ کے چار صوبوں کی مجموعی آبادی کا تناسب 62.70 فیصد مسلم اور 37.93 فیصد غیر مسلم آبادی پر مشتمل تھا جب کہ شمال مشرقی علاقے کے دو صوبوں کی مجموعی آبادی کا 51.69 مسلم اور 48.31 فیصد غیر مسلم آبادی پر مشتمل تھا۔ باقی ماندہ برطانوی ہند کے بارے میں بتایا گیا کہ اس کی کل 18 کروڑ 80 لاکھ آبادی کے اندر تقریباً 2 کروڑ مسلمان بکھرے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال پر مشن نے کہا کہ ''ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق پاکستان کی ایک الگ خودمختار ریاست قائم کر دی جائے تو اس سے فرقہ وارانہ اقلیت کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ نہ ہی ہمارے پاس اس امر کا کوئی جواز ہوگا کہ ہم خودمختار پاکستان میں پنجاب، بنگال اور آسام کے ان اضلاع کو شامل کریں کہ جہاں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ ہر وہ دلیل جو پاکستان کے حق میں دی جا سکتی ہے ہماری رائے میں وہی دلیل غیر مسلم علاقوں کو پاکستان سے باہر رکھنے کے حق میں مساوی طور پر دی جا سکتی ہے۔ یہ نقطۂ خاص طور سے سکھوں کی حیثیت کو متاثر کرتا ہے۔

''چنانچہ ہم نے یہ بھی جائزہ لیا کہ ایک چھوٹا خودمختار پاکستان جو صرف مسلم اکثریت کے علاقوں تک محدود ہو، تصفیے کی ممکنہ بنیاد بن جائے۔ مسلم لیگ نے اس قسم کے پاکستان کو بالکل ناقابل عمل قرار دیا ہے کیونکہ اس میں ان علاقوں کو پاکستان سے نکال دیا گیا ہے۔

(الف) پنجاب سے تمام انبالہ ڈویژن اور جالندھر ڈویژن

(ب) آسام کا پورا صوبہ سوائے ضلع سلہٹ

(ج) مغربی بنگال کا بڑا حصہ بشمول کلکتہ کہ اس شہر میں مسلمان کل آبادی کا فقط 23.6 فیصد ہیں۔

ہم خود بھی اس کے قائل ہیں کہ کوئی بھی ایسا حل جس کے نتیجے میں پنجاب اور بنگال کو کسی بڑی تقسیم کے عمل سے گزرنا پڑے جیسا کہ اس صورت میں ہوگا، ان صوبوں کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد کی خواہشات اور مفادات کے خلاف ہوگا۔ بنگال اور پنجاب دونوں کی اپنی مشترک زبان، ایک طویل تاریخ اور ایک روایت موجود ہے۔ مزید برآں پنجاب کی تقسیم لازمی طور پر سکھوں کو تقسیم کر دے گی۔ سرحد کے دونوں اطراف ان کی اچھی خاصی تعداد رہ جائے گی۔ چنانچہ مجبوراً ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نہ تو بڑی اور نہ چھوٹی خودمختار ریاست پاکستان، فرقہ وارانہ مسئلے کا کوئی قابل قبول حل بن سکتی ہے۔

''مذکورہ بالا پُرزور دلائل کے علاوہ دوسرے انتظامی، معاشی اور فوجی نوعیت کے وزنی دلائل بھی موجود ہیں۔ ہندوستان میں نقل وحمل اور ڈاک وتار کا سارا نظام متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اگر اس نظام کو پارہ پارہ کر دیا گیا تو اس سے ہندوستان کے دونوں حصوں کو نقصان پہنچے گا۔ متحدہ دفاع کا مؤقف اس سے بھی زیادہ وزنی ہے۔ ہندوستانی مسلح افواج کی بحیثیت مجموعی استواری بحیثیت مجموعی ہندوستان کے دفاع کے لیے ہوئی ہے، ان کو دو حصوں میں بانٹ دینے سے ہندوستانی فوج کی پرانی روایات اور کارکردگی کے اعلیٰ معیار کو شدید دھچکا لگے گا جس کے نتیجے میں شدید خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ انڈین نیوی اور انڈین ائیرفورس اور بھی زیادہ بے اثر ہو جائیں گی۔ مجوزہ پاکستان کے دونوں حصے ہندوستان کی انتہائی پرخطر سرحدوں پر واقع ہوں گے اور کامیاب دفاع کے لیے جس قدر چوڑائی درکار ہے، پاکستان کا علاقہ اس کے لیے ناکافی ہوگا۔

''مزید قابل غور اہم مسئلہ یہ درپیش ہوگا کہ دیسی ریاستوں کے لیے تقسیم شدہ برطانوی ہندوستان کے ساتھ روابط قائم رکھنا بہت مشکل ہوگا۔

''مزید برآں یہ کہ مجوزہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان کوئی سات سو میل کا فاصلہ ہوگا اور امن و جنگ دونوں صورتوں میں ان کے درمیان مواصلات کا سارا دارومدار ہندوستان کی خیرسگالی پر ہوگا۔

''چنانچہ ہم برطانوی حکومت سے یہ سفارش نہیں کر سکتے کہ برصغیر کا اقتدار جو اس وقت برطانیہ کے ہاتھ میں ہے، دو بالکل علیحدہ خودمختار ریاستوں کے سپرد کیا جائے۔''[1]

اس کے بعد پیرگراف نمبر 12 اور نمبر 13 میں کانگرس کی مجوزہ سکیم کا تذکرہ کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان ایک وفاق ہوگا جس میں دفاع، امور خارجہ اور مواصلات لازمی طور پر مرکز کے پاس ہوں گے اور اگر صوبے چاہیں گے کہ وہ معاشی اور انتظامی منصوبہ بندی میں وسیع پیمانے پر شریک ہوں تو وہ مذکورہ لازمی شعبوں کے علاوہ بعض اختیاری شعبے بھی مرکز کو تفویض کر سکتے ہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مشن کی جانب سے کہا گیا کہ "ہماری رائے میں اس سکیم میں بہت سے آئینی نقائص اور سقم موجود ہیں۔ ایک ایسی مرکزی ایگزیکٹو اور قانون ساز اسمبلی وضع کرنا مشکل ہو جائے گا کہ جس میں کچھ وزیر جو لازمی شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہوں وہ تو پورے ہندوستان کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جائیں جب کہ کچھ وزیر جو اختیاری شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہوں صرف ان صوبوں کے لیے ذمہ دار ہوں جنھوں نے ان شعبوں میں اشتراک عمل کا فیصلہ کیا اور انہیں مرکز کے تحت کر دیا۔ یہ مسئلہ اس وقت زیادہ نمایاں ہوگا جب مرکزی اسمبلی میں بعض ارکان کو ان موضوعات پر بحث میں شریک ہونے اور رائے دینے سے روک دیا جائے گا کہ جن سے ان کے صوبوں کا تعلق نہیں ہوگا اس عملی مشکل کے علاوہ ہم یہ بھی جائز نہیں سمجھتے کہ جن صوبوں نے مرکز کو اختیاری شعبے تفویض نہیں کئے ان کو اس مقصد کے لیے اپنا الگ گروپ بنانے کا حق نہ دیا جائے۔"

چنانچہ مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے مؤقف سے بظاہر انحراف کرتے ہوئے مشن نے ان کے بین بین ایک آئینی منصوبہ پیش کیا جس کا مرکز و محور برصغیر کی ایک ہی مملکت کو برقرار رکھنا تھا۔ یہ منصوبہ کم و بیش اسی گروپنگ سکیم کے مشابہ تھا جس پر مشن نے دونوں فریقین کو شملہ میں مذاکرات کی دعوت دی اور تصفیہ کرانے کی کوشش کی تھی جو کہ ناکام رہی تھی۔ خاص فرق یہ تھا کہ اب کانگرس کو راضی کرنے کی خاطر مرکز میں نمائندگی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پیریٹی (برابری) کا اصول ترک کر دیا گیا تھا اور اس کی بجائے آبادی کے تناسب کو بنیاد بنایا گیا تھا۔ اس منصوبے کا خاکہ وزارتی مشن کے بیان کے پیرا 15 سے 19 تک بالصراحت بیان کیا گیا تھا۔ پیرا۔ 15، جس کی بعد ازاں مختلف توجیہات کی گئیں، کا متن یہ ہے:

"15۔ اب ہم ایک ایسا حل پیش کرتے ہیں جو ہماری رائے میں تمام فریقین کے مطالبوں پر پورا اُترتا ہے۔ اس میں یہ امکان پوری طرح موجود ہے کہ کل ہند آئین کی ایک

مستحکم اور قابل عمل صورت پیدا ہو جائے گی۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئین کو ذیل میں دی گئی بنیادی ہیئت کا روپ اختیار کرنا چاہیے۔

1۔ ایک یونین آف انڈیا ہوگی جو سارے برطانوی ہند اور ریاستوں پر مشتمل ہوگی اور امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے اس کی تحویل میں ہوں گے اور اسے ان محکموں کے لیے درکار آمدنی کے حصول کے ضروری اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

2۔ یونین کی ایک ایگزیکٹو اور ایک قانون ساز اسمبلی ہوگی جو برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ قانون ساز اسمبلی میں درپیش کسی بھی بڑے فرقہ وارانہ مسئلہ کے فیصلے کے لئے ہر دو بڑے فرقوں کے حاضر اور رائے شماری میں شریک نمائندوں کی اکثریت اور ایوان میں حاضر اور رائے شماری میں شامل تمام ارکان کی بحیثیت مجموعی اکثریت درکار ہوگی۔

3۔ یونین کی تحویل میں دیئے گئے شعبوں کے علاوہ باقی تمام شعبے اور باقی ماندہ اختیارات صوبوں کو تفویض کئے جائیں گے۔

4۔ ریاستیں وہ تمام اختیارات اور شعبہ جات اپنے پاس رکھیں گی جو مرکز کی تحویل میں نہیں دیئے گئے ہیں۔

5۔ صوبوں کو آزادی ہوگی کہ وہ اپنے گروپ تشکیل دیں جن کی اپنی ایگزیکٹو اور قانون ساز اسمبلی ہو۔ علاوہ بریں ہر گروپ صوبائی شعبہ جات میں سے ان شعبوں کا تعین کر سکے گا جو اس گروپ کے مابین مشترکہ ہوں گے۔

6۔ یونین اور گروپوں کے دساتیر میں یہ شق شامل ہوگی کہ ابتدائی دس سال بعد اور پھر ہر دس سال بعد کوئی بھی صوبہ اپنی قانون ساز اسمبلی کی کثرت رائے سے آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔''

اس کے بعد پیراگراف 16 میں کہا گیا کہ مشن کا مدعا یہ نہیں ہے کہ ان خطوط پر آئین کی تفصیلات بھی طے کر دی جائیں بلکہ اس کا مقصد ''ایک ایسے نظام (مشینری) کو حرکت میں لانا ہے جس سے ہندوستانیوں کا آئین ہندوستانیوں کے ذریعے طے پا جائے۔''
آئین سازی کے اس نظام کی وضاحت کرتے ہوئے پیراگراف 18 میں کہا گیا کہ

اگرچہ آئینی ڈھانچہ وضع کرنے کی خاطر اسمبلی کی تشکیل کے لیے کل آبادی کی درست اور وسیع تر نمائندگی نہایت ضروری ہے لیکن موجودہ حالات میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے تو آئین سازی کے کام میں ناقابل قبول تاخیر پیدا ہو جائے گی اس لیے حال میں منتخب ہونے والی صوبائی اسمبلیوں کو انتخابی ادارے کی حیثیت سے بروئے کار لایا جائے گا۔ صوبوں سے نمائندگی کو آبادی کے تناسب کے مطابق بنانے کے لیے یہ طریقہ کار وضع کیا گیا کہ

ا۔ ہر صوبے کے لیے اس کی آبادی کے تناسب سے کل نشستیں اس طرح مخصوص کی جائیں کہ کم و بیش ہر دس لاکھ آبادی کے حصے ایک نشست آئے تاکہ اسے بالغ رائے دہی کے قریب قریب متبادل سمجھا جا سکے۔

ب۔ صوبوں کے لیے مخصوص کی جانے والی نشستوں کو ہر صوبے کے بڑے فرقوں کے مابین ان کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کر دیا جائے۔

ج۔ ہر فرقہ کے لیے مخصوص کی جانے والی نشستوں پر نمائندوں کا انتخاب اسی فرقے سے تعلق رکھنے والے ارکان صوبائی اسمبلی کریں گے۔''

اس مقصد کے لیے فرقہ وارانہ تقسیم تین حصوں میں کی گئی تھی

(۱) عمومی

(۲) مسلم

(۳) سکھ

یہاں عمومی کی اصطلاح میں ہندوؤں سمیت وہ تمام لوگ شامل تھے جو نہ مسلم تھے اور نہ سکھ۔ اس کے بعد پیراگراف۔ 19 میں آئین سازی کے طریق کار کی مرحلہ وار تفصیل طے کی گئی تھی۔ اس طویل پیراگراف، جس نے بعد میں بڑی متنازعہ فیہ صورت اختیار کر لی تھی اور جس کی مختلف توجیہات کی گئی تھیں، کا پورا متن یہ ہے:

''19۔(۱) چنانچہ ہماری تجویز یہ ہے کہ ہر صوبائی قانون ساز اسمبلی درج ذیل تعداد میں نمائندے منتخب کرے گی۔ قانون ساز اسمبلی کا ہر حصہ (یعنی عمومی، مسلم یا سکھ) اپنے نمائندے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر واحد قابل انتقال ووٹ کے ذریعے منتخب کرے گا۔

نمائندگی کا جدول

(گروپ الف)

صوبہ	عمومی	مسلم	کُل
مدراس	45	4	49
بمبئی	19	2	21
یو۔پی	47	8	55
بہار	31	5	36
سی۔پی	16	1	17
اڑیسہ	9	0	9
کل	167	20	187

(گروپ ب)

صوبہ	عمومی	مسلم	سکھ	کُل
پنجاب	8	16	4	28
سرحد	0	3	0	3
سندھ	1	3	0	4
کل	9	22	4	35

(گروپ ج)

صوبہ	عمومی	مسلم	کُل
بنگال	27	33	60
آسام	7	3	10
کل	34	36	70

برطانوی ہند کے لیے کل نشستیں	292
دیسی ریاستوں کے لیے مخصوص نشستیں	93
کل میزان	385

''(۲)۔ ریاستوں کو حتمی آئین ساز اسمبلی میں مناسب نمائندگی دینے کا بھی مقصد ہے۔ برطانوی ہند میں نمائندوں کی تعداد کے تعین کے لیے جو طریقۂ کار وضع کیا گیا ہے، اسی کو بنیاد بنا کر ریاستوں سے آئین ساز اسمبلی میں لیے گئے ارکان کی تعداد 93 سے تجاوز نہیں کرے گی۔ ان کے چناؤ کا طریقہ مشورے سے طے کیا جائے گا۔ ابتدائی مرحلوں میں ریاستوں کی ابتدائی نمائندگی کا کام ایک مذاکراتی ٹیم کے سپرد ہوگا۔

''(۳)۔ اس طرح منتخب ہونے والے نمائندوں کا اجلاس جتنی جلد ممکن ہوگا نئی دہلی میں منعقد ہوگا۔

''(۴)۔ یہ ایک ابتدائی اجلاس ہوگا۔ جس میں صرف عمومی فرائض انجام دیئے جائیں گے۔ چیئرمین اور دوسرے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے گا۔ شہریوں، اقلیتوں، قبائلیوں اور مستثنیٰ علاقوں کے حقوق کے لیے مشاورتی کمیٹی قائم کی جائے گی۔ اس کے بعد صوبوں کے نمائندے تین حصوں (سیکشنوں) میں بٹ جائیں گے جیسا کہ اس پیراگراف کے ذیلی پیراگراف (ا) میں نمائندگی کے جدول میں ا، ب اور ج کے طور پر دکھائے گئے ہیں۔

''(۵)۔ یہ حصے (سیکشن) اپنے اندر شامل صوبوں کے لیے آئین تشکیل دیں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا ان صوبوں پر مشتمل گروپ کا کوئی آئین ہوگا یا نہیں اور اگر ہوگا تو وہ کون سے شعبے ہوں گے جو کہ گروپ کی تحویل میں ہوں گے۔ صوبوں کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ نیچے دی گئی ذیلی دفعہ (۸) کے مطابق گروپوں سے علیحدگی اختیار کر سکیں گے۔

''(۶)۔ یونین کا آئین طے کرنے کے لیے گروپوں اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے دوبارہ مجتمع ہوں گے۔

''(۷)۔ یونین کی آئین ساز اسمبلی میں ایسی قرار دادیں جو پیراگراف۔ 15 کی شقوں میں تبدیلی کا موجب ہوں یا کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ اٹھاتی ہوں، دونوں بڑے فرقوں سے تعلق رکھنے والے حاضر اور رائے شماری میں شریک ارکان کی اکثریت سے طے پائیں گی۔ اسمبلی کا چیئرمین یہ فیصلہ کرے گا کہ آیا کسی قرارداد سے بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا ہوگا اور یہ کہ اس معاملے میں اگر کسی بڑے فرقے کی

اکثریت نے مطالبہ کیا تو وہ کوئی فیصلہ دینے سے پہلے وفاقی عدالت (فیڈرل کورٹ) سے مشورہ کرے گا۔

''(۸)۔ جونہی نیا آئینی بندوبست عمل میں آجائے گا تو پھر کسی بھی صوبے کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اس گروپ سے باہر نکلنے کا انتخاب کر سکے کہ جس میں اسے رکھا گیا ہے۔ اس قسم کا فیصلہ صوبے کی وہ قانون ساز اسمبلی کر سکے گی جو نئے آئین کے تحت منعقد ہونے والے پہلے عام انتخابات کے بعد وجود میں آئے گی۔''

اس کے بعد پیراگراف 20 میں شہریوں، اقلیتوں، قبائلیوں اور مستثنیٰ علاقوں کے حقوق کے بارے میں مشاورتی کمیٹی کی تشکیل اور ڈھانچے کی تفصیل دی گئی تھی۔ آخر میں پیراگراف 23 میں کہا گیا کہ آئین سازی کے عرصے کے دوران کاروبار حکومت چلانے کے لیے بڑی سیاسی پارٹیوں کے تعاون سے عبوری حکومت تشکیل دی جائے گی جس میں محکمہ جنگ سمیت تمام محکموں کے قلمدان ایسے ہندوستانیوں کے سپرد کئے جائیں گے جنہیں عوام کا پورا اعتماد حاصل ہو گا۔ یہ بھی ذکر کیا گیا کہ وائسرائے نے اس سلسلے میں بات چیت کا آغاز کر دیا ہے اور بہت جلد عبوری حکومت کی تشکیل کی توقع ہے۔[2]

وزارتی مشن کی طرف سے جاری کردہ یہ اعلان محض ارکان مشن کی جانب سے نہیں تھا بلکہ ''حکومت عالیہ برطانیہ'' کی توثیق کے بعد دہلی اور لندن میں بیک وقت جاری ہوا تھا۔ اس میں برصغیر کو متحد رکھ کر اس خطے کو آزادی دینے کا مکمل منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ اعلان کے اول حصے میں برطانوی حکمرانوں کی جانب سے کھل کر اور بالوضاحت مطالبہ پاکستان کو مسترد کیا گیا تھا۔ ایٹلی اپنی سوانح حیات میں وزارتی مشن اور حکومت برطانیہ کی جانب سے مطالبہ پاکستان مسترد کرنے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ''مجھے اور میرے رفقاء کو ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی ساری مشکلات نظر آتی تھیں کیونکہ تقسیم کی صورت میں دونوں ریاستوں میں اقلیتوں کا رہنا لازمی تھا۔ ہمیں یہ بھی شبہ تھا کہ پاکستان قائم رہ سکے گا جب کہ اس کا ایک اہم جغرافیائی یونٹ مرکز سے اس قدر الگ ہوگا۔ لہٰذا میرے وزارتی رفقاء اور وائسرائے نے اس مسئلہ کے ایسے حل کی تلاش میں کئی گھنٹے صرف کئے جو دونوں فرقوں کے لیے اطمینان بخش ہوسکتا تھا۔''[3] مشن کی جانب سے جاری کردہ بیان میں مطالبہ پاکستان

مسترد کرنے کے جواز میں دو اہم وجوہات بیان کی گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایک قابل ذکر غیر مسلم اقلیت کو مسلم اکثریت کے ملک میں مغلوب ہو کر رہنا پڑے گا اور دوسرے یہ کہ ہندوستان کی جغرافیائی تقسیم اور اس کی مسلح افواج کی تقسیم سے برصغیر کا دفاع کمزور پڑ جائے گا۔ (یہاں دفاع سے مراد سوویت یونین کے خلاف اینگلو امریکی حلقۂ اثر کا دفاع تھا)۔

16 رمئی کو پیتھک لارنس نے اور 17 رمئی کو ویول نے مجوزہ سکیم کے سلسلے میں علی الترتیب کی گئی اپنی نشری تقریروں میں انہی دو وجوہات کا اعادہ کرتے ہوئے آزاد و خودمختار پاکستان کا مطالبہ رد کر دیا۔ پیتھک لارنس نے کہا کہ ''مسلم لیگ کی مطلوبہ ریاست پاکستان صرف مسلمانوں پر مشتمل نہیں ہوگی۔ اس میں لگ بھگ چالیس فیصد دوسرے فرقے بھی آباد ہوں گے۔ اس لیے ایک علیحدہ آزاد و خودمختار مسلم مملکت فرقہ وارانہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس نے کہا کہ پاکستان کی بقیہ ہندوستان سے مکمل علیحدگی کے نتیجے میں پورے ملک کا دفاع خطرے میں پڑ جائے گا کیونکہ فوج دو حصوں میں منقسم ہو جائے گی اور ملک کی وہ چوڑائی بھی ختم ہو جائے گی جو جدید جنگ میں دفاع کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔''[4] ویول نے مجوزہ سکیم کے بارے میں کہا کہ ''اس کے ذریعے ہندوستان کی لازمی وحدت محفوظ رہے گی جس کو دو بڑے فرقوں کے باہمی تنازعہ سے خطرہ درپیش ہے اور بالخصوص ہندوستانی فوج جیسے عظیم اشتراک عمل کا شیرازہ بکھرنے کا اندیشہ بھی دور ہو جائے گا جس کا ہندوستان پہلے ہی کافی ممنون احسان ہے اور جس کی قوت، وحدت اور مستعدی پر مستقبل میں اس کی سلامتی کا انحصار ہے۔''[5] چنانچہ برصغیر کی فوجی وحدت کی خاطر سیاسی وحدت کو برقرار رکھنے کی سفارش کی گئی تھی اور مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ مجوزہ سکیم میں ان کو ''پاکستان کے تمام فوائد تقسیم ہند میں مضمر خطرات سے دوچار ہوئے بغیر ہی حاصل ہو جائیں گے۔'' جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کے لیے وہ رعائتیں بھی مزید کم کر دی گئی تھیں جو شملہ مذاکرات میں زیر بحث گروپنگ سکیم میں مشن نے خود تجویز کی تھیں۔ اُس میں مرکز کی آئین ساز اور قانون ساز اسمبلیوں میں مسلم اکثریت کے گروپ کو غیر مسلم اکثریت کے گروپ کے برابر نمائندگی دی گئی تھی اور پیریٹی (برابری) کا اصول رکھا گیا تھا۔ لیکن اب اعلان کردہ سکیم میں برطانوی ہند کی 292 نشستوں میں آبادی کے تناسب کی بنیاد پر مسلم اکثریت کے گروپ کو (یعنی ب اور ج ملا

کر) صرف 78 نشستیں دی گئی تھیں۔ مزید یہ کہ مسلم گروپ کو تقسیم کر کے دو حصوں ب اور ج میں بانٹ دیا گیا تھا تاکہ مرکز میں مسلم گروپ کی ہم آہنگی برقرار نہ رہ سکے۔ مسلمان عوام الناس جنہوں نے حالیہ انتخابات میں تقریباً بحیثیت مجموعی مسلم لیگ کو ووٹ دے کر آزاد وخودمختار پاکستان کے حصول کے لیے اپنے غیر متزلزل عہد کا مظاہرہ کیا تھا، اعلان کردہ وزارتی مشن منصوبہ میں مطالبہ پاکستان کے بُری طرح رد کیے جانے پر سخت برافروختہ ہوئے۔ منصوبہ میں مسلمانوں کے لیے جو کچھ تجویز کیا گیا تھا اسے ان کی طرف سے فوری پذیرائی حاصل نہ ہوسکی۔

جناح کا مثبت ردِ عمل

جناح اپنی صحت کی خرابی کے باعث ابھی تک شملہ میں تھے۔ 18 رمئی کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکریٹری جارج ایبل نے اعلان کردہ مشن منصوبہ کے بارے میں فوری ردعمل جاننے کے لیے جناح کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کی۔ جناح نے کہا کہ مسلم لیگ کی کونسل اور مجلس عاملہ کے ساتھ مشورہ کئے بغیر کسی فیصلے پرنہیں پہنچ سکتا جن کے اجلاس اوائل جون میں طلب کئے گئے ہیں۔ تاہم انہوں نے کہا کہ مشن کے جاری کردہ بیان پر مسلمانوں کا ردعمل بہت شدید ہے۔ اگر عجلت سے کام لیا گیا تو بڑے افسوس کی بات ہوگی۔ مزید گفتگو کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ وزارتی مشن سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ ذرا تحمل سے کام لے اور مسلم لیگ کو کچھ وقت دے۔ مجھے اتنا وقت دیا جائے کہ میں ''اپنے عوام'' کو یہ سمجھا سکوں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں۔ اگر عجلت دکھائی گئی تو سب کچھ بگڑ جائے گا۔ ان کی رائے میں مسلم عوام پر لازم ہے کہ وہ مشن منصوبہ کی حقیقی اہمیت کو سمجھیں۔ جناح نے ایبل کو بتایا کہ ''میں بروز پیر (22 رمئی) کی صبح کو ایک بیان جاری کروں گا جس میں مسلمانوں سے درخواست کروں گا کہ وہ پرسکون رہیں اور یہ کہ مشن کا جاری کردہ بیان نہایت اہمیت کا حامل ہے اور مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اس کا جائزہ لیں۔ آخر میں جناح نے ایبل کی وساطت سے وزارتی مشن سے ایک بار پھر درخواست کی کہ جلد بازی سے کام نہ لیا جائے۔ اگر مسلمانوں کو وقت دیا گیا تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ کوئی سودمند نتیجہ برآمد ہوجائے گا۔''[6]

اس دوران مسلم لیگ کا سیکرٹری جنرل لیاقت علی خان شملہ میں جناح سے ملاقات

کرنے کے بعد واپس دہلی پہنچا۔ 19 رمئی کو لیاقت علی خان نے جناح کے ساتھ اپنی بات چیت کی تفصیل سے وزارتی مشن اور وائسرائے کو آ گاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ جناح سمجھتے ہیں کہ مشن کے جاری کردہ بیان سے مسلمانوں میں مایوسی پیدا ہوئی ہے۔ اگر مسلم لیگ نے ابھی فوری طور پر اس پر غور کیا تو ایک جذباتیت کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے انہوں نے مشن سے درخواست کی ہے کہ انہیں جس قدر ممکن ہو سکے وقت دیا جائے تاکہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے اجلاس پرسکون ماحول میں منعقد ہو سکیں۔''[7] مشن کے ارکان نے اس تاخیر پر افسوس کرتے ہوئے وقت دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لیاقت علی خان نے انہیں آ گاہ کیا کہ جناح کی ہدایت پر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے اجلاس علی الترتیب 3 رجون اور 5 رجون کو دہلی میں رکھے گئے ہیں۔

جناح کی طرف سے کچھ مہلت کے حصول پر اصرار سے یہ صاف عندیہ ملتا تھا کہ وہ مشن منصوبہ کو قبول کرنے کی جانب مائل تھے لیکن مسئلہ اس مسلم رائے عامہ کا تھا جو آزاد و خودمختار پاکستان کے مطالبے سے ایک قدم پیچھے ہٹنے کو آمادہ نہ تھی۔ مسلمانوں کو برانگیختہ کرنے میں اس امر کو بھی دخل تھا کہ ہندو پریس خوشی کے شادیانے بجا رہا تھا کہ انگریزوں نے مطالبہ پاکستان کو ہمیشہ کے لیے رد کر دیا ہے اور یہ کہ انگریز بہرطور برصغیر کو متحد رکھنا چاہتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کے اخبار ''نیشنل ہیرلڈ'' کی رائے یہ تھی کہ جناح نے جس پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اسے وزارتی مشن کی دستاویز میں سرکاری طور پر دفن کر دیا گیا ہے اور اس امر کا برملا اور پُرزور الفاظ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ وزارتی مشن نے جناح کے پاکستان کو جو موت کی سزا دی ہے حکومت برطانیہ اس پر مہر توثیق ثبت کر چکی ہے تاکہ اس کی موت کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہ رہے اور نہ ہی اس کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکان کا خطرہ رہے۔[8] کانگرسی پریس کے اس اشتعال انگیز رویے کی وجہ سے جناح اور بھی مجبور ہوئے کہ وہ کچھ مہلت لے کر ''اپنے عوام'' کو مشن منصوبے کی حقیقی اہمیت سمجھنے پر مائل کر سکیں۔ اس لیے انہوں نے فوری ردعمل کے طور پر 22 رمئی کو ایک محتاط قسم کا بیان جاری کیا۔ اس بیان میں وزارتی مشن کی مجوزہ سکیم پر بہت سے اعتراضات کئے گئے۔ سب سے بڑا اعتراض پاکستان کو رد کیے جانے پر تھا۔ یہ اعتراض بھی کیا

گیا کہ مسلم گروپ (پاکستان گروپ) کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے چھوٹے بڑے اعتراضات کرنے کے بعد آخر میں کہا گیا کہ "میں آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل کے فیصلے کے لیے کوئی پیش بندی نہیں کر رہا ہوں جن کے اجلاس عنقریب دہلی میں ہونے والے ہیں۔ ان اجلاسوں میں برطانوی وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے جاری کردہ بیان کے تمام اچھے برے پہلوؤں پر اچھی طرح غور وفکر کرنے اور اس کا تفصیلی اور غیر جذباتی جائزہ لینے کے بعد جو مناسب ہوگا فیصلہ کیا جائے گا۔"[9] ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان عامتہ الناس کی جذباتی کیفیت وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کرنے پر مائل نہ تھی اور جناح کی جانب سے اس کا "غیر جذباتی" ہو کر تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کی ضرورت پر زور دینے کا مطلب یہی تھا کہ مسلمان عامتہ الناس کو مشن منصوبہ قبول کرنے پر راغب کیا جائے۔ اس لیے کہ بقول چودھری محمد علی "وزارتی مشن نے پورے برصغیر کی وحدت کو قائم رکھنے کے لیے جو منصوبہ پیش کیا تھا وہ ان سارے منصوبوں سے بہتر تھا جو اس سے پہلے مرتب کئے گئے تھے۔ اگرچہ مشن نے پاکستان کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا تھا لیکن اس نے مسلمانوں کو ان کی اکثریت والے علاقوں میں اپنے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی مفادات پر خاصا کنٹرول دیا تھا۔"[10]

مجوزہ گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لیے گاندھی، پیتھک لارنس اور کرپس کی ساز باز۔ قانونی موشگافیاں

گانگرسی حلقوں میں جہاں اس امر پر خوشی اور اطمینان پایا جاتا تھا کہ مشن اور حکومت برطانیہ نے مطالبہ پاکستان کو بالکل رد کر دیا ہے وہاں انہیں اس بات پر سخت اعتراض بھی تھا کہ متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے مسلم صوبوں کو اپنے علیحدہ گروپ بنانے کے حق کی سفارش کیوں کی گئی ہے۔ وہ مشن منصوبہ میں تجویز کردہ آئین ساز اسمبلی کو تو قبول کرتے تھے کہ اس میں ہندوؤں کو بھاری اکثریت دی گئی تھی۔ لیکن وہ اسے تین گروپوں میں تقسیم کرنے کے خلاف تھے اور اس اسمبلی میں اپنی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر اپنی مرضی کا آئین وضع کرنا چاہتے تھے۔ انہیں اس ضمن میں مشن کی سفارشات کا پابند ہونا قبول نہ تھا۔

مشن کا بیان جاری ہوتے ہی اس سلسلے میں پہلا اور فوری ردعمل گاندھی کی جانب سے

ہوا۔ اس نے 17رمئی کو ایک بیان میں جو اس کے اخبار ہریجن میں شائع ہوا، کہا ''مشن اور وائسرائے نے فریقین کے مابین مفاہمت کی پوری کوشش کی لیکن وہ کوئی تصفیہ نہ کروا سکے۔ چنانچہ انہوں نے ملک کے لیے وہ سفارشات دی ہیں جو ان کے خیال میں آئین ساز اسمبلی کو قابل قبول ہوں گی۔ یہ ادارہ (یعنی آئین ساز اسمبلی) ان سفارشات میں ترمیم کرنے یا ان کو ردکرنے یا ان میں اصلاح کرنے کا مجاز ہوگا۔ ان کی یہ سفارشات ''قبول کرو یا رد کرو'' کے زمرے میں نہیں آتیں۔ اگر قدغنیں لگائی گئیں تو آئین ساز اسمبلی کو ہندوستان کی آزادی کا آئین آزادانہ طور پر وضع کرنے کے لیے ایک خودمختار ادارہ کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ اب جیسے کہ مشن کی جانب سے مرکز کے بعض شعبے مخصوص کئے گئے ہیں۔ اسمبلی کو مسلموں اور غیر مسلموں کی جداگانہ کثرت رائے سے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ (مسلم وغیر مسلم کی) اس تفریق کو جسے مشن نے مجبوراً تسلیم کرلیا ہے، کا خاتمہ کردے۔ یہی صورت گروپنگ کی ہے۔ صوبوں کو آزادی ہے کہ وہ چاہیں تو گروپنگ کو سرے سے ہی رد کردیں۔ اگر گروپنگ کا تصور تسلیم بھی کر لیا گیا تب بھی کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف گروپ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔''[11]

دراصل گاندھی چاہتا تھا کہ وزارتی مشن منصوبہ میں سے اپنے مطلب کی باتیں قبول کر لی جائیں اور بقیہ جو اپنے مطلب کے خلاف جاتی ہوں انہیں توڑ مروڑ کر اپنے مطلب کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ اسی لیے اس کے نزدیک یہ منصوبہ پورے کا پورا نہ تو ''قبول کرو'' میں آتا تھا اور نہ ہی ''رد کرو'' میں۔ اس منصوبہ میں ہندو بورژوا کے حق میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ برصغیر کو ایک سیاسی وحدت کے طور پر برقرار رکھا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ ایک ایسی آئین ساز اسمبلی کے قیام کی سفارش کی گئی تھی جس میں آبادی کی بنیاد پر ہندو اکثریت کو غلبہ حاصل تھا۔ گاندھی ان دو بنیادوں کو تسلیم کرکے باقی عمارت اپنی مرضی سے کھڑی کرنا چاہتا تھا کہ جس میں گروپنگ اور مسلم وغیر مسلم کے امتیاز کے حوالے سے مسلمانوں کو دی گئی رعایتوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے اس مقصد کا حصول برملا اور کھلے انداز سے کرنے کی بجائے منافقت اور چال بازی کے ذریعے کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے مشن کے دوسرکردہ ارکان سرسیٹفورڈ کرپس اور وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس کا در پردہ تعاون بھی حاصل تھا اور جن کے ساتھ اس کا براہ راست رابطہ بھی قائم رہتا تھا۔

18رمئی کو ساڑھے چھ بجے ان دونوں اصحاب کی گاندھی کے ساتھ تین گھنٹے طویل ملاقات ہوئی۔ اسی روز دوپہر بارہ بجے مشن کے ارکان اور وائسرائے ویول کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ان دونوں صاحبان نے گاندھی کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ پیتھک لارنس نے بتایا کہ ''شروع میں گاندھی ہمارے سرکاری بیان پر بالکل مطمئن نظر آتا تھا لیکن پھر اس نے ایک ایسا نکتہ اٹھایا کہ مجھے مشکل پڑ گئی۔ گاندھی صحیح طور پر سمجھا تھا کہ سرکاری بیان کے پیراگراف 15 میں کی گئی سفارشات میں ترمیم یونین آئین ساز اسمبلی کی مجموعی کثرت رائے اور دونوں بڑے فرقوں کے ارکان کی جداگانہ کثرت رائے سے ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس نے سوال اٹھایا کہ آیا آئین ساز اسمبلی کے لیے وضع کردہ طریقۂ کار میں بھی اسی طرح سے ترمیم کی جاسکتی ہے۔ اس کی خاص مثال دیتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کانگرس پارٹی کے نمائندے اس معاملہ میں کہ آیا واقعی یہ اسمبلی تین حصوں میں تقسیم ہوجائے یا اس سے پہلے یونین کا آئین وضع کرے، سوال اٹھانے کے مجاز ہوں گے؟'' سرکاری ریکارڈ کے مطابق پیتھک لارنس نے اجلاس کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے گاندھی کو کیا جواب دیا۔ البتہ اس نے یہ ضرور بتایا کہ گاندھی نے عندیہ دیا ہے کہ اس کی جانب سے مشن منصوبے کی حمایت کا سارا انحصار اسی نکتے پر ہے۔ سیٹفورڈ کرپس نے اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے اجلاس کو بتایا کہ ''دراصل پیراگراف 19 کی ذیلی شق (vii) کے اندر ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے جس سے وضاحت ہوتی ہو کہ اس قسم کے معاملہ کو بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دیئے بغیر اس پر دونوں بڑے فرقوں کی جداگانہ کثرت رائے درکار ہوگی اور بلا شبہ یہی صورت اس مثال میں ہے جو گاندھی نے پیش کی ہے۔''[12]

حقیقت یہ تھی کہ مشن کے جاری کردہ بیان کے پیراگراف 15 میں جہاں کہ آئین کا خاکہ دیا گیا تھا صوبوں کو گروپ بنانے کی آزادی دینے کا ذکر تو تھا لیکن یہ کہ تین گروپ ہوں گے اور فلاں صوبے ان میں شامل ہوں گے وغیرہ وغیرہ، یہ بات اس پیرے میں شامل نہیں تھی بلکہ پیرا۔19 میں آئین ساز اسمبلی کے ضمن میں شامل کی گئی تھی۔ پیراگراف 19 ہی کی شق (vii) کے مطابق دونوں بڑے فرقوں کی جداگانہ کثرت رائے سے صرف پیراگراف 15 میں دیئے گئے آئینی خاکے میں ترمیم کا حق تھا یا پھر وہ حق اس صورت میں استعمال کرسکتے تھے جب

کہ اسمبلی میں درپیش کسی معاملہ کو بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ قرار دیا گیا ہو۔ کسی قرارداد کو بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ کا موجب قرار دینے کا اختیار اسمبلی کے چیئرمین (سپیکر) کو حاصل تھا یا پھر دونوں میں سے کسی ایک بڑے فرقے کی درخواست پر وہ اس ضمن میں فیڈرل کورٹ سے مشورہ لے سکتا تھا۔ وزارتی مشن کے بیان میں موجود ایسے سقم پر مبنی تانا بانا جوڑ کر گاندھی نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ بنایا تھا وہ یوں تھا کہ آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کانگرسی ارکان کی طرف سے اسمبلی کے تین گروپوں میں تقسیم ہونے کے خلاف قرارداد پیش کروا دی جائے۔ چونکہ اسمبلی کا تین گروپوں میں تقسیم ہونا پیرا۔ 15 میں وضع کردہ آئینی خاکہ کا جزو نہیں تھا اس لیے پیرا۔19 کی ذیلی شق (vii) کے مطابق اس معاملہ پر مسلم ارکان کی جداگانہ کثرت رائے درکار نہ تھی تاآنکہ گروپنگ کی اس سکیم کو بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ قرار نہ دے دیا گیا ہو جس کا اختیار اسمبلی کے چیئرمین کو حاصل تھا جو بہرصورت اکثریتی جماعت کانگرس کے ارکان کے اندر سے منتخب شدہ ہونا تھا اور جس پر باپو کے اشاروں پر چلنا لازم تھا۔ زیادہ سے زیادہ معاملہ فیڈرل کورٹ تک جاتا تو وہاں بھی ہندو بورژوا کو جو اثر حاصل تھا وہ مسلمانوں کے پاس کہاں تھا اور پھر ویسے بھی اس معاملے میں فیڈرل کورٹ کی حیثیت محض مشاورتی تھی۔ اس طرح گروپنگ سکیم کو آئین ساز اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں کانگرس کی جانب سے سبوتاژ کر کے اس کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا اور اسی لیے گاندھی کے نزدیک وزارتی مشن منصوبہ کا اگرچہ سرکار عالیہ برطانیہ کی جانب سے اعلان کیا گیا تھا لیکن اس کو ایوارڈ کی حیثیت حاصل نہ تھی، اسے سفارش کا درجہ حاصل تھا جس کو قبول کرنے کا اگرچہ بظاہر مطلب یہی تھا کہ پیرا۔19 میں وضع کردہ آئین سازی کی مرحلہ وار سکیم بھی قبول کر لی گئی ہے جو صوبوں اور تین گروپوں کی آئین سازی کے مراحل سے گزر کر مرکز کی آئین سازی پر آئی تھی جب کہ گروپوں میں شامل صوبوں کی بھی واضح نشاندہی کر دی گئی تھی۔ لیکن درپردہ مشن کے مذکورہ دونوں ارکان نے گاندھی کو یقین دہانی کرا دی تھی کہ اس سکیم کی پابندی لازمی نہیں ہے۔ یہ بات 18 رمئی کی صبح کو ان دونوں صاحبان کی گاندھی کے ساتھ ہونے والی تین گھنٹے کی طویل خفیہ بات چیت میں ہوئی۔ گاندھی کا سوانح نگار اور ذاتی سیکرٹری پیارے لال اس ملاقات کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''لارڈ پیتھک لارنس نے گاندھی جی کے ایک سوال کے جواب میں انہیں یہ یقین دہانی کرائی کہ

ہمارے مجوزہ منصوبے کی ساری بنیاد رضا کارانہ ہے۔ اس میں کسی جگہ بھی جبر کا عنصر شامل نہیں ہے۔ گاندھی جی نے اس پر استدلال کیا کہ اگر ایسا ہے تو پھر باقی کام تشریح وتوضیح کے ذریعے سیدھا کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس کام پر اپنے قانونی ذہن کا اطلاق کیا''[13] چنانچہ مشن کے اہم ترین ارکان کی جانب سے یقین دہانی ملنے کے بعد اس ''قانونی ذہن'' نے جو کہ دراصل ''شیطانی ذہن'' تھا، پیراگراف 15 اور 19 کی تشریح وتوضیح پر پورا زور صرف کر دیا اور وزارتی مشن منصوبہ کی اصل روح یعنی گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لیے طرح طرح کی توجیہات نکال لیں۔

پیتھک لارنس اور کرپس اپنے ہی مشن کی جانب سے پیش کردہ منصوبہ کو سبوتاژ کروانے کے لیے گاندھی کے ساتھ جو ساز باز کر رہے تھے اور اسے جو یقین دہانیاں کروا رہے تھے اس کا جناح کو قطعاً علم نہ تھا۔ یہاں تک کہ مشن کے تیسرے رکن اے۔ وی۔ الیگزینڈر اور وائسرائے ویول سے بھی ان رابطوں اور یقین دہانیوں کو پوشیدہ رکھا جا رہا تھا جو اول الذکر دونوں صاحبان گاندھی اور کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ کر رہے تھے۔ اسی روز جب دوپہر کو ارکان مشن اور وائسرائے کے مابین اجلاس ہوا تو کرپس اور پیتھک لارنس نے یہ تو بتایا کہ گاندھی نے اپنی حمایت دینے کا دارومدار کس نکتے پر رکھا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے اس بارے میں اسے کیا یقین دہانی کرائی ہے۔ تاہم ویول کو کچھ شبہ تھا کہ ان دونوں کی جانب سے گاندھی کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور یہ کہ گاندھی کا ''قانونی ذہن'' کس سمت میں کام کر رہا ہے۔ ویول نے کرپس اور پیتھک لارنس کی بات سن کر کہا کہ ''مجھے پوری طرح تو معلوم نہیں کہ گاندھی کے پس ذہن کیا کارفرما ہے۔ لیکن مشن کے ارکان کے ذہنوں میں کانگرس کے عزائم کے بارے میں کوئی شک وشبہ یا غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ ویول نے اپنی پختہ رائے کا اظہار کیا کہ ''کانگرس کے رہنماؤں کا مقصد عبوری حکومت کے تحت مرکز میں اقتدار کا حصول ہے۔ اس کے بعد وہ جب چاہیں گے کوئی فرقہ وارانہ مسئلہ کھڑا کر کے آئین ساز ادارے کو تارپیڈو کر دیں گے۔ اگر وہ اس وقت تک آئین سازی کے کام کو تاخیر میں ڈال دیں کہ جب تک برطانوی افواج کا یہاں سے مکمل انخلا ہو جائے اور ان کو پولیس اور ہندوستانی فوج پر کنٹرول حاصل ہو جائے تو پھر وہ اس پوزیشن میں ہوں گے کہ مسلمانوں اور دیسی ریاستوں کے ساتھ اپنے وقت

پر اپنی مرضی کا سلوک کریں......'' کرپس نے جواب میں کہا کہ ''دراصل کانگرس میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ جو کہ بڑا ہے چاہتا ہے کہ آئین عبوری دور میں ہی مکمل ہو جب کہ ایک واضح عنصر ایسا بھی موجود ہے جو وہ کرنا چاہتا ہے جس کا وائسرائے نے ذکر کیا ہے''۔ کرپس نے مزید کہا کہ ''گاندھی کو ان انتہا پسند عناصر کی جانب سے مشکل کا سامنا ہے جو مشن منصوبہ کی مخالفت کر رہے ہیں اور یہ کہ گاندھی اس ضمن میں یہ یقین دہانی چاہتا ہے کہ آیا ابتداء ہی میں گروپوں کے تشکیل پانے کے معاملے کو زیر بحث لایا جا سکے گا اور آیا اس میں ترمیم ممکن ہو گی اگر مسلم ارکان کی اکثریت کو اس ترمیم کے حق میں رائے دینے پر راغب کیا جائے۔''[14] لیکن کرپس نے انتہائی بد دیانتی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ صبح کی ملاقات میں اس کی موجودگی میں پیتھک لارنس نے گاندھی کو یہ یقین دہانی کرا دی ہے کہ یہ منصوبہ ''رضا کارانہ'' ہے اور اس میں کوئی ''لازمی عنصر'' شامل نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ ہر ترمیم ہو سکتی ہے اور اس کے لیے مسلم ارکان کا اکثریتی ووٹ بھی لازمی نہیں ہے۔ تاہم مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ آئین ساز ادارے کے لیے وضع کردہ طریقۂ کار میں ترمیم دونوں بڑے فرقوں کی کثرت رائے سے ہی ہو سکے گی اور اس سلسلے میں پیتھک لارنس کو ہدایت کی گئی کہ وہ گاندھی کو بذریعہ مراسلہ مطلع کر دے۔ پیتھک لارنس نے مراسلہ بھیج دیا۔ گویا پیتھک لارنس اور کرپس ایک طرف اے۔ وی۔ الیگزینڈر اور ویول کے ساتھ بیٹھ کر سرکاری سطح پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے کہ وہ غیر جانب داری سے کام لے رہے ہیں مگر دوسری طرف گاندھی اور کانگرس کو در پردہ یقین دہانیوں کے ذریعے یہ باور کروا رہے تھے کہ وہی کچھ ہو گا جو گاندھی اور کانگرس چاہیں گے۔

پیتھک لارنس اور کرپس، گاندھی کے روحانی ہم مشرب۔ ان کی کانگرس نوازی اور اے۔ وی الیگزینڈر اور ویول کی برہمی

سامراجیوں میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے طریقۂ کار پر باہمی اختلاف رائے موجود ہوتا ہے اور اس ضمن میں ہمیشہ ایک سے زائد مکتبہ ہائے فکر موجود ہوتے ہیں۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر یہ بات برطانیہ کے کم و بیش سب ہی حلقوں نے تسلیم کر لی تھی کہ برصغیر کو آزاد کر کے اس بوجھ سے نجات حاصل کی جائے مگر اس طرح کہ یہاں زیادہ سے زیادہ مفادات

بھی محفوظ رہ جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی سب کی متفقہ رائے تھی کہ برصغیر کو سیاسی اور فوجی لحاظ سے متحد رہنا چاہیے۔ لیکن ان مقاصد کے حصول کے لیے طریق کار پر اختلاف پایا جاتا تھا۔ برسراقتدار لیبر پارٹی کا مؤثر گروپ ہندو بورژوا کی نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگرس کو برصغیر کا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور گاندھی کے نام نہاد ''عدم تشدد'' اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں کی اعتدال پسندی میں انہیں برصغیر میں سامراج دشمن انقلابی تحریکوں اور کمیونسٹ عناصر کے فروغ کا توڑ بھی نظر آتا تھا۔ اس لیے وہ برصغیر کی تقدیر کانگرس کے حوالے کرنے کے خواہاں تھے۔ انتقال اقتدار کا طریقہ اور مراحل طے کرنے کے لیے جو سہ رکنی وزارتی مشن ہندوستان بھیجا گیا تھا اس میں خود وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس اور بورڈ آف ٹریڈ کا چیئرمین سر سٹیفورڈ کرپس اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسرا رکن فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی (یعنی وزیر بحریہ) اے۔ وی۔ الیگزینڈر ہندوستان کے حالات سے بہت کم واقف تھا اور جب مارچ کے اواخر میں وہ مشن کے ہمراہ یہاں آیا تو اس کے ذہن پر ہندوستانی سیاست کے بارے میں جو تھوڑے بہت نقوش تھے وہ کانگرس ہی کے بارے میں تھے۔ یہاں قیام کے دوران اسے ہندوستانی صورتحال کا پتہ چلا اور وہ گاندھی کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کر سکا۔

جہاں تک وائسرائے ویول کا تعلق تھا تو وہ جب 1943ء میں وائسرائے مقرر ہوا تو وہ بھی کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتا تھا اور اس نے آتے ہی ہندوستان کو ایک ازلی جغرافیائی وحدت قرار دیا تھا۔ گاندھی کے ساتھ خط و کتابت کی اور پھر اسے رہا کیا اور رفتہ رفتہ دوسرے کانگرسی لیڈروں کو بھی رہا کر دیا اور کانگرس کے ساتھ رابطوں کو بڑھایا۔ لیکن کچھ عرصہ ہندوستان کا انتظامی کنٹرول سنبھالنے کے بعد اسے یہاں موجود فرقہ وارانہ تضادات کی شدت کا اندازہ ہوا اور خالص امن عامہ کے نقطۂ نگاہ سے اس کا یہ تاثر گہرا ہوتا گیا کہ اگر ہندو مسلم تضاد کو حل کیے بغیر ہندوستان کو چھوڑ دیا گیا تو یہ پورا خطہ بدامنی اور انتشار کا شکار ہو جائے گا اور برطانیہ تو کئی سال کے لیے یہاں الجھ جائے گا یا پھر بڑا شدید نقصان اٹھا کر یہاں سے جانا پڑے گا۔ اسے اس صورت حال سے انتہا پسندوں اور کمیونسٹوں کے فائدہ اٹھانے کا ڈر تھا۔ خاص طور پر 1945-1946ء کے انتخابات کے بعد اس کی یہ رائے پختہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دیئے بغیر ہندوستان کا امن اور اتحاد برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے بیشتر گورنروں کی

بھی یہی رائے تھی۔ فرقہ وارانہ مسئلہ پر گاندھی کے منافقانہ رویے اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں کی جانب سے بلاشرکت غیرے کانگرس کو اقتدار منتقل کرنے اور بصورت دیگر امن عامہ خراب کرنے کی دھمکیوں کے پیش نظر اسے گاندھی سے بالخصوص اور کانگرسی لیڈروں سے بالعموم چڑ ہو گئی تھی۔ تاہم وہ نہرو کو بہت پسند کرتا تھا اور پٹیل کی بھی اس لحاظ سے تعریف کرتا تھا کہ وہ صاف گو تھا۔ اپنے عہد کے اوائل میں اس نے جناح کو بالکل منہ نہ لگایا لیکن جوں جوں فرقہ وارانہ مسئلے کی اہمیت اُس پر واضح ہوتی گئی اُس نے جناح کی قدر کرنی شروع کر دی۔ اگرچہ وہ جناح کے بارے میں بھی سخت الفاظ استعمال کرتا تھا اور انہیں سرد مہر، بے لچک اور سخت گیر کہتا تھا لیکن وہ گاندھی کے مقابلے میں ان کو زیادہ معقول اور صاف گو سمجھنے لگا تھا۔ وہ پاکستان کا ہمیشہ مخالف رہا۔ وہ متحدہ ہند کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے ہندو مسلم مسئلے کے حل کا متمنی تھا۔ چونکہ جناح کا رویہ بھی اس معاملے میں زیادہ سخت نہیں تھا، اس لیے بھی وہ ان کو گاندھی کے مقابلے میں معقول سمجھتا تھا۔ ان حالات میں جب مارچ کے اواخر میں وزارتی مشن یہاں آیا تو پیتھک لارنس اور سٹیفورڈ کرپس کی جانب سے گاندھی کی چاپلوسی کرنے کے انداز کو اس نے سخت ناپسند کیا اور ان دونوں وزیروں کے ساتھ اس کا تضاد پیدا ہو گیا۔

3/اپریل کو گاندھی کے ساتھ مشن کی پہلی ملاقات کا، جس میں ویول خود بھی موجود تھا، اپنے روزنامچے میں احوال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''وزیر ہند (پیتھک لارنس) نے اس بدباطن بڈھے سیاست دان کے ساتھ اپنی مخصوص کریم النفسی سے لبریز رقت آمیز لہجے میں گفتگو کا آغاز کیا جس نے اگرچہ بظاہر بڑی زہد و تقدیس کی باتیں کی تھیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کی سرشت میں نرمی ذرہ بھر بھی موجود نہیں ہے۔'' آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ ''سچی بات ہے گاندھی کے ساتھ حد درجہ مؤدب ہونے پر اس وقت مجھے سخت دھچکا لگا جب اس نے پانی کے گلاس کی خواہش ظاہر کی اور وزیر (پیتھک لارنس) بجائے چپراسی کو بھیجنے کے خود پانی لانے چلا گیا اور جب اس کی واپسی میں دیر ہوئی تو پیچھے پیچھے کرپس بھی دوڑا چلا گیا۔ میں اسے نہ صرف وقار کے منافی سمجھتا ہوں بلکہ میری رائے میں اس قسم کی باتوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔''[15] 8/اپریل کے روزنامچے میں اس نے مشن کے ارکان کے ساتھ اپنے اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''میں نے کانگرس کے ساتھ مسلسل چاپلوسی کا رویہ رکھنے پر اعتراض کیا۔''

اس نے کہا کہ ''گاندھی اینڈ کمپنی'' کو یہ تاثر مت دیجئے کہ وہ ہندوستان کے مالک بن چکے ہوئے ہیں۔ اس پر الیگزینڈر نے ویول کے ساتھ اتفاق کیا لیکن پیتھک لارنس اور کرپس خاموش رہے۔''[16] 9/اپریل کے روزنامچہ میں وہ پیتھک لارنس کے ساتھ اپنی گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ'' گزشتہ روز میں نے کانگرس کے ساتھ چاپلوسی کے رویے پر جو اعتراض کیا تھا اس کا پیتھک لارنس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور وہ پھر سے اسی قسم کی فراخدلانہ باتیں کر رہا تھا۔ ویول نے اسے اس خطرہ سے آگاہ کیا جو کانگرس کو یہ تاثر ملنے سے پیدا ہوسکتا تھا کہ وہ جو چاہے حاصل کر سکتی ہے۔''[17]

18/اپریل کو مشن ارکان کے ساتھ اجلاس میں عبوری حکومت کے اختیارات کا معاملہ زیر غور آیا۔ کانگرس چاہتی تھی کہ وائسرائے کے اختیارات کم کر کے ایگزیکٹو کونسل کے اختیارات بڑھا دیئے جائیں۔ ویول کی پختہ رائے تھی کہ ایسا نہ کیا جائے بلکہ جو دستور چل رہا ہے اسی کو رہنے دیا جائے اور اس مؤقف پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا جائے۔ الیگزینڈر نے ویول کی تائید کی لیکن کرپس نے یہ عندیہ دیا کہ اگر کانگرس نے بریک ڈاؤن کی دھمکی دی تو پھر ہمیں ان کا یہ مطالبہ ماننا پڑے گا۔ ویول نے اس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے روزنامچے میں لکھا کہ''...... مجھے یہ جان کر ذرا حیرت نہ ہوئی کہ اس نکتے پر کرپس پہلے ہی کانگرس والوں کی تشفی کرنے کا وعدہ کر چکا ہے......''[18] مئی کے اوائل میں جب مشن کے ارکان شملہ میں تھے اور مذاکرات کے ساتھ ساتھ مشن منصوبہ کا مسودہ بھی خفیہ طور پر تیار کیا جا رہا تھا، ویول نے اپنے 4/مئی کے روزنامچے میں کرپس کے بارے میں لکھا''......اس کی ساتھ ساتھ چلنے والی سرگرمیاں اکثر و بیشتر شرارت آمیز ہوتی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ خود کو صرف مسودہ نگاری تک محدود رکھے تو ٹھیک ہے کہ یہ کام وہ اچھی طرح کرتا ہے......''[19] شملہ کانفرنس کی ناکامی پر 12/مئی کو اپنے روزنامچے میں اس نے لکھا ''میرا خیال ہے کرپس کے کانگرس کیمپ کے ساتھ مسلسل اور روزمرہ رابطے بہت غلط رہے۔''[20] پھر اسی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد 16/مئی کو وزارتی مشن منصوبہ پیش ہوا جس پر ''قانونی ذہن'' کا اطلاق کر کے گاندھی اسے اپنے مطلب کے مطابق ''سیدھا'' کر رہا تھا اور کرپس اور پیتھک لارنس اس کی پشت پناہی کر رہے تھے۔

گاندھی کے ساتھ ان کے خصوصی مراسم اور رابطوں کے بارے میں ویول کے بیانات

کی تصدیق خود گاندھی کے ذاتی سیکرٹری پیارے لال سے بھی ہوتی ہے جس نے ان مراسم اور رابطوں کا ذکر اپنے ممدوح کی تعریف وتوصیف کے طور پر کیا ہے پیارے لال لکھتا ہے" وزارتی مشن کے تین ارکان میں سے لارڈ پیتھک لارنس اور سرسٹیفورڈ کرپس گاندھی جی کو پہلے سے جانتے تھے۔ مسز ایمیلین پیتھک لارنس کی ان کے ساتھ ملاقات ایک میٹنگ میں ہوئی تھی جو عورتوں کے حق رائے دہی کی مہم کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ ان کے انگلستان کے ابتدائی دوروں کے دوران کا واقعہ ہے۔" آگے چل کر لکھتا ہے" لیڈی پیتھک لارنس ان دونوں (یعنی گاندھی اور پیتھک) کے مابین رابطہ بنی۔"[21] کرپس کے بارے میں پیارے لال لکھتا ہے کہ "سرسٹیفورڈ اپنی انتہائی سادگی پسندی، نباتات خوری اور روح کی شفایابی کی قوت پر ایمان کی بدولت اپنی ذہنی وضع میں گاندھی سے قریب تر ہوا۔ اگر لارڈ پیتھک لارنس مضبوط برطانوی عقل سلیم کا حامل ہوتے ہوئے وزارتی مشن کے ضمیر کی نمائندگی کرتا تھا تو سرسٹیفورڈ اس کا دماغ تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی ذہنی توانائی، حاضر دماغی اور قانونی فراست کے ذریعے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے ساتھیوں کو گاندھی جی کا ذہن سمجھنے کے لیے کلید مہیا کی۔ گاندھی جی اپنے طور پر سرسٹیفورڈ کو اپنا "دست و بازو اور دھن کا پکا" جان کر بہت خوش ہوتے تھے......جس چیز نے گاندھی جی کا دل بالکل موہ لیا تھا وہ سرسٹیفورڈ کی یہ بات تھی، جیسا کہ بعد کے واقعات نے بھی ثابت کیا کہ وہ اپنے یقین محکم پر ثابت قدم رہنے کی جرأت رکھتا تھا۔" پیارے لال نے اس سلسلے میں یہ واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ مشن کے دہلی میں قیام کے دوران کرپس بیمار ہو گیا۔ گاندھی نے اپنے ڈاکٹر ڈنشا مہتا کو بھیجا جو کہ "قدرتی علاج" کا ماہر تھا۔ قدرتی علاج میں جدید دواؤں سے بالکل پرہیز کیا جاتا تھا اور روح کی قوت شفایابی پر انحصار کیا جاتا تھا۔ سٹیفورڈ نے گاندھی کے اس طریقہ علاج پر عمل کیا اور ڈنشا کے بارے میں لکھا کہ "اس نے میرا دل بالکل جیت لیا" تاہم سٹیفورڈ کو اس سے بالکل کوئی افاقہ نہ ہوا اور ہسپتال میں کئی روز داخل رہنے اور جدید ادویات کے استعمال نے اسے ٹھیک کیا۔ لیکن بقول پیارے لال "گاندھی جی کے رام نامہ نے اسے روحانی تسکین مہیا کی اور وہ قوت اور استقلال دیا جس کی مدد سے اس نے امن وسکون اور حاضر دماغی کے ساتھ اس بیماری کا نڈر ہو کر مقابلہ کیا۔"[22]

گاندھی کے ساتھ ان کی مذہبی حوالے سے قربت کا ذکر کرتے ہوئے پیارے لال لکھتا

ہے ”لارڈ پیتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ دونوں گاندھی جی کی گہری مذہبی حیثیت کے معاملے میں بھی ان کے شریک تھے۔“ اس ضمن میں تفصیل یہ تھی کہ وزارتی مشن کے دہلی پہنچتے ہی کرپس نے گاندھی کو فوری طور پر دہلی پہنچنے کے لیے جو خط لکھا اس میں یہ بھی لکھا کہ ”برطانوی انجمن احباب“ سے تعلق رکھنے والے دو احباب اگا تھا ہیریسن اور ہوریس الیگزینڈر نے مسیحی امن مشن کے سلسلے میں آئندہ اتوار کو دہلی میں ”احباب“ کی ایک مجلس کا اہتمام کیا ہے۔ میں نے اگا تھا ہیریسن سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس طمانیت فکر اور عبادت میں شریک ہوں گا۔ میں پوری امید کروں گا کہ آپ بھی وہاں تشریف رکھتے ہوں، تا کہ ہم کچھ دیر اس روحانی ہم مشربی میں باہم شریک ہوں۔ مجھے بھرپور توقع ہے کہ آپ ہر ممکن طور پر وہاں موجود ہوں گے اور اس طرح سرکاری ماحول میں ملاقات کرنے سے پیشتر مجھے آپ سے ملنے اور غیر رسمی بات چیت کرنے کا موقع بھی حاصل ہو جائے گا۔“[23] گاندھی نے یہ دعوت قبول کر لی اور مذکورہ مجلس میں ان کی ملاقات ہوئی اور ان غیر سرکاری رابطوں کا آغاز ہوا جن پر ویول کو اعتراض تھا۔

دہلی میں گاندھی نے بالمیکی مندر میں قیام کیا۔ گاندھی کو ہندوؤں کے سیاسی رہنما کے علاوہ مذہبی پیشوا کا درجہ بھی حاصل تھا اور اسی لیے اسے مہاتما کہا جاتا تھا۔ وہ مندر یا آشرم میں قیام کرتا یا برلا یا ٹاٹا کے محلات میں۔ اس کا معمول تھا کہ صبح اور شام پرارتھنا سبھا یعنی عبادت کی مجلس منعقد کرتا تھا۔ جس میں ویدوں اور ہندو دھرم کی دوسری مقدس کتابوں کا پاٹھ کیا جاتا اور بھجن گائے جاتے۔ آخر میں گاندھی وعظ کرتا جن میں ان مقدس کتابوں سے یا کسی بھجن سے رہنمائی لی جاتی تھی۔ وہ اپنی ان تقریروں میں حالات حاضرہ پر اپنے موقف کا اظہار اشاروں میں اور بعض اوقات واضح الفاظ میں کرتا تھا۔ چنانچہ وزارتی مشن کے سلسلے میں دہلی کے بالمیکی مندر میں قیام کے دوران بھی اس کا یہ معمول جاری رہا۔ پیارے لال کے مطابق پیتھک لارنس اور سٹیفورڈ کرپس نے گاندھی کی ان پرارتھنا سبھاؤں میں شرکت کی اور ”پرارتھنا“ کی ان خاموش سبھاؤں نے وزارتی مشن کے ارکان اور گاندھی جی کو روحانی ہم مشربی کا ایک قابل قدر موقع مہیا کیا۔“[24] اس طرح برطانوی لیبر کابینہ کے یہ ”روشن خیال“ وزیر بالمیکی مندر سے مہاتما کی روحانی ہم مشربی حاصل کر کے برصغیر میں ”سیکولر“ بنیادوں پر فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے اور جناح کو مطالبہ پاکستان کی بنا پر ”رجعت پسند“ قرار دیتے تھے۔

گاندھی کی جانب سے گروپنگ سکیم کی کھلی مخالفت اور پیتھک لارنس اور کرپس کی مخالفت

اس پس منظر میں جب 16رمئی کو وزارتی مشن منصوبہ کا اعلان ہوا تو گاندھی کے ''قانونی ذہن'' نے اپنے ''روحانی ہم مشربوں'' پیتھک لارنس اور سٹیفورڈ کرپس کی پشت پناہی سے اس منصوبے میں گروپنگ کی صورت میں مسلمانوں کی محدود خودمختاری کی جوگنجائش رکھی گئی تھی اس کا قلع قمع کرنا شروع کر دیا۔ 18رمئی کو اگرچہ صبح کے وقت ملاقات میں پیتھک لارنس اور کرپس نے گاندھی کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ آئین ساز اسمبلی کے طریق کار میں گروپنگ سے متعلق طریق کار کی پابندی لازمی نہیں ہے لیکن دوپہر کو مشن کے اجلاس میں تیسرے رکن الیگزینڈر اور وائسرائے ویول کی موجودگی میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس طریق کار میں تبدیلی کے لیے مسلم ارکان آئین ساز اسمبلی کی کثرت رائے بھی درکار ہوگی اور مشن کے اس مؤقف سے پیتھک لارنس نے گاندھی کو بذریعہ مراسلہ آگاہ کر دیا تھا۔ اس میں پیتھک لارنس نے لکھا تھا کہ ''اگر فریقین مجوزہ طریقۂ کار پر باہم عمل شروع کر دیں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ انہوں نے اسے بطور بنیاد قبول کر لیا ہے لیکن ہر دو فریقین کی کثرت رائے سے اس میں ترمیم بھی کی جاسکتی ہے۔'' 19رمئی کو گاندھی نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''آپ کے اس جملے کا آخری حصہ کاٹ دینا چاہیے کیونکہ میرے منشاء کے لیے یہ زائد از ضرورت ہے۔'' گویا وہ ترمیم کے لیے ہر دو فریقین کی کثرت رائے کے اصول کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس طرح اسمبلی کے پہلے اجلاس میں صرف ہندو ارکان کی اکثریت سے گروپنگ کو سبوتاژ کرنے کا اس کا ''منشاء'' پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد اس نے پیرا۔15 کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس میں تجویز کردہ خاکہ کی حیثیت محض سفارش کی ہے، آئین ساز اسمبلی اس کی پابند نہیں ہوگی۔'' یاد رہے کہ پیرا۔15 میں دیئے گئے خاکہ میں صرف گروپوں کے بنانے کے اختیار کا ذکر کیا گیا تھا، تین گروپوں اور ان میں شامل صوبوں کی نشاندھی اس میں نہیں کی گئی تھی، یہ پیرا۔19 میں کی گئی تھی۔ لیکن گاندھی کو لفظ ''گروپ'' بھی بری طرح چبھ رہا تھا۔ اس نے لکھا کہ ''کیا مشن کی اس دستاویز کو قبول کرنے والوں کو گروپنگ کی کھلے عام مخالفت کا اختیار حاصل ہوگا اور اگر اس کا

جواب ''ہاں'' میں ہے تو پھر صوبہ سرحد اور آسام کے ارکان کو آزادی ہوگی کہ وہ ان گروپوں سے باہر نکل جائیں جن میں انہیں شامل کیا گیا ہے۔''[25] اس خط کے لکھنے سے پہلے گاندھی کی کرپس اور پیتھک لارنس کے ساتھ سات گھنٹے کی طویل گفتگو رہی تھی۔

سہ پہر کے وقت مشن کے ارکان اور وائسرائے کا اجلاس ہوا جس میں کرپس نے اس طویل گفتگو کا خلاصہ بیان کیا اور گاندھی کا مذکورہ خط زیر بحث آیا۔ کرپس کے مطابق گاندھی نے علاوہ اور نکات کے سب سے پہلے یہ نکتہ اٹھایا کہ آیا آئین ساز اسمبلی کے طریق کار میں ترمیم ہر دو فریقین کی رضامندی کے بغیر ممکن ہوگی اور یہ کہ سرحد اور آسام کی کیا حیثیت ہوگی؟ نیز عبوری حکومت کے اختیارات بھی زیر غور آئے۔ ویول اُس روز کے اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ ''کرپس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کوئی بات مانے بغیر ہر نکتے پر اس کی تسلی کر دی ہے لیکن مجھے اس پر بھرپور شبہ ہے...... میں نے کرپس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اس کی رائے میں گورنر جنرل کے اختیارات کو روایت ڈال کر محدود کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے کانگرس کو اس رائے پر پختہ کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔'' پھر گاندھی کے مذکورہ خط کو زیر بحث لانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔''......(یہ خط) صوبوں کے گروپوں کا قلع قمع کرنے کی کانگرس کی پہلی کوشش ہے۔ مشن نے اپنے بیان پر ثابت قدم اور پختہ نہ رہ کر یہی کچھ حاصل کرنا تھا۔ انہوں نے گاندھی کے ساتھ سات گھنٹے صرف کئے اور یہ نتیجہ نکلا۔ یہ ایک زیرک اور بددیانت سیاست دان کی پورے منصوبے کو تارپیڈو کرنے کی عیارانہ کوشش ہے۔ میں نے مشن کو صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ اگر ہم اپنے بیان کی اصلاح کرنے یا اس کے وکیلانہ نکتوں پر بحث کرنے میں پڑ گئے تو ہماری سکیم بالکل غرق ہو جائے گی۔ ہماری بچت صرف اسی میں ہے کہ ہم ثابت قدم اور پختہ رہیں اور بحث بازی سے انکار کر دیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔''[26] اس اجلاس میں ویول نے مزید کہا کہ کانگرس نے ہمیں ایک طرح سے مطلع کر دیا ہے کہ وہ گروپنگ کی تجویز سے پہلوتہی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ الیگزینڈر نے کہا کہ آئین سازی کے مرحلے کے دوران صوبہ سرحد اور آسام کو گروپ ب اور ج سے کس طرح خارج کیا جا سکتا ہے۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق اس کے ساتھ کرپس نے بھی اتفاق کیا کہ مختلف گروپوں کے صوبوں کی فہرست میں کوئی ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم کرپس نے کہا

کہ ہم نے اپنے بیان میں یہ نہیں کہا ہے کہ یہ معاملات آئین ساز ادارے کے فیصلے کے دائرہ کار سے باہر ہیں بشرطیکہ وہ پیرا۔19 (vii) کی شق کے مطابق ہوں۔ اس پر ویول نے کہا کہ ''اگر اب تک ہم نے نہیں کہا تو اب ہمیں ضرور اس کا برملا اظہار کر دینا چاہیے۔''[27] دراصل گاندھی کے روحانی ہم مشرب کرپس نے وزارتی مشن منصوبہ کا مسودہ اس طرح تیار کیا تھا کہ اس میں گروپنگ سکیم بظاہر اس کا لازمی حصہ نظر آئے لیکن حقیقت میں ایسا نہ ہو بلکہ اس میں ایسے سقم رہنے دیئے گئے کہ گاندھی کا ''قانونی ذہن'' آسانی سے اس سکیم کو تارپیڈو کر سکے۔ اس کا توڑ الیگزینڈر اور ویول کے مطابق یہی تھا کہ گروپنگ کے معاملے میں بے لچک اور سخت رویہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ ان دونوں کا اصرار تھا کہ گاندھی کے مذکورہ خط کے جواب میں قطعی اور فیصلہ کن ''نہیں'' لکھ کر بھیج دیا جائے۔ لیکن کرپس اور پیتھک لارنس کی تجویز تھی کہ جواب نہ تو اثبات میں اور نہ ہی نفی میں دیا جائے بلکہ کوئی معقول جواب دیا جائے۔

ابھی مشن کے ارکان اور ویول اس بارے میں کوئی تصفیہ نہ کر پائے تھے کہ 20 رمئی کو گاندھی کا ایک اور مراسلہ بنام پیتھک لارنس موصول ہو گیا۔ اس میں گاندھی نے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس نے لکھا کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان کے انتخابات سے پہلے عبوری حکومت کا وجود میں آنا ضروری ہے۔ جسے قومی حکومت کا نام دیا جائے جو منتخب مرکزی قانون ساز اسمبلی کو جواب دہ ہو۔ اس نے دونوں بڑی پارٹیوں کی مخلوط حکومت کی مخالفت کی اور پیریٹی (برابری) کے اصول کو بھی رد کیا اور رائے دی کہ یا تو کانگرس کو یا مسلم لیگ کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ علاوہ اور باتوں کے اس سلسلے میں گزشتہ روز سات گھنٹے طویل ملاقات میں گفتگو ہو چکی ہوئی ہے۔ لیکن مشن کے اجلاس میں جو 20 رمئی کو منعقد ہوا، پیتھک لارنس صاف مکر گیا کہ کل جو بات ہوئی تھی اسے غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے حالانکہ 19 رمئی کو پیتھک لارنس نے وزیراعظم ایٹلی کے نام اپنے مراسلے میں گاندھی کے ساتھ اس طویل گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''وہ کہتا ہے کہ میری رائے میں کانگرس، مشن کی جاری کردہ دستاویز کے بارے میں اپنی قرارداد اس وقت تک منظور نہیں کرے گی جب تک کہ عبوری حکومت طے نہیں ہو جاتی۔''[28] گویا گاندھی نے عبوری حکومت کے قیام یا دوسرے لفظوں میں انتقال اقتدار کو اولیت قرار دے دیا اور آئین سازی کو ثانوی حیثیت دے دی۔

گاندھی کے خط پر ارکان مشن کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے ویول اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ ''گاندھی کے اپنے اصل روپ میں سامنے آنے پر یہ تینوں حضرات جس قدر ہکا بکا ہوئے انہیں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کرپس اور پیتھک لارنس اندر تک ہل گئے جب کہ الیگزینڈر کا ردعمل خالص جان بُل (یعنی خالص انگریز) والا تھا جو کہ محب وطن اور تنگ نظر ہوتا ہے۔ کچھ دیر تک کے لیے کرپس بالکل ''آ ہوری''☆ ہو کر رہ گیا، پیتھک لارنس مغموم و مایوس ہو رہا اور الیگزینڈر غصہ سے کھولتا رہا اور میں خود بڑی کوشش کر کے یہ کہنے سے اجتناب کرتا رہا کہ میں نے کہا نہیں تھا......''[29] سرکاری ریکارڈ کے مطابق 20 رمئی کو ارکان مشن کے ہمراہ اجلاس میں ''گاندھی کے اس خط پر بحث کرتے ہوئے ویول نے کہا کہ اس خط نے میرے اس مؤقف کی تصدیق کر دی ہے کہ کانگرس کا مقصد کوئی آئین وضع کرنے سے پیشتر کسی نہ کسی طور اقتدار حاصل کرنا ہے اور برطانوی غلبہ کا خاتمہ کر کے مسلمانوں کو مغلوب کرنا اور ریاستی حکمرانوں کو بے دخل کرنا ہے۔ اے۔ وی الیگزینڈر نے کہا کہ گاندھی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ''کانگرس ہمارے جاری کردہ بیان کی بنیاد پر کسی تصفیے پر آمادہ نہیں ہے۔ اگر یہ خط گاندھی کے رویئے کی نمائندگی کرتا ہے تو پھر بہتر ہوگا کہ مشن واپس وطن چلا جائے۔''[30]

اسی روز کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد کی جانب سے پیتھک لارنس کے نام خط موصول ہوا۔ یہ کانگرس کی جانب سے مشن منصوبہ پر پہلا ''سرکاری'' ردعمل تھا۔ اس میں صاف طور پر کہا گیا تھا کہ ہماری مجلس عاملہ کی رائے میں ''مجوزہ آئین ساز اسمبلی آئین سازی کے معاملے میں بالکل خودمختار ہوگی اور اس پر کوئی بیرونی اثر نہیں ہوگا۔'' مزید کہا گیا کہ ''آئین ساز اسمبلی جس معاملے پر چاہے گی غور کرے گی اور جو چاہے گی فیصلہ دے گی۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کسی بڑے فرقہ وارانہ مسئلہ پر ہر دو فرقوں کے ارکان کی کثرت رائے درکار ہوگی۔'' گویا وہ مشن منصوبے کی مجوزہ آئین ساز اسمبلی کو تو قبول کرتے تھے لیکن اس کا تین گروپوں میں منقسم ہونا انہیں ہرگز قابل قبول نہیں تھا۔ یوں وہ ہندو ارکان کی اکثریت کا وضع کردہ آئین پورے برصغیر پر لاگو کرنا چاہتے تھے۔

20 رمئی کو کافی بحث و مباحثے کے بعد ارکان مشن نے گاندھی کو جواب بھیجا کہ

☆ آ ہوری کا لفظ جنوبی ہند میں نیچ اور گھٹیا ذات شخص کے لئے بولا جاتا ہے۔

''آزادی نئے آئین کے عمل میں آنے کے بعد دی جائے گی، اس سے پہلے نہیں۔'' اس لیے کہ یہ اندیشہ دُور دراز نہیں تھا کہ کانگرس کو اقتدار سونپا جائے اور برصغیر فرقہ وارانہ انتشار اور بدامنی کا شکار نہ ہو۔ ویول اور اس کے ہم خیال انگریز حکام اسے بے حد اہمیت دیتے تھے کہ ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن ادھر گاندھی کو متحدہ ہند کے لیے وہ آئین نہیں چاہیے تھا جس میں مسلمانوں کو محدود پیمانے پر بھی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی خودمختاری دی گئی ہو۔ جس کی ایک شکل مشن منصوبہ میں مجوزہ گروپنگ سکیم تھی۔ گاندھی کو مشن منصوبہ کی آئین ساز اسمبلی بغیر گروپنگ کے قابل قبول تھی جس کے ہندو ارکان کی اکثریت برصغیر کے سیاہ و سفید کی مالک ہوتی۔

گاندھی نے 20رمئی کو اپنے ''قانونی ذہن'' کا اطلاق کر کے اخبار ہریجن کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں مشن منصوبہ کو وہ مفہوم پہنانے کی کوشش کی گئی جو ہندو بورژوا کے مفاد میں تھا۔ اس نے مشن منصوبہ کے بارے میں لکھا ''یہ ایک اپیل ہے اور ایک مشورہ ہے۔ اس میں کوئی جبر نہیں ہے۔ چنانچہ صوبائی اسمبلیاں چاہیں تو (آئین ساز اسمبلی کے لیے) ارکان منتخب کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ یہ منتخب ارکان چاہیں تو آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوں اور چاہیں تو نہ ہوں۔ اسمبلی اپنے اجلاس میں اس طریقۂ کار سے مختلف طریقۂ کار بھی وضع کر سکتی ہے جو (مشن کی) دستاویز میں وضع کیا گیا ہے۔ صرف صورت حال کے تقاضے کے مطابق کسی شخص یا فریق کو پابند کیا جا سکے گا۔ دونوں بڑے فریقین کے لیے جداگانہ رائے دہی کی پابندی بھی صرف اس اسمبلی کی بقا کی خاطر لگائی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تادم تحریر میں نے اس دستاویز کی ایک ایک شق کو بار بار پڑھا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قانونی طور پر اس میں کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ صرف وقار اور تقاضا دو ہی لازم قوتیں ہیں۔'' گویا مشن منصوبہ میں جو کچھ کہا گیا تھا اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کو قبول کرنے کی صورت میں بھی کچھ طے نہیں ہوا تھا۔ کچھ لازم نہیں تھا، اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے سب نئے سرے سے شروع کیا جا سکتا تھا۔ گروپنگ پر اعتراضات کرتے ہوئے اس نے لکھا ''......کیا سکھ جن کا گھر ہندوستان میں سوائے پنجاب کے اور کوئی نہیں ہے، اپنی مرضی کے خلاف ایسے گروپ میں شامل ہونا قبول کر لیں گے جو سندھ، بلوچستان اور سرحد پر مشتمل ہے؟ اور کیا صوبہ سرحد اپنی مرضی کے خلاف پنجاب کے ساتھ گروپ میں شامل ہو جائے گا؟ اور اسی طرح کیا آسام جو کہ غیر مسلم اکثریت

کا صوبہ ہے، گروپ ج میں شامل ہو جائے گا؟ میری رائے میں دستاویز کی رضا کارانہ حیثیت کا تقاضا ہے کہ انفرادی یونٹوں (صوبوں) کی آزادی میں خلل نہیں پڑنا چاہیے۔ گروپوں کا کوئی بھی رکن چاہے تو گروپ میں شامل ہو اور چاہے تو نہ ہو۔'' آگے چل کر گاندھی نے اس آزادی کا جواز مہیا کرنے کے لیے پیرا 15 کی شق۔ 5 کی ایک نئی توجیہہ پیش کی۔ ''اس میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ آئین ساز اسمبلی کا چیئرمین پہلے ہی اجلاس میں صوبوں کے نمائندوں سے یہ دریافت کرے گا کہ آیا انہیں گروپوں کا اصول قابل قبول ہے یا نہیں اور اگر قبول ہے تو جس گروپ کے اندر انہیں شامل کیا گیا ہے آیا وہ بھی انہیں قبول ہے۔ پیرا 15(5) میں ہر صوبے کو دی گئی یہ آزادی بہر طور محفوظ ہے......اس لیے جو لوگ گروپوں اور ان میں اپنی بلا اصول شمولیت سے پریشان ہیں، ان سے میری درخواست ہے کہ اگر میری توضیح درست ہے تو پھر انہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''[31] یہ توضیح جسے گاندھی نے خود ہی فرض کر لیا تھا، کا مقصد یہ تھا کہ سرحد اور آسام جہاں کانگرس کی حکومتیں تھیں، گروپ ب اور ج سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کر دیں اور پنجاب سے سکھ بھی اُٹھ کھڑے ہوں تو گروپنگ سکیم اپنی موت آپ مر جائے گی کہ مشن منصوبے کی مجوزہ گروپنگ سکیم کی پابندی آئین ساز اسمبلی پر لازم نہیں ہے بلکہ دراصل ماسوائے اس اسمبلی کے قیام کے اس منصوبے کی کسی بھی بات کی پابندی لازمی نہیں ہے۔

گاندھی کا یہ مضمون ہریجن میں 26 رمئی کو چھپا لیکن مشن کے ارکان کو اس کی ایڈوانس کاپی 20 رمئی کو بھیج دی گئی۔ اُسی روز آزاد کی طرف سے جو خط آیا تھا اس کا نفس مضمون بھی یہی تھا کیونکہ آزاد کی بطور صدر کانگرس محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت تھی۔ اس کی جانب سے مشن کو لکھے گئے بیشتر خطوط اور کانگرس کی قراردادوں کا مسودہ گاندھی تیار کرتا تھا[32] اور وہ صرف دستخط کرتا تھا۔ مشن کے ارکان نے گاندھی کے مضمون پر غور کیا۔ ابھی تک گاندھی اور کانگرس کی جانب سے مشن منصوبے کو مسخ کر کے پیش کرنے اور گروپنگ کو رد کرنے کے سلسلے میں جتنے بیانات جاری ہوئے تھے، ویول کے اصرار کے باوجود مشن نے نہ تو ان کی تردید کی تھی اور نہ ہی ان کے خلاف سخت مؤقف اختیار کیا تھا۔ اس کی وجہ گاندھی کے ''روحانی ہم مشرب'' سٹیفورڈ کرپس اور پیتھک لارنس کا گاندھی نواز رویہ تھا جنہوں نے کئی کئی گھنٹے کی ملاقاتوں میں گاندھی کو نہ جانے کیا یقین دہانیاں کرا دی ہوئی تھیں۔

20رمئی کے گاندھی کے خط، جس نے کرپس کو ''ہکا بکا'' اور ''آ ہوری'' بنا دیا تھا، کے بعد کرپس پیچش میں مبتلا ہو کر صاحب فراش ہو گیا۔ 21رمئی سے ارکان مشن کے اجلاس میں جس میں گاندھی کا صرف ایک ''روحانی ہم مشرب'' یعنی پیتھک لارنس رہ گیا تو ویول اور اے۔ وی۔ الیگزینڈر کے نقطۂ نظر کو کچھ فوقیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ 21رمئی کو گاندھی کے مضمون کے جواب میں پیتھک لارنس کی جانب سے ایک کمزور اور مہمل سا جواب بھیجا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''......آپ کے مضمون کے بعض حصوں کے بارے میں میرے خیالات آپ کے خیالات سے بالکل مختلف ہیں۔''[33] لیکن ان حصوں کی کوئی نشاندھی نہیں کی گئی تھی۔ 22رمئی کو صدر کانگرس آزاد کے جواب میں یہ مراسلہ بھیجا گیا جس میں کہا گیا کہ یہ سکیم من حیث کُل حیثیت میں ہی اپنا وجود رکھتی ہے اور صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے مفاہمت اور تعاون کے جذبے سے قبول کیا جائے اور اسی جذبے سے اس پر عمل کیا جائے۔ آپ کو معلوم ہے کہ صوبوں کی گروپنگ کی کیا وجوہات ہیں اور یہ اس سکیم کی ایک لازمی خصوصیت ہے، جس میں ردو بدل صرف دونوں پارٹیوں کی باہمی رضامندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔''[34] مشن کی جانب سے پہلی مرتبہ گروپنگ پر مؤثر مؤقف اختیار کیا گیا ''جس پر'' بقول ویول ''پنجے گاڑنا کانگرس کی بلی کے لیے خاصا مشکل تھا۔''

کانگرس کی تعبیر اور مشن کی تعبیر

چنانچہ 24رمئی کو کانگرس کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔ کانگرس مجلس عاملہ نے گاندھی کے ''قانونی ذہن'' کی اختراعات پر مبنی ایک قرار داد منظور کر دی جس میں مشن منصوبہ پر بعض اعتراضات اٹھائے گئے اور اسے اپنا ایک الگ مفہوم پہنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ کانگرس مجلس عاملہ کی جانب سے پہلا ''سرکاری'' ردعمل تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے جاری کردہ دستاویز میں بعض سفارشات کی گئی ہیں اور ان میں آئین ساز اسمبلی کی استواری کے طریقہ کار کے بارے میں بعض تجاویز دی گئی ہیں جو کہ، جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے، ایک خود مختار حیثیت کی حامل ہیں۔ مجلس عاملہ ان بعض سفارشات کے ساتھ اتفاق نہیں کرتی۔ اس کی رائے میں آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ بذات خود جس مرحلے

پر چاہے ترامیم اور تبدیلی کر دے۔ صرف بعض بڑے فرقہ وارانہ مسئلوں پر یہ شرط ہو گی کہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے دونوں فرقوں کی کثرت رائے درکار ہو۔'' آگے چل کر صوبوں کی خودمختاری کے حوالے سے کہا گیا کہ ''ایک جانب تو مشن کہتا ہے کہ صوبے خودمختار ہوں گے اور تمام باقی ماندہ اختیارات کے حامل ہوں گے اور دوسری جانب کہا گیا ہے کہ صوبوں کے ارکان حصوں میں بٹ جائیں گے اور گروپ بنانے کا فیصلہ کریں گے اور اپنے گروپ کے صوبوں کا آئین وضع کریں گے۔ اس طرح صوبائی خودمختاری پر جبر کا عنصر مسلط کر دیا گیا ہے۔'' چنانچہ اس دستاویز کی سفارشی حیثیت کو برقرار رکھنے اور اس کی شقوں کو باہم مربوط کرنے کے لئے مجلس عاملہ کے نزدیک پیراگراف 15 کا دراصل مفہوم یہ ہے کہ ''سب سے پہلے متعلقہ صوبے یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ خود کو اس گروپ میں شامل رکھیں گے یا نہیں کہ جس میں انہیں شامل کیا گیا ہے، چنانچہ آئین ساز اسمبلی کو ایک خودمختار ادارہ سمجھنا چاہیے جس کو آئین تشکیل دینے اور اس کو لاگو کرنے کے حتمی اختیارات حاصل ہوں۔''[35]

25 رمئی کو مشن اور وائسرائے کی جانب سے کانگرس مجلس عاملہ کی اس قرارداد کی تردید میں بیان جاری ہوا جس میں کہا گیا کہ ''یہ سکیم من حیث کل حیثیت میں ہی اپنا وجود رکھتی ہے اور یہ صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ اسے تعاون کے جذبے کے ساتھ قبول کیا جائے اور اسی جذبے سے اس پر عمل کیا جائے۔'' مزید کہا گیا کہ ''کانگرس نے اپنی قرارداد میں ہماری دستاویز کے پیراگراف 15 کی جو یہ توضیح کی ہے کہ صوبوں کو شروع میں ہی یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ اس گروپ میں شامل ہیں یا نہیں کہ جس میں انہیں شامل کیا گیا ہے، مشن کی منشاء کے خلاف ہے۔ صوبوں کی گروپنگ کی وجوہات سب کو اچھی طرح معلوم ہیں اور یہی اس سکیم کی لازمی خصوصیت ہے اور اس میں ردوبدل صرف دونوں پارٹیوں کی باہمی رضامندی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ جب آئین سازی کا کام مکمل ہو جائے گا تو گروپ سے علیحدگی کا اختیار خود عوام کی جانب سے استعمال ہو سکے گا کیونکہ نئے صوبائی آئین کے تحت جو نئے انتخابات ہوں گے، ظاہر ہے کہ ان میں علیحدگی کا سوال ایک بڑا متنازعہ فیہ مسئلہ ہو گا اور وہ تمام لوگ جو نئے حق رائے دہی کے تحت رائے شماری کا حق رکھتے ہوں گے اس بارے میں حقیقی جمہوری فیصلے میں حصہ لے سکیں گے۔''[36] چنانچہ گاندھی کے ''قانونی ذہن'' نے گروپنگ کے

متعلق مشن منصوبے کی جو توضیح کی تھی اور جسے کانگرس نے اپنی قرار داد کا حصہ بنا لیا تھا اسے واشگاف الفاظ میں رد کر کے مشن اور وائسرائے نے تمام غلط فہمیاں دور کر دی تھیں۔ کسی بھی دستاویز کو جاری کرنے والا خود اس کی جو توضیح وتشریح کرتا ہے اسے ہی درست مانا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں نیوز کرانیکل لندن کے نمائندے نارمن کلف نے ایک انٹرویو میں گاندھی سے پوچھا ''اس کی وہی توضیح کیوں نہ درست مانی جائے جو وہ خود کرتے ہیں۔ اس بارے میں تو وہ خود ہی بہترین منصف ہیں کہ ان کی کیا منشا ہے؟'' گاندھی نے جواب میں کہا ''قانون بجا طور پر کسی قانون ساز کی اس منشاء کو قبول نہیں کرتا جو مسودۂ قانون سے باہر ہو۔'' اس پر کلف نے کہا کہ ''منشاء واضح کرنے کے لیے کیا اس دستاویز کے الفاظ میں ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔'' گاندھی نے کہا کہ ''یہ ناممکن ہے۔ اس طرح متواتر کانٹ چھانٹ ہوتی رہے گی۔'' کلف نے کہا کہ ''کیا الفاظ کے بجائے منشاء کا مفہوم لینا زیادہ بہتر نہیں ہوگا۔'' گاندھی نے جواب دیا ''یہ وہ سوال ہیں جن کا فیصلہ عدالت کرے گی۔'' اس پر کلف بولا کہ ''کیا نفئ ذات آپ کے بنیادی عقائد کا جزو نہیں ہے۔'' اس پر گاندھی نے زوردار قہقہہ لگایا اور کہا ''شیطان بھی صحیفوں کے حوالے دے سکتا ہے۔''[37] چنانچہ مقصد لفظوں کے ہیر پھیر سے کام لے کر مشن منصوبہ کو سبوتاژ کرنا تھا۔ گروپنگ کے معاملے کو عدالت میں لے جانا ایک ایسا تاخیری حربہ تھا کہ خود انگریز اس تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ درحقیقت کانگرس مجلس عاملہ نے اپنی قرارداد میں صاف لفظوں میں تو نہیں کہا تھا لیکن تارا چند کانگرس مجلس عاملہ کے مؤقف کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اس نے ذیلی وفاق (گروپ) کے تصور کو رد کر دیا تھا۔''[38] جب کہ آر۔ سی موجمدار مشن کے مؤقف کی حمایت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''مشن نے بجا طور پر یہ زور دیا تھا کہ اس سکیم کو من حیث کل حیثیت میں ہی لینا چاہیے۔''[39] لیکن کانگرس اس کی کلّی حیثیت کے بجائے اس میں سے گروپنگ کو منفی کر کے باقی منصوبہ کو قبول کرنا چاہتی تھی جس میں ہندو اکثریت کی حامل مجتمع آئین ساز اسمبلی کے علاوہ فوری طور پر عبوری حکومت میں شمولیت بھی شامل تھی۔ اس لیے کانگرس کی طرف سے یہ مطالبہ بھی شدومد کے ساتھ کیا جا رہا تھا کہ عبوری حکومت میں گورنر جنرل کے اختیارات کم سے کم کر دیئے جائیں اور ایگزیکٹو کونسل کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنا دیا جائے۔ 25رمئی کو مشن اور وائسرائے کی جانب سے کانگرس کے رد میں

جاری کردہ بیان کے بعد کانگرس نے آئین سازی کے معاملے کو ثانوی اور عبوری حکومت میں اقتدار کے حصول کی کوشش کو اولیت دے دی۔

سکھ مسئلہ اور مشن منصوبہ

برصغیر کے فرقہ وارانہ مسائل میں سکھوں کا مسئلہ بھی سنجیدہ صورت اختیار کر گیا تھا اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن یا گروپ میں سکھوں کو مسلم اکثریت کے غلبے کا وہی ڈر تھا جو متحدہ ہند میں مسلمانوں کو ہندو غلبے سے تھا۔ مسلمانوں کے مطالبات کے خلاف کانگرس اس سکھ مسلم تضاد سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ برصغیر کی تقسیم اور مطالبہ پاکستان کے خلاف انگریزوں کی جانب سے بھی ایک بڑی دلیل سکھوں کے مسئلے کے حوالے سے دی جاتی تھی کہ پھر پنجاب کو تقسیم کرنا پڑے گا اور ایک کٹا پھٹا پاکستان وجود میں آئے گا جو ناقابل عمل ہوگا۔ وزارتی مشن کی جانب سے 16 رمئی کو جو دستاویز جاری ہوئی اس کے ابتدائی نصف حصے میں پاکستان کے خلاف جو دلائل دیئے گئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ وزارتی مشن منصوبے میں سکھوں کے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ ہندوستان اور پنجاب کی تقسیم نہیں کی گئی تھی لیکن انہیں گروپ ب میں دی گئی نمائندگی پر اعتراض تھا اور وہ مزید تحفظات چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں سکھ رہنماؤں ماسٹر تارا سنگھ اور بلدیو سنگھ نے 16 رمئی کو ویول اور اے۔ وی الیگزینڈر کے ساتھ ملاقات کی اور انہیں مذکورہ اعتراضات سے آگاہ کیا۔ گروپ ب کی جانب سے آئین ساز اسمبلی میں سکھوں کے لیے چار نشستیں مخصوص کی گئی تھیں۔ ان دونوں سکھ رہنماؤں نے انہیں ناکافی قرار دیا۔ علاوہ ازیں مطالبہ کیا کہ جس طرح آئین ساز اسمبلی میں مسلمانوں کو یہ تحفظ دیا گیا ہے کہ کوئی بھی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ ہر دو بڑے فرقوں کے ارکان کی کثرت رائے سے طے پائے گا، ایسا ہی بندوبست گروپ ب کی اسمبلی میں سکھوں کے لیے بھی کیا جانا چاہیے۔ اس پر ویول نے جواب دیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جب پنجاب کا آئین بنے تو اس میں سکھوں جیسے بااثر اور طاقتور عنصر کو نظرانداز کر دیا جائے۔

تاہم سکھ رہنماؤں کی تسلی نہ ہوسکی۔ دراصل 1946ء کے اوائل میں پنجاب کے انتخابات سے پہلے تک سکھوں اور یونینسٹ پارٹی کے مابین تعاون چلا آتا تھا جس کی بنیاد

سکندر۔ بلدیو سنگھ معاہدہ میں رکھی گئی تھی۔ ان انتخابات میں یونینسٹ پارٹی کے پرخچے اڑ گئے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کو جو حمایت حاصل رہی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اب مسلم لیگ کو پاکستان کے نعرے پر کم وبیش تمام مسلم نشستوں پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ نتیجتاً سکھوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا کیونکہ وہ مسلم لیگ کے پاکستان میں مسلم غلبے سے خائف تھے۔ پس منظر میں تین چار سو سال کا سکھ۔ مسلم تضاد بھی موجود تھا۔ انتخابات میں اکالیوں اور دوسرے سکھ گروپوں نے پنتھک پارٹی کی صورت میں مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور بعد ازاں انہوں نے یونینسٹ اور کانگرس کے ساتھ مخلوط حکومت میں شامل ہو کر مسلم لیگ کو پنجاب میں حکومت بنانے سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن یہ محض ایک عارضی سہارا تھا۔ سکھوں کو انگریزوں سے بہت توقعات تھیں لیکن وزارتی مشن منصوبے سے ان کو دھچکا سا لگا اور ان میں بے چینی پھیل گئی۔ انگریزوں میں اے۔ اے۔ میکڈانلڈ جو پنجاب کا ہوم سیکرٹری اور پھر گزشتہ انتخابات میں پنجاب کا الیکشن کمشنر رہ چکا تھا، اور میجر شارٹ جو پنجاب میں رابطہ آفیسر رہ چکا تھا، اور ان دنوں کرپس کے ذاتی معاون کی حیثیت سے دہلی میں تھا، سکھوں سے گہرے روابط رکھتے تھے۔ ان کے ذریعے سکھوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی سادہ اکثریت کی حامل ہے۔ اس لیے مسلمان اس صوبے پر سکھوں کا تعاون حاصل کئے بغیر حکومت نہیں کر سکیں گے۔ طاقت کا توازن ہمیشہ سکھوں کے پاس رہے گا۔ پنجاب کی مسلم لیگ پارٹی کچھ عرصہ تو ان کے ساتھ معاندانہ رویہ رکھے گی۔ لیکن پھر یونینسٹوں کی طرح وہ ان سے رشتۂ دوستی استوار کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔''[40] مگر 21 رمئی کو گورنر پنجاب ایوان جینکنز نے سکھوں کی بے چینی کا احوال بیان کرتے ہوئے ویول کو لکھا کہ ان باتوں کا سکھوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ سکھوں کا کہنا ہے کہ ''اگر انہیں وزارتی مشن کے ارادے پہلے سے معلوم ہوتے تو ہم جناح کے ساتھ کچھ پہلے سمجھوتہ کر سکتے تھے۔ مگر اب ہمیں مستقلاً اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس لیے اب یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم جناح یا مسلم لیگ کے ساتھ کوئی معقول سودا کر سکتے ہیں۔'' جینکنز نے ویول کو یہ بھی مطلع کیا کہ ''ہمیں سکھوں کی طرف سے بڑا سنگین مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے جو اگر اجتماعی کاروائی کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں تو بے حد ضدی اور خوف ناک ہوتے ہیں۔''[41]

پینڈرل مون جو امرتسر کا ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا، لکھتا ہے کہ مئی کے اوائل میں جب وہ خود دہلی میں تھا، اس کی ملاقات ایک اکالی رہنما سے ہوئی جو پنجاب کے بٹوارے کی باتیں کرتا تھا۔ وہ جب اسے 1942ء میں ملا تھا تو دریائے چناب کو حد مقرر کرتا تھا مگر اب وہ راوی کو سرحد مقرر کر رہا تھا۔ مون نے جب اس سے کہا کہ مسئلہ تو پھر بھی حل نہ ہوگا کیونکہ بہت سے سکھ اب بھی پاکستان میں رہ جائیں گے تو اس اکالی لیڈر نے جواب دیا کہ ''اس کی رائے میں کچھ تبادلہ آبادی کرنا پڑے گا۔'' جواب میں مون نے اس سے کہا کہ اس کے لیے طاقت درکار ہوگی۔ آپ پنجاب کے بٹوارے کا نہ سوچیں کیونکہ پنجاب اور ہندوستان دونوں کی وحدت محفوظ رہنے کا پورا امکان موجود ہے۔[42] ان حالات میں سکھوں کی طرف سے جب کہ تبادلۂ آبادی تک کے بارے میں سوچا جانے لگا تھا، وزارتی مشن منصوبے کے بعد سکھ مسلم تضاد میں کمی کے بجائے اضافہ ہوا۔ ایسے میں گاندھی اور گانگرس نے مہمیز کا کام کیا۔ پینڈرل مون گاندھی کے ہریجن کے مضمون (تحریر شدہ 20رمئی) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''گاندھی، جس نے آج تک سکھوں سے کبھی معمولی ہمدردی کا اظہار بھی نہیں کیا تھا اور اکالی رہنماؤں کو ہمیشہ فرقہ پرست قرار دیتا تھا، اب کسی عقل مندی کا ثبوت نہ دیتے ہوئے ان کے خدشات پر لوگوں کی توجہ دلا رہا تھا۔''[43] یاد رہے کہ اس مضمون میں گاندھی نے لکھا تھا کہ کیا سکھ جن کا ہندوستان میں گھر صرف پنجاب ہے، اپنی مرضی کے خلاف ایک ایسے گروپ میں شامل ہو جائیں گے جو سندھ، بلوچستان اور سرحد کے صوبوں پر مشتمل ہے۔

25رمئی کو اکالی سربراہ ماسٹر تارا سنگھ نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں لکھا ''جب سے برطانوی وزارتی مشن کی طرف سے مستقبل کے آئین کے بارے میں سفارشات شائع ہوئی ہیں، سکھ فرقے کے اندر دل شکستگی، آزردگی اور برہمی کی شدید لہر اُٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی وجوہات صاف ظاہر ہیں۔ ہمیں مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ گروپ ب جو پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہے، اس میں فرقہ وارانہ نمائندگی اس طرح ہے کہ مسلمان 23، ہندو 9 اور سکھ 4۔ کیا اس اسمبلی سے سکھوں کے لیے کسی انصاف کی اُمید کی جا سکتی ہے؟'' اس نے مطالبہ کیا کہ اس گروپ میں سکھوں کو بھی ویسی ہی رعائتیں اور تحفظات فراہم کیے جائیں جو مسلمانوں کو کل ہند سطح پر دیئے گئے ہیں۔ 26رمئی کو بلدیو سنگھ نے بھی پیتھک

لارنس سے ایک مراسلے کے ذریعے یہی مطالبہ دہرایا اور کہا کہ اس سلسلے میں مشن کی جانب سے جاری کردہ دستاویز میں ترمیم کا اعلان کیا جائے جس کے ذریعے سکھوں کو بقیہ دو بڑے فرقوں کے ہم سر قرار دیا جائے اور ان کے برابر تحفظات مہیا کئے جائیں۔ 26 مئی کو لاہور میں سکھوں نے ایک احتجاجی جلسہ عام منعقد کیا جس میں مذکورہ مطالبات کا اعادہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ برطانیہ نے سکھوں کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ مورچہ شروع کرنے کی دھمکی بھی دی گئی۔''[44]

27 مئی کو بلدیو سنگھ نے گورنر پنجاب ایوان جینکنز کے ساتھ ملاقات میں انکشاف کیا کہ مجھے پہلے ہی جناح کی جانب سے (بظاہر بذریعہ قاضی محمد عیسیٰ آف بلوچستان۔ بقول جینکنز) گروپ آئین کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنانے کی خاطر سکھوں اور مسلمانوں کے مابین تعاون کے لیے تجاویز موصول ہو چکی ہیں۔ ان تجاویز کے مطابق اس تعاون کے عوض میں مسلمانوں کی جانب سے سکھوں کے لیے سول سروسز میں فراخدلانہ ویٹیج رکھا جائے گا۔ وہ گروپ ب کے لیے کل دفاعی سروسز کا چالیس فیصد طلب کرنا چاہتے ہیں اور ان سروسز میں بھی سکھوں کو ان کا حصہ دینے کی پابندی کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن بلدیو سنگھ نے یہ اقرار کرتے ہوئے کہ بظاہر یہ تجاویز خوش کن معلوم ہوتی ہیں اور ممکن ہے بعض سکھوں کو مائل بھی کر سکیں، کہا کہ میرے خیالات ان کے برعکس ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ''آج صبح جناح نے مجھے ٹیلی فون کیا اور مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا مگر میں نے جواب دیا کہ اس وقت سکھوں کے جذبات کی جو کیفیت ہے اس میں میرا اپنی پوزیشن کمزور کئے بغیر آپ سے ملنا ممکن نہیں ہے۔'' گویا جناح سکھوں کو رعایتیں دے کر اور یقین دہانیاں کروا کر ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے خواہش مند تھے لیکن سکھ رہنما یہ رعائتیں اور یقین دہانیاں انگریزوں سے لینا چاہتے تھے اور یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وزارتی مشن اپنی دستاویز میں ترمیم کر کے گروپ ب میں ان کے لیے فرقہ وارانہ تحفظات کا اعلان کرے اور انہیں سکیم کا جزو قرار دیا جائے۔ بلدیو سنگھ نے جینکنز کے ساتھ ملاقات میں اس مطالبے کا اعادہ کیا اور پیتھک لارنس کے نام بھیجے گئے اپنے مراسلے کی نقل بھی دکھائی۔ جینکنز نے ویول کے نام مراسلے میں بلدیو سنگھ کے ساتھ اپنی ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے سکھوں کے مطالبے کی سفارش کی اور لکھا کہ ''خود میری رائے میں بلدیو سنگھ کے تجویز کردہ طریقے کے مطابق گروپ ب میں سکھوں کو ممتاز کرنے کے لیے کچھ اعلان ہونا

چاہیے جو اگرچہ میں سمجھتا ہوں اس مرحلے پر خاصا مشکل ہوگا۔'' ظاہر ہے کہ وزارتی مشن کی دستاویز میں کانٹ چھانٹ کا عمل ترامیم کا ایک لامتناہی سلسلہ چھیڑ سکتا تھا جس میں کانگرس اور لیگ بھی شامل ہوسکتی تھیں۔ تاہم جینکنز نے سفارش کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ ''میرا تاثر ہے کہ سکھ پہلے ہی اس قدر پختہ عزم کر چکے ہیں کہ اب ان کا پیچھے ہٹنا مشکل ہے...... اگر اس مرحلے پر ان کی تشفی کا کوئی سامان کر دیا جائے تو میری رائے میں یہ بہتر ہوگا۔ یونینسٹ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ سکھ محض سودے بازی کر رہے ہیں اور انہیں امید ہے کہ وہ مسلمانوں کو جھوٹ موٹ کی محبت جتا کر، ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اور انگریزوں کو گالیاں نکال کر اس سے کہیں زیادہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ویسے ان کو دیا جا رہا ہے۔ مجھے اس تشخیص کے درست ہونے پر شک ہے۔''[45] تاہم جینکنز کسی طور پر سکھوں کی ناراضگی کا متحمل نہیں تھا اور ہر قیمت پر ان کی دلجوئی اور تشفی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے 29 رمئی کو ایک اور مراسلے میں ویول کو لکھا کہ ہمیں سکھوں کو راضی کرنے کے لیے فوری اور سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔ ان میں رنجش کا احساس بجا اور فوری حل طلب ہے ''کوئی کاروائی کرنے کی عملی وجہ یہ ہے کہ سکھ پنجاب میں کسی بھی ایسی سکیم کو تباہ و برباد کر سکتے ہیں جو واقعی انہیں ناقابل قبول ہوگی۔'' اس نے رائے دی کہ سکھ مسلم لیگ کے ساتھ رضامندی پر آمادہ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ آئین ساز اسمبلی کے گروپ ب میں ان کو وہی فرقہ وارانہ تحفظات دے دیئے جائیں جو مرکز میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ حکومت میں نمائندگی اور ملازمتوں میں ویٹیج کے موجودہ نظام کو آبادی کے تناسب کی بنیاد پر تبدیل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد اس نے 9 رجون کو امرتسر میں ہونے والے سکھ اجتماع کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''اس سے پیشتر اگر سکھوں کو راضی نہ کیا گیا تو معلوم نہیں کیا ہوگا۔ البتہ اس ماہ (جون) کے آخر تک حالات اس قدر بگڑ سکتے ہیں کہ بڑے پیمانے پر فوجی مداخلت درکار ہوگی۔''[46] اس مراسلے کے حاشیے پر ویول نے نوٹ لکھا کہ ''ہاں میرا خیال ہے کہ ہم نے سکھوں کے لیے فرقہ وارانہ تحفظ فراہم نہ کر کے غلطی کی ہے......'' درحقیقت فوج میں سکھوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ انگریز ان کو ناراض کرنا کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں ہندوستانی فوج کے ڈسپلن اور مستعدی کو بہرحال برقرار رکھنا تھا کہ ابھی انہیں اس کی بہت ضرورت تھی۔ ویسے بھی سوویت یونین سے قریب ہونے کی وجہ سے پنجاب میں گڑبڑ اور انتشار

کے معاملے میں انگریز بہت حساس واقع ہوئے تھے۔

ایوان جینکنز کے ویول کو بھیجے گئے مراسلوں میں گھبراہٹ اور فکر مندی کا شدید احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن میجر شارٹ جس کے سکھوں کے ساتھ گہرے روابط تھے اور جو سکھوں کے امور کے ماہر کی حیثیت سے مشن کے ہمراہ بطور معاون کام کر رہا تھا، جینکنز کی رائے سے مختلف رائے رکھتا تھا۔ اس نے 5/ جون کو سکھوں کی صورت حال کے بارے میں اپنا تجزیہ ایک نوٹ کی صورت میں مشن کو پیش کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''ماضی کے تجربے اور اطلاعات کے موجودہ ذرائع کا جائزہ لینے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت سکھ ایسا خطرہ نہیں ہیں جیسا کہ حکومت پنجاب انہیں سمجھتی ہے۔ میں اپنی اس رائے کو زیادہ صائب اس لیے بھی سمجھتا ہوں کہ ابھی تک مجھے کوئی خفیف سی شہادت بھی ایسی نہیں ملی ہے کہ جس سے پتہ چلے کہ مسلح افواج کے سکھوں کو بھی اس معاملے سے کوئی تعلق خاطر پیدا ہوا ہے۔ جب سکھوں کا یہ طبقہ اثر قبول کرے گا۔ تب ہی سکھوں کو ایسا خطرہ قرار دیا جا سکے گا، جیسا کہ اب انہیں سمجھا جا رہا ہے۔ میرے خیال میں سکھوں کا موجودہ موڈ تب واقعی خطرناک ہو جائے گا کہ یہ یوں ہی جاری رہے اور چلتا چلا جائے ، یہاں تک کہ جناح برافروختہ ہو جائے تو پھر ہمارے لیے گروپ ب میں مسلم۔ سکھ تعلقات کو مستحکم رکھنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گا۔ اس لیے میں انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ رضا جوئی کے ذریعے ان کے اس موڈ کا فوری سدباب کیا جائے مگر ساتھ ہی اپنے پختہ استقلال پر قائم رہنے کا تاثر بھی قائم رکھا جائے۔'' آگے چل کر اس نے سکھوں کو یہ باور کرانے کا مشورہ دیا کہ ہم نے ان کو جو مراعات مجوزہ منصوبہ میں دی ہیں اگر اس سے زیادہ دیتے تو دونوں بڑے فریق اور دوسرے لوگ (یعنی اچھوت وغیرہ) ناراض ہو جاتے اور ان سے یہ مراعات چھیننے کی کوشش کرتے''۔اب بھی ہم نے ان کو غالب سیاسی حیثیت دی ہے...... ان کو چاہیے کہ وہ ہم پر اعتماد کریں اور ہمارے مشورے پر عمل کرتے ہوئے تحمل سے کام لیں، مجنونانہ رویہ نہ اپنائیں اور جناح کو برافروختہ نہ کریں بلکہ اسے خود کو مستحکم کرنے کے لیے وقت دیں۔ اس دوران اسے بھی یہ سمجھ آ جائے گی کہ وہ سکھوں کے بغیر یا ان کی قیمت پر کوئی استحکام حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر انہوں نے ہمارا یہ مشورہ قبول نہ کیا تو پھر ہم بھی جناح کو یہ احساس دلانے کے قابل نہ رہیں گے کیونکہ اس طرح سکھ اس کے خلاف نا قابل تلافی بدگمانی پیدا کر چکے ہوں گے

اور یوں مسلح افواج میں اس کی ساکھ کو نا قابل تلافی نقصان پہنچانے کے ذمہ دار ہوں گے جو اس کے لیے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے ہمارا مشورہ یہی ہے کہ سکھ ہم پر اعتماد کریں اور ہمارے مشورے پر عمل کریں۔"[47]

میجر شارٹ کے اس تجزیے کے اگلے روز یعنی 6 رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے بلد یو سنگھ اور ماسٹر تارا سنگھ کے ساتھ اکٹھے ملاقات کی۔ اس سے پیشتر ان دونوں کے مراسلوں کے جواب میں پیتھک لارنس نے یکم جون کو دونوں کو الگ الگ مراسلے بھیج کر انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کی تھی اور ساتھ ہی مشن اور وائسرائے کے ساتھ ملاقات کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ اس ملاقات میں ویول نے ان کو سمجھایا کہ جناح سکھوں کے معاملے میں ہمدردانہ رویہ رکھتا ہے اور سکھوں کو نقصان پہنچانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس پر تارا سنگھ نے کہا کہ جناح کا ارادہ ممکن ہے ایسا نہ ہو لیکن پھر بھی ایسا ہو تو سکتا ہے۔ ویول نے کہا کہ میں اور وزارتی مشن سکھوں کو ان کا پورا حق دلانے کے لیے اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کریں گے۔ لیکن دونوں سکھ رہنما اس پر اصرار کرتے رہے کہ گروپ ب کی اسمبلی میں سکھ ارکان کو فرقہ وارانہ مسائل پر جداگانہ کثرت رائے کی ویٹو کا وہی حق دیا جائے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مرکزی اسمبلی میں رکھا گیا ہے اور اس سلسلے میں وزارتی مشن منصوبہ میں ترمیم کا اعلان کیا جائے۔ مشن نے کہا کہ پھر گروپ الف میں یہی حق اچھوتوں اور دوسرے گروہوں کو بھی دینا پڑے گا اور یہ ایک سلسلہ چل نکلے گا۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ گروپ ب کی آئین سازی کے دوران سکھ اپنا یہ حق منوالیں۔ بلد یو سنگھ نے پوچھا کہ کیا مشن جناح کے ساتھ اس معاملے کو اٹھائے گا۔ ویول نے اس بارے میں یقین دھانی کرادی۔ ویول نے مزید کہا کہ آپ اپنی تعداد کے بجائے اپنی اہلیت پر بھروسا رکھیں۔ پنجاب کا آئین وضع کرتے ہوئے سکھوں کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔ مشن کے ارکان نے ان دونوں رہنماؤں کو سمجھایا کہ اس وقت ایجی ٹیشن سے آپ کو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ اس سے آپ جناح کی مخالفت مول لے لیں گے اور پھر آپ کے لیے ہم بھی جناح پر دباؤ نہ ڈال سکیں گے۔"[48]

تاہم 9 اور 10 رجون کو امرتسر میں تمام سکھ جماعتوں کا اجتماع منعقد ہُوا۔ اس میں گروپنگ سکیم کو سکھوں کے مفادات کے خلاف قرار دیا گیا اور ایک قرارداد کے ذریعے وزارتی

مشن منصوبہ کو رد کر دیا گیا۔ اس میں کسی مورچہ کے آغاز کرنے کا اعلان نہیں کیا گیا البتہ ایک مجلس عمل (کونسل آف ایکشن) تشکیل دی گئی جس کا سربراہ نرنجن سنگھ گل کو بنایا گیا۔ باقی ارکان میں ماسٹر تارا سنگھ، بلدیو سنگھ، بسنت سنگھ موگا، اجل سنگھ، اندر سنگھ، درشن سنگھ پھرمان، اجیت سنگھ، پریتم سنگھ گوجراں، ایشر سنگھ مجھیل، بھائی جودھ سنگھ، سرمکھ سنگھ چمک، ندھن سنگھ الم (نامدھاری)، گیانی کرتار سنگھ اور باوا ہرکشن سنگھ شامل تھے۔ اس کا مقصد وزارتی مشن منصوبہ کی مخالفت کو منظم کرنا تھا۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق بلدیو سنگھ نے ایوان جینکنز کو بتایا کہ اس موقع پر سکھوں نے نجی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ ''(ا) عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کی جائے گی (ب) آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا بائیکاٹ نہیں کیا جائے گا۔ ڈائریکٹ ایکشن آخری حربہ ہوگا جو صرف اس صورت میں اختیار کیا جائے گا کہ ہم اپنے مقصد کی تکمیل میں ناکام ہو گئے۔''[49] گویا سکھ پرامن ذرائع سے دباؤ ڈال کر اپنے مقاصد کی تکمیل چاہتے تھے اور عبوری حکومت اور آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونے پر آمادہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں وزارتی مشن منصوبہ پر عملدرآمد میں شریک ہونا انہیں قابل قبول تھا۔ لیکن ان کی طرف سے گروپنگ کی مخالفت سے اس وقت گاندھی اور کانگرس کے گروپنگ کے خلاف مؤقف کی تائید وحمایت ہو رہی تھی۔

مشن منصوبہ کی ناکامی کے پیش نظر برطانوی حکمرانوں کے اندیشے اور ویول کا ''بریک ڈاؤن پلان''

وزارتی مشن اور وائسرائے نے 16 رمئی کی دستاویز جاری کرنے کے فوراً بعد اس مسئلے پر غور شروع کر دیا تھا کہ دونوں بڑی پارٹیوں یا دونوں میں سے کسی ایک طرف سے مشن منصوبہ رد کئے جانے اور منصوبے کی ناکامی کے کیا مضمرات ہوں گے اور ملک کے انتشار کی لپیٹ میں آ جانے کی صورت میں لائحہ عمل کیا ہوگا؟ مسلم لیگ کی جانب سے رد کیے جانے کی صورت میں ویول کے اندازے کے مطابق اندیشہ تھا کہ ''پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔''[50] 24 رمئی کو بنگال کے گورنر بروز نے وائسرائے اور مشن کے ارکان کے ساتھ مشترکہ ملاقات میں بتایا کہ ''جناح کی جانب سے وزارتی مشن منصوبہ کے رد کئے جانے اور اس

کے نتیجے میں بنگال کی مسلم لیگی وزارت کے مستعفی ہو جانے کی صورت کو بنگال میں خطرے کا نشان تصور کرنا چاہیے۔ یہ جہاد کے لیے اشارہ ہوگا۔ وزارتی مشن کی دستاویز کے اجراء کے موقع پر چٹا گانگ میں سنگین صورت حال درپیش ہوگئی تھی جہاں طلباء نے پاکستان کو رد کئے جانے کے خلاف احتجاجی مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ مسلم لیگی وزیروں نے اپنے اثر و رسوخ کو بروئے کار لا کر معاملہ رفع دفع کیا۔"[51] بنگال میں ہندو مسلم تضاد کی شدت سب سے زیادہ گھمبیر تھی۔ تاہم باقی علاقوں میں بھی حالات اچھے نہ تھے۔ لیکن مسلم لیگ کے انکار سے پیدا شدہ صورت حال سے انگریز انتظامیہ کو کوئی بہت زیادہ پریشانی لاحق نہ تھی۔ کانگرس کی جانب سے رد کی صورت میں جسے وہ دونوں جماعتوں کی جانب سے رد کے مترادف گردانتے تھے، خطرہ یہ تھا کہ کانگرس ملک گیر سطح پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی اور پورا برصغیر انتشار کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اس صورت حال میں سب سے زیادہ ڈر اس بات کا تھا کہ حالات خود کانگرس کی اعتدال پسند قیادت اور گاندھی کے ہاتھ سے باہر نکل جائیں گے۔ کانگرس کا بایاں بازو اور کمیونسٹ اس پر چھا جائیں گے۔ اس قسم کی صورت حال کا مظاہرہ اس سال کے اوائل میں نیوی کے عملہ کی ہڑتال کے دوران دیکھنے میں آ چکا تھا اور پھر آزاد ہند فوج کا عنصر بھی موجود تھا۔ قحط سالی اور بے روزگاری کی وجہ سے بے چینی اور اضطراب کی کیفیت پہلے ہی موجود تھی۔ لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز تھا۔ بس اک ذرا چھیڑنے کی ضرورت تھی۔ انگریز اس موقع پر جب کہ عالمی جنگ ان کا دیوالیہ کر چکی ہوئی تھی اور وہ یہاں سے بوریا بستر لپیٹ رہے تھے، کسی مصیبت میں پھنسنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اپنا بہت کچھ یہاں محفوظ چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے بریک ڈاؤن کی ایسی صورت حال سے کہ جو برصغیر کو انتشار اور طوائف الملوکی کی لپیٹ میں لا سکتی تھی، نمٹنے کے طریقے وضع کرنے شروع کر دیئے۔

اس بارے میں ابتدائی سوچ بچار، مشن اور وائسرائے نے 22رمئی کو اپنے اجلاس میں کی۔ طے پایا کہ ویول اس سلسلے میں ایک جامع منصوبہ تیار کرے اور پھر مشن کے ارکان کے غور و خوض کے بعد حکومت برطانیہ سے اس کی قبل از وقت منظوری حاصل کر لی جائے۔ 31رمئی کو مشن کے ارکان نے ویول کے تیار کردہ بریک ڈاؤن پلان پر کئی گھنٹے غور و خوض کیا۔ 3رجون کو اسے حتمی شکل دی گئی اور بذریعہ مراسلہ وزیراعظم ایٹلی کو بھیج دیا گیا تا کہ کابینہ اسے رد یا

منظور کر سکے۔ اس کے مطابق متوقع گڑ بڑ سے عہدہ براء ہونے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ اسے ہر طرح کچل دیا جائے اور اپنی حکومت برقرار رکھی جائے۔ ویول اس پر عملدرآمد کے لیے تیار تھا اور اسے کامیابی کا امکان بھی نظر آتا تھا بشرطیکہ برطانوی حکومت کی طرف سے مزید دو یا تین ڈویژن فوج مہیا کی جائے اور اسے استعمال کرنے کے بارے میں بھی اسے کھلی چھٹی دی جائے۔ نیز مارشل لاء لاگو کرنے کے اختیارات بھی دیے جائیں۔ تاہم ویول کا خیال تھا کہ اس کے نتیجے میں امکان ہے کہ برطانیہ کو مزید دس یا بیس سال کے لیے یہاں رکنا پڑ جائے گا۔ کمانڈر انچیف کی رائے تھی کہ ہندوستانی فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی اور اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکے گا خواہ اس کو کانگرس کی بھرپور بغاوت کو کچلنے کے لیے استعمال کیا جائے خواہ اسے مسلم لیگ کے جہاد کے مقابلے کے لیے استعمال میں لایا جائے۔ شہری انتظامیہ بھی تھک چکی ہے اور پولیس کی وفاداری بھی مشکوک ہے۔ مشن کی رائے میں اس طرح برصغیر کے مسئلے کے سیاسی حل کا امکان تقریباً معدوم ہو کر رہ جائے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برطانیہ میں لیبر حکومت کے حامی اس اقدام کی سخت مخالفت کریں گے۔ چنانچہ ان پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے یہ راستہ اختیار کرنے کی سفارش نہیں کی گئی۔ دوسری انتہا پر ایک اور راستہ زیر بحث لایا گیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ جوں ہی کانگرس ہمارے خلاف عوامی تحریک کا اعلان عام کرے ہمیں ہنگامی بنیادوں پر ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے۔ اہم بندرگاہوں، دہلی اور بعض وہ مقامات کہ جہاں یورپی مقیم ہیں کنٹرول رکھا جائے اور ہنگامی بنیادوں پر گورنروں، ان کے ملازموں اور یورپی شہریوں کا انخلاء عمل میں لایا جائے۔ اس طرح ہم ہندوستان کے داخلی جھگڑوں میں پڑے بغیر یہاں سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس کے نتیجے میں انتظامی بحران جنم لے گا اور پورا برصغیر قحط اور خانہ جنگی کا شکار ہو جائے گا۔ ساری برطانوی دولت مشترکہ میں خوف و اضطراب کی لہر دوڑ جائے گی۔ ویول کا خیال تھا کہ ہماری روایات اور ہماری عالمی حیثیت کے حوالے سے اول الذکر راستے کی نسبت یہ راستہ کہیں زیادہ تباہ کن اور مہلک ثابت ہوگا۔ اس لیے وہ اسے اختیار کرنے کے بالکل حق میں نہیں تھا۔ مشن کے ارکان کی رائے بھی یہ تھی کہ جب تک صورت حال کے ہاتھوں انتہائی مجبور نہ ہو جائیں ہمیں یہ راہ اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ مذکورہ دونوں انتہائی راستے نامنظور قرار دینے کے بعد وزارتی مشن اور وائسرائے نے بین بین دو راستے تجویز کئے۔ ان میں سے

ایک راستہ مذکورہ انخلاء کے راستے کی ہی کچھ بہتر صورت تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ’’ہمیں ہندوستان سے انخلاء کے لیے ایک مقررہ تاریخ کا اعلان کر دینا چاہیے جو مثال کے طور پر یکم جنوری 1947ء بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک کے درمیانی وقفہ میں مرحلہ وار انخلاء کے انتظامات سیاسی جماعتوں کے مشورے سے مکمل کئے جائیں۔ مرکزی حکومت کانگرس کو سونپ دی جائے۔ اس کے جواز میں یہ کہا جائے کہ ہم نے قحط اور انتشار سے ملک کو بچانے کی خاطر ایسا کیا ہے۔ اس طرح کانگرس کے ساتھ بھی خیر سگالی قائم رہے گی۔ لیکن دوسری طرف مسلمان ہمارے مخالف ہو جائیں گے اور ہمیں مسلم اکثریتی صوبوں سے فوری انخلاء عمل میں لانا پڑے گا کیونکہ یہاں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہو گی۔ مسلمانوں کے ساتھ آزادی کا ایفائے عہد نہ کرنے اور انہیں مذکورہ صورت حال سے دوچار کرنے کی پاداش میں مشرق وسطیٰ کے مسلم ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ علاوہ ازیں خانہ جنگی کے دوران انتظامی انتشار سے لازمی دوچار ہونا پڑے گا جس سے بچنے کے لیے یہ راستہ تجویز ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ راستہ جسے کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے مترادف قرار دیا جائے گا، کسی صورت بھی انخلاء کی اس ہنگامی صورت سے بہتر نہیں ہے جسے ہم پہلے ہی رد کر چکے ہیں‘‘۔ تاہم مشن اور وائسرائے نے ایک دوسرے بین بین راستے کے حق میں تجویز دی جو یہ تھی کہ ہندو اکثریت کے چھ صوبوں یعنی مدراس، بمبئی، سی۔ پی، یو۔ پی، بہار اور اڑیسہ کو آزادی دے دی جائے جب کہ شمال مغرب یعنی پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں اور شمال مشرق یعنی بنگال اور آسام میں فی الوقت موجودہ حالات کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ یعنی ان صوبوں کو کچھ عرصہ کے لیے بدستور برطانوی کنٹرول میں رکھا جائے۔ چونکہ پنجاب اور بنگال میں فرقہ وارانہ صورت حال بہت کشیدہ ہے اس لیے عارضی طور پر ان علاقوں کا برطانوی کنٹرول میں رہنا برصغیر کے مفاد میں ضروری ہے۔ برطانوی افواج، ملازموں اور باشندوں کو ہندو صوبوں سے ایک منظم طریقے سے مسلم صوبوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ ہم اپنا مرکز بدستور دہلی میں رکھیں گے اور مسلم صوبوں کی ہندو غلبے کے خلاف مدد کریں گے اور ان کو اپنا آئین وضع کرنے میں ان کی اعانت کریں گے۔ اس سے ہندوستانی فوج منقسم ہو جائے گی۔ برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مستقلاً ہماری فوجی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ ہندوستان سے انخلاء کر کے پاکستان آنے کی فوجی کاروائی کے

دوران بھی مشکلات پیش آئیں گی۔ ہم زیادہ دیر مسلم صوبوں (پاکستان) میں بھی قیام نہیں کریں گے اور کوشش کریں گے کہ ہندوستان اور پاکستان باہمی سمجھوتے کے ذریعے ایک یونین حکومت وضع کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ تاہم اس منصوبے پر عملدرآمد سے پیشتر کانگرس کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے گا۔ یہ ہماری آخری کوشش ہو گی جس میں ہم کانگرس کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ ہندوستان کی وحدت کی خاطر 16 رمئی کے جاری کردہ مشن منصوبہ کو قبول کر لو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس ہنگامی منصوبے پر باقاعدہ عملدرآمد کی خاطر اسے قبول کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ بعد ازاں مسلم لیگ کی رضامندی حاصل کی جائے گی۔ اس ہنگامی منصوبے کے مندرجہ ذیل فوائد گنوائے گئے:

1۔ ہم نے اپنی دستاویز میں مسلمانوں کے لیے انصاف کے جس حق کو تسلیم کیا ہے، یہ اس سے ہم آہنگ ہے۔

2۔ یہ ہمیں اُن لوگوں کے الزام سے بری کر دیتا ہے کہ جن لوگوں نے جنگ میں ہماری مدد کی تھی اور جن کو 1940ء میں ہم نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ان پر برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے ایسی حکومت کو مسلط نہیں کیا جائے گا کہ جس کے اختیار کو وہ تسلیم نہ کرتے ہوں گے۔

3۔ اس سے ہندو اکثریت کے علاقوں کو مکمل سیاسی آزادی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح ان علاقوں میں کانگرس کی طرف سے سول نافرمانی اور سبوتاژ کا جو ہتھیار آزمایا جانا تھا، وہ بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔

4 ۔ یہ ہمارے اس قول کے ساتھ بھی مربوط ہے کہ کسی اقلیت کی جانب سے مزاحمت کی وجہ سے اکثریت کی سیاسی ترقی کو روکا نہیں جائے گا۔

5۔ ہم ہندوؤں کی جانب سے مسلم بغاوت کو کچلنے کے عمل میں ملوث ہونے کے خدشے سے بھی بچ جائیں گے۔

اس کے مندرجہ ذیل نقصانات گنوائے گئے:

1۔ ہمیں یہ الزام دیا جائے گا کہ ہم اپنے 16 رمئی کے اعلان کردہ منصوبہ کے باوجود برصغیر کے بٹوارے کی حمایت کر رہے ہیں۔

2۔ ہم مسلم اکثریتی صوبوں میں کہ جہاں ہندو اور سکھ اقلیتیں آباد ہیں، ہونے والے واقعات میں ذمہ دار شمار کئے جائیں گے۔

3۔ مسلم علاقوں سے اپنے حسب منشاء موقع پر انخلاء میں ہمیں دقت پیش آسکتی ہے۔

مراسلے کے آخر میں کابینہ کو یہ اطلاع بھی دے دی گئی کہ سٹیفورڈ کرپس اس منصوبے کے بجائے اس سے پہلے بیان کردہ منصوبہ کا حامی ہے جس میں پورا برصغیر کانگرس کے حوالے کر کے یہاں سے رخصت ہونے کی تجویز ہے۔[52]

5/ جون کو لندن میں وزیراعظم ایٹلی کی زیرصدارت برطانوی کابینہ کے اجلاس میں یہ مراسلہ زیرغور آیا۔ اس میں برطانیہ کی بری، بحری اور فضائی تینوں مسلح افواج کے سربراہوں اور ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے بھی شرکت کی۔ وائسرائے اور مشن کے مجوزہ ہنگامی منصوبہ کے فوجی پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ ہندوستان کے کمانڈر انچیف کلاڈ آکن لیک نے اس منصوبے کی عملی مشکلات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اگر کانگرس کا تعاون حاصل ہوا تب بھی انخلاء میں تین سال لگ جائیں گے اور اگر کانگرس نے اس منصوبے کی مخالفت کی تو پھر جنگی بنیادوں پر انخلاء کو عمل میں لانا پڑے گا اور یہ پیش گوئی کرنا ناممکن ہے کہ یہ کیوں کر عمل میں آئے گا۔ اس نے کہا کہ ہندوستانی فوج میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی اور ان کے کوئی علیحدہ یونٹ نہیں ہیں۔ اگر کانگرس نے وزارتی مشن منصوبہ رد کر دیا تو پھر فوج میں ہندوؤں کے عنصر پر اعتماد کرنا غیر دانشمندانہ ہوگا کہ وہ کانگرس کے زبردست سیاسی اثر کے ماتحت ہے۔ اگر ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کو عمل میں لانا ضروری ہوا تو پھر تو ہندوؤں کو فوج سے فارغ کر کے ہندوستان بھیجنا ناگزیر ہو جائے گا۔ فوج کی نئی گروہ بندی کرنا ایک طویل عمل ہوگا اور ایک مستعد مسلم فوج تشکیل دینے میں کئی سال کا عرصہ درکار ہوگا۔ اس نے مزید کہا کہ ''مسلمانوں کو اگلے پانچ برس کے اندر اندر ہندوستان کی جانب سے حملے کی توقع رکھنی چاہیے اور انہیں ہندوستان سے یہ توقع بھی رکھنی چاہیے کہ وہ برصغیر کے شمال کی جانب سے بیرونی مداخلت بھی کرواسکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات کابینہ کے علم میں ہے کہ افغانستان کے شمال میں پہلے ہی سوویت افواج کی تعداد میں مزید اضافے کی اطلاعات ہیں اور کچھ شواہد یہ بھی ملے ہیں کہ سوویت ایجنٹ ایران کے راستے جنوب کی جانب بڑھ رہے ہیں۔'' داخلی گڑبڑ اور انتشار کے بارے میں اس نے کہا کہ

''اگر ہندوستانی فوج پر اعتماد کرنا بالکل ناممکن ہو گیا تو پھر سارے برصغیر میں امن عامہ کو برقرار رکھنا ان برطانوی افواج کے بس سے باہر ہو گا جو برصغیر میں ہیں یا یہاں بآسانی پہنچ جانے کی دوری پر موجود ہیں۔ ان برطانوی افواج سے تو گولہ بارود کے ذخائر اور فیکٹریاں بڑی مشکل سے کنٹرول ہو سکیں گی یا زیادہ سے زیادہ بندرگاہیں اور بعض کلیدی مقامات کی حفاظت کا بندوبست ہو سکے گا......اس صورتحال پر قابو پانے کے لیے کم و بیش چار یا پانچ ڈویژن فوج مزید درکار ہو گی۔ ہندوستان میں موجود برطانوی فضائیہ کو تقویت پہنچانا سودمند ثابت نہ ہو گا۔ کیونکہ مظاہرین کے خلاف طیارے کا استعمال آخری حربے کے طور پر ہی ہو سکتا ہے اور پھر جان و مال کے تحفظ میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' اس موقع پر چیف آف دی امپیریل جنرل سٹاف نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ''وزارتی مشن اور وائسرائے نے جو مسائل اٹھائے ہیں ہمیں ان کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے مزید وقت دیا جائے۔ اس نے کہا کہ صرف ہندوستان کے اندرونی ردعمل ہی کو نہیں دیکھنا ہو گا بلکہ یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ برما، ملایا اور انڈونیشیا (نیدر لینڈ شرق الہند) میں موجود ہندوستانی افواج پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ جہاں تک ہندوستان کے لیے کمک کا تعلق ہے تو اس نے کہا کہ صرف دو بریگیڈ ملایا میں اور ایک بریگیڈ فلسطین میں دستیاب ہے۔ اگر مزید کمک درکار ہوئی تو پھر ہمیں بعض علاقوں میں اپنی سلامتی کو خطرے میں ڈال کر اس کمک کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ یہ علاقے فلسطین اور قبرص ہیں۔'' کابینہ نے افواج کے سربراہوں کو مزید جائزہ لینے کے لیے وقت دے کر انہیں رخصت کر دیا اور پھر ہندوستان کی متوقع ہنگامی صورت حال سے پیدا مسائل کے سیاسی مضمرات کا جائزہ لیا۔ کابینہ نے دونوں انتہائی راستوں کو رد کر دیا جن کا مشن کے مراسلے میں ذکر کیا گیا تھا۔ کابینہ نے درمیانی راستوں میں سے بیان کردہ پہلا راستہ بھی رد کر دیا جس کی صرف کرپس نے اپنی کانگرس نوازی کی وجہ سے حمایت کی تھی۔ جب کہ بقیہ ارکان مشن اور وائسرائے نے بھی اسے رد کیا تھا جس میں کسی مقررہ تاریخ کا اعلان کر کے داخلی فرقہ وارانہ مسئلہ حل کرائے بغیر اس تاریخ کو پورے برصغیر سے انخلاء کا منصوبہ تھا۔ کابینہ کی رائے تھی کہ اس وقت انہیں فلسطین اور مصر میں جن مشکلات کا سامنا ہے، ان کے پیش نظر کسی جگہ بھی ایسی پالیسی اختیار نہ کی جائے کہ جس سے یوں لگے کہ ہم ''راہ فرار'' اختیار کر رہے ہیں۔ اس سے ہمارے اپنے ملک میں اور

ڈومینینوں میں شدید ردعمل پیدا ہوگا اور ہماری بین الاقوامی ساکھ کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس موقع پر وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے کہا کہ ''اس قسم کی پالیسی سے پیرس کے آمدہ مذاکرات میں ہماری پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ کابینہ کی عمومی رائے یہ تھی کہ اگر وزارتی مشن منصوبہ ناکام ہو جائے تو کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جس سے ہماری کمزوری عیاں ہوتی ہو۔'' مشن کے ارکان اور وائسرائے نے جو ہنگامی منصوبہ اپنی رائے میں درست گردانتے ہوئے تجویز کیا تھا اس کے بارے میں کابینہ کی رائے یہ تھی کہ اس میں بھی بہت سی جائز مشکلات کا سامنا ہوگا۔'' اس تجویز کے تحت دراصل ہم مسلم لیگ کو وہ پاکستان دے دیں گے جس کی ہم نے اب تک مخالفت کی ہے۔ ہندو صوبوں میں اقلیتوں کے ساتھ اچھے سلوک کی بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوگی۔'' کابینہ کی رائے تھی کہ عام لائن یہ اختیار کی جانی چاہیے کہ ''ہم تو ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے بےقرار ہیں اور اس کے لیے ہم نے منصوبہ بھی تجویز کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگ آپس میں آزادی کے منصوبے پر متفق نہیں ہو سکے ہیں۔ ان حالات میں ہم کسی ایسی صورت حال کو پیدا ہونے نہیں دیں گے جو انتشار اور قحط کا سبب ہو۔ چنانچہ ہم اپنی ذمہ داریاں اس وقت تک نبھائیں گے جب تک ہندوستانی کسی منصوبے پر متفق نہیں ہو جاتے۔ اس دوران ہماری تجاویز بدستور موجود ہیں۔''[53]

6رجون کو وزیراعظم ایٹلی نے ارکان مشن اور وائسرائے کے نام اپنے مراسلے میں کابینہ کی کاروائی کے اہم نکات اور تاثرات سے آگاہ کر دیا۔ تاہم ابھی مشن کے مجوزہ ہنگامی منصوبے پر کوئی فیصلہ نہ دیا کیونکہ ابھی فوج کے سربراہوں نے اس پر اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ 12رجون کو برطانیہ کو بری فضائی اور بحری مسلح افواج کے سربراہوں نے دفاعی مضمرات کے بارے میں اپنی تیار کردہ ایک رپورٹ کابینہ کو پیش کی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ''ہندوستان کے متعلق مستقبل کی پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے فوجی مضمرات کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مستقبل کی کسی بھی جنگ میں ہندوستان سے ہماری فوجی اہمیت کی جو ضروریات وابستہ ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ سب سے بڑے پشت پناہ علاقے کا کام دے گا (یعنی ہمیں یہاں کی افرادی قوت اور صنعتی اہلیت کا آسرا رہنا چاہیے) اور یہ کہ ہم فوجی نقل وحرکت، انتظامی ضروریات اور فضائی حملوں کے لیے اس علاقے میں اڈے قائم کر سکیں۔ چنانچہ یہ

بے حد اہم ہے کہ ہندوستان کو بیرونی حملے اور اندرونی گڑبڑ سے محفوظ رہنا چاہیے۔ دفاعی مقاصد کی خاطر ہندوستان کو ایک وحدت رہنا چاہیے۔'' آگے چل کر یہ بھی کہا گیا کہ سرحدوں پر روس کی طرف سے کمیونسٹ قوتوں کو منظم کیا جارہا ہے۔ اگرچہ کوئی فوری خطرہ تو درپیش نہیں ''لیکن اس صورت میں روسی مداخلت کا خطرہ بڑھ جائے گا۔ اگر ہم نے ہندوستانی مسئلہ طے کرنے میں کمزوری دکھائی اور اگر اس کے دفاع کی وحدت میں کمی واقع ہوئی۔''[54]

12 رجون کو پارلیمانی نائب وزیر ہند آرتھر ہینڈرسن نے کابینہ کے نام ایک یادداشت پیش کی جس میں مشن کے مجوزہ ہنگامی منصوبے کی مخالفت کی۔ اس کا لب لباب بھی یہی تھا کہ پاکستانی علاقوں کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ پاکستانی علاقے فوجی اور معاشی لحاظ سے قابل عمل نہیں ہیں جب کہ پورا ہندوستان ایک قابل عمل ملک ہوگا۔''[55]

14 رجون کو برطانوی کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت وزیر اعظم ایٹلی نے کی۔

چیف آف دی امپیریل جنرل سٹاف نے مجوزہ ہنگامی منصوبے کے فوجی مضمرات کے بارے میں تمام چیفس آف سٹاف کے خیالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا ''ہندوستان سے انخلاء کر کے پاکستان چلے آنے کی پالیسی کے نتیجے میں ہمارے فوجی اہمیت کے مفادات محفوظ نہیں رہیں گے اور پورا برصغیر خانہ جنگی کی لپیٹ میں آجائے گا۔ یہ ایک ایسی صورت ہوگی جو فوجی وجوہات کی بناء پر مکمل طور پر ناقابل قبول ہوگی۔ چیفس آف سٹاف کی رائے یہی ہے کہ بہترین راستہ ایسی پالیسی اختیار کرنے ہی میں مضمر ہے کہ جس میں پورے ہندوستان میں موجود رہا جائے اور امن عامہ کی ذمہ داری پوری طرح قبول کی جائے۔'' آگے چل کر اس نے ہندوستان کے لیے کمک کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگر ہندوستان کے لیے کمک پہنچانا ضروری ہو گیا تو اس کے لیے اٹلی سے ہمیں اپنی ایک ڈویژن فوج کا انخلاء ایک انتہائی نازک موقع پر کرنا پڑے گا اور جرمنی سے ایک ڈویژن اور سات بریگیڈز کا انخلاء ہماری وہاں موجود قابض افواج میں سے بہت بڑا اخراج ہوگا۔'' وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے کہا کہ ضرورت پڑنے پر اگر یونان سے برطانوی افواج کا انخلاء کیا گیا تو پیرس میں آمدہ چار بڑی طاقتوں کی وزرائے خارجہ کانفرنس پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔ تاہم اس نے امید ظاہر کی کہ ''ممکن

ہے بلغاریہ کے ساتھ امن معاہدہ طے پا جائے اور روسی افواج اس ملک سے چلی جائیں تو پھر یونان کو درپیش خطرے میں کچھ کمی واقع ہو سکتی ہے لیکن پھر بھی اس صورت میں مجھے ڈینیوب کے سوال پر پیچھے ہٹنا پڑے گا۔" چنانچہ وزیر خارجہ نے مزید کہا کہ "ان حالات میں میں اس پالیسی کے حق میں ہوں کہ ہمیں پورے ہندوستان میں رہنا چاہیے اور امن عامہ کی تمام تر ذمہ داری کو ثابت قدمی سے قبول کرنا چاہیے۔ اگر ہم نے یہ پالیسی اختیار نہ کی تو بلاشبہ ہم مشرق بعید اور یورپ دونوں جگہ اپنا وقار کھو بیٹھیں گے۔" ایٹلی نے بھی اس رائے کے ساتھ پوری طرح اتفاق کیا جو افواج کے سربراہ اور وزیر خارجہ نے متفقہ طور پر دی تھی۔"[56] چنانچہ مشن کے ارکان اور وائسرائے کا تجویز کردہ ہنگامی منصوبہ مذکورہ فوجی اور بین الاقوامی وجوہات کی بناء پر کابینہ کی جانب سے رد کر دیا گیا اور اس کی اطلاع مشن اور وائسرائے کو دے دی گئی۔

کرم خوردہ برطانوی سامراج کے بین الاقوامی تقاضے

کرم خوردہ برطانوی سامراج جو اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا، اب محض اپنے ظاہری جھوٹے سچے بھرم کے زور پر دنیا میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کی فکر میں تھا۔ سوویت یونین عالمی جنگ میں فاشسٹوں کو عبرت ناک شکست فاش دینے کے بعد سرخرو ہو کر ایسی بے مثال قوت کے طور پر ابھرا تھا کہ تمام مغربی سامراجی طاقتیں اس کے خوف سے لرزہ براندام تھیں۔ ان کو اپنی نجات نئے امریکی سامراج اور اس کے قبضے میں ہولناک تباہی کے حامل ایٹم بم میں نظر آتی تھی۔ برطانوی سامراج جو یوں تو بالکل کھوکھلا اور دیوالیہ ہو چکا تھا مگر کم و بیش ایک سو سال تک دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مالک رہنے کے ناطے ابھی اس کا بھرم قائم تھا۔ سوویت یونین پر بھی ابھی اس کے بھرم کا فریب پوری طرح آشکارا نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے یورپی حریف نازی جرمنی سے عالمی جنگ میں مار کھائی تھی لیکن ابھی اپنی کسی نو آبادی میں اپنے سے "چھوٹے" انقلابی سے مار نہیں کھائی تھی۔ اگرچہ مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ میں بہت سے حریت پسند "چھوٹے" جدوجہد کا آغاز کر چکے تھے لیکن ابھی اس کی سب سے بڑی نو آبادی ہندوستان میں صرف خطرے کی گھنٹیاں بجی تھیں، عملاً بڑے پیمانے پر ابھی کچھ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس برصغیر کو عالمی سامراج کے آخری قلعے کی حیثیت حاصل تھی، یہاں عام

شورش ہو جانے کا بہت بڑا مطلب تھا۔ اس سے نپٹنے کے جو طریقے برطانوی کابینہ کے مذکورہ اجلاس میں زیر بحث آئے تھے ان کی دو ہی صورتیں تھیں:

1۔ اگر سارے ہندوستان سے نہیں تو اس کے بڑے حصے سے راہ فرار اختیار کی جائے۔

2۔ شورش کو کچلنے کے لیے ساری دنیا سے اپنی فوج کو بلا کر یہاں جھونک دیا جائے۔

ان دونوں صورتوں میں ان کی بربادی تھی اسی لیے کابینہ نے دونوں صورتیں رد کر دی تھیں۔ اور تجویز کیا تھا کہ بھرم قائم رکھو اور شورش کو ہونے ہی نہ دو اور ہو سکے تو محدود حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہ دو۔ وجہ یہ تھی کہ پہلا راستہ اختیار کرنے میں ان کے کھوکھلا اور دیوالیہ ہونے کی قلعی کھل جاتی تھی اور ایک ایسا بند ٹوٹ جاتا تھا جس کے بعد مشرق بعید سے مشرق وسطیٰ اور یورپ تک یہ کہیں ٹھہر ہی نہ سکتے تھے۔ دوسری صورت میں ہندوستان بچاتے بچاتے وہ دنیا کے دوسرے علاقوں اور خود یورپ میں اپنا بیڑہ غرق کر لیتے اور شاید ہندوستان پھر بھی گنوا بیٹھتے۔ وہ جس جگہ سے بھی فوجیں نکال کر ہندوستان بھیجتے اس جگہ سوویت یونین کے لیے پیش قدمی یا دباؤ ڈالنے کا راستہ کھل جاتا۔ یورپ اور بحیرہ روم کے خطے میں تو وہ ایسا ہرگز گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ پیرس میں چار بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس اسی مسئلے پر تعطل کا شکار تھی۔

تاریخ میں کئی بار روسیوں کو مشرقی یورپ کے راستے یورپیوں کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ہر مرتبہ بھاری جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ اب وہ اس علاقے میں اپنی دوستانہ حکومتوں کے قیام اور یہاں اپنی فوجی موجودگی رکھ کر ہی سکون کی نیند سو سکتے تھے۔ اس لیے وہ جہاں تک آئے تھے اس سے پیچھے ہٹنے کے بجائے بحیرہ روم کے علاقے تک اپنے تحفظ کی چوکیاں قائم کرنا چاہتے تھے۔ ادھر اینگلو امریکی بلاک امریکی ایٹم بم کے زعم میں سوویت یونین پر مشرقی یورپ سے بھی نکل جانے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ مارچ کے اوائل میں چرچل کی فولٹن (مسوری، امریکہ) کی تقریر میں جس پر وہاں موجود صدر ٹرومین نے بھی داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے تھے، سوویت یونین کو ایک لعنت قرار دیا گیا تھا اور اس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے تمام انگریزی بولنے والوں کو متحد ہو جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اس کے بعد اپریل۔ مئی میں جب چار بڑوں کے وزرائے خارجہ کے پیرس میں مذاکرات شروع ہوئے تو سوویت یونین

نے سخت گیر مؤقف اختیار کر لیا۔ بقول فلیمنگ ''نظریۂ چرچل پر اس کے علاوہ اور کس ردعمل کی توقع کی جاسکتی تھی۔''[57] چنانچہ کانفرنس میں ہر بات پر تعطل پیدا ہو گیا۔ سوویت یونین مشرقی یورپ سے اپنی فوجوں کے انخلاء کے لیے مہلت مانگتا تھا۔ سوویت یونین کا کہنا تھا کہ امریکہ ترکی اور ایران میں اپنے اڈے قائم کرنا چاہتا ہے۔ یونان میں برطانوی افواج براجمان ہیں۔ امریکہ نے جرمنی کے بارے میں معاہدے کا جو مسودہ تیار کیا روس نے اسے رد کر دیا۔ اطالوی نوآبادیوں کی تقسیم پر بھی کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ روس نے اٹلی سے جو ہرجانہ طلب کیا تھا اس کے بارے میں بھی کچھ طے نہ ہو سکا۔ جزائر ڈاڈکان (Dodecanese) جن پر یونان کا دعویٰ تھا اور ٹریسٹے جس پر بلغاریہ اور اٹلی کی مخاصمت تھی، کے مسائل پر کانفرنس بالکل معطل ہو گئی۔ وزرائے خارجہ اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے۔ اب 15 جون کو یہ کانفرنس پیرس میں دوبارہ شروع ہونے والی تھی۔ اس پس منظر میں کہ اینگلو امریکی بلاک کی جانب سے نظریۂ چرچل پر چلتے ہوئے سوویت یونین پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کی جارہی تھی جب کہ وہ انہیں خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ جون کے اوائل میں ہندوستان کے مسئلہ پر برطانوی وزیر خارجہ کا مؤقف سمجھ میں آتا تھا کہ برطانیہ کی کمزوری کے ڈھول کا پول کھل جانے سے پرہیز اختیار کیا جائے ورنہ پیرس مذاکرات میں اس کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی اور یہ کہ بحیرہ روم (جس میں فلسطین اور مصر بھی شامل تھے) اور یورپ کے خطے سے برطانوی افواج کو ہندوستان بھیجنا بھی ناممکن تھا کہ اس سے انہیں اس خطے میں بڑا دھچکا پہنچنے کا احتمال تھا۔

اس بین الاقوامی صورت حال میں وہ ہندوستان میں انتشار اور افراتفری کے امکان سے جس قدر ممکن تھا گریز اختیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان کا مسئلہ اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ نہ وہ خود لے جانے کے حق میں تھے اور نہ ہی ایسی نوبت آنے دینا چاہتے تھے کہ کوئی دوسرا ملک اسے اقوام متحدہ میں لے جا کر اسے بین الاقوامی مسئلہ بنا دے۔ اس بارے میں برطانوی وزیر خارجہ نے پیرس مذاکرات کے دوبارہ آغاز سے ایک روز قبل 14 رجون کو کہ جس روز کابینہ کی دفاعی کمیٹی کا مذکورہ اجلاس بھی منعقد ہوا تھا، ایک رپورٹ کابینہ کو پیش کی۔ اس میں کہا گیا کہ ''......حکومت ہندوستان یا حکومت برطانیہ میں سے کسی ایک کی جانب سے بھی اقوام متحدہ کو اپیل کی گئی تو اس کا صاف مطلب ہو گا کہ ہم اقتدارِ اعلیٰ کھو چکے

ہیں اور یہ اعتراف ہوگا کہ ہم ہندوستان میں امن عامہ برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئے ہیں۔ اس سے کوئی عملی فائدہ حاصل ہونا عبث ہے، بلکہ بہ الفاظ دیگر یہ سوویت یونین کو کھلی دعوت ہوگی کہ وہ آ کر ہماری جگہ لے لے۔'' اس نے امریکیوں کی برصغیر میں دلچسپی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''عمومی طور پر حکومت برطانیہ کا کوئی بھی اقدام جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ ہم وزارتی مشن کے تجویز کردہ خطوط پر کوئی تصفیہ کرائے بغیر ہندوستان کو چھوڑ رہے ہیں تو اس کے نتیجے میں بین الاقوامی امور میں ہماری پوزیشن اس حد تک کمزور ہو جائے گی کہ اسے برطانوی اقتدار اور استقلال کے زوال کی علامت کے طور پر تعبیر کیا جائے گا اور یہ بات امریکیوں کے نقطۂ نظر سے بھی خاص طور پر اہم ہے۔ امریکی انتظامیہ گزشتہ کئی ماہ سے یہ تلقین کر رہی ہے کہ ہمیں ہندوستان میں فوجی نوعیت کے اہم مقامات کو نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ وہ ہمارے ساتھ مل کر حکومت ہند سے اس معاملے میں رسائی چاہتے ہیں کہ انہیں ان میں سے بعض مقامات کی نگہداشت اور استعمال کی اجازت دی جائے۔ ان کی اس منشاء میں ان کی روس کی جانب سے تشویش کو دخل ہے اور ہماری ایسی کسی پالیسی سے کہ جس سے روس کو ہندوستان میں مداخلت کا موقع مل سکے، ان کو سخت مایوسی ہوگی۔ بغیر تحفظات کا بندوبست کئے ہوئے ہمارا ہندوستان سے صاف دستبردار ہو جانا ان کے لیے اس درجہ پشیمانی کا باعث ہوگا کہ وہ اس معاملے میں ہماری کھل کر حمایت نہیں کر سکیں گے۔ جہاں تک امریکی رائے عامہ کا تعلق ہے ہماری دستبرداری کی پالیسی کے بارے میں ہماری توقع سے بہت کم ہمدردی ہمیں لبرل بین الاقوامیت پسند حلقوں کی جانب سے حاصل ہوگی۔ جب کہ اس کے برعکس ہمارے لیے کہیں زیادہ نقصان دہ وہاں کے وسیع تر حلقوں کی طرف سے اس خیال کی تصدیق ہوگی کہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے ہمارے پاس وسائل نہیں رہے اور ہم ثابت قدم نہیں رہ سکے۔ ہماری طرف سے اقوام متحدہ میں اس مسئلہ کا صرف حوالہ دینا ہی امریکیوں کے لیے افسوس ناک امر ہوگا کیونکہ اس طرح روس کو اس صورت حال کی خرابی سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع مہیا ہو جائے گا۔ عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکی انتظامیہ ہر اس پالیسی میں ہماری پشت پناہی کرے گی جس میں وزارتی مشن کے مجوزہ خطوط پر تصفیہ کے معاملے کو بدستور اختیار رکھ کر ہماری جانب سے کھل کر یہ اظہار کیا جائے گا کہ ہم ہندوستان کی حکومت کی اہم ذمہ داریاں پوری کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔'' اقوام متحدہ کو ملوث کرنے کے

مضمرات کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے مزید لکھا کہ ''......ہمیں خاص طور سے معلوم ہونا چاہیے کہ ہر وہ قدم جو برطانوی مفاد کے حق میں جاتا ہوگا، سوویت حکومت اسے ویٹو کر دے گی اور اس صورت سے مفاد اٹھانے کی کوشش کرے گی...... اس کا امکان بھی ہے کہ اگر سلامتی کونسل ہندوستان میں امن عامہ کی بحالی کی خاطر فوجی کاروائی کا اصولی فیصلہ کرتی ہے تو پھر سوویت یونین ہی وہ واحد ملک ہوگا جو مطلوبہ افواج مہیا کرنے کے لیے تیار اور اہل ہوگا...... گویا سلامتی کونسل سے اپیل کا مطلب عملاً یہ ہوگا کہ ہم نے اپنی سلطنت ہند کو اٹھا کر سوویت یونین کی جھولی میں ڈال دیا ہے۔'' اس نے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان میں گڑبڑ کی صورت حال کا مشرق وسطیٰ کے عرب ملکوں پر اور مشرق بعید کے قوم پرستوں پر بہت گہرا اثر پڑے گا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اگر ہم فلسطین اور مصر کا مسئلہ عربوں کے حق میں حل نہ کر سکے اور ادھر ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی بے سروپا چھوڑ دیا تو عرب ممالک اور ایران میں اس کا بڑا شدید ردعمل ہوگا۔ روسی دباؤ کے خلاف ان کی مزاحمت کم ہو جائے گی۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ہندوستان میں برطانیہ کمزور ہو رہا ہے۔ اگر ہم ہندوستان میں فوجی اعتبار سے بہت زیادہ ملوث ہو گئے تو سوویت یونین موقع سے فائدہ اٹھا کر ایران اور ترکی میں گھس بیٹھے گا۔ جرمنی، اٹلی، یونان اور مشرق وسطیٰ سے برطانوی افواج کو بلانا پڑ گیا تو اس کے نتائج یہ ہوں گے کہ سوویت یونین ان علاقوں میں اپنی من مانی کاروائیاں کرے گا اور مذاکرات میں سخت رو ہو جائے گا۔ یوگوسلاویہ بڑھ کر ٹریسٹے پر قبضہ کر لے گا۔ مشرق وسطیٰ میں برطانوی افواج کو دوبارہ لے جانا مشکل ہو جائے گا اور فلسطین میں اگر اپنی بجائے امریکی فوج کو نہ چھوڑا گیا تو وہاں خانہ جنگی ہو جائے گی۔ یونان اور ترکی اپنے پاؤں پر کھڑے نہ رہ سکیں گے۔''[58]

برطانوی وزیر خارجہ ارنسٹ بیون کی اس رپورٹ اور برطانوی کابینہ اور اس کی دفاعی کمیٹی کے مذکورہ اجلاسوں کی کاروائی سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بین الاقوامی بساط پر ہندوستان کہاں کھڑا تھا؟ ہندوستان میں اینگلو امریکی سامراجی تقاضے کیا تھے؟ سوویت یونین سے ان کو کیا خدشات لاحق تھے؟ وہ ہر قیمت پر ہندوستان کو متحد اور پرامن کیوں رکھنا چاہتے تھے؟ اور وزارتی مشن اور وائسرائے کے مجوزہ ہنگامی منصوبے کو کیوں رد کیا گیا تھا؟ یاد رہے کہ اس ہنگامی منصوبے کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی گئی تھی کہ اگر کانگرس کو وزارتی مشن منصوبہ

ناقابل قبول ہوا تو وہ سول نافرمانی اور بغاوت کی تحریک کو شہ دے گی جس کے نتیجے میں ہندوستانی فوج اور پولیس میں پھوٹ پڑ جائے گی اور ملک خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ جائے گا۔ حالات کانگرس کے اعتدال پسند رہنماؤں کے ہاتھ سے نکل کر بائیں بازو اور کمیونسٹ عناصر کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ مسلم لیگ کی بغاوت کی صورت میں صرف فرقہ وارانہ فسادات بھڑکنے کا اندیشہ تھا جس کی سنگینی کو وہ براہ راست حکومت کے ساتھ تصادم کی مذکورہ صورت کے مقابلے میں کم تر اہمیت دیتے تھے۔ تو گویا اب برطانوی کابینہ نے یہ تجویز کیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے کانگرس کو ناراض نہ کیا جائے۔ اعتدال پسندوں کو ہمیشہ انتہا پسندوں کے نام پر بلیک میلنگ کی جو قوت حاصل ہوتی ہے وہ گاندھی، نہرو، پٹیل وغیرہ کو بھی حاصل تھی۔ ویسے بھی بڑی پارٹی ہونے کے ناطے سے بلیک میلنگ کی قوت سب سے زیادہ کانگرس ہی کو حاصل ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس یہ دھونس تھی کہ وہ جب چاہے ہندوستانی عوام کے جن کو بوتل سے باہر نکال دے گی اور وہ حالات پیدا کر دے گی جن سے نمٹنے کے لیے مشن اور وائسرائے پیش از وقت ہنگامی منصوبہ وضع کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ چنانچہ اس موقع پر اینگلو امریکی سامراج کو گاندھی کی اہنسا یا عدم تشدد کی سخت ضرورت تھی تاکہ بوتل کا منہ بند رکھا جا سکے۔ گڑبڑ کی جو صورت حال اینگلو امریکی سامراجی پیدا ہونے دینا نہیں چاہتے تھے وہ ہندو بورژوا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس سے اس کے مفادات کو بھی خطرات لاحق تھے۔ کابینہ کے اجلاس (5رجون) نے کانگرس میں ایک ایسے ''طاقتور عنصر'' کی نشاندھی بھی کی تھی۔ ''جو انتشار اور خلفشار کی طرف لے جانے والے راستے کی مخالفت کرے گا اور کانگرس کے غیر ذمہ دار عنصر کے خلاف اپنا پورا زور صرف کرے گا۔''[59]

چنانچہ اس ''طاقتور عنصر'' اور برطانوی سامراج کے مشترکہ مفادات اس ''روحانی ہم مشربی'' کی بنیاد بنے جو سٹیفورڈ کرپس اور پیتھک لارنس، گاندھی کی پرارتھنا سبھا میں جا کر حاصل کرتے تھے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے ترقی یافتہ مغربی صنعتی معاشرے کے ''روشن خیال'' رہنما تھے لیکن ایک ایسے مکروہ شخص کی محبت سے روحانی فیضان حاصل کرنے آئے تھے جو معاشرے کو ہزاروں سال پیچھے کی طرف دھکیلنے کا خواہاں تھا جسے عہد جدید کی تمام تر ترقی ناقابل قبول تھی۔ جو ہندوستان کے کروڑوں غریب عوام کو چرخے اور بیل گاڑی کے زمانے میں مقید رکھنا چاہتا تھا۔ جو برہنہ رہنے پر فخر کرنا سکھاتا تھا اور غریب عوام الناس کو کپڑوں کی محرومی پر

راضی بہ رضا رکھنا چاہتا تھا۔ جو جدید طبی سہولتوں سے انکار کرتا تھا کہ عوام کو یہ بھی نہ دی جائیں۔ وہ قدرتی علاج یعنی قدرت کے رحم و کرم پر زندگی کو داؤ پر لگائے رکھیں اور رام رام کرتے رہیں۔ اس قسم کا شخص یقینا ترقی یافتہ صنعتی معاشرے کے روشن خیال افراد کے لیے کہ جو لیبر پارٹی کا ترقی پسند عنصر تھا، کسی صورت مشعل راہ نہیں ہوسکتا تھا لیکن سامراجی تقاضوں کے تحت یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایسے شخص کی دلجوئی کی جائے اور اس کی ہر بات مانی جائے۔ کانگرس کی منشاء کو نظر انداز کر کے کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ رہا مسلم لیگ کا معاملہ تو اس کی قیادت بھی اعتدال پسند تھی اور برصغیر کو ان حالات سے دوچار کرنا نہیں چاہتی تھی کہ جن سے اینگلو امریکی سامراجی مفادات خطرے میں پڑتے ہوں اور جو سوویت یونین کے فائدے میں جاتے ہوں۔ قائداعظم جناح کی پوری کوشش تھی کہ متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے فرقہ وارانہ مسئلے کا پرامن حل نکل آئے۔ تاہم اس وقت بھی اینگلو امریکی سامراج کی جانب سے کانگرس کو مسلم لیگ پر فوقیت دی گئی اور بعدازاں جب ہندوستان پاکستان وجود میں آ گئے تو بھی ہندوستان ان کی اولیں ترجیح رہا۔

باب: 12

مشن منصوبہ۔ مسلم لیگ کی منظوری
عبوری حکومت۔ کانگرس کی منظوری

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس اور مشن منصوبہ کی منظوری

شملہ مذاکرات کے بعد جناح شملہ میں قیام پذیر رہے جہاں سے انہوں نے 22رمئی کو وزارتی مشن کی دستاویز پر اپنا پہلا بیان جاری کیا تھا جس میں اس دستاویز پر بہت سے اعتراضات کیے گئے تھے مگر آخر میں سارا معاملہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ اور کونسل پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس دوران مسلم لیگ نے اپنے آئین کی رو سے دو ہفتے کے نوٹس پر اپنی کونسل کا اجلاس 5رجون اور مجلس عاملہ کا اجلاس 3رجون کو دہلی میں طلب کیا تھا۔ درحقیقت جناح نے کچھ وقت حاصل کیا تھا تا کہ وزارتی مشن منصوبہ کے بارے میں ''اُن کے عوام'' جذباتی کیفیت سے گزر جانے کے بعد اُن کے 22رمئی کے بیان کے مطابق اس کا ''محتاط''، ''غیر جذباتی'' اور ''تفصیلی'' جائزہ لے سکیں۔ مگر ارکان مشن اور وائسرائے اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتے تھے اور نجی سطح پر جناح اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں کی رائے سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے تھے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ مسلم لیگ کیا فیصلہ کرنے جا رہی ہے۔ کیونکہ ایگزیکٹو کونسل کا معاملہ بھی اس کے ساتھ منسلک تھا جس کی تشکیل میں وائسرائے تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ 24رمئی کو سٹیفورڈ کرپس کے ذاتی معاون وڈرووائٹ نے شملہ میں جناح کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح نے اسے بتایا کہ مشن نے دستاویز کے ابتدائیہ میں پاکستان کی سخت مخالفت کر کے میرے لیے مشکل کا

سامان پیدا کر دیا ہے۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی ایسا محض کانگرس کو خوش کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ میرے پاس میرے حامیوں کے ٹیلی گراموں کی بھر مار ہو چکی ہے جس میں انہوں نے مشن کی دستاویز پر سخت احتجاج کیا ہے۔ مسلمانوں کا ردعمل بڑا شدید ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگوں کو اتنا وقت مل جائے کہ وہ ان دو صدموں کو برداشت کر جائیں جو ان کو پہنچے ہیں۔ ایک تو میرے خط سے جس میں میں نے ایک مرکزی حکومت کو قبول کرلیا ہے اور دوسرے مشن کی دستاویز کے ابتدائیہ سے۔ دورانِ گفتگو جناح نے مشن منصوبہ پر بہت سے اعتراضات کئے اور وائٹ سے کہا کہ چونکہ کانگرس مخلص نہیں ہے اس لیے یہ منصوبہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ وائٹ نے ان کے تمام اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے کہا کہ پھر بھی مسلم لیگیوں کی طرف سے اس قسم کا مؤقف تو اختیار کیا جا سکے گا کہ ''......اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ مجوزہ نظام نہیں چل سکے گا لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ اسے آزمانا چاہتے ہیں وہ اسے قبول کرلیں گے اور بلاوجہ اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ وہ اسے پاکستان کی شاہراہ پر پہلے قدم کی حیثیت سے قبول کرلیں گے۔'' اس پر جناح نے خوش ہو کر کہا کہ ''ہاں۔ بالکل صحیح ہے۔ تم سمجھ گئے ہو۔'' وائٹ نے اس گفتگو کی تفصیل ایک نوٹ کی صورت میں ارکان مشن اور وائسرائے کو پیش کی جس کے آخر میں لکھا کہ ''مجھے پورا یقین ہے کہ مسلم لیگ انہی خطوط پر عملدرآمد کرے گی۔''[1] یعنی تمام اعتراضات گنوانے کے بعد منصوبے کو یہ کہہ کر قبول کرلے گی کہ یہ حصول پاکستان کی راہ میں پہلا قدم ہے۔ اس کے بعد 30 رمئی کو وائسرائے کے ایک معاون بی۔ این راؤ نے بھی شملہ میں جناح کے ساتھ ملاقات کی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آئین ساز ادارہ وضع کرنے کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ جناح نے جواب دیا کہ اس معاملے میں وائسرائے بااختیار ہے۔ راؤ نے کہا مگر وہ عبوری حکومت میں شامل دونوں پارٹیوں کے ارکان سے بھی مشورہ کرے گا۔ جناح نے جواب دیا کہ یہ تو درست ہے لیکن فیصلہ وائسرائے کو خود ہی کرنا ہوگا۔''[2] مراد یہ تھی کہ آئین ساز ادارے کی تشکیل کے بارے میں وائسرائے پارٹیوں کی رائے یا توضیحات کا پابند نہیں ہے۔ اشارہ کانگرس کی پیرا۔15 کی غلط توضیح کرنے کی جانب تھا۔

یکم جون کو وائسرائے کے نائب ذاتی معاون آئی۔ ڈی۔ سکاٹ نے مسلم لیگ کے

سیکرٹری جنرل لیاقت علی خان کے ساتھ ملاقات کی۔ اس نے اپنے نوٹ میں لیاقت علی کے بارے میں لکھا کہ ''دو زبردست جنز اور ایک وہسکی کے بعد وہ ذرا کھلا''۔ سکاٹ کا مدعا شراب کے نشے کے زیر اثر لیاقت سے یہ جاننے کا تھا کہ عبوری حکومت میں شمولیت کے بارے میں مسلم لیگ کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ چنانچہ اس نے لیاقت علی سے معلوم کرنے کے بعد لکھا ''وہ عبوری حکومت میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں اس دور باش (Rebuff) کا بھی خدشہ ہے کہ کہیں ہم تو وزارتی مشن منصوبہ قبول کر لیں مگر کانگرس اسے رد کر دے۔'' اور پھر وائسرائے بھی انہیں صاف جواب دے دے کہ ''جناب آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں آپ کی پیش کش بروئے کار نہیں لا سکتا۔'' لیاقت علی خان نے اس سے پوچھا کہ کیا لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس سے پیشتر جناح کو یہ یقین دہانی کرائی جا سکتی ہے کہ اگر لیگ نے قبول کر لیا اور کانگرس نے رد کر دیا تو کانگرس کے رویے کا لحاظ کئے بغیر عبوری ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کو اس کے کوٹہ کی نشستیں دے دی جائیں گی۔ جواب میں اس نے کہا کہ ''ایسا واقعتاً ہوگا۔ لیکن اس کی الٹ صورت کہ جس میں لیگ رد کر دے اور کانگرس قبول کر لے تو ایسی ہی یقین دہانی کانگرس کو کرائے جانے کے بارے میں ہم صاف طور پر انکار کر چکے ہیں۔ کیونکہ اس سے مسلم مفادات کو بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ لیگ مجلس عاملہ کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ اگر اس نے کانگرس کے ہاتھوں سٹیم رول نہیں ہونا تو گھٹنے ٹیک دے اور قبول کر لے۔'' سکاٹ کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لیاقت علی نے کہا کہ کیا وائسرائے نجی طور پر بھی جناح کو یہ یقین دہانی نہیں کروا سکتا کہ لیگ کے قبول کرنے اور کانگرس کے رد کرنے کی صورت میں لیگ کو اس کی نشستوں کا کوٹہ دے دیا جائے گا۔ لیاقت نے مزید کہا کہ ''اگر ہمیں اس قسم کی یقین دہانی مل جائے تو ہمارے لیے اس سلسلے میں کافی سہولت ہو جائے گی کہ ہم احتجاج کرنے کے ساتھ ساتھ (مشن منصوبہ) قبول کرنے کی قرارداد منظور کر دیں۔'' سکاٹ نے کہا کہ میں اس بارے میں وائسرائے کو آگاہ کر دوں گا۔''[3]

2 رجون کو ویول نے ارکان مشن کے نام ایک نوٹ لکھا جس میں دونوں پارٹیوں کے ردعمل سے متوقع مختلف صورتوں کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس میں ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل سے متعلق اس صورتحال کے بارے میں جس میں مسلم لیگ کی طرف سے مشن منصوبہ قبول اور کانگرس کی

طرف سے رد کیا گیا ہو، اس نے خیال ظاہر کیا کہ ''اس صورت میں سرکاری افراد پر مشتمل کونسل تشکیل دی جائے کیونکہ کانگرس کے بغیر مسلم لیگ کے رہنماؤں کو کونسل میں شریک کرنا مناسب نہ ہوگا۔لیکن سکاٹ کے مذکورہ نوٹ اور دوسرے ذرائع سے یہ جان کر کہ مسلم لیگ اس مسئلے پر اڑ گئی ہے اور 3/جون کو جناح اس کے ساتھ جو ملاقات کرنے والے ہیں اس میں وہ اسی نکتے پر دباؤ ڈالیں گے، ویول نے 3/جون کی صبح کو اپنی رائے میں تبدیلی کر کے ارکان مشن کو آگاہ کر دیا کہ گزشتہ روز (2/جون) کے نوٹ میں ایگزیکٹو کے بارے میں پیراگراف کو یوں پڑھا جائے: ''میں عبوری حکومت میں مسلم لیگی رہنماؤں کو مقرر کروں گا اور محکموں کا خاصا حصہ ان کو دوں گا۔ تاہم بلاشبہ وہ کونسل میں غالب حیثیت میں نہیں ہوں گے، وہ اقلیت ہی میں رہیں گے۔'' اس طرح ویول نے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ مان لیا کہ کانگرس کے انکار اور مسلم لیگ کے اقرار کی صورت میں ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ کے رہنماؤں کو شامل کیا جائے گا اور جناح کو یہ یقین دہانی کرانے سے پہلے اس نے مشن کے ارکان کو اس کی اطلاع دے دی۔

اس کے بعد 3/جون کو صبح دس بجے ویول کی جناح کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ جناح نے مذکورہ حالات پیدا ہونے کی صورت میں مسلم لیگ کے لیے یقین دہانی طلب کی۔ ویول نے کہا کہ ''میں گارنٹی کر سکتا ہوں کہ مسلم لیگ کو اس کا حصہ دیا جائے گا۔'' جناح نے کہا کہ اگر اس بارے میں تحریری طور پر یقین دہانی مل جائے تو میں اپنی مجلس عاملہ کے ساتھ سہولت سے بات کر سکوں گا جس کے ساتھ آج شام کو 6 بجے میری ملاقات طے ہے۔ اس پر ویول نے کہا کہ اس کے لیے مجھے مشن کے ارکان کے ساتھ مشورہ کرنا پڑے گا۔ چنانچہ 11 بجے ویول نے مشن کے ارکان کے ساتھ اجلاس میں یہ معاملہ اٹھایا۔ مشن کے ارکان نے بقول ویول ''مجھے اس امر کی اجازت دے دی کہ میں جناح کو زبانی طور پر یہ یقین دہانی کرادوں کہ اگر مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کر لیا تو ہم مسلم لیگ کے ساتھ مل کر کام کریں گے۔'' یعنی اسے حکومت میں لے لیں گے۔ بعد از دوپہر ویول نے مشن کے ارکان سے اس زبانی یقین دہانی کے مسودے کی بھی منظوری حاصل کر لی اور پھر سہ پہر 4 بجے ویول نے جناح کے ساتھ دوبارہ ملاقات کی اور انہیں فائل میں لگی ہوئی یہ تحریر پڑھنے کے لیے دی ''وزارتی مشن آپ کو تحریری یقین دہانی نہیں کرا سکتا کہ مجوزہ مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے

گا۔لیکن میں وزارتی مشن کی جانب سے آپ کو یہ ذاتی یقین دہانی کراتا ہوں کہ ہم کسی پارٹی کے ساتھ سلوک میں کوئی امتیاز روانہیں رکھیں گے اور یہ کہ اگر دونوں میں سے کسی ایک پارٹی نے بھی وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کرلیا تو جس قدر حالات اجازت دیں گے ہم اس منصوبہ پر عمل درآمد شروع کردیں گے۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ دونوں پارٹیاں اسے قبول کرلیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس یقین دہانی کو عام نہیں کریں گے اور اگر ضروری ہوا تو صرف اپنی مجلس عاملہ کو فقط یہ کہیں گے کہ آپ اس نکتے پر مطمئن ہیں۔''[4] اس کے بعد یہ تحریر فائل میں اٹھا کر رکھ دی گئی اور جناح نے شام کو مسلم لیگ مجلس عاملہ کے سامنے اس نکتے پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا اور مذکورہ یقین دہانی کی روشنی میں وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کے لیے ارکان مجلس عاملہ کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ 4/جون کو ویول نے تحریر کی ابتدائی سطر کہ ''وزارتی مشن آپ کو تحریری یقین دہانی نہیں کرا سکتا......'' حذف کر کے اس مقام سے کہ ''میں وزارتی مشن کی جانب سے آپ کو ذاتی یقین دہانی کراتا ہوں......'' آخر تک تمام تحریر کو اپنی جانب سے ایک مراسلے کی صورت میں جناح کو بھیج دیا۔[5] اس طرح ویول نے ذاتی حیثیت میں جناح کو تحریری یقین دہانی بھی بھیج دی کہ جس کی بنیاد پر جناح ارکان مسلم لیگ مجلس عاملہ اور کونسل کو مشن منصوبہ قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے تھے۔ جناح کی مشکل بہت حد تک آسان ہوگئی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد لیگ مجلس عاملہ و کونسل کے اجلاسوں کو خفیہ رکھا گیا تھا اور ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ البتہ انٹیلی جنس کی طرف سے وائسرائے کو جو رپورٹ بھیجی گئی اس کے مطابق جناح نے مجلس عاملہ اور کونسل دونوں کو اس امر سے آگاہ کیا کہ وائسرائے نے یقین دلایا ہے کہ اگر کانگرس نے مشن منصوبہ قبول نہ کیا تب بھی اس کی پرواہ نہیں کی جائے گی اور عبوری حکومت مسلم لیگ کے حوالے کر دی جائے گی اور مسلم لیگ کی پوری طرح حمایت کی جائے گی۔''[6] چنانچہ کونسل کے آخری اجلاس میں ووٹنگ سے پہلے جناح نے ایک طویل تقریر کی جس میں انہوں نے کہا ''میں نے آپ سے کرپس تجاویز (1942ء) رد کرنے کو کہا تھا، میں نے آپ سے شملہ کانفرنس فارمولا (1945ء) رد کرنے کے لیے بھی کہا تھا۔لیکن میں برطانوی وزارتی مشن کی تجاویز کو رد کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ اسے قبول کرلیا

جائے۔'' انہوں نے مزید کہا کہ'' قرارداد لاہور کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جوں ہی مسلمانوں نے یہ مطالبہ پیش کیا، اسے فوراً تسلیم کر لیا جائے گا۔ یہ ایک بڑی اور مسلسل جدوجہد ہے۔ پہلی جدوجہد یہ تھی کہ لیگ کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کروایا جائے۔ ہم نے یہ لڑائی لڑی اور جیتی۔ مشن منصوبہ قبول کرنے سے پاکستان کی جدوجہد کا خاتمہ نہیں ہوگا۔ آپ حصول پاکستان تک اس جدوجہد کو جاری رکھ سکتے ہیں۔''[7]

6 رجون کو رات گئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس قرارداد میں مشن کی جاری کردہ دستاویز کے ابتدائیہ میں مطالبہ پاکستان کے خلاف جو مؤقف اختیار کیا گیا تھا، اس کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی اور کہا گیا کہ'' ...... آل انڈیا مسلم لیگ اعادہ کرتی ہے کہ پوری طرح خودمختار پاکستان کے حصول کا مقصد اب بھی مسلمانان ہند کا ناقابل ترمیم نصب العین ہے۔ جس کے حصول کی خاطر اگر ضروری ہوا تو وہ اپنے بس میں سارے ذرائع بروئے کار لائیں گے اور کسی قربانی یا تکلیف کو خاطر میں نہ لائیں گے۔'' تاہم مشن منصوبہ قبول کرنے کی دو وجوہ بیان کی گئیں۔ اول یہ کہ ''مسائل بہت سنگین ہیں اور مسلم لیگ ان کے پرامن حل کی خواہاں ہے۔'' دوئم یہ کہ منصوبے میں پاکستان کے قیام کی بنیاد موجود ہے کیونکہ مسلم اکثریت کے چھ صوبوں کی دو گروپوں ب اور ج کی صورت میں لازمی گروپنگ کی گئی ہے۔ کونسل نے امید ظاہر کی کہ'' بالآخر یہ منصوبہ مکمل طور پر خودمختار پاکستان کے قیام پر منتج ہوگا۔''[8] اس طرح مسلم لیگ نے پاکستان کے نام پر وزارتی مشن منصوبہ قبول کر کے اگر مطالبہ پاکستان سے دستبرداری اختیار نہیں کی تھی تو کم از کم اس کے حصول کو دس سال کے لیے ملتوی ضرور کر دیا تھا کہ مجوزہ منصوبے میں دس سال کے بعد ہی آئین میں ترمیم ممکن تھی۔ ان حالات میں جب کہ مسلمان عوام الناس کی امنگیں آزاد پاکستان کے حصول کے لیے ولولہ انگیز تھیں، برصغیر ہند کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے جناح اور مسلم لیگ کی جانب سے اس سے بڑھ کر پرخلوص کاوش اور کیا ہو سکتی تھی؟ یہاں ایک جملہ معترضہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ مطالبہ پاکستان کا مقصد اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کا حصول تھا۔ کیا ہندو اکثریت کے ساتھ ایک مرکز میں رہنا قبول کر کے جو تجربہ کیا جا رہا تھا وہ اسلامی نظام کا تھا یا سیکولر نظام کا؟ یہ الگ بات ہے کہ کانگرس نے اس تجربے کو کامیاب نہ ہونے

دیا کہ آزادی سے پہلے اور بعد میں بھی اس جماعت نے کبھی سیکولر اصولوں پر عمل نہیں کیا، صرف ڈھونگ رچانے کی کوشش کی۔ اپنی اصل میں یہ جماعت کٹر ہندو تنظیم تھی۔

عبوری حکومت با اختیار ہو گی؟ ویول کی یقین دہانی۔ کانگرس اور ویول کا تضاد

کانگرس مجلس عاملہ نے 24 رمئی کو گروپوں کی بنیاد پر آئین سازی کے بارے میں خود اختراعی بیان جاری کرنے کے بعد وزارتی مشن کے مجوزہ طویل المیعاد منصوبے کو کھٹائی میں ڈال دینے کا بندوبست کر دیا اور پھر اپنی تمام تر کوشش قریب المیعاد منصوبے یعنی عبوری حکومت میں حصول اقتدار پر مرکوز کر دی۔ وہ پہلے تو 1935ء کے ایکٹ میں گورنر جنرل (وائسرائے) کو دیئے گئے اختیارات کو محدود کر کے ایگزیکٹو کونسل کے اختیارات میں اضافہ کرانا چاہتی تھی اور پھر با اقتدار ہو کر اپنی من مانی کارروائیوں کے ذریعے مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی خواہاں تھی۔ ہندو مسلم تضاد کے ایک ہزار سالہ پس منظر میں ہندو بورژوا کے عزائم بھی قابل فہم تھے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال میں جس وسیع و عریض برصغیر کو انگریزوں نے یکجا کیا تھا۔ ہندو بورژوا اس کا ایک انچ چھوڑے بغیر بلا شرکتِ غیرے اس تمام پر جلد از جلد قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی جانب پہلا قدم عبوری حکومت تھا۔

نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کا مختصر پس منظر یہ تھا کہ مئی کے اوائل میں جب شملہ میں وزارتی مشن اور وائسرائے دونوں جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کر رہے تھے، وائسرائے نے ارکان مشن کے لیے نئی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے معاملے پر ایک نوٹ لکھا جس میں کہا گیا کہ ''میں اس سلسلے میں سب سے پہلے کانگرس سے ملنا چاہتا ہوں......خواہ مذاکرات (مستقبل کے آئینی ڈھانچے سے متعلق) کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ نکلے اور خواہ مسلم لیگ اس میں شمولیت پر آمادہ ہو یا نہ ہو، میں ایگزیکٹو کونسل بہت جلد تشکیل دینا چاہتا ہوں۔'' اس سلسلے میں ویول نے بارہ محکموں کی فہرست تیار کی اور ان کو یوں تقسیم کیا کہ پانچ کانگرس (بشمول ایک اچھوت) پانچ مسلم لیگ ایک سکھ اور ایک کوئی اور جو اینگلو انڈین یا ہندوستانی عیسائی یا غیر لیگی مسلمان ہو سکتا تھا۔ ویول نے اس امکان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اگر کانگرس نے نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر اصرار کیا تو ''ذاکر حسین ایک قابل قبول شخص ہو سکتا ہے اور ضرورت

پڑنے پر تیرھویں رکن کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔"[9] 3رمئی کو ارکان مشن کے اجلاس نے ویول کے اس فارمولے کی تصدیق کر دی۔ اس موقع پر کرپس نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر مسلم لیگ نے شمولیت سے انکار کر دیا تو کیا لائحہ عمل ہو گا۔ اس پر ارکان مشن اور وائسرائے نے اتفاق کیا کہ اس صورت میں لیگ کے بغیر ہی ایگزیکٹو کونسل تشکیل دے دی جائے گی۔ مسلم لیگ کے کوٹے کی نشستوں کو دوسرے مسلمانوں سے پر کر دیا جائے گا۔"[10]

ویول نے اپنے پروگرام کے مطابق سب سے پہلے کانگرس کے ساتھ رابطہ کیا اور 8رمئی کو آزاد اور نہرو کے ساتھ ملاقات میں ان کو مجوزہ فارمولے کی تفصیلات سے آگاہ کیا۔ بعد ازاں ارکان مشن کے اجلاس کو اس ملاقات کے بارے میں آگاہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "جہاں تک کونسل کی ہیئت ترکیبی کا تعلق ہے، اس بات پر کوئی فوری ردعمل نہیں ہوا ہے کہ وائسرائے کی اس تجویز میں مسلم لیگ اور کانگرس کو برابری حاصل ہو گی۔"[11] اس نے اپنے روزنامچے میں بھی لکھا کہ "پھر ہم نے محکموں، ہیئت ترکیبی اور خوش اسلوبی سے ناموں کی فہرست وضع کرنے کے طریقۂ کار پر تبادلۂ خیال کیا۔ بحیثیت مجموعی یہ گفتگو بہت معقول رہی۔"[12] گویا مشن کے ساتھ شملہ مذاکرات ناکام ہونے سے پہلے تک کانگرس کو ہیئت ترکیبی پر کوئی اعتراض نہ ہوا جو مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین برابری پر مبنی تھی۔ 13رمئی کو جب کہ شملہ مذاکرات ناکام ہو چکے تھے، ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات میں ان کو ایگزیکٹو کے مجوزہ فارمولے کے بارے میں آگاہ کیا اور انہیں مشورہ دیا کہ "اگر کانگرس نے اسے قبول کر لیا تو مسلم لیگ کے لیے بہترین مشورہ یہ ہو گا کہ ایسے موافق تناسب کو فوراً قبول کر لے۔" جناح نے کہا کہ اس کا انحصار اس طویل المیعاد منصوبے پر ہو گا جو آپ اپنی دستاویز میں پیش کرنے جا رہے ہیں۔"[13]

14رمئی کو ویول اور نہرو کے مابین ایگزیکٹو کونسل کے معاملے پر ایک اور ملاقات ہوئی۔ شملہ مذاکرات کی ناکامی سے 8رمئی والی صورت حال برقرار نہیں رہی تھی۔ اس دوران کرپس اور پیتھک لارنس کی طرف سے درون خانہ کانگرس کو بعض یقین دہانیاں بھی کرائی جا چکی تھیں۔ ایک روز پیشتر یعنی 13رمئی کو نہرو پیتھک لارنس سے بھی ملا تھا۔ ویول اپنے روزنامچے (14رمئی) میں نہرو کے ساتھ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "میرا یہ خدشہ غلط نہیں بلکہ درست ہے کہ کل پیتھک لارنس نے واضح طور پر اسے یہ امید دلائی ہے کہ ہم پیریٹی کے معاملے پر

رعایت دے دیں گے اور قول وقرار کے ذریعے وائسرائے کے اختیارات کو محدود کر دیں گے اور اختیار اعلیٰ عبوری حکومت کو دے دیں گے۔میرا یقین ہے کہ ان دونوں معاملوں پر ہم بالکل صحیح رہتے اگر ہم شروع ہی سے ان پر پختہ اور قطعی رویہ اپنائے رکھتے لیکن پیتھک لارنس کے گول مول رویے اور کرپس کی طرف سے کانگرس کی مسلسل خوشامد اور چاپلوسی نے کانگرسی رہنماؤں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں''[14] اور پھر کانگرس کا رویہ بے لچک ہوتا چلا گیا۔

16رمئی کی وزارتی مشن کی دستاویز پر جناح کے 22رمئی کے بیان سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ لیگ اسے قبول کرنے پر مائل ہے،جس کا مطلب تھا کہ اب لیگ کا ایگزیکٹو میں آنا بھی یقینی ہے، چنانچہ کانگرس نے ایگزیکٹو کے معاملے میں مزید غیر مصالحانہ رویہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔ 24رمئی کو کانگرس مجلس عاملہ اپنی قرارداد میں گروپنگ پر اعتراضات اٹھا چکی تھی۔ 25رمئی کو نہرو نے ویول کے نام اپنے مراسلے میں لکھا''ہم میں سے کوئی بھی کسی ایسی حکومت یا کونسل میں شامل ہونے پر آمادہ نہیں ہے جس کی حیثیت موجودہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی سی ہو۔ہم صرف ایک عبوری قومی حکومت کے بارے میں ہی سوچ سکتے ہیں جو ایک آزاد حکومت کے طور پر کام کرے اور قانون ساز اسمبلی کو جواب دہ ہو۔اس حکومت یا کابینہ کو باہم مربوط اور ایک ٹیم کی طرح کام کرنے کا اہل ہونا چاہیے۔اس وقت جو کونسل تجویز کی گئی ہے اس میں انمل بے جوڑ افراد کو مجتمع کیا گیا ہے جو خواہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں،ٹیم کے طور پر کام نہیں کر سکتے۔اسی طرح پیریٹی کا اصول بھی ناگواری کا باعث ہے اور اس پر بھی سخت برہمی کا اظہار کیا جائے گا۔''[15] گویا یہاں''باہم مربوط''اور''ٹیم'' سے مراد یہ تھی کہ ایک ہی پارٹی جو کہ کانگرس ہی ہو سکتی تھی، پر مشتمل ایگزیکٹو بنائی جائے۔مزید یہ کہ اس میں انمل بے جوڑ یعنی مسلم لیگ اور کانگرس کے ارکان مجتمع نہیں ہو سکتے۔گویا لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت نہیں بنائی جا سکتی اور اگر ایسا ناگزیر ہی ہو تو پھر پیریٹی کا اصول نہیں ہونا چاہیے۔یعنی کانگرس کے زیادہ اور لیگ کے ارکان کم لیے جائیں۔

اسی روز کانگرس کے کٹھ پتلی صدر آزاد کی جانب سے بھی دو مراسلے ویول کو بھیجے گئے، ایک اس کی سرکاری حیثیت میں اور دوسرا ذاتی حیثیت میں لکھا گیا تھا۔اول الذکر خط میں اس

نے کانگرس کے ان مطالبوں کو دہرایا تھا کہ ایگزیکٹوکونسل کو بااختیار ہونا چاہیے اور صرف مرکزی اسمبلی کے سامنے جواب دہ ہونا چاہیے۔ مؤخر الذکر خط میں اس نے ذاتی طور پر ویول سے یہ درخواست کی تھی کہ ایگزیکٹوکونسل کے بارے میں کانگرس کے مطالبات کوتسلیم کرلیا جائے۔ اس نے لکھا تھا ''آپ تو واقف ہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے ہند۔ برطانیہ مسئلے کے پرامن اور باوقار حل کے لیے ہمیشہ گفت وشنید کے ذرائع اختیار کیے ہیں۔ میرے خیال میں یہ دونوں ملکوں کے باہمی مفاد میں ہوگا کہ انتقال اقتدار کا معاملہ بغیر تشدد اور بحران پیدا کئے طے ہوجائے۔ میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ کانگرس مجلس عاملہ کے اندر اور باہر ایسے عناصر موجود ہیں جو اس معاملے کو کسی اور طرح دیکھتے ہیں اور پرتشدد طریقے کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود میں نے مجلس عاملہ کو وزارتی مشن کی تجاویز پر اپنے نقطۂ نگاہ سے غور کرنے پر آمادہ کرلیا ہے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ وزارتی مشن کا جس دوستانہ طریقے سے خیر مقدم کیا گیا ہے اور اس کی تجاویز کو زیر غور لایا گیا ہے اس میں زیادہ تر میرے مصالحانہ رویے کو دخل ہے۔ جسے اختیار کرنے کے لیے میں نے مجلس عاملہ کو آمادہ کیا۔ میری درخواست ہے کہ میں نے جو خط سرکاری طور پر آپ کو بھیجا ہے اس کا جواب دیتے ہوئے آپ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیں گے۔''[16] دراصل آزاد کی خواہش یہ تھی کہ ایگزیکٹو کے مسئلے پر کوئی ایسا جھگڑا پیدا نہ ہوجائے کہ کانگرس کا انتہاپسند عنصر مشن کے مجوزہ طویل المیعاد منصوبے کو رد کرنے کا جواز بنالے۔ آزاد کی مشکل یہ تھی کہ وہ خلوص دل سے متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل چاہتا تھا اور اس کی رائے میں وزارتی مشن منصوبے نے اس کا بہترین حل پیش کیا تھا۔

مئی کے اواخر میں جب ''دیکھو اور انتظار کرو'' کے ارادے سے کانگرس مجلس عاملہ کے ارکان نے لیگ کی کونسل کے فیصلے تک دہلی سے منتشر ہونے کا فیصلہ کیا تو آزاد مسوری چلا گیا وہ لکھتا ہے کہ ''مسوری میں قیام کے دوران مسلم لیگ کے بعض ارکان کی میرے ساتھ ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی بوکھلاہٹ اور حیرانی کا اظہار کیا اور صاف کہا کہ اگر لیگ وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کے لیے تیار ہے تو پھر اس نے آزاد مملکت کے لیے اس قدر شور کیوں مچایا اور مسلمانوں کو گمراہ کیوں کیا؟ میں نے ان کے ساتھ اس معاملے پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی۔

آخر میں وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ مسلم لیگ کا نقطۂ نظر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، مسلمانان ہند اس سے بہتر حل کی توقع نہیں کر سکتے جو کہ وزارتی مشن منصوبہ میں پیش کیا گیا ہے۔''[17] چنانچہ آزاد اس ''بہترین حل'' کی خاطر یہ نہیں چاہتا تھا کہ کانگرس کے انتہا پسند ایگزیکٹو کونسل کے مسئلے پر مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جائیں اور اصل معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے۔ لیکن وہ برخود غلط آدمی تھا جیسا کہ اس کے ویول کے نام خط سے بھی ظاہر ہے۔ اسے یہ احساس نہیں تھا کہ ہندو بورژوا نے اسے محض ''شو بوائے'' کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہندو بورژوا کے اصل عزائم کیا ہیں اور کانگرس کی حقیقی قیادت کرپس اور پیتھک لارنس کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے بالا ہی بالا کس سمت میں جا رہی ہے۔ کانگرس کی حقیقی قیادت نے اس کے نزدیک ''مسلمانان ہند کے لیے سب سے بہتر حل'' کو سبوتاژ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ کانگرس کے انتہا پسندوں سے اسے بجا طور پر خدشہ لاحق تھا۔ جو ایگزیکٹو کونسل کے معاملے کو تشدد تک لے جانا چاہتے تھے۔

کانگرس کی حقیقی قیادت یعنی باپو کے نزدیک بھی اصل اہمیت ایگزیکٹو کونسل کو حاصل تھی۔ اس نے اپنے اخبار ہریجن کے لیے ایک مضمون میں، جس کی ایڈوانس کاپی 26 مئی کو مشن کے ارکان کو بھیجی گئی، اس میں اس نے کہا کہ مشن کو چاہیے تھا کہ وہ پہلے مرکزی حکومت تشکیل کرتا اور پھر دستاویز جاری کرتا، لیکن اس نے الٹ کیا ہے، دستاویز پہلے جاری کر دی ہے اور اب عبوری حکومت کی تشکیل کی جا رہی ہے۔[18] چنانچہ یہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ ہندو بورژوا فرقہ وارانہ مسئلے کے طویل المیعاد حل کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش مرکزی اقتدار پر بلاشرکت غیرے قبضہ کرنا تھی۔ پیتھک لارنس نے وزیراعظم ایٹلی کو 26 مئی کو اپنے مراسلے کے ذریعے مطلع کیا کہ ''فی الحقیقت کانگرسی رہنما تقریباً اقتدار مطلق کے خواہاں ہیں اور وہ اس بارے میں اپنے لوگوں کو کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ جناح نہ صرف یہ کہ وائسرائے کے اختیار کا خاتمہ نہیں چاہتا بلکہ وہ بالضرور چاہتا ہے کہ اسے یہ اختیار حاصل رہے۔''[19] اس لیے کہ ہندو بورژوا کے غلبے کی زد میں آنے سے بچنے کی کوئی امید مسلمانانِ ہند کے لیے اگر باقی تھی تو وہ اس عبوری دور میں انگریز حکومت ہی سے تھی اور اسی لیے وہ انگریزوں کے انتقال اقتدار سے پہلے اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ آزاد ملک کی صورت میں یا کسی اور طرح!

25/مئی کے وضاحتی بیان میں مشن نے کانگرس پر واضح کر دیا تھا کہ عبوری دور کی ایگزیکٹوکونسل مرکزی اسمبلی کو جواب دہ نہیں ہوگی اور یہ کہ موجودہ آئین یعنی 1935ء کا ایکٹ بدستور نافذ العمل رہے گا۔ تاہم آزاد کے مراسلوں کے جواب میں 30/مئی کو ویول نے آزاد کے نام مراسلے کے ذریعے کانگرس کو یہ یقین دہانی کر دی کہ...... ''حکومت برطانیہ نئی عبوری حکومت کے ساتھ برتاؤ میں اسے ویسی ہی بھرپور مشاورت اور اہمیت دے گی، جیسی کہ وہ ایک ڈومینین حکومت کو دیتی ہے۔ حکومت برطانیہ پہلے ہی یہ کہہ چکی ہے کہ وہ ہندوستانی حکومت کو ملک کا روزمرہ کاروبار چلانے میں ہر ممکن آزادی دے گی۔ چنانچہ میری طرف سے اب آپ کو یہ یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں خلوص نیت کے ساتھ اس عہد کا پاس کروں گا۔''[20] گویا بغیر آئینی ترمیم کے اتنی رعایت ضرور دے دی گئی تھی کہ عبوری دور کی حکومت میں ایگزیکٹو گذشتہ دور کی ایگزیکٹو کے مقابلے میں بہت زیادہ بااختیار ہوگی۔ کرپس اور پیتھک لارنس کی جانب سے خفیہ یقین دہانیاں علیحدہ تھیں۔ اس معاملے پر 3/جون کو ویول اور ان دونوں حضرات کے مابین نوبت تلخ کلامی تک بھی جا پہنچی تھی۔[21] ویول کی اس یقین دہانی کے بارے میں وی۔ پی مینن لکھتا ہے کہ ''جس خیال کے پیش نظر وائسرائے نے یہ یقین دہانی کرائی تھی اس کی بنیاد وہ تاثر تھا جو اسے آزاد سے ملا تھا کہ اگر ایک مرتبہ عبوری حکومت کی حیثیت اور اختیار کا مسئلہ کانگرس کی تسلی کے مطابق طے پا جائے تو پھر کابینہ کی ہیئت ترکیبی کے معاملے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔''[22] لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ ویول کا یہ تاثر صحیح نہیں تھا۔ ہندو بورژوا اس ایگزیکٹوکونسل پر بلاشرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جون کے اوائل میں وائسرائے نے مشن کی اجازت سے جناح کو جو خفیہ یقین دہانی کرائی تھی وہ خفیہ نہ رہ سکی۔

عبوری حکومت میں پیریٹی کے مسئلے پر کانگرس اور لیگ کا تضاد، کانگرس کو رعایت دے دی گئی

مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے کا اعلان کیا تو یہ پہلے ہی سب کو معلوم تھا کہ اب ایگزیکٹوکونسل میں مسلم لیگ کے لیے مخصوص پانچ نشستوں پر اس کا قبضہ پکا ہو گیا ہے۔ خواہ کانگرس منصوبہ قبول کرے خواہ رد کرے۔ چنانچہ کانگرس کے لیے یہ بات کہ لیگ حکومت میں

ہواور کانگرس یا تو حکومت سے باہر ہو اور اگر حکومت میں ہو تو لیگ کے ہم پلہ یعنی پانچ نشستوں ہی پر قابض ہو، ایک ایسی بات تھی جسے ہندو بورژوا برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ کانگرسی پریس بلبلا اٹھا اور مجوزہ ایگزیکٹو میں لیگ۔ کانگرس پیریٹی کے مسئلہ پر ایک طوفان کھڑا کردیا گیا۔

6 رجون کو ہندو بورژوازی کے ستون گھنشام داس بِرلا نے وزارتی مشن کے سیکرٹری اور پیتھک لارنس کے معاون ایف۔ ایف۔ ٹرنبل کو اپنے ہاں لنچ پر بلایا۔ بِرلا کے ساتھ اپنی گفتگو پر مبنی نوٹ میں ٹرنبل لکھتا ہے کہ ''گفتگو کے آغاز ہی میں برلا نے عبوری حکومت کا موضوع چھیڑ دیا۔ اس نے کہا کہ جناح کے اس بیان نے مجھے پریشان کردیا ہے کہ وہ عبوری ایگزیکٹو کونسل میں مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین پیریٹی (برابری) پر اصرار کرے گا۔ برلا نے اپنے یقین کا اظہار کیا کہ کانگرس اس پر اتفاق نہیں کرے گی۔ ان کے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ عبوری حکومت میں ''اقلیت'' میں رہنا قبول کریں۔ اس پر میں (یعنی ٹرنبل) نے کہا کہ 1945ء کی شملہ کانفرنس میں کانگرس پیریٹی کو قبول کرنے پر تقریباً آمادہ ہوگئی تھی۔ مسٹر برلا نے کہا کہ اس وقت صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت جنگ سے نبٹنے کے لیے ایک ہنگامی حکومت تشکیل دی جارہی تھی جب کہ اب ہم آئین سازی کے عبوری عرصے کے لیے حکومت وضع کررہے ہیں۔ علاوہ ازیں انتخابات ہوچکے ہیں۔ جن میں کانگرس نے عمومی نشستوں پر بھاری اکثریت حاصل کی ہے۔'' اس کے بعد برلا اور ٹرنبل کے مابین کچھ دلائل کا تبادلہ ہوا لیکن برلا ''اس پر اڑا رہا کہ پیریٹی قابل قبول نہیں ہوگی۔''[23] اسی روز اس مضمون پر مبنی ایک خط برلا نے سٹیفورڈ کرپس کو بھی تحریر کیا۔

اگلے روز پیتھک لارنس اور ویول کے مابین برلا کے مذکورہ خیالات کے بارے میں بات ہوئی تو ویول نے کہا کہ ہمیں پیریٹی کے معاملے میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔[24] لیکن ساتھ ہی اس نے اپنے 6 رجون کے روزنامچے میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''اصل جنگ اب شروع ہوئی ہے اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آیا مشن کانگرس کے مقابلے میں ثابت قدم رہ سکے گا یا نہیں۔ عبوری حکومت میں پیریٹی سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ کرپس اور پیتھک لارنس اس قدر زیادہ حد تک قول وقرار کرچکے ہوئے ہیں کہ اب وہ نہ تو اس قابل ہیں اور نہ ہی وہ چاہتے ہیں کہ کانگرس کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں۔''[25] گویا

ہندو بورژوازی کے ستونوں کے سامنے زوال پذیر برطانوی سامراج کا ثابت قدم رہنا اب ذرا مشکل بات تھی۔ ہندو بورژوازی کا دوسرا اہم ستون ٹاٹا بھی سرگرم عمل تھا۔ ٹاٹا کا ایک ملازم سدھیر گھوش گاندھی اور ارکان مشن کے مابین رابطے کا کام کرتا تھا۔ انہی دنوں ویول کو آئین سازی پر ایک قانونی مشیر کی ضرورت تھی جس کے لیے پیتھک لارنس نے 7/جون کو سدھیر گھوش کا نام تجویز کیا مگر ویول نے اسے قبول نہیں کیا۔[26] اگلے صفحات میں سدھیر گھوش کی سرگرمیوں کا ذکر آئے گا۔

لیگ کی طرف سے وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کے بعد 7/جون کو جناح نے ویول کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح نے کہا کہ میں عبوری حکومت میں 5:5:2 کے تناسب پر اصرار کروں گا اور کسی اور تناسب کو قبول نہیں کروں گا۔ جناح نے ویول کو یاددہانی کرائی کہ آپ اس بارے میں مجھے یقین دہانی کرا چکے ہیں۔ ویول لکھتا ہے ''میں نے جواب میں کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، حالانکہ میں خود ابھی تک اسی فارمولے پر کام کر رہا تھا''[27] جناح نے خود اپنے لیے دفاع کا محکمہ طلب کیا تھا۔ اس کے علاوہ لیگ کے کوٹے کے باقی محکموں میں خارجہ امور اور منصوبہ بندی و ترقیات کے محکموں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ 8/جون کو جناح نے ویول کے نام مراسلے میں لکھا کہ شملہ کی بات چیت سے لے کر 3/جون کو دہلی میں ہونے والی بات چیت تک، مجھے آپ نے 5:5:2 کے تناسب کے متعلق یقین دہانی کرائی تھی اور یہ بھی طے ہوا تھا کہ اہم محکمے دونوں پارٹیوں کے مابین تقسیم کئے جائیں گے۔ ''آپ کی اجازت سے میں نے مجلس عاملہ کو آپ کی یقین دہانی کے بارے میں آگاہ کیا تھا اور یہی چیز وزارتی مشن منصوبہ کو قبول کرنے میں سب سے اہم سبب بنی تھی۔ یہ دونوں باتیں مل کر ایک بات بنی تھی جس کے نتیجے میں 6/جون کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اپنا حتمی فیصلہ دیا تھا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کونسل کی حتمی منظوری سے قبل بھی میں نے کونسل کے سامنے آپ کی کرائی ہوئی یقین دہانی کا اعادہ کیا تھا...... اگر یہ یقین دہانی نہ ہوتی تو ہم اس سکیم پر کونسل کی منظوری کبھی حاصل نہ کر سکتے تھے۔'' جناح نے مزید لکھا کہ کانگرس کے پریس نے آپ کے مذکورہ مجوزہ فارمولے پر ایک طوفان کھڑا کر دیا ہے اور ''اگر آپ نے بالواسطہ یا بلا واسطہ، اس فارمولے سے انحراف کیا تو اس کے بڑے سنگین نتائج برآمد ہوں گے اور پھر مسلم لیگ تعاون نہیں کرے گی۔''[28]

8/جون کو وائسرائے اور ارکان مشن کا باہم اجلاس ہوا جس میں ویول نے جناح کے مؤقف سے ارکان مشن کو آگاہ کیا۔ ویول نے اپنے اس مؤقف کا بھی اعادہ کیا کہ 2:5:5 کے تناسب کی پابندی کرنی چاہیے کہ یہ ہی کسی تصفیے کی امید افزا بنیاد بن سکتا ہے۔ تاہم اس نے کہا کہ میں نے مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کو یہی کہا ہے کہ میں اس فارمولے کی بنیاد پر کام کر رہا ہوں۔ لیکن میں نے اس بارے میں جناح کو بھی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی ہے کہ ایسا ضرور ہی ہو گا۔ اس نے جناح کے مذکورہ خط کا حوالہ بھی دیا۔ جس پر پیتھک لارنس نے کہا کہ جناح کو مطلع کر دینا ضروری ہوگا کہ اس قسم کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی ہے [29] اور پھر 9/جون کو ویول نے جناح کو لکھا کہ ''آپ نے 2:5:5 کے تناسب کے بارے میں یقین دہانی کا ذکر کیا ہے۔ اس نکتے پر کوئی یقین دہانی نہیں کرائی گئی ہے۔ میں نے آپ کو اور کانگرس کو یہی کہا ہے کہ یہ تناسب میرے ذہن میں موجود ہے'' [30] اور 8/جون کو پیتھک لارنس نے ایٹلی کے نام مراسلے میں بھی لکھا کہ ''ویول نے کانگرس پر زور دیا ہے کہ وہ پیریٹی کو قبول کر لے لیکن جناح کے ساتھ بھی کوئی حتمی وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ تصفیے کی خاطر تھوڑا بہت ردو بدل بھی کیا جا سکتا ہے۔'' [31] گویا ہندو بورژوا کے زبردست دباؤ کے سامنے اب ویول بھی ثابت قدم نہیں رہا تھا۔

10/جون کو آزاد اور نہرو نے ویول اور مشن کے ارکان کے ساتھ اکٹھے ملاقات کی۔ ایگزیکٹو کونسل کا مجوزہ فارمولا 2:5:5 زیر بحث رہا۔ ویول اور ارکان مشن نے اس فارمولے کے حق میں دلائل دیئے اور ان دونوں رہنماؤں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ پیریٹی کا اصول ہمیشہ کے لئے رواج نہیں بن جائے گا۔ اسے عارضی طور پر ایک قرین مصلحت تدبیر کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے۔ آزاد نے کہا کہ یہ ایک باہم مربوط حکومت نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ تعطل پیدا کرنے کی کوشش کرے گی تاکہ پاکستان کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔ نہرو نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ ''عبوری حکومت کے اثرات آئین ساز ادارے پر پڑیں گے۔ کانگرس ایک مضبوط مرکز کے لیے کام کرے گی اور گروپ سسٹم کا خاتمہ کرے گی اور اس میں کامیاب ہوگی۔ جناح کی اس ملک میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مسلم لیگ اور کانگرس آئین ساز ادارے کے متعلق بالکل مختلف آراء کی حامل ہیں۔ چنانچہ عبوری حکومت کا اختلافات کا شکار ہونا ناگزیر ہوگا۔'' اس پر اے۔ وی۔ الیگزینڈر نے کہا کہ جناح نے وزارتی مشن منصوبہ قبول کر کے کڑوی گولی نگلی ہے۔ اگر

ہندوستان کا مسئلہ حل کرنا ہے تو مل جل کر کام کرنا پڑے گا۔ اس کے بغیر اور کوئی طریقہ ہی نہیں ہے کہ دس کروڑ کی مسلمان آبادی متحدہ ہند میں خود کو ضم کر دے جس کی اکثریت نے حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کی حمایت کی ہے۔ نہرو نے کہا کہ ''کانگرس کے لیے تو پیریٹی کے معاملے پر غور کرنا بھی محال ہے کیونکہ اس کے حامیوں میں اس پر شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔ اس معاملے پر ہماری تنظیم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔'' کافی دیر تک یہ بحث جاری رہی لیکن کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بالآخر نہرو نے کہا کہ ہم نے اپنی مجلس عاملہ کو جا کر بتانا ہے کہ آپ کی حتمی رائے کیا ہے۔ چنانچہ مشن اور وائسرائے نے کہا کہ آپ بتا دیں کہ مشن کی رائے میں پیریٹی لازم ہے۔ تاہم رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے کانگرس کی جانب سے پندرہ رکنی ایگزیکٹو کونسل کا مطالبہ کر دیا جس میں مجوزہ کونسل میں ایک اچھوت، ایک نیشنلسٹ مسلمان اور ایک ہندوستانی عیسائی کا اضافہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ کانگرس کی مخصوص پانچ نشستوں میں ایک اچھوت کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جس سے اونچی ذات کے ہندوؤں کی نشستوں کی تعداد کم ہوگئی ہے حالانکہ وہ ملک کی سب سے بڑی آبادی ہیں۔ [32] اگر ہندو بورژوا کو برصغیر کے اتحاد کے تمام تر فوائد حاصل کرنے ہی تھے تو پھر اقلیتوں اور بالخصوص بڑی اقلیت مسلمانوں کے ساتھ فراخدلانہ برتاؤ ناگزیر تھا اور پیریٹی کا اصول اس کی ایک ایسی صورت تھی جو ایسی ہی صورت حال میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں اختیار کی جا چکی تھی اور اکثریت۔ اقلیت تضاد کے حل کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ لیکن تاریخی وجوہ کی بناء پر ہندو بورژوا میں یہ فراخدلی موجود نہیں تھی۔ وہ دس کروڑ مسلمانوں کے نمائندے جناح کی ہندوستان میں کوئی حیثیت ہی نہیں سمجھتا تھا۔

کرپس کے معاون وڈرووائٹ نے 9رجون کو گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ خود گاندھی نے سدھیر گھوش کے ذریعے وڈرووائٹ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ملاقات میں گاندھی نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ انگریزوں کو پیریٹی کے معاملے پر زور نہیں دینا چاہیے۔ اگر انگریزوں نے اس پر اصرار کیا تو میں ان سے کہوں گا کہ وہ اپنی حکومت خود ہی چلائیں، کانگرس اس میں شامل نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس یہ معاملہ نہرو اور جناح پر چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ باہم مل کر عبوری حکومت کے ارکان کا فیصلہ کر لیں۔ ممکن ہے وہ جس فہرست پر متفق ہوں اس میں پیریٹی موجود

ہو۔[33] وائٹ نے اس ملاقات کی تفصیل پر مبنی نوٹ 10 ؍جون کو بنا کر پیش کیا۔ اس دوران آزاد اور نہرو مشن کے ارکان اور وائسرائے پر کانگرس کا مؤقف واضح کر چکے تھے۔

مسیحی امن پسند ''انجمن احباب'' سے تعلق رکھنے والی برطانوی خاتون مس اگاتھا ہیریسن گاندھی اور پیتھک لارنس کے مابین رابطے کا کام کر رہی تھی اور بقول ویول، پیتھک لارنس اور مس ہیریسن روز صبح کی سیر پر اکٹھے جایا کرتے تھے۔[34] 11؍جون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے باہم اجلاس کے لیے جمع ہوئے تو پیتھک لارنس اور کرپس نے اطلاع دی کہ مس ہیریسن اور سدھیر گھوش سے یہ معلوم ہوا ہے کہ گاندھی اپنا پورا زور پیریٹی کے خلاف صرف کر رہا ہے اور اس صورت حال کے تدارک کی کوئی امید اسی میں ہے کہ گاندھی کے ساتھ ملاقات کی جائے۔ پیتھک لارنس نے مؤقف اختیار کیا کہ ہمیں پیریٹی پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ ہم اس کے پابند نہیں ہیں اگر اس مسئلہ پر بریک ڈاؤن ہو گیا تو ہم نہ ہندوستان میں اور نہ ہی اپنے ملک میں اس مؤقف پر اڑے رہنے کا جواز مہیا کر پائیں گے۔ کرپس نے بھی کہا کہ ہمیں متبادل بنیادیں تلاش کرنی چاہئیں۔ ویول نے سوال اٹھایا کہ گاندھی کے ساتھ ملاقات کرنی چاہیے یا نہیں۔ کرپس نے کہا کہ ہمیں گاندھی سے ضرور ملنا چاہیے۔ اس موقع پر مشن کا تیسرا رکن اے۔ وی۔ الیگزینڈر برافروختہ ہو گیا اور کہنے لگا ''میں گاندھی سے ملاقات کا سختی سے مخالف ہوں۔ اگر ایسا کیا گیا تو میں کل ہی وطن واپس لوٹ جاؤں گا۔'' اس کا مؤقف یہ تھا کہ اگر گاندھی سے ملنا بہت ضروری ہے تو پھر مشن کے ارکان اور وائسرائے اکٹھے اس کے ساتھ ملاقات کریں اور نوٹس لیے جائیں۔[35] اس نے گویا پیتھک لارنس اور کرپس کی گاندھی کے ساتھ گذشتہ ملاقاتوں پر بداعتمادی کا کھلا اظہار کیا تھا اور یوں ان دونوں کے ساتھ اس کے اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔

اے۔ وی۔ الیگزینڈر بھی لیبر پارٹی سے تعلق رکھتا تھا اور جب وہ یہاں آیا تھا تو گاندھی اور کانگرس کے بارے میں بہتر رائے رکھتا تھا لیکن ہندو بورژوا کی منافقانہ روش اور اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف سے اس منافقت میں شراکت اسے بہت ناگوار گزری تھی۔ اس تلخی کے بعد اجلاس نے فیصلہ کیا کہ صرف ویول گاندھی کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ چنانچہ اسی روز ویول نے گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ ان کے مابین طے پایا کہ نہرو اور جناح کو بلا کر

ایک کمرے میں بٹھا دیا جائے اور وہ پیریٹی کو بالائے طاق رکھ کر صرف اہلیت کی بناء پر ایگزیکٹو کے ارکان کی فہرست مرتب کریں اور جب تک وہ یہ کام مکمل نہ کر لیں ان کو کمرے سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ ارکان کا انتخاب کرتے وقت نہ پیریٹی کا لحاظ کیا جائے، نہ یہ دیکھا جائے کہ تعلق لیگ سے یا کانگرس سے یا کسی سے بھی ہے، صرف یہ دیکھا جائے کہ وہ بہترین دستیاب افراد ہیں۔'' لیکن اس کے ساتھ ساتھ گاندھی کی رائے یہ تھی کہ ''اگر ان کے مابین تصفیہ نہ ہو سکے تو پھر وائسرائے ان دونوں کی الگ الگ مجوزہ فہرستوں کا اہلیت کی بنا پر جائزہ لے کر کسی ایک فہرست کا انتخاب کر لے، دونوں فہرستوں کو ملا کر ملغوبہ مت بنائے۔''[36] گاندھی کو معلوم تھا کہ نہرو، جناح سمجھوتہ عبث ہے۔ وہ لامحالہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مخلوط حکومت نہیں بن سکتی۔ قابلیت اور اہلیت کی بنیاد پر وضع کردہ کانگرس کی فہرست وائسرائے کو کاروبار حکومت چلانے کے لیے زیادہ قابل قبول نظر آئے گی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی عمومی معاشرتی پس ماندگی کی وجہ سے قحط الرجال کا شکار تھی۔ اس طرح کانگرس کی بلاشرکت غیرے اقتدار پر قبضے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ اس لیے اس ملاقات پر اپنا تاثر رقم کرتے ہوئے ویول نے گاندھی کے بارے لکھا ''اس کی تہہ کو پہنچنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ اس کا ذہن کس طرح کام کر رہا ہے۔''[37]

اسی روز وڈرووائٹ نے جناح کے ساتھ ملاقات کی۔ جناح نے اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی کہ لیگ قحط الرجال کا شکار ہے اور اس کے لیے اس اہلیت کے افراد پیش کرنا مشکل ہے جو کہ عبوری دور میں ایگزیکٹو کو درپیش مسائل نبٹانے کے قابل ہوں گے اور وزارتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ جناح نے کہا کہ ''میں ایسے افراد کو نامزد نہیں کروں گا جو مسلم لیگ میں مقبول اور شہرت یافتہ تو ہوں لیکن کام نہ کر سکتے ہوں۔ میرے پاس بہت سے قابل افراد سول سروس میں موجود ہیں، میں ان میں سے بعض کو لے آؤں گا خواہ کبھی کسی نے ان کا نام بھی نہ سنا ہو گا۔ اصل معاملہ صحیح کام کے لیے صحیح آدمی حاصل کرنے کا ہے۔'' اسی ملاقات کے دوران جناح نے وائٹ کو پیریٹی کے معاملے پر اپنی ثابت قدمی جتاتے ہوئے کہا کہ میں اس معاملے پر کسی سے بات چیت کرنے پر آمادہ نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ''میں نے مجلس عاملہ اور کونسل کو یہ یقین دلا کر کہ ایگزیکٹو میں لیگ اور کانگرس کو پیریٹی حاصل ہو گی، مشن منصوبہ قبول کرنے پر آمادہ کیا تھا، اب میں اس سے منحرف نہیں ہو سکتا۔ میں خود اپنا مالک

نہیں ہوں۔'' انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نہرو یا کانگرس کے کسی فرد کے ساتھ عبوری حکومت پر بات چیت کرنے کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہوں جب تک کانگرس وزارتی مشن منصوبہ منظور نہیں کر لیتی اور وہ بھی پیریٹی کی بنیاد پر ہو گی جس میں صرف نام اور محکمے زیر بحث آ سکیں گے۔[38] اسی روز شام کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے فیصلہ کیا کہ کرپس جناح کے ساتھ ملاقات کر کے نہرو کے ساتھ ملاقات کرنے پر آمادہ کرے۔ چنانچہ اسی رات کو کرپس نے جناح سے ملاقات کی۔ جناح نے انہی خیالات کا اظہار کیا جو دن میں وڈرو وائٹ کے ساتھ کر چکے تھے۔ انھوں نے کرپس کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ''یہ ضروری نہیں کہ مسلم لیگ مجلس عاملہ کے ارکان کو حکومت میں لایا جائے، میں نوجوانوں کو اس میں لے آؤں گا اور یہ کہ ہم حکومت میں آ کر غیر فرقہ وارانہ جذبے کے ساتھ پورے ہندوستان کی فلاح کے لیے کام کریں گے۔خود اپنے لیے انھوں نے دفاع کا محکمہ طلب کیا تھا۔ پیریٹی کے معاملے میں ان کے مؤقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔''[39]

12 رجون کی صبح کو وائسرائے نے مشن کے ارکان کے فیصلے کے مطابق جناح اور نہرو کو اسی روز شام کو اکٹھے ملاقات کی دعوت دے دی۔ جناح نے اپنے مذکورہ مؤقف کی روشنی میں جواب دے دیا کہ میں نہرو یا کسی اور کانگرسی رہنما کے ساتھ ملاقات نہیں کروں گا تا آنکہ کانگرس 16 رمئی کے مشن منصوبہ کو قبول نہیں کر لیتی۔ ادھر گاندھی، جس نے کل خود ہی جناح، نہرو ملاقات کا فارمولا ویول کے ساتھ طے کیا تھا، اب بدل چکا تھا۔ ویول نے گذشتہ روز کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے روزنامچے میں لکھا تھا کہ '' گاندھی نے جناح کی نہرو کے ساتھ ملاقات پر اتفاق کیا تھا کیونکہ اسے جناح کی آزاد کے ساتھ ملاقات کی مشکل کے بارے میں احساس تھا۔[40] پیارے لال نے بھی لکھا ہے کہ '' گاندھی جی نے کانگرس کو مشورہ دیا کہ تصفیے کی خاطر یہ بات مان لینی چاہیے بشرطیکہ یہ واضح کر دیا جائے کہ پنڈت نہرو مولانا صاحب کے ماؤتھ پیس کی حیثیت سے ملنے آیا ہے۔''[41] لیکن خود گاندھی نے 12 رجون کو جو خط ویول کو لکھا اس میں اس کے برعکس معاملہ تھا۔ اس نے کانگرس مجلس عاملہ کے ساتھ اس ضمن میں اپنی بات چیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ '' کانگرس والوں کے لیے یہ وقار کا مسئلہ ہے کہ کوئی بھی مشترکہ مذاکرات منعقد نہیں ہو سکتے جب تک مولانا صاحب کو ان میں شامل نہ کیا جائے۔ آپ

(ویول) نے کہا تھا کہ یہ قائداعظم جناح کی دکھتی رگ ہیں اور میں نے آپ کو یہ جواب دیا تھا کہ اس دکھتی رگ کا کوئی جواز نہیں ہے اور یہ کہ کانگرس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے پچیس سال پرانے بااعتماد خادم کو جس کا ایثار اور خلوص ہمیشہ شک وشبہ سے بالاتر رہا ہو، قربان کر دے۔لیکن میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا نازک معاملات کو نبٹانے کا وسیع تجربہ اس مشکل سے نکلنے کی راہ سمجھا دے گا''[42] اور پھر اس کے پیچھے پیچھے نہرو کا جوابی مراسلہ بھی ویول کو پہنچ گیا۔جس میں لکھا گیا تھا ''میں کسی بھی وقت آپ سے بخوشی ملنے کو تیار ہوں لیکن اس قسم کے معاملات میں ہمارے سرکاری ترجمان ہمارے صدر مولانا آزاد ہیں۔ وہ ہی بااختیار ہو کر بات چیت اور مذاکرات کر سکتے ہیں، جو کہ میں نہیں کرسکتا۔ اس لیے مناسب یہی ہوگا کہ کسی بھی بااختیار مذاکرات میں ہماری جانب سے وہ ہی قیادت کریں۔لیکن چونکہ آپ نے بلایا ہے اس لیے میں آ جاؤں گا......مگر میں بغیر کسی اختیار کے بات کروں گا جو صرف ہمارے صدر اور مجلس عاملہ کو حاصل ہے۔''[43]

چنانچہ ان حالات میں اگر جناح، نہرو ملاقات ہو بھی جاتی اور ایگزیکٹو کے ارکان کی کسی متفقہ فہرست پر فیصلہ ہو بھی جاتا تو اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ پیارے لال کی بددیانتی خود گاندھی اور نہرو کے مذکورہ خطوط سے عیاں ہو جاتی ہے جن کا اس نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اسی قسم کی بددیانتی وی۔ پی۔ مینن نے بھی کی ہے جو مجوزہ جناح، نہرو مذاکرات کے منعقد نہ ہونے کی ذمہ داری فقط جناح پر ڈالتا ہے[44] اور گاندھی اور نہرو کے مذکورہ خطوط کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ شخص وائسرائے کے سٹاف پر تھا اور وائسرائے کے سیاسی معاملات کے مشیر کے اعلیٰ عہدے پر ہوتے ہوئے اس قسم کی تمام خط و کتابت سے واقف تھا۔ وہ نہرو کی وائسرائے سے ملاقات کا سبب یہ ظاہر کرتا ہے کہ ''ان دنوں کانگرس کا صدر بیمار تھا۔''

بہرصورت اس ملاقات میں جو نہرو نے بلا اختیار کی تھی، نہرو نے کانگرس کی تجویز کردہ پندرہ رکنی ایگزیکٹو کے ناموں پر مشتمل فہرست ویول کو پیش کی۔ اس میں پانچ کانگرس (تمام ہندو) چار مسلم لیگ، ایک غیر لیگی مسلمان، ایک غیر کانگرسی ہندو ایک کانگرسی اچھوت، ایک ہندوستانی عیسائی ایک سکھ اور ایک کانگرس خاتون شامل تھی۔ ویول نے کہا کہ فہرست جناح کو ہرگز قابل قبول نہیں ہوگی۔نہرو نے اسے یہ بھی بتایا کہ ایک روز قبل کانگرس مجلس عاملہ نے مشن

کے سارے منصوبے کو رد کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا اور اس سلسلے میں وائسرائے اور مشن کو بھیجنے کے لیے خط تیار بھی کر لیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی نے مداخلت کی اور یہ خط نہ بھیجا گیا۔ ویول نے کہا کہ ابھی ایک دو روز تک کوئی خط نہ بھیجا جائے تا کہ ہم تصفیے کی کوئی راہ نکال سکیں۔"[45]

دراصل اسی روز نہرو سے ملنے سے پہلے ویول نے پٹیل کے ساتھ بھی ملاقات کی تھی اور اسے کانگرس مجلس عاملہ کی صورت حال کا علم ہو چکا تھا۔ پٹیل نے اسے بتایا تھا کہ نہ صرف میں بلکہ ساری مجلس عاملہ وزارتی مشن منصوبہ قبول کرنے اور عبوری حکومت میں شمولیت، دونوں باتوں کے خلاف ہے، کوئی بھی اس کے حق میں نہیں ہے۔ صرف گاندھی مشن منصوبہ قبول کرنے کے حق میں دلائل دے رہا ہے۔ پٹیل نے کہا کہ اگر ایک مرتبہ پیریٹی کا اصول قبول کر لیا گیا تو اسے زندگی کے ہر شعبے میں اور حکومت کی ہر سطح پر رواج بنا لیا جائے گا۔ ویول نے اس کی تردید کی اور کہا یہ صرف ایک ہنگامی صورت حال میں قرین مصلحت حل کے طور پر اختیار کیا جا رہا ہے اور اسے رواج کے طور پر نہیں اپنایا جائے گا۔ پٹیل نے کہا کہ اگر جناح حکومت میں آ گیا تو وہ اپنے اختیارات کو فرقہ وارانہ اور انتشار پیدا کرنے والے مقاصد کے لیے استعمال کرے گا۔ ویول نے کہا کہ آپ اس بارے میں مجھ پر بھروسا کریں، میں عبوری حکومت کو فرقہ وارانہ میدان کارزار نہیں بننے دوں گا۔ تاہم پٹیل قائل نہ ہوا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر نہرو اور جناح نے ناموں کی کسی فہرست پر اتفاق کر لیا تو وہ بھی اسے قبول کر لے گا۔[46] یاد رہے کہ ایف۔ ایف۔ ٹرنبل کی اطلاع کے مطابق پٹیل کو گھنشام داس برلا کی اشیر باد حاصل تھی اور نہ صرف یہ کہ وہ پٹیل کا بے حد احترام کرتا تھا بلکہ وہ پٹیل کے مؤقف کی حمایت کر رہا تھا۔[47]

ہندو بورژوازی اپنے مقاصد میں اختلاف نہیں رکھتی تھی، صرف اس کے حصول کے لیے طریقۂ کار پر نقطہ ہائے نظر کا اختلاف ہوتا تھا۔ اور وہی نقطۂ نظر کامیاب ہوتا تھا جو ان کے بہترین مفاد میں ہوتا تھا چنانچہ گاندھی نے اپنا ''قانونی ذہن'' استعمال کر کے جو راہ نکالی اور جو بالآخر اختیار کی گئی وہ پٹیل سے مختلف تھی۔ گاندھی کا مؤقف تھا کہ مشن منصوبہ قبول کر کے مسلم لیگ حکومت میں آنے کی حق دار بن چکی ہے اور ایسا نہ کر کے کانگرس نے اپنا استحقاق قائم نہیں کیا ہے۔ جہاں تک مشن منصوبے کا تعلق ہے تو اسے قانونی تشریحات و توضیحات کے ذریعے سے بالآخر فیڈرل کورٹ کے ذریعے اپنے حسب منشا ڈھالا جا سکتا اور گروپنگ کو سبوتاژ کیا جا

سکتا ہے۔ پیریٹی کی مخالفت میں وہ پٹیل سے بھی دو ہاتھ آگے تھا اور سرے سے مخلوط حکومت کے ہی حق میں نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ لیگ اکیلے حکومت نہ سنبھال سکے گی اور نہ ہی برطانوی حکمران کانگرس کو باہر رکھ کر مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی منظوری دیں گے۔ بشرطیکہ کانگرس مشن منصوبہ منظور کر کے لیگ کے استحقاق کو زائل کر دے۔ اس بارے میں اس کے ''روحانی ہم مشربوں'' نے اسے یقین دہانیاں کرائی ہوئی تھیں۔ چنانچہ وہ پورے زور وشور سے مخلوط ایگزیکٹو کی تشکیل کے خلاف سرگرم عمل ہو گیا۔

گاندھی نے 12رجون کو پیتھک لارنس کے ساتھ ملاقات میں کہا کہ جناح عبوری حکومت میں آ کر اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے بیج کی آبیاری کرے گا۔ 13رجون کو اس نے ویول کو مراسلہ لکھا جس میں کہا ''آپ دو گھوڑوں میں سے ایک کا انتخاب کریں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں آپ دونوں گھوڑوں پر بیک وقت سواری نہیں کر سکتے۔ یا کانگرس یا لیگ کے پیش کردہ ناموں میں سے ایک کے تجویز کردہ نام قبول کر لیجئے اور بھگوان کے لیے ان کی بے جوڑ آمیزش مت کیجئے کہ اس کوشش میں آپ ایک خوفناک دھماکا پیدا کر دیں گے۔''[48] اسی روز اس نے کرپس کو ایک ذاتی خط لکھا جس میں کہا کہ ''آپ کو دونوں میں سے ایک کو چننا ہوگا۔ مسلم لیگ اور کانگرس، دونوں ہی آپ کی تخلیق ہیں...... کبھی آپ کانگرس کو ناز و ادا دکھاتے ہیں اور کبھی مسلم لیگ کو اور کبھی پھر کانگرس کو اور یوں عاجز ہو رہے ہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یا تو آپ حق کا کلمہ پڑھیں یا پھر برطانوی پالیسی کے فوری تقاضوں کے مطابق عمل کریں۔ دونوں صورتوں میں جرأت کی ضرورت ہے۔ گاندھی نے مزید کہا کہ آپ اپنے پروگرام کے سختی سے پابند رہیں اور 16رجون تک خواہ کانگرس اور لیگ کی کولیشن بنے خواہ نہ بنے، آپ یہاں سے (اپنے پروگرام کے مطابق) چلے جائیں۔ مزید یہ کہ وہاں جا کر اپنی نجی زندگی میں مصروف ہو جائیں تا کہ ایک جرأت مندانہ برطانوی اعلان ہو جو ہندوستانی توقعات پر پورا اترے۔''[49] گویا گاندھی چاہتا تھا کہ مشن ناکام ہو کر واپس چلا جائے اور اس وقت لیگ کے حکومت میں آنے کا جو امکان پیدا ہوا ہے وہ ختم ہو جائے۔ برطانوی حکومت کوئی نیا اعلان کرے۔ اس کے جواب میں اسی روز کرپس نے لکھا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ نہ تو مجھ میں اور نہ ہی میرے ساتھیوں میں جرأت کا فقدان ہے بلکہ ہم جرأت

اور مصلحت اندیشی کا امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مجھے بہت امید ہے کہ ہندوستان سے جانے سے پہلے ہم مسئلے کے تصفیے کی راہ ہموار کر کے جائیں گے۔''[50]

گاندھی اپنی طرف سے مشن کو ناکام کر چکا تھا۔ 14 ر جون کو گاندھی نے پرارتھنا سبھا میں بھاشن دیتے ہوئے وزارتی مشن کو ایک ماں سے تشبیہ دی جو اپنے بچے کو مرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ مگر ''وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑ رہی ہے۔ وہ ڈاکٹروں، طبیبوں اور عطاروں سب کے نسخے آزما رہی ہے۔ کبھی ایک کبھی دوسرا اور کبھی تیسرا یہاں تک کہ لمحۂ آخر ہو جائے۔''[51] یہ تھا مہاتما کا رویہ لیگ اور کانگرس کے مابین مفاہمت کی ان تمام تر کوششوں کے بارے میں جو وزارتی مشن گذشتہ تین چار ماہ سے کر رہا تھا گویا وہ مفاہمت چاہتا ہی نہیں تھا۔ وہ لیگ اور کانگرس کی عبوری حکومت کی تشکیل کی راہ میں روڑہ بن کر اٹک گیا تھا۔ چنانچہ 13 ر جون ہی کو کانگرس مجلس عاملہ کی جانب سے سرکاری طور پر آزاد بنام وائسرائے مراسلے کے اندر مجوزہ 12 رکنی ایگزیکٹو کو پیریٹی کی بنیاد پر رد کر دیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ ''کانگرس مجلس عاملہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مخلوط حکومت کی کامیابی کے لیے فی الوقت اس کا نظریہ اور پروگرام مشترکہ ہونا چاہیے۔ اس حکومت کو تشکیل دینے کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ ایسا ہے کہ اس امکان پر غور ہی نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ مجلس عاملہ کو یہ بھروسا نہیں ہے کہ ایسی مخلوط حکومت کامیابی کے ساتھ چل سکے گی۔''[52] گویا وہ صرف کانگرس کی حکومت چاہتے تھے۔ ان کی مجوزہ پندرہ رکنی ایگزیکٹو جس میں مسلم لیگ کو صرف چار نشستیں دی گئی تھیں، کا مطلب بھی صرف کانگرس کی حکومت تھا کیونکہ مسلم لیگ کو یہ تناسب ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔

کیا انگریز کانگرس کو نظر انداز کر کے مخلوط حکومت تشکیل دے سکتے تھے؟ اس سوال کا جائزہ ہندوستان میں وائسرائے کا سٹاف بھی لے رہا تھا☆ اور اس کے بارے میں مشن

☆ 4 ر جون کو وائسرائے کے ذاتی معاون ایبل نے ایک نوٹ میں ایگزیکٹو کے لئے لیگ کے ارکان کے علاوہ غیر کانگرسی ہندو سیاسی شخصیات کے نام تجویز کئے۔ 5 ر جون کو جی۔ ایچ سپنس سیکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا لیجسلیٹو ڈیپارٹمنٹ نے ان ناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ مزید نام تجویز کئے۔ اسی روز وی۔ پی۔ مینن نے بھی ان ناموں پر تبصرہ کیا اور کہا کہ کانگرس کے انکار کی صورت میں تمام ہندوؤں میں مخالفت کی لہر دوڑ جائے گی اور غیر کانگرسی ہندو سیاسی شخصیات کے لئے بھی شامل ہونا مشکل ہو جائے گا۔ ان حالات میں صرف ہندو سرکاری افسروں میں سے کچھ افراد کو لیا جا سکے گا۔ (ٹرانسفر آف پاور۔ ص 800، 5-804، جلد 7)

کے سربراہ پیتھک لارنس کا وزیراعظم ایٹلی کے ساتھ بھی رابطہ قائم تھا۔ ادھر انہی دنوں برطانوی کابینہ اور مسلح افواج کے سربراہ کانگرس کے عدم تعاون سے پیدا شدہ ہنگامی صورت حال کا جائزہ لینے میں بھی مصروف تھے جس کا تفصیلی ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایٹلی نے اپنے 6 رجون کے مراسلے میں پیتھک لارنس کو 5 رجون کے کابینہ کے اجلاس کے تاثرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ جس کے مطابق کانگرس کے عدم تعاون کی صورت حال سے گریز اختیار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ 12 رجون کو کابینہ کی دفاعی کمیٹی کی رپورٹ میں بھی یہی سفارش کی گئی تھی کہ اینگلو امریکی سامراجی تقاضے اس امر کی اجازت نہیں دیتے کہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر گڑبڑ ہو اور یہاں مزید فوج بھیجنی پڑے۔ 12 رجون کو پیتھک لارنس نے ایٹلی کے نام مراسلے میں دریافت کیا کہ کیا لیگ کے ارکان کو ساتھ لے کر کانگرس کے بغیر ایگزیکٹو تشکیل دی جا سکتی ہے اور اس کے نتائج جن سے آگاہ کیا جا چکا ہے، قابل قبول ہوں گے؟ 13 رجون کو پارلیمانی نائب وزیر ہند آرتھر ہینڈرسن نے اس سلسلے میں ایٹلی کے نام اپنے نوٹ میں لکھا کہ اگر یہ راستہ اختیار کیا گیا تو وہ ہنگامی صورت حال پیدا ہو جائے گی جس کا مشن اور وائسرائے کے مجوزہ ہنگامی منصوبے میں تذکرہ کیا گیا ہے اور جس کو اختیار کرنے کے بارے میں کابینہ نے پسندیدگی ظاہر نہیں کی ہے۔ تاہم ہندوستان کا جو عنصر بھی تعاون پر آمادہ ہو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے اور اس لحاظ سے ویول نے جناح کو جو یقین دہانی کرائی ہے وہ بھی حق بجانب ہے۔[53] چنانچہ 13 رجون کو ایٹلی نے پیتھک لارنس کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ کابینہ نے مجوزہ ہنگامی صورت حال کی منظوری نہیں دی ہے تاہم وہ اس بات پر متفق ہے کہ مشن منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے۔[54] گویا برطانوی حکومت اپنے بین الاقوامی سامراجی تقاضوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر کانگرس سے بلیک میل ہونے پر آمادہ ہو گئی۔ ایگزیکٹو میں پیریٹی کو ختم کرنے کا کانگرس کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا۔ کانگرس کی نشستوں کی تعداد 5 سے بڑھا کر 6 کر دی گئی۔ پہلے فارمولے میں ایک اچھوت کی نشست بھی کانگرس کے پانچ کے کوٹے میں شامل تھی۔ اب کانگرس کی 5 نشستوں کے علاوہ اسے اچھوت کے لیے علیحدہ سے ایک چھٹی نشست دے دی گئی۔

مشن کی جانب سے منظوری لینے کے بعد ویول نے 13 رجون کی دوپہر کو جناح کو بلا کر تیرہ رکنی ایگزیکٹو کی اس تجویز سے آگاہ کیا۔'' جناح اسے قبول کرنے بلکہ اپنی مجلس سے اس کی

سفارش کرنے پر آمادہ ہو گئے[55] اس کے بعد ویول نے سہ پہر کو نہرو کو بلا کر اسے اس تجویز کی تفصیل سے آگاہ کیا اور 13 ناموں پر مشتمل ایک فہرست اسے پیش کی۔ نہرو نے کہا کہ کانگرس مجلس عاملہ کے ساتھیوں کو اس پر قائل کرنا بہت مشکل ہو گا تاہم میں یہ فہرست ان کے سامنے رکھوں گا لیکن کامیابی کی کوئی امید نہیں ہے۔ نہرو کے جانے کے بعد مشن کے ارکان اور وائسرائے نے باہم مشورہ کر کے طے کیا کہ پٹیل کے ساتھ ملاقات کر کے اسے یہ فارمولا قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ ویول نے شام کو پٹیل کو بلا کر اس سے ملاقات کی۔ پٹیل نے بتایا کہ مجلس عاملہ اس فارمولے پر غور کر چکی ہے اور یہ کہ ''اسے رد کرنے میں ہمیں پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔'' یہ ملاقات ناکام رہی۔ اگلے روز (14 ر جون) ویول نے آزاد اور نہرو کے ساتھ ملاقات کی اور بقول ویول وہ دونوں 13 رکنی ایگزیکٹو کے فارمولے کو اس روز سہ پہر کے وقت مجلس عاملہ کے سامنے پھر پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے جس کے بعد شام کے وقت کانگرس کا سرکاری جواب آزاد بنام ویول خط کی صورت میں موصول ہوا جس میں مجوزہ تیرہ رکنی ایگزیکٹو کو مسترد کر دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ عبوری حکومت 15 ارکان پر مشتمل ہونی چاہیے اور ان کے انتخاب میں کسی قسم کی ''پیریٹی'' نہیں ہونی چاہیے۔ اگرچہ اب پیریٹی کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان نہیں رہ گئی تھی بلکہ اونچی ذات کے ہندوؤں (جن کے لیے اب 5 نشستیں تھیں) اور مسلمانوں کے درمیان تھی اور یہ وہی صورت تھی جسے جون 1945ء کی شملہ کانفرنس میں کانگرس اور گاندھی قبول کر چکے ہوئے تھے۔ مگر اس کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے آزاد کی جانب سے ارسال کردہ کانگرس کے مذکورہ مراسلے میں اب پھر وہی اعتراض اٹھایا گیا تھا جس پر گذشتہ سال کی شملہ کانفرنس ناکام ہوئی تھی کہ مسلمانوں کی پانچ نشستوں پر تمام مسلم لیگی کیوں لیے گئے ہیں۔''[56] حالانکہ اب 46-1945ء کے انتخابات یہ ثابت کر چکے تھے کہ مسلم لیگ کو برصغیر کی تمام تر مسلم آبادی کی نمائندہ جماعت کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن بقول برلا حالات اب ہندو بورژوا کے لیے بھی بدل گئے تھے۔ تب عالمی جنگ کا مقابلہ درپیش تھا۔ اب انتقال اقتدار کا مرحلہ تھا۔ ہندو بورژوا ایک انچ جگہ پر مفاہمت کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ برطانوی حکومت اس کی شرائط کے سامنے جھکنا شروع ہو چکی تھی۔

کانگرس کی جانب سے تیرہ رکنی ایگزیکٹو کی تجویز رد کئے جانے پر وائسرائے اور مشن

کے ارکان اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب مفاہمت کی مزید کوشش بے سود ہے۔ اس لیے ہم ازخود ایگزیکٹو کا اعلان کر دیتے ہیں جس میں مزید ایک کا اضافہ کر کے چودہ ارکان لیے جائیں۔ کافی سوچ بچار کے بعد ایک پارسی وکیل کو چودھواں رکن منتخب کیا گیا۔ 14 رجون کو کانگرس کا حتمی جواب آنے سے پیشتر ہی انہوں نے اپنے اجلاس میں اس مجوزہ اعلان کا مسودہ تیار کر کے اس کی منظوری حاصل کرنے کے لیے وزیر اعظم ایٹلی کو ارسال کر دیا تھا۔ اس دوران ویول نے کانگرس کو رام کرنے کی ایک اور کوشش کی اور آزاد کے 14 رجون کے خط کے جواب میں کہ جس میں گروپنگ پر بھی بڑی سخت تنقید کی گئی تھی اور یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وزارتی مشن منصوبہ بھی کانگرس کے لیے ناقابل قبول ہے۔ ویول نے 15 رجون کو آزاد کے نام اپنے خط میں کہا کہ ''وزارتی مشن اور میں گروپنگ کے اصول پر آپ کے اعتراضات سے بخوبی واقف ہیں۔ تاہم میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ 16 رمئی کی دستاویز میں گروپنگ کو لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ صوبوں کے منتخب نمائندوں پر چھوڑ دیا گیا ہے جو وہ گروپ کی صورت میں بیٹھ کر کر سکتے ہیں...... اور یہ فیصلہ ہونے کے بعد بھی صوبوں کو اپنی انفرادی حیثیت میں اگر چاہیں تو علیحدگی اختیار کرنے کا حق حاصل رہے گا۔''[57] مزید برآں ویول نے گذشتہ سال کی شملہ کانفرنس کا حوالہ دے کر مجوزہ 13 رکنی ایگزیکٹو کو قبول کرنے کی ایک بار پھر درخواست کی جس میں اس کے بقول ''اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین پیریٹی نہیں ہے۔ اب اس میں 6 ہندو اور 5 مسلمان ہیں۔'' ویول کے اس خط سے اور کوئی فائدہ تو حاصل نہ ہوا البتہ گروپنگ کے بارے میں اس کی مذکورہ تشریح سے کانگرس نے بعد میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ 16 رجون کو آزاد کی جانب سے اس کے جواب میں کہا گیا کہ ''گروپنگ کے بارے میں آپ نے جو کہا ہے اسے ہم نے نوٹ کر لیا ہے۔ ہم اس کے بارے میں اپنی تشریح کے پابند ہیں۔'' شملہ کانفرنس کے حوالے سے تناسب پر بحث کے جواب میں کہا گیا کہ ''اب صورتحال بالکل بدل گئی ہے۔ اب ہمیں اس مسئلہ پر نئے سیاق و سباق، یعنی متوقع آزادی اور آئین ساز اسمبلی کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا ہو گا۔''[58] یہ وہی جواب تھا جو برلا نے ٹرنبل کے ساتھ ملاقات (6 رجون) میں دیا تھا۔ ہندو بورژوا کو یہ یقین تھا کہ حکومت برطانیہ اس کے تعاون کے بغیر برصغیر میں عبوری طور پر بھی کوئی آئینی یا سیاسی نظام نافذ نہیں کر سکتی، اس لیے وہ اپنی شرائط منوانے پر ہٹ دھرمی سے کام لے رہا تھا۔

گروپنگ کو سبوتاژ کرنے کے لیے کانگرس کا بنگال اور آسام کی اسمبلیوں کے یورپی ارکان کو حتمی رائے دہی سے محروم کرنے کا مطالبہ بین بین منظور

اس دوران ایک اور مسئلہ جس پر کانگرس نے ایک طوفان کھڑا کیا ہوا تھا، بنگال اور آسام کی صوبائی اسمبلیوں کے یورپی ارکان کی جانب سے آئین سازی میں کردار سے متعلق تھا۔ اس مسئلے کی تفصیل یہ تھی کہ وزارتی مشن منصوبہ کی مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں بنگال اور آسام پر مشتمل گروپ ج کے لیے مندرجہ ذیل نشستیں مخصوص کی گئی تھیں جن پر نمائندوں کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں کے ارکان نے کرنا تھا:

صوبہ	عمومی	مسلم	کل
بنگال:	27	33	60
آسام:	7	3	10
کل:	34	36	70

بنگال اسمبلی میں عمومی (غیر مسلم) ارکان کی کل تعداد 127 تھی جن میں سے 25 ارکان یورپی تھے۔ متناسب نمائندگی کے لحاظ سے وہ آئین ساز اسمبلی کی 27 عمومی نشستوں میں سے پانچ پر اپنے نمائندے منتخب کر سکتے تھے۔ اسی طرح آسام اسمبلی میں کل 74 عمومی (غیر مسلم) ارکان تھے جن میں سے 9 یورپی تھے۔ چنانچہ وہ بھی متناسب نمائندگی کے مطابق آئین ساز اسمبلی کی 7 عمومی نشستوں میں سے ایک پر اپنا نمائندہ منتخب کر سکتے تھے۔ یوں گروپ ج کی کل 34 عمومی نشستوں میں سے یورپیوں کے حصے میں 6 نشستیں آجاتی تھیں اور گروپ میں طاقت کا توازن ان کو حاصل ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ اوپر کے جدول سے ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی کے اس گروپ میں عمومی اور مسلم کے مابین 34 اور 36 کا تناسب ہونے کی وجہ سے صورت حال خاصی نازک تھی۔ 36 مسلم نشستوں میں سے مسلم لیگ 35 نشستیں حاصل کر سکتی تھی کیونکہ

صوبائی اسمبلی کی پانچ مسلم نشستوں پر اے۔ کے فضل الحق کی کرشک پر جا پارٹی کو کامیابی حاصل ہوئی تھی اور وہ بھی متناسب نمائندگی کے حساب سے آئین ساز اسمبلی کی مسلم نشستوں میں سے ایک پر قبضہ کر سکتے تھے۔ فضل الحق جناح کی مخالفت میں کانگرس کا ساتھ دے رہا تھا اور گروپنگ کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ ہوسکتا تھا۔[59]

مجوزہ مشن منصوبہ کے مطابق آئین ساز اسمبلی کے تین گروپوں میں تقسیم ہونے کے بعد ہر گروپ پیرا۔ 15(5) اور پیرا۔ 19(5) کے مطابق گروپ کی آئین سازی کے موقع پر گروپ کے بننے یا نہ بننے پر رائے شماری کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر اگر یورپی ارکان آئین ساز اسمبلی اور فضل الحق پارٹی کا ایک رکن گروپنگ کے خلاف کانگرس کا ساتھ دے دیتے تو گروپ میں 35 حق میں اور 35 مخالفت میں ووٹ ہو جاتے اور یوں گروپ ج ڈیڈ لاک کا شکار ہو جاتا اور بطور گروپ ٹوٹ جاتا اور پوری گروپنگ سکیم سبوتاژ ہو جاتی۔ دوسری صورت میں اگر یہی 6 یورپی نمائندے گروپنگ کے حق میں ووٹ دے دیتے تو حق میں 41 اور مخالفت میں 29 ووٹ ہو جاتے اور گروپ مستحکم ہو جاتا۔ اگر یہ یورپی ارکان گروپنگ پر رائے شماری میں غیر جانب دار ہو جاتے تب بھی مسلم لیگ کی واضح اکثریت کی بدولت گروپ قائم رہ جاتا۔ اس طرح گروپنگ سکیم کی پورے طور پر کامیابی یا ناکامی کا دارومداران یورپی ارکان کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ کانگرس کا مطالبہ یہ تھا کہ بنگال اور آسام کی صوبائی اسمبلیوں کے یورپی ارکان کو آئین ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق ہی نہیں ہونا چاہیے۔ مقصد یہ تھا کہ اس گروپ کی تمام 34 عمومی نشستوں پر کانگرس کا قبضہ ہو جائے اور وہ فضل الحق کو ساتھ ملا کر 35:35 کا تناسب حاصل کر کے گروپ ج کو ڈیڈ لاک کا شکار کر دے اور یوں گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کر دے۔ اپنے اس مقصد کے لیے وہ وزارتی مشن کے 16 رمئی کے اعلان کے اس جملے کا سہارا لے رہے تھے کہ ''ہم ایک ایسے نظام کو حرکت میں لانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا آئین ہندوستانیوں کے ذریعے طے پائے۔'' وہ اپنے اصل عزائم کا کھل کر اظہار کرنے کے بجائے اسے ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کا مسئلہ بنا کر پیش کر رہے تھے۔ چونکہ یہ مسئلہ حقیقت میں ہندوستانی غیر ہندوستانی کا نہیں تھا بلکہ واضح طور پر مسلمانوں کو ان کی جائز خودمختاری سے محروم کر کے ان سے عداوت کا مظہر تھا اس لئے مسلمانوں کی طرف سے زور دیا جا رہا تھا کہ یورپی ارکان

آئین ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیں اور اپنے ارکان چن کر آئین ساز اسمبلی میں بھیجیں۔

حقیقت یہ تھی کہ اس بات کا دارومدار کہ اولاً صوبائی اسمبلیوں کے یورپی ارکان آئین ساز اسمبلی کے لیے نمائندے منتخب کریں یا نہیں اور دوئم یہ کہ یہ منتخب نمائندے گروپ کے حق میں یا مخالفت میں یا غیر جانبداری میں رائے دیں، اس پر تھا کہ خود برطانوی حکمران گروپنگ سکیم کو کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ کیونکہ وہ حکومت برطانیہ کے فیصلے کے پابند تھے۔ اس لیے یورپین ایسوسی ایشن اس مسئلے پر بنگال اور آسام کے گورنروں سے اور وہ وائسرائے اور مشن کے ارکان سے اور وہ وزیر اعظم ایٹلی کے ساتھ مسلسل رابطے رکھے ہوئے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اگر کانگرس کا مطالبہ تسلیم کرلیا جاتا تو یہ گروپنگ کو صاف طور پر سبوتاژ کی کھلی چھٹی دینے کے مترادف تھا۔ جس پر جناح کے باغی ہوجانے اور لیگ کی طرف سے مشن منصوبہ رد کرنے اور عبوری حکومت میں شمولیت سے انکار کر دینے کا خطرہ تھا۔ دوسری طرف گاندھی اور کانگرس نے اس مسئلے کو ایگزیکٹو میں پیریٹی کے مسئلے کی طرح زندگی و موت کا مسئلہ بنا دیا تھا۔

مئی کے اواخر سے وسط جون تک گاندھی، نہرو، پٹیل اور آزاد نے وائسرائے اور ارکان مشن کے ساتھ جتنی ملاقاتیں کیں اور انہیں جتنے خطوط ارسال کئے اور کانگرس مجلس عاملہ نے جتنی قراردادیں منظور کیں ان سب میں پیریٹی کے ساتھ ساتھ یورپیوں کا مسئلہ سرفہرست رہا۔ پیریٹی اور یورپیوں کے معاملے کو مشن منصوبہ کی منظوری اور ایگزیکٹو میں شمولیت کے لیے شرطِ اولین قرار دے دیا گیا تھا۔ ورنہ بریک ڈاؤن کی صورت تھی۔ لیکن ہندو بورژوا کی قوت سے بلیک میل ہو کر جیسے برطانوی حکام نے پیریٹی کے معاملے میں پسپائی اختیار کرنا شروع کر دی تھی ویسے ہی اس معاملے میں بھی گنجائش پیدا کی گئی۔ گورنر بنگال بروز نے وائسرائے اور مشن کے ساتھ ایک ملاقات میں کہا کہ ''بنگال کی صنعت و تجارت کا نوے فیصد ہندوؤں کے کنٹرول میں ہے۔ مستقبل میں یورپی تجارتی مفادات کا ان کی خیر سگالی پر انحصار ہوگا۔ اگر انہوں نے آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخاب کا حق استعمال کیا تو ہندوؤں کے اندر یورپی کمیونٹی کے لئے مستقل عناد پیدا ہو جائے گا۔''[60] چنانچہ ان تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر برطانوی ارباب اقتدار کے مابین کافی لے دے جاری رہی۔ 15 رجون کو مشن اور وائسرائے کے اجلاس میں کرپس نے اس معاملے میں کانگرس کے مؤقف کو ''زوردار'' قرار دیکر اس کی تائید کی۔[61] اسی

روز کلکتہ میں یورپی ایسوسی ایشن نے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر دیا کہ آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے نہ ہم خود کسی یورپی کو بطور امیدوار نامزد کریں گے اور نہ ہی کسی یورپی کو ووٹ دیں گے۔ البتہ دونوں بڑی جماعتوں کے مابین تصفیے کی مطابقت سے ہم رائے شماری میں ضرور حصہ لیں گے۔ اس طرح کانگرس کا مطالبہ بین بین تسلیم کر لیا گیا تھا اور یہ گنجائش بھی رکھی گئی تھی کہ جناح بھی باغی نہ ہونے پائیں۔

باب: 13

مشن منصوبہ، کانگرس نے منظور کیا یا نامنظور

عبوری حکومت کے لئے فارمولے کا اعلان، جسے سبوتاژ کرنے کے لیے گاندھی نے نیشنلسٹ مسلمان کا مسئلہ کھڑا کر دیا

''یورپین'' اور ''پیریٹی'' دونوں معاملوں پر کانگرس کو رعایتیں دینے کے بعد 16 رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے 14 رکنی ایگزیکٹو پر مبنی اپنا اعلان جاری کر دیا۔ اس کی منظوری وزیراعظم ایٹلی اور شاہ برطانیہ سے حاصل کر لی گئی تھی۔ اس میں کانگرس کے 6۔ مسلم لیگ کے 5۔ ایک سکھ، ایک ہندوستانی عیسائی اور ایک پارسی شامل تھا۔ اس اعلان کا پیراگراف 8 سب سے زیادہ اہم تھا جو بعد میں متنازعہ فیہ صورت اختیار کر گیا۔ اس میں کہا گیا تھا: ''اگر دونوں بڑی پارٹیوں یا دونوں میں سے کوئی ایک مذکورہ خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل میں شمولیت اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وائسرائے اس کے باوجود عبوری حکومت کی تشکیل کرے گا جو ان عناصر کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرے گی جو 16 رمئی کے منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔''[1] بالفاظ دیگر اس پیراگراف میں اعلانیہ طور پر یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر کانگرس نے عبوری حکومت میں شامل ہونے پر آمادگی ظاہر نہ کی تو مسلم لیگ اور دوسرے عناصر کو اس حکومت کی تشکیل کی دعوت دی جائے گی کیونکہ مسلم لیگ 16 رمئی کا وزارتی مشن منصوبہ قبول کر چکی ہوئی تھی، جب کہ کانگرس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اب صورت یہ تھی کہ یا تو کانگرس لیگ کے ساتھ اس مخلوط حکومت پر رضامندی ظاہر کرے یا بصورت دیگر مسلم لیگ کو حکومت کی تشکیل کا موقع فراہم ہونے دے۔ گاندھی کو یہ دونوں صورتیں قبول نہ تھیں اور اس لحاظ سے 16 رجون

کا متذکرہ اعلان گاندھی کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہوا۔ دراصل پچھلے چند روز سے جب سے کانگرس کو کچھ رعایتیں دے کر اور مسلم لیگ کو دی گئی رعایتوں کا لحاظ رکھ کر دونوں جماعتوں کے مابین مفاہمت کی برطانوی حکام کی کوششیں بارآور ہوتی نظر آنے لگی تھیں، گاندھی کرب کے عالم میں مبتلا تھا۔ اس کا ذاتی معاون پیارے لال اپنی 15 رجون کی ڈائری میں لکھتا ہے...... ''ایک بار پھر باپو پر ''وجدان'' کی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ پچھلے تین دن سے انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ حالات غلط رخ اختیار کر رہے ہیں۔ وائسرائے سمیت ہر شخص جناح سے خوف زدہ معلوم ہوتا ہے اور ہر قیمت پر اس کی دلجوئی کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ نامعقول ہے۔ مگر الزام پھر بھی کانگرس پر دھرا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کرپس اپنے ساتھیوں میں تنہا رہ گیا ہے۔''[2]

اس کے اس تاثر کی وجہ یہ تھی کہ کرپس کی کوشش تھی کہ ایگزیکٹو میں کانگرس کی مخصوص 6 نشستوں کے علاوہ ایک غیر کانگرسی ہندو کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ اس سلسلے میں 14 رجون کو وائسرائے اور مشن کے باہمی اجلاس میں جب چودھویں رکن کے اضافے کا فیصلہ کیا گیا تو یہ سوال اٹھایا گیا اور اس سلسلے میں دو ہندوؤں بی۔ این۔ راؤ اور گوپالا سوامی آئنگر کے نام زیرغور بھی آئے لیکن پھر یہ فیصلہ ہوا کہ اس طرح ہندوؤں کی تعداد 7 ہو جائے گی اور چونکہ جناح کو 6 ہندوؤں کے بارے میں اعتماد میں لیا گیا ہے، اس لیے ایسا کرنے سے جناح کے ساتھ بدعہدی ہوگی جو ممکن ہے حالات میں خرابی کا باعث بنے۔ اس لیے پارسی کی شمولیت پر اتفاق ہو گیا۔''[3] اس بات سے گاندھی کو شدید صدمہ ہوا اور اسے یہ تاثر ملا کہ کرپس کا مشن کے بقیہ ارکان اور ویول پر کوئی اثر نہیں رہا اور وہ تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ پیارے لال کی ڈائری کے 15 رجون کے ورق کا یہ تاثر مزید گہرا ہو گیا جب 16 رجون کو اعلان جاری کرنے سے پیشتر مشن کے ارکان اور وائسرائے کے اجلاس میں کرپس نے ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ بی۔ این۔ راؤ کو ایگزیکٹو میں شامل کیا جائے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ مجھے راج گوپال اچاریہ نے گذشتہ شام ایک طویل ملاقات کے دوران بتایا ہے کہ اگر ایگزیکٹو میں 7 کانگرسی ہندوؤں کو شامل کر لیا گیا تو کانگرس مجلس عاملہ اسے قبول کر لے گی۔ چنانچہ کرپس نے کہا کہ اگر کانگرسی نہیں تو غیر کانگرسی ہندو کا اضافہ کر کے اس شرط کو کسی حد تک پورا کر دیا جائے۔ لیکن ایک بار پھر اس

دلیل کی بنیاد پر کہ اس سے جناح کے ساتھ بدعہدی ہوگی، یہ تجویز رد کر دی گئی۔ اس سلسلے میں اے۔ وی۔ الیگزینڈر اور مشن کے ایک سینئر سٹاف ممبر ڈبلیو کرافٹ نے ویول کی بھرپور حمایت کی۔ پیتھک لارنس کو بھی طوعاً و کرہاً ساتھ دینا پڑا۔''[4]

کرپس کی یہ تنہائی گاندھی کے لیے سوہان روح بنی۔ 16 رجون کو ایگزیکٹو کا اعلان جاری کرنے سے پیشتر پیتھک لارنس نے گاندھی کو بلا کر اس کا متن اسے دکھایا۔ اسے دیکھ کر گاندھی نے سوائے اس کے اور کوئی اعتراض نہ کیا کہ اس میں کسی خاتون کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔[5] لیکن درحقیقت اس کی رات کی نیند اڑ گئی۔ وہ ہر قیمت پر اس مجوزہ ایگزیکٹو کو سبوتاژ کرنے پر تل گیا۔ بقول پیارے لال 16-17 رجون کی درمیانی شب گاندھی ''ڈیڑھ بجے اٹھ بیٹھا اور اس نے کانگرس مجلس عاملہ بنام وائسرائے ایک خط کا ڈرافٹ لکھوایا جس میں اس نے ان چار نکات پر زور دیا: (1) لیگ ایک اعلانیہ مسلم تنظیم ہونے کی وجہ سے کسی غیر مسلم نمائندے کو اپنی فہرست میں شامل نہیں کر سکتی۔ (2) کانگرس ایک نیشنلسٹ تنظیم ہونے کی بدولت اپنی فہرست میں ایک کانگرسی مسلمان کو شامل کرنے کا حق رکھتی ہے۔ (3) لیگ کو اپنے مخصوص کوٹے سے باہر باقی ناموں کے انتخاب پر رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کی مخصوص نشستوں میں سے اگر کوئی خالی ہوتی ہے تو اس نشست کو پر کرنے کے لیے نام تجویز کرنے کا حق صرف کانگرس کو حاصل ہوگا کہ یہ حق خدمت کی بنیاد پر تمام طبقوں کی نمائندگی کی دعویدار ہے۔ (4) عملاً عبوری حکومت کو اسمبلی کے منتخب نمائندوں کے سامنے جواب دہ سمجھا جانا چاہیے۔''[6]

لیکن اگلے روز یعنی 17 رجون کو کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو اب وہ صورت نہیں تھی کہ وہ اسے ''رد کرنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگاتے۔'' بلکہ اس کے ارکان حق اور مخالفت میں نصف نصف بٹے ہوئے تھے۔[7] خود پیارے لال کے بقول ''اگلے روز سہ پہر کو جب کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو گاندھی جی کے ڈرافٹ کو عملاً سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ وہ وائسرائے کی تجویز کو فریفتگی سے نہیں دیکھ رہے تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کو ''نہ'' کرنا نہیں چاہتا تھا۔''[8] اس کے ساتھ ساتھ بقول ویول ''پیتھک لارنس اور کرپس کانگرس کیمپ کے ساتھ بذریعہ اگاتھا ہیریسن اور سدھیر گھوش اینڈ کو قریبی رابطہ رکھے ہوئے تھے۔''[9] کانگرس

مجلس عاملہ میں مجوزہ ایگزیکٹو میں کچھ ردوبدل کے بعد اسے قبول کر لینے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ فوری طور پر وہ اس میں تین تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ کانگرس کی نشستوں میں سے ایک نشست پر اڑیسہ کے کانگرسی وزیر اعلیٰ ہرے کرشنا مہتاب کو مقرر کیا گیا تھا، وہ اس کی جگہ سرت چندر بوس کا تقرر چاہتے تھے تاکہ کانگرس کے بائیں بازو کی تشفی ہو سکے اور بنگال کی نمائندگی بھی ہو جائے۔ دوسرے ان کو مسلم لیگ کی نشستوں میں سے ایک پر سردار عبدالرب نشتر کی تقرری پر اعتراض تھا کیونکہ وہ سرحد میں کانگرس کے مقابلے میں انتخاب ہار گیا ہوا تھا۔ یہ مسئلہ سرحد کانگرس نے اٹھایا تھا اور اس سوال پر خان عبدالغفار خان پشاور سے دہلی کے لیے روانہ ہو چکا ہوا تھا۔ تاہم خیال تھا کہ اس پر زیادہ زور نہیں دیا جائے گا۔ تیسرا اعتراض گاندھی نے اٹھایا تھا اور وہ یہ کہ چونکہ اب پیریٹی کا معاملہ نہیں رہا ہے، اس لیے حکومت کی غیر فرقہ وارانہ حیثیت ظاہر کرنے کے لیے اس میں ایک غیر لیگی غیر کانگرسی مسلمان کو کانگرس کے کوٹے کی نشستوں پر مقرر کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے ذاکر حسین کا نام تجویز کیا۔ یہ وہ شرارت آمیز تجویز تھی جو اسے رات ڈیڑھ بجے سوجھی تھی اور اس کے بعد یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ جناح کچھ بھی قبول کر سکتے ہیں یہ کبھی نہیں مان سکتے، وہ آرام کی نیند سو گیا تھا کہ اب مجوزہ ایگزیکٹو کو بآسانی سبوتاژ کیا جا سکتا ہے۔ 17 رجون کو پیتھک لارنس اور کرپس کے ساتھ ملاقات میں سرکاری طور پر کانگرس کے صدر آزاد نے یہ تینوں اعتراضات پیش کر دیے۔

18 رجون کو نہرو اور آزاد نے ویول کے ساتھ ملاقات کی اور مزید ایک اعتراض کا اضافہ کر دیا۔ یہ چودھویں نشست پر مقرر کیے گئے پارسی وکیل این۔ پی۔ انجینئر کی سرکاری حیثیت کے بارے میں تھا جو ان دنوں ایڈووکیٹ جنرل کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس اعتراض پر ویول نے بہت حد تک ان کی تشفی کر دی۔ علاوہ ازیں ویول نے مہتاب کی جگہ سرت چندر بوس کی تقرری کی ترمیم بھی قبول کر لی جو اگرچہ کانگرس کی طرف سے مجوزہ فہرست میں شامل تھا لیکن آزاد ہند فوج کے ساتھ روابط کی بنا پر ویول نے شامل نہیں کیا تھا کہ اس پر حکومت برطانیہ سے اس کی منظوری حاصل کرنا ذرا مشکل تھا۔ جہاں تک نشتر کے تقرر کا تعلق تھا تو ان دونوں نے کہا کہ خان عبدالغفار کے آنے کے بعد ہی فیصلہ کیا جائے گا کہ آیا اس پر اعتراض روا رکھا جائے یا نہیں۔ تاہم ان کا خیال تھا کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ ویول نے بھی یہ

واضح کر دیا کہ میں نشتر کا علیحدہ کیا جانا منظور نہیں کروں گا۔ نیشنلسٹ مسلمان کی کانگرس کی نشست پر تقرری کے نازک مسئلہ پر ویول نے کہا کہ اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی تاہم ''اگر آپ اس پر تلے ہوئے ہیں تو میں اس پر غور کروں گا۔''[10] یہ ملاقات بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔ کانگرس کی ممکنہ حد تک تشفی کر دی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے بعد سہ پہر کو جب کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مجوزہ ایگزیکٹو کو قبول کر لینے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ تاہم گاندھی نے عبوری حکومت میں نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت کے معاملے پر اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ پٹیل نے گاندھی کے اس مؤقف کی سخت مخالفت کی کہ کانگرس کے کوٹے میں کسی مسلمان کو شامل کیا جائے۔ اس طرح ایگزیکٹو میں بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی تعداد 6 ہندوؤں کی تعداد 6 کے برابر اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد 5 سے زیادہ ہو جاتی۔ چنانچہ پٹیل کے مؤقف کو غلبہ حاصل ہوا اور کانگرس مجلس عاملہ نے گاندھی کا مؤقف رد کر دیا......ان کی رائے تھی کہ اگر کانگرس کی طرف سے کسی مسلمان کو شامل کرنا مقصود ہے تو پھر آزاد کو ہونا چاہیے لیکن سب کی عمومی رائے تھی کہ اس سے پوری سکیم معطل ہو کر رہ جائے گی۔''[11] پیارے لال لکھتا ہے کہ'' وائسرائے کے دوستانہ لہجے اور ملک کو درپیش بحرانوں کے پیش نظر جن میں خوراک کی قلت اور آمدہ ریلوے ہڑتال شامل تھے، مجلس عاملہ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ بقیہ معاملات کو تعطل کی حد تک طول دیا جائے۔ چنانچہ مجلس عاملہ نے 18 رجون کے اجلاس میں عبوری حکومت کی مجوزہ سکیم کو منظور کرنے کا غیر حتمی فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں قرارداد کا مسودہ بھی ترتیب دے دیا گیا۔ لیکن اسے وائسرائے کو نہ بھیجا گیا کیونکہ مجلس عاملہ خان عبدالغفار خان سے جو اگلے روز یہاں پہنچنے والا تھا، خاص طور پر عبدالرب نشتر کے مسلم لیگ کی فہرست میں تقرر کے بارے میں رائے جاننا چاہتی تھی۔''[12] جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ کانگرس نشتر کے معاملے پر زیادہ زور نہ دینا چاہتی تھی اور یہ مسئلہ حل پذیر تھا، اسے تعطل کی حد تک نہیں بڑھایا جا سکتا تھا۔ یاد رہے کہ بعد ازاں غفار خان نے اس بنیاد پر یہ اعتراض نہ اٹھایا کیونکہ وہ سرے سے حکومت میں شمولیت ہی کے خلاف تھا اور اس کے لیے یہ بے معنی تھا کہ کون اس میں شامل ہے۔ کانگرس مجلس عاملہ کا غیر حتمی فیصلہ دانشمندانہ تھا اور ان کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان اور بالخصوص آزاد کی شمولیت کے معاملے پر جناح کسی حالت میں اتفاق نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجتاً ساری سکیم معطل ہو

کر رہ سکتی تھی اور ملک جس انتشار کے دہانے پر کھڑا تھا اس کا شکار ہو سکتا تھا۔

اسی روز یعنی 18 رجون کو ویول نے جناح کے ساتھ ملاقات میں جب کانگرس کے مبینہ اعتراضات سے آ گاہ کیا تو بقول ویول ''اس نے مہتاب کی جگہ سرت بوس کی شمولیت کو بلاتبصرہ قبول کر لیا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ کانگرس کی جانب سے کانگرسی ہندو کی نشست پر ذاکر حسین کا نام تجویز کیے جانے کا امکان ہے تو اس نے کہا کہ یہ مطلقاً اور کلیتہً نا قابل قبول ہے۔ وہ گفتگو کے دوران بار بار پلٹ کر ذاکر حسین کو ایک بھانڈ قرار دیتا رہا۔ اس نے کہا کہ اگر میں نے اسے قبول کر لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔''[13] حالیہ انتخابات میں مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی کے بعد اسے مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت کا جو درجہ حاصل ہوا تھا اس کے پیش نظر جناح کا مؤقف حق بجانب تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ مجلس عاملہ نے بھی اسی روز اپنے اجلاس میں فیصلہ کر کے ویول کو آ گاہ کیا کہ اگر مسلم لیگی کے علاوہ کسی مسلمان کو نامزد کیا گیا تو مسلمانان ہند کی جانب سے اس پر شدید ردعمل ہوگا، ہمارے نزدیک یہ ''نہایت اہم اور بنیادی بات ہے۔''[14]

ان حالات میں 18 رجون کو کانگرس مجلس عاملہ کا مذکورہ ''غیر حتمی'' فیصلہ انتہائی دانشمندانہ اور مثبت تھا اور پٹیل کا ایک ہندو کے طور پر کھلا مؤقف اختیار کرنا بھی قابل داد تھا۔ اس قسم کی صاف گوئی اختیار کر کے ہی مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کی راہ نکل سکتی تھی اور 18 رجون کی فضا میں یہ لگتا تھا کہ تصفیہ ہونے والا ہے۔ لیکن گاندھی اپنی تمام تر منافقت کے ساتھ درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے روز یعنی 19 رجون کو بقول پیارے لال ''باپو نے آج مجلس عاملہ کو حتمی نوٹس دے دیا ہے کہ اگر انہوں نے نیشنلسٹ مسلم کو شامل نہ کرنے اور این۔ پی۔ انجینئر کو شامل کرنے کے حق میں منظوری دے دی...... تو میرا اس معاملے کے ساتھ کوئی سروکار نہیں ہوگا اور میں دہلی سے چلا جاؤں گا۔''[15] گاندھی کی اس قسم کی بلیک میلنگ اکثر کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس مرتبہ بھی ہو گئی۔ فضا میں جو مثبت رنگ آیا تھا وہ پھر سے منفی ہو گیا۔ صورت حال میں اس تبدیلی کی اطلاع 20 رجون کی صبح کو راج گوپال اچاریہ نے مشن کو دی۔ اس کی اطلاع کے مطابق کانگرس مجلس عاملہ اس بات پر رضامند ہو گئی تھی کہ اگر کانگرس کے کوٹے میں کسی مسلمان کو شامل کرنا ہی ہے تو پھر آزاد کو شامل کرنا چاہیے۔ آزاد نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب گاندھی نے سختی

سے دباؤ ڈالا تو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا۔"[16] یہ اطلاع ملنے پر مشن کی جانب سے کرپس نے فوری طور پر آزاد کے ساتھ ملاقات کی۔ آزاد نے کہا کہ مجلس عاملہ میں مجھے بہت زیادہ دباؤ کا سامنا ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس معاملہ میں گاندھی کے ساتھ بات کی جائے۔ چنانچہ کرپس نے فوراً بعد گاندھی کے ساتھ ملاقات کی۔ گاندھی نے کہا کہ آپ آزاد کے ساتھ بات کریں۔ کرپس نے کہا کہ میں اس سے بات کر چکا ہوں اور اس نے تجویز کیا ہے کہ آپ کے ساتھ بات کی جائے۔ اس پر گاندھی سٹپٹایا اور بولا: "اس نے ہم دونوں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" بہرصورت اس ملاقات میں گاندھی نے اپنے مؤقف کا اعادہ کیا اور کہا کہ حکومت بنانے کا یہ طریقہ ہی غلط ہے۔ یا کانگرس یا لیگ دونوں سے کسی ایک کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے۔ انگریزوں کی طرف سے دونوں پر مخلوط حکومت تھوپی نہیں جا سکتی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اس معاملے پر تعطل پیدا ہو تو بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں کوئی بہتر بندوبست نکل آئے گا۔"[17] بقول پیارے لال "کرپس معذرت خواہ ہوا کہ اب اتنی دور آنے کے بعد نئے سرے سے آغاز نہیں کیا جا سکتا۔ جناح نہیں مانے گا...... آخر میں باپو نے کہا کہ اس صورت میں وزارتی مشن کا جو جی چاہے وہ کرے، میرا کوئی سروکار نہیں ہوگا۔"[18] مطلب صاف تھا کہ یا حکومت کانگرس کو دو ورنہ جو کرنا ہے کرلو کیوں کہ اسے یہ اچھی طرح یقین تھا کہ انگریز کانگرس کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ کرپس کی آزاد اور گاندھی کے ساتھ ملاقاتوں کے بعد اسی روز (20رجون) سہ پہر کو، کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں بقول پیارے لال "باپو نے نیشنلسٹ مسلمان شامل کئے جانے پر اپنے مؤقف کا اعادہ کیا۔ سردار (پٹیل) نے اس کی پرزور تائید کی اور کہا کہ ہم باپو سے روگردانی کر کے وزارتی مشن کے ساتھ معاملات طے کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ آخر میں یہ طے پایا کہ باپو کے تیار کردہ خط کا ڈرافٹ وزارتی مشن کو بھیجا جائے۔"[19] ان حالات میں پیتھک لارنس نے وزیر اعظم ایٹلی کو بذریعہ مراسلہ 20رجون کو اطلاع دی کہ کانگرس مجلس عاملہ مجوزہ ایگزیکٹو کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ لیکن گاندھی نے نیشنلسٹ مسلم کی شمولیت پر اصرار کر کے مجلس عاملہ کے اس فیصلے کو الٹ دیا ہے اور "اب یوں لگتا ہے کہ کانگرس کی طرف سے آزاد کے تقرر کے مطالبہ کے نتیجے میں مذاکرات ٹوٹ جائیں گے۔"[20]

ارکان مشن اور وائسرائے کے مابین داخلی تضاد کی شدت

اس صورت حال کے بارے میں ڈپٹی نائب وزیر ہند ڈبلیو کرافٹ نے جو مشن کے سٹاف میں ہمراہ آیا تھا، نائب وزیر ہند آرتھر ہینڈرسن کے نام 22 رجون کو اپنے مراسلے میں لکھا ''...... دراصل میں سوموار (18 رجون) کی شب وی۔ پی۔ مینن اور بعض دوسرے احباب کے ہمراہ رات کے کھانے پر تھا کہ مینن کو ٹیلی فون موصول ہوا۔ اس کے ایک خفیہ ذریعۂ معلومات نے کانگرس کیمپ کے اندر کی صورت حال کے بارے میں اطلاع دی کہ مجوزہ ایگزیکٹو کو قبول کرنے پر کانگرسی مجلس عاملہ کے 11 ارکان حق میں اور 4 ارکان مخالفت میں ہیں۔ جناح کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ کانگرس کی طرف سے پہلے فیصلہ کئے جانے کا انتظار کر رہا ہے کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے پہلے منظوری دے دی تو کانگرس منظوری دینے کی خاطر کہیں اور زیادہ رعایتیں حاصل نہ کر لے۔ تاہم ہمارا خیال نہیں تھا کہ اگر کانگرس نے مزید رعایتیں حاصل کئے بغیر منظوری دے دی تو جناح انکار کرے گا۔ لیکن آخری لمحے پر اس بڈھے (گاندھی) کا دباؤ پڑنے کی وجہ سے ساری کایا پلٹ ہوگئی جس نے بلاشبہ خود کو اس سارے معاملے میں نابغۂ بد ثابت کیا ہے۔ مجلس عاملہ کی اکثریت پہلے بھی اور بعد میں بھی نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر زور دینے کے خلاف تھی اور خود مجلس عاملہ کے دو نیشنلسٹ مسلم ارکان یعنی آزاد اور آصف علی بھی اس معاملے میں اکثریت کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن بڈھے نے یہ ضد کر کے اس معاملے کو پھر ایک بار طول دے دیا کہ میرے لیے یہ اصول کا سوال ہے کہ کانگرس کو کل ہند پارٹی کی حیثیت سے کردار ادا کرنا چاہیے۔ اب واقعی یہ اصول کا سوال ہے یا یہ کہ وہ مخلوط حکومت بنانے کے تصور کے ہی خلاف ہے، واضح نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ تسلسل کے ساتھ یہ موٴقف اختیار کئے رہا ہے کہ حکومت کانگرس کی ہو یا لیگ کی، مربوط ہونی چاہیے مخلوط نہیں۔ وہ لیگ کی حکومت ماننے کے لیے آمادہ ہے۔ بشرطیکہ دوسرے بھی آمادہ ہوں۔ لیکن بلاشبہ اس کے خیال میں لیگ کی حکومت زیادہ عرصہ نہ نکال سکے گی اور اس کی ناکامی کے نتیجہ میں خالص کانگرسی حکومت وجود میں آجائے گی جو یقیناً اس کی اور بیشتر کانگرسیوں کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔ [21]

اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے 21 رجون کی صبح کو مشن کے ارکان اور

وائسرائے کا اجلاس ہوا۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ آیا کانگرس کے انکار کی صورت میں مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے یا نہیں۔ ویول کا یہ مؤقف تھا اور جس کی اے۔وی۔ الیگزینڈر نے بھی حمایت کی کہ ان حالات میں مسلم لیگ کو اس کا مخصوص کوٹہ دے کر بقیہ کانگرسی نشستوں پر غیر کانگرسی یا سرکاری افسروں میں سے ہندوؤں کا تقرر عمل میں لایا جائے اور عبوری حکومت تشکیل دے دی جائے۔ کرپس کا مؤقف تھا کہ پہلے یہ معاملہ جناح کے ساتھ زیر بحث لایا جائے۔ اگر جناح معقول شرائط پر حکومت بنانے سے انکار کریں تو پھر کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے۔ ویول نے اس کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا کہ اگر جناح نے کسی وجہ سے انکار کیا تو پھر میں تمام تر سرکاری افراد پر مشتمل ایگزیکٹو تشکیل دوں گا۔ اے۔وی۔ الیگزینڈر نے بھی کرپس کی مخالفت کی اور کہا کہ چونکہ ہمارے 16رجون کے اعلان کے مطابق زیر بحث حالات میں عبوری حکومت میں شمولیت کے لیے 16رمئی کے اعلان کردہ وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری ضروری ہے اور کانگرس نے ابھی اسے منظور نہیں کیا ہے اس لیے کانگرس کو حکومت بنانے کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ کرپس نے کہا کہ میں آپ کی اس رائے کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ اگر ضروری ہے تو یہ معاملہ کابینہ کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ پیتھک لارنس نے جو ان دونوں مخالف آراء کے بین بین چلنے کی کوشش کر رہا تھا، کہا کہ کابینہ کے ساتھ ذاتی صلاح و مشورہ لندن جا کر کیا جائے تو تب ہی اس بارے میں کوئی فیصلہ ہوسکتا ہے۔ اس نے کرپس کی اس رائے کے ساتھ اتفاق کیا کہ جناح کو حکومت بنانے کی دعوت دینے سے قبل یہ طے ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ شرائط کیا ہوں گی۔ اگر وہ دوبارہ 2:5:5 کے فارمولے کو اختیار کرنے پر اصرار کریں یا اپنی کوئی اور شرط منوانے کی کوشش کریں اور مفاہمت نہ ہو سکے تو پھر اس صورت میں سرکاری افراد پر مشتمل ایگزیکٹو عارضی طور پر تشکیل دے دی جائے یہاں تک کہ مشن کے ارکان واپس لندن جا کر کابینہ سے یہ فیصلہ حاصل کریں کہ لیگ کے بغیر صرف کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے۔ کرپس نے کہا کہ اس صورت میں ہمیں ہندوستان میں یہ اعلان کرنا ہوگا کہ صلاح مشورے کے قلیل عرصے کے لیے سرکاری ایگزیکٹو کا یہ بندوبست بالکل عارضی ہے۔[22]

اس اجلاس میں مشن کے ارکان کے مابین اختلافات شدید حد تک کھل کر سامنے آ

گئے۔ ویول اپنے روزنامچے میں کرپس کی جانب سے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت کی تجویز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے "کرپس نے اپنی کانگرس نوازی کا بھرپور مظاہرہ کیا اور کہا کہ اگر اس کی یہ بات نہ مانی گئی تو وہ استعفیٰ دے دے گا...... اب کرپس بے تکلفی سے استعفیٰ کی دھمکیاں دیتا ہے۔ غالباً یہ تیسری یا چوتھی مرتبہ تھی کہ اس نے یہ دھمکی دی ہے۔"[23] اس اجلاس میں کرپس نے واضح طور پر گاندھی کے اس مؤقف کی حمایت کر دی تھی کہ لیگ یا کانگرس کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے۔ باوجود اس کے کہ کانگرس نے مشن کی نہ تو 16 رمئی اور نہ 16 رجون کو پیش کردہ سکیموں کو قبول کیا تھا، کرپس کانگرس کو حکومت حوالے کرنے کے حق میں تھا۔ مخلوط حکومت کے امکانات معدوم ہوتے جارہے تھے۔ 21 رجون کو کانگرسی مجلس عاملہ کے اجلاس میں بقول پیارے لال "باپو نے تمام ارکان کو متنبہ کیا کہ اگر گھٹنے ٹیک کر نیا سودا قبول کیا تو ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنے اس خیال کا اعادہ کیا کہ اگر وزارتی مشن نے ہماری شرائط تسلیم نہ کیں تو پھر بہتر ہوگا کہ عبوری دور کے لیے مرکز میں مسلم لیگ کو حکومت بنانے دی جائے۔"[24] چونکہ دو کے علاوہ باقی تمام صوبوں میں کانگرس کی حکومتیں تھیں۔ اس لیے وہ بڑی آسانی کے ساتھ مرکز میں لیگ کی حکومت کو ناکام بنا سکتی تھیں۔ اس خدشے کا اظہار وائسرائے کے معاون جارج ایبل نے 21 رجون کے متذکرہ اجلاس کے دوران کیا تھا اور ڈبلیو کرافٹ نے ہینڈرسن کے نام اپنے مراسلے میں بھی کیا تھا۔ اس لیے صرف مخلوط حکومت ہی عبوری دور میں امن وامان کی ضمانت دے سکتی تھی۔

عبوری حکومت کی تشکیل اور گروپنگ کے مسئلہ پر لیگ کانگرس تضاد کی شدت

اس دوران ایک اور مسئلہ کھڑا کر کے کانگرس نے عدم مفاہمت کا جواز بنانے کی کوشش کی۔ اس کی تفصیل یہ تھی کہ 19 رجون کو جناح نے ایک خط میں ویول سے بعض وضاحتیں اور بعض امور پر یقین دہانیاں طلب کی تھی جو یہ تھیں:

1۔ کیا مجوزہ عبوری حکومت کی حیثیت حتمی ہے یا اس میں کسی متعلقہ فریق یا فرد کی ایماء پر ردو بدل ممکن ہے؟

2۔ کیا عبوری دور میں 14 ارکان کی تعداد میں کوئی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے؟

3۔ اقلیتوں کے چار نمائندوں اچھوت، سکھ، ہندوستانی عیسائی اور پارسی میں سے کوئی عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت رد کر دیتا ہے تو اس صورت میں اس اسامی یا اسامیوں کو کس طرح پر کیا جائے گا اور کیا اس سلسلے میں مسلم لیگ کے رہنماؤں سے مشورہ اور منظوری حاصل کی جائے گی؟

4۔ (ا) کیا مجوزہ فارمولے میں فرقہ وارانہ تناسب کو عبوری دور میں برقرار رکھا جائے گا؟
(ب) مذکورہ چار اقلیتوں کی نمائندگی کی کسی ردوبدل کے بغیر پابندی کی جائے گی؟

5۔ ابتدائی تجویز میں بارہ کی جگہ چودہ ارکان کا فارمولا وضع ہونے کے بعد بھی یہ شق موجود رہے گی کہ ایگزیکٹو کونسل کسی بھی بڑے فرقہ وارانہ معاملہ پر فیصلہ نہیں دے گی اگر مسلم ارکان اس کی مخالفت کریں گے۔[25]

ان وضاحتوں کے جواب میں ویول نے 20 / جون کو جناح کے نام خط میں لکھا کہ:

1۔ جن افراد کو عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت دی گئی ہے جب تک ان سب کی جانب سے قبولیت کی اطلاع موصول نہیں ہو جاتی، ناموں کو حتمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اعلان کردہ اصول میں کوئی ردوبدل دونوں پارٹیوں کے مشورے کے بغیر عمل میں نہیں لایا جائے گا۔

2۔ دونوں پارٹیوں کے مشورے کے بغیر 14 کی تعداد میں تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

3۔ اگر اقلیتوں کی نشستوں پر کوئی اسامی پیدا ہوئی تو اسے پر کرنے کے لیے دونوں پارٹیوں سے مشورہ کیا جائے گا۔

4۔ فرقوں کا تناسب بھی دونوں پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر نہیں بدلا جائے گا۔

5۔ کسی بھی بڑے فرقہ وارانہ معاملہ پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر کسی بھی ایک فرقے کے ارکان کو اس پر اختلاف ہوگا، کانگرس کے صدر کو اس نکتے سے آگاہ کیا جا چکا ہے اور وہ اس کو درست سمجھتے ہیں۔[26]

21 / جون کو جناح کے 19 / جون کے خط کے بعض مندرجات پریس میں شائع ہو گئے۔ جس پر کانگرس نے طوفان کھڑا کر دیا کہ جناح نے کانگرس کی نامزدگیوں پر اعتراضات وارد کئے ہیں۔ آزاد نے اس بابت 21 / جون کو ویول کو خط لکھا جس کے جواب میں ویول نے

جناح کے خط کا متذکرہ اقتباس اور اس کے جواب میں اپنے خط کے مندرجات کا متن آزاد کو بھیج دیا۔ اس پر کانگرس کو یہ اعتراض ہوا کہ اچھوت کی نشست پر تقرری کو ویٹو کرنے کا حق مسلم لیگ کو کیسے دیا جاسکتا ہے۔ جب کہ اچھوت کی نشست کانگرس کی مخصوص چھ نشستوں کے کوٹے کا حصہ ہے۔ اگر اچھوت کی نشست جداگانہ ہے اور اس اسامی کو پُر کرنے کے معاملے میں لیگ کو بھی دخل ہے تو پھر کانگرس کی نشستیں تو صرف پانچ ہی رہ گئیں اور ایک بار پھر چور دروازے سے پیریٹی یعنی 5 کانگرس، 5 مسلم لیگ والا اصول در آ گیا ہے۔ بقول پیارے لال ''اس پر مجلس عاملہ میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وائسرائے نے اگر لیگ کے ساتھ گٹھ جوڑ نہیں بھی کیا ہوا تو کم از کم وہ اس کے ساتھ جانبداری کا ثبوت ضرور دے رہا ہے۔''[27] کانگرس کو عدم مفاہمت کا اچھا جواز مل گیا تھا۔

22 رجون کی صبح کرپس نے سدھیر گھوش کے ساتھ ملاقات میں کہا کہ ''نیشنلسٹ مسلمان کے بارے میں کانگرس کا مؤقف مطلقاً منطقی اور جائز ہے لیکن کیا کانگرس اپنے اس حق سے دستبردار نہیں ہوسکتی؟ کرپس نے انکشاف کیا کہ مولانا صاحب کی جانب سے ہمیں یہ یقین دہانی موصول ہوئی تھی کہ مجلس عاملہ اس معاملے پر اٹک کر نہیں رہ جائے گی۔ ہم نے اسی یقین دہانی پر پیش رفت کی تھی۔''[28] انہی دنوں آزاد نے اس سلسلے میں ایک خط میں تحریری طور پر وائسرائے کو یقین دہانی کرائی تھی جس کا مجلس عاملہ کو علم نہیں تھا۔ 23 رجون کو یہ خط وائسرائے کے معاون ایبل نے گاندھی کی معاون راجکماری امرت کور کو دکھایا اور بتایا کہ ہم نے اس کی بنیاد پر پیش رفت کی تھی۔''[29] گویا آزاد کی ذاتی طور پر حتی الامکان کوشش تھی کہ کسی طرح مفاہمت کی راہ نکل آئے اور عبوری نوعیت کے معمولی مسئلوں پر الجھنے کے بجائے طویل المیعاد منصوبے کو عمل میں لانے کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ لیکن گاندھی اور مجلس عاملہ کے دیگر ارکان کے ہاتھوں میں اس کی حیثیت محض ایک مہرے کی تھی جسے وہ جب چاہتے تھے اپنے مقاصد کے لیے سیاسی چال کے طور پر چل دیتے تھے۔ جیسے اب انہوں نے ڈیڈ لاک کی صورت پیدا کر دی تھی۔

22 رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے اجلاس میں اس ڈیڈ لاک کو توڑنے کے لیے اقدام پر غور و فکر کیا۔ اس سلسلے میں کانگرس کے نام خط کے مواد پر بحث ہوئی۔ کرپس نے جو مسودہ پیش کیا اس میں کانگرس کو بعض مزید رعایتیں ایسی دی گئی تھیں کہ ویول کے مطابق جناح ان کی مخالفت میں بالکل آخری سرے تک جاسکتا تھا۔ کافی بحث و مباحثے کے بعد

ویول کے معاون ایبل کے تیار کردہ مسودے میں ردوبدل کر کے اتفاق رائے کے ساتھ اسے ویول کی طرف سے آزاد کے نام ارسال کر دیا گیا۔ اس میں عبوری حکومت میں کانگرس کی مخصوص نشستوں پر اپنی مرضی سے کسی مسلمان کے تقرر کے بارے میں صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ ''جن اسباب سے آپ بخوبی واقف ہیں ان کے پیش نظر وزارتی مشن اور میرے لیے آپ کی یہ درخواست قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔'' مزید کہا گیا کہ جیسا کہ 16 رجون کے اعلان میں بھی واضح کر دیا گیا ہے، عبوری حکومت کی ہیئت ترکیبی کو مستقبل کے لیے مثال نہیں بنایا جائے گا اس لیے ''ہم کانگرس سے درخواست کرتے ہیں کہ اس مطالبے پر زور نہ دے اور مضبوط عبوری حکومت میں شرکت اختیار کرے جس کی کہ ملک کو اشد ضرورت ہے۔''[30] ☆ مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا کہ کانگرس کے انکار کی صورت میں ''اگر جناح نے حکومت تشکیل دی تو ہر ممکن حد تک آئین سازی کے عمل کو بھی آگے بڑھایا جائے گا اور ہر قیمت پر کوشش کی جائے گی کہ آئین ساز اسمبلی کے گروپ ب اور ج عمل میں آجائیں۔''[31] لیکن یہ محض مفروضوں کی باتیں تھیں، حقیقت میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے پیش نظر کانگرس کو نظر انداز کر کے برطانوی حکام کا کوئی اقدام کرنا عبث تھا۔

اگلے روز یعنی 23 رجون کو علی الصبح پیتھک لارنس گاندھی کی پرارتھنا سبھا میں شرکت کے لیے بالمیکی مندر پہنچ گیا۔ جہاں وہ پہلے بھی کئی مرتبہ جا چکا تھا۔ اس روز یہاں اس نے گاندھی، سروجنی نائیڈو اور پٹیل کے ساتھ بات چیت کی۔ پٹیل نے بتایا کہ گزشتہ دو روز کے دوران وائسرائے کی جانب سے جو دو خطوط موصول ہوئے ہیں انہوں نے معاملہ صاف کر دیا ہے۔ اس نے تین باتوں پر زور دیا۔ ایک تو یہ کہ کانگرس کے صدر نے عبوری حکومت میں فرقہ

☆ یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ وی۔ پی۔ مینن نے آزاد کے نام اس خط کو ویول کی جانب سے جناح کو تحریر کردہ ظاہر کیا ہے۔ اور اسے بھی ویول کی جناح کو یقین دہانی سے تعبیر کرتے ہوئے عبوری حکومت کے مسئلہ پر عدم تصفیہ کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ (مینن۔ ص 277)

مزید یہ کہ مینن کی اس غلطی کا اعادہ آر۔ سی۔ موجمدار نے بھی کیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ وائسرائے کا جناح کے سامنے بالکل ہتھیار ڈال دینا مشکل سے سمجھ میں آتا ہے۔ (موجمدار۔ ص 768)

یہ ان مورخوں کا سہو ہے یا بد دیانتی؟

وارانہ رائے شماری پر کبھی بھی اتفاق نہیں کیا۔ دوئم یہ کہ اقلیتوں کے نمائندوں کی تبدیلی پر وائسرائے کا دونوں بڑی پارٹیوں کے ساتھ مشورہ کرنے کا مطلب ہے کہ جناح کو ویٹو کا حق دے دیا گیا ہے۔ سوئم یہ کہ فرقہ وارانہ تناسب میں دونوں بڑی پارٹیوں کے مشورے کے بغیر کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ تینوں اعتراض گنوانے کے بعد پٹیل نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ہر معاملے میں مسلم لیگ کے نیچے لگ گئے۔ پیتھک لارنس نے کہا کہ ایسی بات نہیں ہے، جناح نے بھی بہت چیزیں چھوڑی ہیں اور اس نے 16 رمئی کا وزارتی مشن منصوبہ بھی منظور کرلیا ہوا ہے۔ اس پر پٹیل بول اٹھا کہ ہم نے بھی یہ دستاویز قبول کر لی ہے اور ہم بھی طویل المیعاد منصوبے پر عمل پیرا ہوں گے خواہ عبوری حکومت کا فیصلہ کچھ بھی ہو۔[32] یہ پہلا موقع تھا کہ انکشاف ہوا کہ کانگرس 16 رمئی کی مشن دستاویز کو منظور کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن چونکہ اس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا اس لئے پٹیل کے اس بیان کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی...... اس کے اعلان کے ساتھ عبوری حکومت کا معاملہ لازم وملزوم کے طور پر جڑا ہوا تھا۔

پٹیل کے ان خیالات کو پیتھک لارنس نے اسی صبح کو مشن اور وائسرائے کے باہم اجلاس میں پیش کیا۔ گزشتہ شام سدھیر گھوش اور راج گوپال اچاریہ بھی پیتھک لارنس کو کانگرس مجلس عاملہ میں پائی جانے والی معاندانہ فضا سے آگاہ کر چکے تھے۔ ان دونوں کی اطلاع کے مطابق کانگرس نے مجوزہ ایگزیکٹو کو رد کرنے کا تقریباً فیصلہ کر لیا ہوا تھا اور ان دونوں کی رائے تھی کہ کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ ملاقات ضروری ہے۔ چنانچہ اسی روز مشن کے ارکان اور وائسرائے نے کانگرس مجلس عاملہ کے چار سرکردہ رہنماؤں آزاد، نہرو، پٹیل اور راجندر پرشاد کے ساتھ اکٹھے ملاقات کی۔ مشن کی جانب سے مؤقف اختیار کیا گیا کہ ہم کانگرس کے نیشنلسٹ کردار سے بخوبی واقف ہیں اور ہم جناح کے اس نقطۂ نگاہ کے بھی حامی نہیں ہیں کہ مسلم لیگ پوری مسلم رائے عامہ کی نمائندہ ہے، لیکن اس وقت عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے ہم نے کانگرس کے صرف ان دلائل کو پیش نظر رکھا جن کا اعادہ 16 رجون سے پہلے کیا گیا تھا اور انہی کی روشنی میں حکومت کے ارکان کی ایسی فہرست مرتب کی گئی کہ دونوں پارٹیوں کو قابل قبول ہو۔ نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر زور بعد میں دیا گیا ہے۔ اس لیے ان حالات میں ہماری درخواست یہی ہے کہ اپنے نیشنل کردار اور مقام سے دستبردار ہوئے بغیر آپ اس

نکتے پر زور نہ دیں ورنہ ہندوستان کا تمام تر مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔ کانگرس نے مؤقف اختیار کیا کہ نیشنلسٹ مسلمان کی تقرری کے معاملے کو کانگرس نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اگر ایک بار عبوری طور پر ہی سہی پیریٹی کو قبول کر لیا گیا تو مستقبل میں ہمیشہ کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ نہرو نے ایگزیکٹو میں فرقہ وارانہ رائے شماری پر اعتراض اٹھایا۔ پیتھک لارنس نے جواب دیا کہ آپ نے خود اور آزاد نے میرے ساتھ ملاقات میں فرقہ وارانہ رائے شماری کے حق میں تجویز دی تھی۔ ویول نے بھی کہا کہ کانگرسی رہنماؤں سے اس بارے میں پہلے بھی کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ بحث پھر دوبارہ کانگرسی مسلمان یا نیشنلسٹ مسلمان کی ایگزیکٹو میں شمولیت کے مسئلے پر چل پڑی۔ کرپس نے کہا کہ صوبائی حکومتوں میں کانگرس کی وزارتوں میں مسلمان شامل ہیں اور یوں اس کا نیشنلسٹ کردار برقرار ہے۔ اے۔ وی۔ الیگزینڈر نے کہا کہ 16 رجون سے پیشتر مسئلہ صرف پیریٹی کا تھا جس کو حل کرنے کے لیے واضح طور پر کانگرس کے لیے 6 ہندو نشستیں رکھی گئیں اور یہ کئی روز تک بات چیت اور خط و کتابت میں زیر بحث رہیں تب نیشنلسٹ مسلمان کا معاملہ نہ اٹھایا، جب 16 رجون کو ہم نے اعلان جاری کر دیا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مزید کہا کہ ''ساری دنیا کی نظروں کے سامنے یہ ایک انتہائی المناک بات ہوگی کہ اتنے طویل مذاکرات اس طرح اس بات پر آ کر ٹوٹ جائیں۔'' لیکن کانگرسی رہنما بدستور اپنی ضد پر قائم رہے اور آخر پر انہوں نے یہ تاثر دیا کہ ہم اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے باوجود اپنے حامیوں کو اس بات پر قائل نہیں کر سکتے جو مشن چاہتا ہے۔''[33] چنانچہ یہ طویل بحث بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ گاندھی اور اس کے زیر اثر کانگرس نے ہندو بورژوا کی امنگوں کی تکمیل کرتے ہوئے ایک کے بعد ایک بہانہ بنا کر عبوری دور میں بھی مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت کی تشکیل کا امکان ختم کر دیا۔

گاندھی اور کانگرس کو اپنے عزائم کی تکمیل کسی حد تک وزارتی مشن کی 16 رمئی کی اعلان کردہ دستاویز میں نظر آتی تھی۔ اس میں قابل اعتراض معاملہ گروپنگ کا تھا تو اس کے لیے گاندھی کے ''قانونی ذہن'' نے متعلقہ پیروں (15 اور 19) کی اپنے موافق تشریح کر دی تھی اور جس کا کانگرسی مجلس عاملہ کی طرف سے 24 رمئی کو اعلان کیا گیا تھا۔ اگرچہ مشن نے 25 رمئی کے بیان میں اسے تسلیم نہیں کیا تھا لیکن کانگرس اپنی تشریح کو منوانے اور دوسرے کئی طریقوں سے

گروپنگ کوسبوتاژ کرنے کے بارے میں کافی پرامید تھی۔ چنانچہ 23/جون کی سہ پہر کو کانگرس مجلس عاملہ کے اجلاس میں گاندھی نے زور دے کر یہ رائے دی کہ "کانگرس کو عبوری حکومت سے علیحدہ رہنا چاہیے لیکن آئین ساز اسمبلی میں شامل ہوجانا چاہیے کہ یہ ایک منتخب ادارہ ہوگی جس کی نمائندہ حیثیت برطانوی حکومت بھی تسلیم کرتی ہے۔ وائسرائے اس کے کام میں دخل نہ دے سکے گا......اگر حالات بد سے بدتر بھی ہو گئے تو یہ ایک باغی ادارہ بن جائے گی......" بصورت دیگر اس نے کہا کہ "مقابلہ کرنے کا کوئی اور امکان نظر نہیں آتا کیونکہ آنے والے وقت میں عدم تشدد کا ماحول برقرار نہیں رہے گا۔ خود میں ذاتی طور پر سول نافرمانی شروع کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔"[34] ظاہر ہے کہ انتشار اور خلفشار کے نتیجے میں حالات کے بے قابو ہونے کا اندیشہ تھا جس کی ہندو بورژوا کبھی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

ابھی کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس جاری تھا کہ گاندھی کی توجہ ایک اور مسئلہ کی جانب دلائی گئی۔ اس کی تفصیل یہ تھی کہ وائسرائے کی جانب سے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے کاروائی کا آغاز ہو چکا تھا اور صوبائی اسمبلیوں کے سپیکروں کو وہ فارم جاری کر دیئے گئے تھے جن پر اس انتخاب کے لیے امیدواروں نے اپنی نامزدگی جمع کروانی تھی۔ ان میں امیدوار ہونے کی شرائط کے خانے میں درج تھا کہ امیدوار ایک اقرار نامہ بھی جمع کرائے گا کہ وہ "......مشن کی دستاویز کے پیراگراف 19 کے مقاصد کی خاطر اپنے صوبے کے نمائندے کے فرائض انجام دے گا۔" کانگرس کو اس پیراگراف میں گروپنگ سے متعلقہ شقوں پر سخت اعتراض تھا اور وہ آئین ساز اسمبلی میں جانے سے پہلے خود کو اس پیراگراف کا پابند کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو اسمبلی میں جا کر پہلا کام ہی گروپنگ کو سبوتاژ کئے جانے کا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ گاندھی نے کہا "اب تو آئین ساز اسمبلی والا منصوبہ بھی غرق ہوگیا۔ مجھے خدشہ ہے کہ ہم اسے چھو بھی نہیں سکتے۔"[35]

کرپس اور پیتھک لارنس کے ایماء پر گاندھی اور کانگرس کی چال، اعلان 16/مئی منظور۔ اعلان 16/جون نامنظور

لیکن اسی رات (23/جون) کو صورت حال نے ایک اور ایسا موڑ کاٹا جس کے نتیجے میں لیگ کانگرس تضاد میں کانگرس کی مکمل جیت کی راہ ہموار ہوگئی۔ یہ موڑ کرپس نے پیتھک

لارنس کی رضامندی سے دیا جو ہر صورت سے ہندو بورژوا کو کامیابی سے ہمکنار دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ کرپس نے رات کو سدھیر گھوش کو بلایا اور اس سے کہا کہ ہم نے (یعنی اس نے اور پیتھک لارنس نے) فیصلہ کیا ہے کہ اگر کانگرس طویل المیعاد منصوبہ قبول کر لے اور قریب المیعاد تجویز کو رد کرے تو وزارتی مشن نے اب تک 16/جون کے اعلان کے مطابق عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب کالعدم قرار پاجائے گا اور نئے سرے سے کوششوں کا آغاز کیا جائے گا۔ انہوں نے اس سلسلے میں گاندھی اور پٹیل کے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ ''معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس ابتری کا ازالہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جو ویول کی طرف سے جناح کو کرائی گئی یقین دہانیوں نے پیدا کر دی تھی۔''[36]

اگلے روز (24/جون) علی الصبح سدھیر گھوش نے آ کر گاندھی کو اس امر کی اطلاع دی۔ چنانچہ صبح سات بجے گاندھی اپنے ہمراہ پٹیل اور سدھیر کو لے کر کرپس اور پیتھک لارنس سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ ملاقات کے دوران اس نے کہا ''معلوم ہوا ہے کہ آپ عبوری حکومت کے تمام تر منصوبے پر اب تک ہونے والے سارے کام کو کالعدم قرار دینے اور بالکل نئے سرے سے ساری بات شروع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں......سدھیر کی بات سے مجھے اس وقت موجود تاریکی میں روشنی کی کرن نظر آئی ہے۔ لیکن کیا واقعی یہ روشنی ہے؟'' اس شبے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کی نامزدگی کے فارم میں پیراگراف نمبر 19 کے بارے میں دی گئی شرط کا ذکر کیا۔ کرپس اور پیتھک لارنس نے یہ یقین دہانی کرائی کہ اس خدشے کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ پٹیل مطمئن ہو گیا۔ لیکن گاندھی کو اطمینان نہ ہو سکا۔[37] طے پایا کہ رات کو مشن کے ارکان کے ساتھ دوبارہ ملاقات ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تک کے لیے گاندھی نے مون برت (چپ کا روزہ) رکھا ہوا تھا۔☆ تاہم گاندھی اور پٹیل نے آ کر مجلس عاملہ کو اس نئی پیش رفت کے بارے میں آگاہ کیا۔ جہاں تک 16/جون کی اعلان کردہ عبوری حکومت کی تجویز کا تعلق تھا، اسے رد کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہوا تھا۔ اب صرف 16/مئی کی دستاویز میں مجوزہ طویل المیعاد منصوبہ کو منظور یا نامنظور کرنے کا سوال رہ گیا تھا۔ نئی پیش رفت کے مطابق پٹیل اور

☆ گاندھی ہفتے میں ایک دن صبح سے شام تک چُپ کا روزہ رکھا کرتا تھا جسے مون کہا جاتا ہے۔ اس دوران وہ لکھ کر بات کیا کرتا تھا۔ 24 جون کے مون کا کانگرس کو یہ فائدہ ہوا کہ اسے سودے بازی کے لئے مزید مہلت مل گئی۔

مجلس عاملہ کے بیشتر ارکان کی رائے تھی کہ اسے منظور کرلیا جائے۔ لیکن گاندھی ابھی مزید یقین دہانیاں چاہتا تھا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ رات کو مشن کے ساتھ دوبارہ ملاقات کے بعد ہی 16 رمئی کی دستاویز کے بارے میں حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔

کرپس اور پیتھک لارنس نے جو چال چلی تھی اس کے مطابق کانگرس 16 رمئی کی دستاویز کے مشن منصوبہ کو مجوزہ عبوری حکومت کو رد کرنے کی صورت میں 16 رجون کے اعلان کے پیرا۔ 8 کی زد سے باہر نکل جاتی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ''اگر دونوں بڑی پارٹیاں یا دونوں میں سے کوئی ایک مخلوط حکومت کی تجویز کو رد کر دیتی ہے تو'' وائسرائے اس کے باوجود عبوری حکومت کی تشکیل کرے گا جو ان عناصر کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی کرے گی جو 16 رمئی کے منصوبے کو قبول کرتے ہیں۔'' چنانچہ کرپس اور پیتھک لارنس کی چال کے مطابق کانگرس بھی ''ان عناصر'' میں شامل ہونے کی شرط پر پوری اتر آتی تھی جن کی مدد سے وائسرائے نے اس کے باوجود عبوری حکومت تشکیل دینا تھی کہ کانگرس مجوزہ مخلوط حکومت کو رد کر دیتی۔ اس طرح یہ امکان کہ اگر کانگرس نے مجوزہ مخلوط حکومت کو رد کر دیا تو کانگرس کے بغیر مسلم لیگ کو شامل کر کے نئی ایگزیکٹو تشکیل دے دی جائے گی، خود بخود ختم ہو جاتا تھا۔

24 رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے کے باہم اجلاس میں کرپس اور پیتھک لارنس نے اس امکان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس میں پنہاں اپنی سازش کے عنصر کو منہا کر دیا اور علی الصبح ہونے والی ملاقات کا حوالہ دے کر گاندھی سے منسوب کر کے ساری بات بیان کی۔ پیتھک لارنس نے البتہ کہا کہ میں نے گاندھی اور پٹیل کے ساتھ ملاقات میں ان کو کہا کہ اگر کانگرس 16 رمئی کی دستاویز کو منظور کر لے تو وہ عبوری حکومت میں شمولیت کی خاطر مسلم لیگ کی سطح پر آ جائے گی۔ کرپس نے کہا کہ گاندھی کی رائے میں اگر وہ 16 رمئی کی دستاویز منظور کر لے اور 16 رجون کی مجوزہ عبوری حکومت رد کر دے تو موخر الذکر منصوبہ زمیں بوس ہو جائے گا اور نئی حکومت بالکل مختلف اصولوں پر وضع کی جائے گی۔ اس پر اے۔ وی۔ الیگزینڈر نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ چال بازی سے کام لے رہی ہے اور 16 رمئی کی دستاویز کو محض کاغذی منظوری دینا چاہتی ہے تاکہ 16 رجون کے اعلان کے پیرا۔ 8 کے تحت عبوری حکومت میں شامل ہو سکے اور اپنی مرضی کے مطابق اس پر کنٹرول حاصل کر سکے۔ ان کی طرف سے 16 رمئی کی دستاویز کی منظوری حقیقی نہیں ہوگی۔ وائسرائے نے اس کی تائید کرتے

ہوئے کہا کہ ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہیے کہ کانگرس نے 16رمئی کی دستاویز کو منظوری دے دی ہے تا آنکہ وہ اسے خلوص دل سے بلا حیل و حجت منظوری نہ دے دے۔ الیگزینڈر نے کہا کہ ''ہمیں جناح کے ساتھ ملاقات کر کے اسے بھی آگاہ کر دینا چاہیے کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں جب ہندوستان آیا تھا تو میں کسی کا طرفدار نہیں تھا بلکہ مجھے جناح کا رویہ اشتعال انگیز معلوم ہوا کرتا تھا لیکن میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ گزشتہ چھ ہفتے کے دوران کانگرس نے جس رویے کا اظہار کیا ہے ویسا شرمناک مظاہرہ میں نے اپنی ساری سیاسی زندگی میں کہیں نہیں دیکھا۔''[38] تاہم جناح کے ساتھ فوری ملاقات کا کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ جناح اور مسلم لیگ کو کچھ معلوم نہ تھا کہ در پردہ کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی کے ساتھ کیا ساز باز کی ہے۔ خود ویول اور الیگزینڈر کو بھی اس بارے میں علم نہیں تھا، انہیں محض شبہ تھا۔ ویول نے اس روز اپنے روزنامچے میں لکھا ''کرپس اب کہتا ہے کہ کانگرس عبوری حکومت کی تجویز کو رد کر کے 16رمئی کی دستاویز کو قبول کر رہی ہے، حالانکہ یہ وہ بات تھی جس کے بارے میں اس نے مجھے کل اور پرسوں یقین دہانی کرائی تھی کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اس سے ہماری جناح کے ساتھ پوزیشن خراب ہو جائے گی۔ میری دانست میں کرپس سے یہ بعید نہیں ہے کہ خود اس نے کانگرس کو اپنی ملاقاتوں کے دوران یہ مشورہ دیا ہو کہ ایسا کرنے سے ان کی چال چلنے کی پوزیشن بہتر ہو جائے گی۔''[39] ویول اس صورت حال پر سخت برہم ہوا اور اجلاس کے بعد اس نے پیتھک لارنس کی طرف سے ایک آئینی مشیر مقرر کرنے کی سفارش کے جواب میں کہا کہ ''...... مشن کی آمد سے بہت عرصہ پہلے سے میں اپنی سوجھ بوجھ پر انحصار کرتا آ رہا ہوں۔ اگر حکومت برطانیہ یا وزیراعظم میری جگہ کسی اور کو لانا چاہتے ہوں جس کا سیاسی تجربہ زیادہ ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''[40]

اس کے بعد اس منصوبہ پر عملدرآمد شروع ہو گیا جس کو کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی اور پٹیل کے ساتھ مل کر وضع کیا تھا۔ 24رجون کی دوپہر کو اس کے پہلے مرحلے کے طور پر گاندھی نے ایک مختصر خط تحریر کیا جسے آزاد کی جانب سے وائسرائے کو ارسال کر دیا گیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ''...... پوری طرح جائزہ لینے اور سوچ بچار کرنے کے بعد ہم بادل نخواستہ آپ کی وضع کردہ عبوری حکومت کی تجویز کو رد کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ مفصل اور مدلل جواب اس کے بعد بھیجا جا رہا ہے۔''[41] اس طرح 16رجون کی مجوزہ عبوری حکومت کے رد کرنے کے بعد

اب 16رمئی کی وزارتی مشن دستاویز کومنظور کرنے کا مرحلہ رہ گیا تھا۔ کانگرس مجلس عاملہ نے 24رجون کی سہ پہر کواس پرسوچ بچار کی۔ گاندھی اسے منظوری دینے سے پہلے ہر پہلو سے اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ گروپنگ کوسبوتاژ کرنے کے سلسلے میں مؤثر اقدامات اٹھائے جاسکیں۔ اس ضمن میں اس نے مجلس عاملہ میں ایک اور نکتہ اٹھا دیا۔ اس نے کہا کہ مشن منصوبہ میں مجوزہ آئین ساز اسمبلی کی ازروئے قانون حیثیت کیا ہوگی؟ کیونکہ ابھی برطانوی پارلیمنٹ نے اس کی منظوری نہیں دی ہے؟ یہ منظوری ملنے کے بعد ہی آئین ساز اسمبلی کا چیئرمین (سپیکر) کسی معاملے کو قابل فیصلہ عدالت قرار دینے کا مجاز ہوگا اور اسے فیڈرل کورٹ میں بھیج سکے گا۔ یاد رہے جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا، وہ گروپنگ کے معاملے کوآئین ساز اسمبلی میں متنازعہ قرار دلوانے کے بعد فیڈرل کورٹ میں لاکر اسے سبوتاژ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا دوسرا اعتراض آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کی نامزدگی کے فارموں میں پیرا۔19 کے الفاظ پر تھا۔ مجلس عاملہ میں پٹیل، سرت چندر بوس اور راجندر پرشاد اور دوسرے اراکین کا کہنا تھا کہ مشن کی طرف سے اس کی وضاحت کی جاچکی ہے۔ جوتسلی بخش ہے اور ویسے بھی پیرا۔19 گروپنگ کولازمی قرارنہیں دیتا ہے۔ لیکن گاندھی کواطمینان نہیں تھا۔

رات کوگاندھی اور پٹیل کی مشن کے تمام ارکان اور وائسرائے کے ساتھ ملاقات ہوئی اور متذکرہ بالا دونوں مسائل اُٹھائے گئے۔ گاندھی کی تسلی کرانے کی کوشش کی گئی اور کہا گیا کہ برطانوی حکومت اپنے قول وفعل کی پابند ہوتی ہے، اس لیے پارلیمنٹ کا ایکٹ ضروری نہیں ہے۔ گاندھی نے کہا کہ اگر وزیرہند کی تبدیلی ہوجائے یا حکومت کی تبدیلی ہوجائے یا برطانوی حکومت کی نیت بدل جائے تو کیا ہوگا؟ اسے جواب دیا گیا کہ حکومتیں بدلنے کے باوجود پچھلی حکومتوں کے اقوال واقرار کی پابندی کی جاتی ہے اور اگر پالیسی بدلنی ہوتواسے پارلیمنٹ کا ایکٹ بھی نہیں روک سکتا کیونکہ نئی حکومت پارلیمنٹ میں نیا ایکٹ پاس کرواسکتی ہے۔ دوسرے مسئلے پر بھی گاندھی کی تشفی کرائی گئی کہ آئین ساز اسمبلی کے امیدواروں سے جواقرارنامہ طلب کیا جارہا ہے، اس میں صرف آئین سازی کے مقاصد کی تکمیل کا اقرار درکار ہے، اس سے زیادہ اس کا کچھ مطلب مرادنہیں لیا جائے گا۔''[42] ویول لکھتا ہے کہ'اس قسم کی یقین دہانی کرانا بددیانتی پر مبنی تھا کہ اس کا وہ مطلب نہیں ہے جولیا جارہا ہے اور جب میں نے کہا کہ گروپنگ کوسکیم کے لازمی جزو

کی حیثیت حاصل ہے تو پیتھک لارنس نے مجھ سے کہا کہ اس پر زور نہ دو۔"[43] اس طرح گروپنگ کے معاملے میں بھی کانگرس کے مؤقف کے سامنے جھکنے کا عمل شروع ہو گیا۔

نامزدگی فارموں پر متذکرہ اقرار نامے کی شرط سے پیدا شدہ تنازعہ دور کرنے کے لیے حکومت ہند نے ایک وضاحتی اعلامیہ جاری کر دیا ہوا تھا۔ تاہم اس کے بعد بھی گاندھی کی تشویش پوری طرح رفع نہیں ہوئی تھی۔ مشن اور وائسرائے سے ملاقات کے بعد واپس جا کر اس نے کرپس کو ایک خط لکھا کہ "......اگرچہ مجلس عاملہ آئین ساز اسمبلی میں جانے کے لیے آمادہ ہے لیکن میں انہیں تاریکی میں چھلانگ لگانے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" نامزدگی فارم کے سلسلے میں جاری کردہ ہدایات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ "......اگرچہ یہ بے ضرر معلوم ہوتی ہیں لیکن ایک خوفناک صورت بھی عیاں کرتی ہیں۔ اس لیے میں مجلس عاملہ کو یہی مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ طویل المیعاد منصوبے کو عبوری حکومت کے ساتھ مربوط کئے بغیر قبول نہ کریں۔ مجھے اپنے الہام کے برعکس نہیں جانا چاہیے......میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ خطرے کی گھنٹیاں بج رہی ہیں......میرے پاس کوئی ٹھوس شے موجود نہیں ہے۔"[44] گویا گاندھی یہ چاہتا تھا کہ وزارتی مشن کے طویل المیعاد منصوبے کو قبول کرنے کے ساتھ عبوری حکومت کا کانگرس کو حوالے کیا جانا مشروط کیا جائے۔

کانگرس کو حکومت دینے کے سلسلے میں کرپس نے 21رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے کے اجلاس میں سخت مؤقف بھی اختیار کیا تھا کہ اگر مسلم لیگ "معقول شرائط" پر حکومت بنانے میں ناکام رہے تو پھر کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے جبکہ صورت یہ تھی کہ کانگرس نے 16رجون اور 16رمئی کے مشن کے اعلانات میں سے کسی کو بھی منظور نہیں کیا تھا۔ اس موقع پر کرپس نے کہا تھا کہ اس معاملے کو پوری کابینہ کے سامنے پیش کیا جائے اور ساتھ ہی اس نے استعفیٰ دینے کی بھی دھمکی دی تھی۔ اس سلسلے میں لندن واپسی پر کابینہ سے منظوری لینے کے لیے پیتھک لارنس نے بھی آمادگی ظاہر کی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی بھرپور تائید وحمایت کی موجودگی میں گاندھی چاہتا تھا کہ نہ صرف آئین ساز اسمبلی پر غلبہ حاصل کیا جائے بلکہ عبوری حکومت پر بھی بلاشرکت غیرے قبضہ کیا جائے اور دونوں باتوں کو باہم مربوط کر کے قبول کیا جائے۔ کیونکہ عبوری حکومت پر کنٹرول حاصل کئے بغیر آئین ساز اسمبلی میں جانے

سے اسے ''الہامی'' طور پر ''خطرے کی گھنٹیاں'' بجتی سنائی دیتی تھیں اور اندیشہ تھا کہ کہیں گروپنگ سکیم کامیاب نہ ہوجائے۔ اس لیے وہ انتظامی مشینری پر دسترس حاصل کئے بغیر آئین ساز اسمبلی میں جانے کو''اندھیرے میں چھلانگ لگانے'' کے مترادف قرار دیتا تھا۔لیکن کرپس کی تمام تر کوشش کے باوجود عبوری حکومت فوری طور پر کانگرس کے حوالے کئے جانے کا معاملہ مشن کی لندن واپسی تک التواء میں پڑ گیا تھا۔ اس لئے کرپس اور پیتھک لارنس کا کہنا تھا کہ کانگرس 16رجون کی مجوزہ عبوری حکومت کو رد کرنے کے ساتھ وزارتی مشن کی 16رمئی کی طویل المیعاد منصوبے والی دستاویز کی فوری منظوری دے دے تاکہ اولین فائدہ یہ حاصل ہو کہ مسلم لیگ کے لئے عبوری حکومت میں آنے کا دروازہ بند ہوجائے اور دوئم یہ کہ کانگرس کا عبوری حکومت بنانے کا استحقاق قائم ہوجائے۔ باقی معاملہ مشن کی لندن واپسی کے بعد پر چھوڑ دیا جائے۔پٹیل اس کے لیے تیار ہوگیا تھااور دوسرے ارکان مجلس عاملہ بھی رضامندی ظاہر کررہے تھے، جب کہ گاندھی سارا کچھ ایک ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

25رجون کو کانگرس مجلس عاملہ کے اجلاس میں گاندھی نے کہا کہ ''میں ہار گیا ہوں، آپ میرے غیر مصدقہ شبے کے مطابق عملدرآمد کرنے کے پابند نہیں ہیں۔آپ میرے الہام کی صرف اس صورت میں تقلید کریں کہ جب یہ عقلاً آپ کو لبھائے۔بصورت دیگر آپ اپنا آزادانہ راستہ اختیار کرسکتے ہیں۔''[45] چنانچہ پٹیل کے مؤقف کو کامیابی حاصل ہوئی اور کانگرس مجلس عاملہ نے 'عقل وخرد' سے کام لیتے ہوئے کرپس اور پیتھک لارنس کے سجھائے ہوئے راستے پر چل کر قرارداد منظور کردی جس میں 16رجون کی مجوزہ عبوری حکومت کو رد کردیا گیا تھا اور 16رمئی کے مجوزہ طویل المیعاد مشن منصوبے کو متنازعہ شقوں پر اپنی تشریح کے ہمراہ منظوری دے دی گئی تھی۔ یہ تشریح وہ تھی جو 24رمئی کو کانگرس مجلس عاملہ نے ایک قرارداد میں پہلے ہی کر دی ہوئی تھی جس کے مطابق گروپنگ اس منصوبے کا لازمی حصہ نہیں تھا بلکہ آئین ساز اسمبلی کے تین حصوں میں تقسیم ہونے سے پہلے ہی صوبوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ چاہیں تو گروپ کو نامنظور کردیں جس میں ان کو رکھا گیا تھا۔ چنانچہ قرارداد میں کہا گیا ''برطانوی وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے 16رمئی کو جاری کردہ دستاویز پر مجلس عاملہ نے 24رمئی کو ایک قرارداد منظور کی تھی۔اس قرارداد میں ہم نے اس دستاویز کے اندر موجود بعض نقائص کی نشاندہی کی تھی

اور اُن کے بارے میں اپنی توجیہہ پیش کی تھی۔ تب سے مجلس عاملہ برطانوی حکومت کی جانب سے جاری کردہ 16 رمئی اور 16 رجون کے اعلانات کا بغور جائزہ لینے میں مسلسل مصروف رہی ہے اور اس سلسلے میں اس خط و کتابت کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے جو کانگرس کے صدر اور ارکان مشن اور وائسرائے کے مابین ہوتی رہی ہے۔ مجلس عاملہ نے دونوں منصوبوں کا کانگرس کے نصب العین کو پیش نظر رکھ کر جائزہ لیا ہے...... یہ منصوبے اس نصب العین کی تکمیل سے قاصر ہیں...... جس قسم کی آزادی کانگرس کا نصب العین رہی ہے وہ ہے ایک متحدہ جمہوری ہندوستانی وفاق کا قیام جس کا مرکز بااختیار ہو...... مجوزہ منصوبہ کے مطابق مرکزی اختیارات کا محدود کیا جانا اور صوبوں کا گروپ بندی کا نظام اپنانا اس پُورے ڈھانچے کو کمزور کر کے رکھ دے گا۔ یہ بعض صوبوں مثلاً سرحد اور آسام اور بعض اقلیتوں مثلاً سکھوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہوگا۔ مجلس عاملہ اس چیز کو نامنظور کرتی ہے۔ تاہم مجلس عاملہ کی رائے میں اگر کلی حیثیت میں اس منصوبے کو دیکھا جائے تو اس میں اس امر کی خاصی گنجائش موجود ہے کہ جس سے مرکزی اختیارات کو وسیع اور مضبوط بنایا جا سکتا ہے، کسی صوبے کا گروپ بندی کے ضمن میں اپنی مرضی کے مطابق اقدام کرنے کا حق پوری طرح محفوظ کرایا جا سکتا ہے اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو بھی یقینی بنایا جا سکتا ہے...... چنانچہ مجلس عاملہ فیصلہ کرتی ہے کہ کانگرس ایک آزاد، متحدہ اور جمہوری ہندوستان کا آئین وضع کرنے کے ارادے سے مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت کرے گی۔'' قرارداد میں مجوزہ عبوری حکومت کو رد کرتے ہوئے کہا گیا کہ ''عبوری یا کسی دوسری حکومت کی تشکیل میں کانگرس والے اپنی پارٹی کا نیشنلسٹ کردار کبھی ترک نہیں کر سکتے اور نہ ہی غیر منصفانہ اور مصنوعی پیریٹی کو قبول کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی فرقہ ورانہ گروہ کو ویٹو کا حق دینے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔'' قرارداد کے آخر میں کہا گیا کہ ''اب جب کہ مجلس عاملہ آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کی شرکت پر رضامند ہوگئی ہے، اس لئے اس کی رائے میں اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ایک نمائندہ اور ذمہ دار حکومت تشکیل دی جائے۔''[46]

قرارداد کے متن کے ہمراہ آزاد نے بطور صدر کانگرس ایک خط ویول کو ارسال کیا جس میں کانگرس کے ان تمام اعتراضات کو گنوایا گیا تھا جو وہ گزشتہ دو ہفتوں کے دوران ایک کے بعد ایک کر کے اٹھاتی رہی تھی اور اب مجوزہ عبوری حکومت کے قریب المیعاد منصوبے کو رد کرنے کے

لیے انہیں جواز قرار دیا گیا تھا۔ طویل المیعاد منصوبے کو بھی جس بنیاد پر منظور کیا گیا تھا اس کا خط میں بھی اعادہ کیا گیا کہ ''آئین ساز ادارے کی تشکیل اور اس کے کام کرنے کے طریقے سے متعلق 16 رمئی 1946ء کی دستاویز میں دی گئی تجاویز کے بارے میں مجلس عاملہ نے 24 رمئی 1946ء کو قرار داد منظور کی تھی اور پھر ان کے بارے میں آپ کے اور ارکان مشن کے ساتھ میری اور میرے رفقاء کی بات چیت اور خط و کتابت چلتی رہی جس میں ہم نے اپنے نقطۂ نظر سے ان تجاویز کے نقائص کی نشاندہی کی۔ ہم نے دستاویز کی بعض شقوں کے بارے میں اپنی توجیہہ بھی پیش کی۔ چنانچہ اپنے ان خیالات کا پابند رہتے ہوئے ہم آپ کی تجاویز کو قبول کر رہے ہیں اور اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر ہم ان پر عملدرآمد کے لیے تیار ہیں۔''[47]

چنانچہ نہ صرف 24 رمئی کی مجلس عاملہ کی قرار داد بلکہ بعد ازاں اپنے خطوط اور ملاقاتوں کے دوران کانگرسی رہنماؤں نے اپنے جن خیالات کا اعادہ کیا تھا ان کی پابندی کرتے ہوئے طویل المیعاد منصوبہ منظور کیا گیا تو کیا اسے منظوری قرار دیا جاسکتا تھا؟ 24 رمئی کی قرار داد میں آئین ساز اسمبلی کے بارے میں صریحاً کہا گیا تھا کہ ''جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے یہ ایک خود مختار ادارے کی حیثیت کی حامل ہے...... آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ بذات خود جس مرحلے پر چاہے ترامیم اور تبدیلیاں کر دے۔'' گروپ بندی کے بارے میں کہا گیا تھا کہ ''سب سے پہلے متعلقہ صوبے یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ خود کو اس گروپ میں شامل رکھیں گے یا نہیں کہ جس میں انہیں مجوزہ منصوبے میں شامل کیا گیا ہے۔'' اپنے خطوط اور ملاقاتوں میں وہ وائسرائے اور مشن کے ارکان پر صاف لفظوں میں واضح کر چکے تھے کہ صوبوں کی گروپ بندی انہیں قابل قبول نہیں ہے۔ مشن کے ارکان اور وائسرائے کی جانب سے 25 رمئی کو کانگرس مجلس عاملہ کی 24 رمئی کی قرارداد میں اختیار کردہ مؤقف کی واضح تردید کی جا چکی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ ''......کانگرس نے اپنی قرار داد میں ہماری دستاویز کے پیراگراف 15 کی یہ جو توضیح کی ہے کہ صوبوں کو شروع میں ہی یہ حق حاصل ہوگا کہ یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ اس گروپ میں شامل رہیں گے یا نہیں کہ جس میں انہیں شامل کیا گیا ہے، مشن کی منشا کے خلاف ہے۔'' لیکن اب کانگرس نے اپنے 24 رمئی کے مؤقف پر پابند رہتے ہوئے مشن منصوبہ کو منظوری دے دی تو ''مشن کی منشا کے خلاف'' ہونے کے باوجود مشن نے اس

''منظوری'' کومنظوری قرار دے دیا اور اس بنیاد پر لیگ کے لیے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ اپنے 16/جون کے اعلانیہ وعدے سے پھر گئے اور 24/جون کو گاندھی اور پٹیل کو کرائی گئی خفیہ یقین دہانی کے پابند رہے۔

ویول کی برہمی

کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی اور کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مسلمانان ہند کی نمائندہ جماعت کو جس طرح مات دی تھی اس پر ویول سخت برہم ہوا کہ ان حالات میں جب کہ ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی اپنی انتہا پر تھی، اس کے لیے بطور انتظامی سربراہ بڑی مشکلات پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا جن کا وہ بریک ڈاؤن کی مختلف ممکنہ صورتوں کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے کئی مرتبہ اعادہ کر چکا تھا۔ کانگرس کی 25/جون کی قرارداد میں مشن منصوبہ قبول کر لینے پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''کانگرس والوں کا پہلے ایسا کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ وہ طویل المیعاد منصوبے کو اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک وہ قریب المیعاد منصوبے یعنی عبوری حکومت کو قبول نہ کر لیں...... کرپس نے جو مجھے واضح یقین دہانی کرا چکا تھا کہ کانگرس 16/مئی کے مشن منصوبہ کو کبھی قبول نہیں کرے گی، خود کانگرس والوں کو ایسا کرنے پر اکسایا اور اس طرح عبوری حکومت پر سودے بازی میں ان کو جو فائدہ حاصل ہو سکتا تھا اس کی نشان دہی کی۔ یہی کام پیتھک لارنس نے بھی کیا۔ جب میں نے اس سے اس بارے میں باز پرس کی تو اس نے اس بنیاد پر اپنی صفائی پیش کی کہ کانگرس کو آئین ساز اسمبلی کے اندر لے آنا ایک ایسا فائدہ تھا کہ جس کی خاطر اس نے ایسا کیا تو جائز کیا......''[48] نہ صرف عبوری حکومت کے معاملے میں بلکہ طویل المیعاد مشن منصوبے میں گروپنگ پر بھی کرپس اور پیتھک لارنس نے کانگرس کے مؤقف کے سامنے جس طرح گھٹنے ٹیک دیئے تھے اس پر بھی اس نے احتجاج کیا۔

25/جون کو اس نے مشن کے نام اپنے ایک نوٹ میں گزشتہ رات پٹیل اور گاندھی کے ساتھ ملاقات کے دوران نامزدگی فارم پر پیرا۔19 کے سلسلے میں بحث کے دوران پیتھک لارنس کی طرف سے کرائی گئی یقین دہانی کی سخت مخالفت کی۔ اس نے یاد دلایا کہ خود مشن کی

منظوری سے گورنروں کو ہدایات جاری کی گئی تھیں جن میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کا اہل ہونے کے لیے پیراگراف 19 کو قبول کرنا لازمی امر ہوگا اور اس سلسلے میں امیدواروں کو اقرار نامہ جمع کرانا ہوگا۔ لیکن جب گزشتہ رات میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ پیراگراف 19(v) وزارتی مشن منصوبہ کا اہم جزو ہے تو پیتھک لارنس نے مجھے کہا کہ اس پر زور نہ دیا جائے۔ اس نوٹ میں اس نے مزید کہا کہ اگر کانگرس مشن منصوبے کی گروپنگ پر اپنی تشریح کے ساتھ اس منصوبے کو قبول کرتی ہے تو اسے قبول کرنا شمار نہ کیا جائے اور مشن کو اس معاملے میں واضح مؤقف اختیار کرنا چاہیے۔ ہم اپنے واضح مقاصد کے بارے میں کسی کو توضیح کرنے کا اختیار نہیں دے سکتے۔ اسی روز مشن کے نام تحریر کردہ اپنے ایک اور نوٹ میں جو غالباً کانگرس کی قرارداد موصول ہونے کے بعد لکھا گیا، ویول نے کہا کہ ''کانگرس کی چالوں نے ہمیں جناح کے سامنے ایک مشکل صورت حال سے دوچار کر دیا ہے اور یہ کہ مسلم لیگ کی عبوری حکومت میں شمولیت کو ہمارے لیے ناممکن کر دیا گیا ہے۔'' اس کی رائے میں اب تین ہی متبادل تھے۔ ''(ا) یہ کہ جناح کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ فیصلہ کیا جائے کہ کانگرس کی طرف سے 16 رمئی کی دستاویز کی منظوری بددیانتی پر مبنی ہے...... جو کہ وہ واقعی ہے، اور اسے بطور منظوری تسلیم نہ کیا جائے۔ (ب) کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں اور اسے حکومت بنانے کے لیے کہا جائے جو اپنی شرائط کے مطابق مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ میری رائے میں یہ مسلم لیگ کے ساتھ جائز اور دیانتدارانہ بات نہ ہوگی اور میں اسے قبول نہیں کروں گا۔ (ج) سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت وضع کی جائے جو مختصر عرصہ کے لیے کام کرے جب کہ مشن وطن جا کر صلاح مشورہ کرے......'' ان میں سے متبادل (ب) کو رد کرنے کے بعد (ا) اور (ج) کا موازنہ کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''حل کا انحصار اس بات پر ہے کہ آیا مشن، کانگرس کی طرف سے 16 رمئی کی مشن دستاویز کی منظوری کو حقیقی گردانتا ہے یا نہیں، باوجودیکہ کانگرس نے اس کی انتہائی اہم شقوں سے روگردانی اختیار کرنے کا واضح ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔ اگر مشن اس منظوری کو تسلیم نہیں کرتا تو پھر جناح کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جائے جیسا پہلے طے ہوا تھا۔ بصورت دیگر اگر مشن تسلیم کرتا ہے کہ کانگرس نے مشن

منصوبہ منظور کر لیا ہے تو پھر واحد ممکنہ حل یہی ہے کہ سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت وضع کر دی جائے جو شاید چند ہفتے سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔ لیکن ہم چونکہ چال میں آ گئے ہیں لہٰذا یہی واحد راستہ نظر آتا ہے۔''[49] اس صورت حال پر کرپس اور ڈبلیو کرافٹ نے بھی نوٹ لکھے۔ ان دونوں کی رائے تھی کہ مختصر عرصہ کے لئے سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت تشکیل دے دی جائے اور اس دوران دونوں پارٹیوں کے سربراہوں کو (الگ الگ) بلا کر مخلوط حکومت بنانے کی نئے سرے سے کوشش کی جائے۔

25/جون دوپہر کو ان آراء کو مشن کے ارکان اور وائسرائے کے باہم اجلاس میں زیر غور لایا گیا اور یہی فیصلہ کیا گیا کہ عارضی طور پر سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت وضع کر دی جائے۔ کرپس نے بتایا کہ پٹیل کی رائے بھی یہی ہے کہ فی الوقت سرکاری افراد کی ایک نگران حکومت بنا دی جائے۔ اجلاس کے دوران ویول کے متذکرہ دونوں نوٹ زیر بحث آئے۔ ویول نے ایک بار پھر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مشن کو چاہیے تھا کہ گزشتہ رات کی ملاقات میں گاندھی کو صاف الفاظ میں بتا دیا جاتا کہ آئین ساز اسمبلی کے بارے میں مشن منصوبے کی اس تعبیر کی سختی سے پابندی کی جائے گی کہ یہ تین حصوں میں تقسیم ہو گی۔ پیتھک لارنس نے جواب دیا کہ اگر ہم اس بارے میں زیادہ زور دیتے تو ممکن ہے پھر کانگرس طویل المیعاد منصوبہ منظور نہ کرتی اور یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ ویول نے کہا کہ کانگرس کی یہ منظوری جس سے مراد دراصل معطلی ہے، نامنظوری سے بدتر ہے۔ کرپس نے انکشاف کیا کہ گروپنگ پر سارا مسئلہ گاندھی کا کھڑا کیا ہوا ہے جب کہ مجلس عاملہ اس بارے میں کچھ زیادہ پر جوش نہیں تھی لیکن وہ گاندھی سے مکمل بغاوت بھی نہیں کر سکتے تھے۔''[50] کرپس اور پیتھک لارنس کی کانگرس نوازی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ جب کہ ویول اور اے۔ وی۔ الیگزینڈر مسلم لیگ کو نظر انداز کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔ وزارتی مشن کے ارکان اور وائسرائے کے لیے بحیثیت مجموعی یہ تجربہ بہت تلخ ثابت ہوا۔ ان کی باہمی رقابتوں میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ وہ سب برطانوی سامراج کے مفادات کے محافظ تھے۔ لیکن طریق کار پر باہمی اختلاف نے شدید ہو کر باہمی رقابت کا رنگ اختیار کر لیا جو چند ماہ بعد ویول کی معطلی کا ایک سبب بنی۔

جناح، مشن ملاقات اور لیگ کی طرف سے اعلان 16 رجون کی منظوری

25 رجون کی شام کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے جناح کے ساتھ ملاقات کی جو یقینا ایک خوشگوار ملاقات نہیں تھی۔ جناح نے موٴقف اختیار کیا کہ کانگرس کی طرف سے مشن کے طویل المیعاد منصوبے کو جو منظوری دی گئی ہے اسے منظوری نہ سمجھا جائے کیونکہ یہ منظوری بعض شقوں پر ان کی اپنی تشریح کے ماتحت عمل میں لائی گئی ہے۔ پیتھک لارنس نے جواب دیا کہ مسلم لیگ نے بھی تو اسے منظوری دیتے وقت اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تھا اور مکمل طور پر خود مختار پاکستان کو اپنی منزل قرار دیا تھا۔ اس پر جناح نے کہا کہ مسلم لیگ نے خودمختار پاکستان کا بطور اپنی منزل کے اعادہ کیا تھا لیکن مشن کے منصوبے کو منظوری اس کی شقوں کی تشریح کئے بغیر دے دی تھی۔ پیتھک لارنس نے کہا مسلم لیگ نے اپنی قرار داد میں (جس میں مشن منصوبے کو منظوری دی گئی تھی) حق علیحدگی کا تذکرہ کیا تھا اور اسے بھی تشریح قرار دیا جا سکتا ہے۔ جناح نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے مرکز کے آئین کو مشن منصوبے کے مطابق وضع کئے جانے پر اختلاف نہیں کیا تھا اور نہ ہی ہم نے اس آئین کو دس سال تک جاری وساری رکھنے پر کوئی اعتراض کیا تھا۔ ہمارا موٴقف تو یہ تھا کہ دس سال بعد آئین پر نظر ثانی میں حق علیحدگی مضمر ہوسکتا ہے۔ پیتھک لارنس نے کہا کہ جس طرح مسلم لیگ کو آئین ساز ادارے سے اپنا حق علیحدگی منوانے کا اختیار ہے اسی طرح کانگرس کو بھی اس ادارے میں اپنا نقطۂ نظر منوانے کا حق ہے۔ جناح نے کہا کہ کانگرس کا حق استثناء مختلف نوعیت کا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اصل معاملہ گروپنگ کا ہے جس کا فیصلہ آئین ساز ادارے پر چھوڑا گیا تو کانگرس اپنے حق میں اکثریت حاصل کر لے گی۔ کرپس نے کہا کہ اس پر دونوں فرقوں کی جداگانہ اکثریت کی ضرورت ہوگی کہ یہ ایک بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ ہے۔ جناح نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی کا چیئرمین (سپیکر) ہندو ہوگا جو کبھی بھی اس معاملے کو ''بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ'' قرار نہیں دے گا۔ جناح نے مزید کہا کہ مشن کو چاہیے کہ وہ واضح طور پر اعلان کر دے کہ اس معاملے پر دونوں فرقوں کے ارکان کی اکثریت درکار ہوگی۔ ویول نے کہا کہ مشن نے اپنے 25 رمئی کے اعلان میں کانگرس کی تشریحات وتوضیحات کو پہلے ہی رد کر دیا ہوا ہے۔ پیتھک لارنس نے پھر اصرار کیا کہ کانگرس نے

خلوص دل کے ساتھ مشن منصوبہ کی منظوری دی ہے اور یہ بات ماننی چاہیے۔ جناح بدستور اس رائے سے اختلاف پر قائم رہے اور بحث طول پکڑنے کے ساتھ ساتھ تلخ ہوتی گئی۔ بالآخر عبوری حکومت کا مسئلہ چھڑا۔ وائسرائے نے جناح کو آگاہ کیا کہ اب چونکہ کانگرس نے 16 رمئی کا مشن منصوبہ منظور کر لیا ہے اور اب اس حوالے سے دونوں پارٹیاں یکساں سطح پر آ گئی ہیں مگر کانگرس نے 16 رجون کی مجوزہ عبوری حکومت رد کر دی ہے جس کے بعد اب سے اس کے پیرا۔8 کے مطابق نئی بنیادوں پر عبوری حکومت وضع کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس کے لیے وقفہ درکار ہوگا جب کہ وقفے کے دوران ایک سرکاری ایگزیکٹو کا عارضی تقرر عمل میں لایا جائے گا۔ اس پر جناح نے شدید ردعمل ظاہر کیا اور کہا کہ ہم نے وائسرائے کی جانب سے یہ یقین دہانی ملنے کے بعد 16 رمئی کا مشن منصوبہ منظور کیا تھا کہ مجوزہ ایگزیکٹو کا فارمولا اگر کانگرس نے رد کر دیا تب بھی مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کر لیا جائے گا۔ لیکن اب آپ کے ارادے بدل گئے ہیں۔ جناح نے مؤقف اختیار کیا کہ عبوری حکومت کی تشکیل کو ملتوی نہ کیا جائے بلکہ 16 رجون کے اعلان کے مطابق اسے وضع کیا جائے۔ لیکن مشن کے ارکان اور وائسرائے اسی مؤقف پر اڑے رہے کہ اب 16 رجون کے اعلان کو ختم سمجھا جائے اور عبوری حکومت کے لیے نئے سرے سے کوشش شروع کی جائے۔ جناح نے کہا کہ آپ تحریری طور پر اپنے اس لائحہ عمل سے آگاہ کر دیں تا کہ میری مجلس عاملہ اس پر غور کر سکے۔"[51] اس ملاقات کے بارے میں ویول لکھتا ہے کہ جناح نے "ہم پر بددیانتی کا الزام لگایا اور کہا کہ آپ نے کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔"[52]

اس ملاقات سے واپس جانے کے فوراً بعد جناح نے مسلم لیگ مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد کیا اور 16 رجون کے اعلان میں مجوزہ عبوری حکومت کو منظور کرنے کا اعلان کر دیا کہ لیگ کا فیصلہ ابھی تک اس لیے محفوظ تھا کیونکہ وہ اس انتظار میں تھی کہ کانگرس کیا فیصلہ کرتی ہے۔[53]

یہ قرارداد فوری طور پر مشن اور وائسرائے کو بھجوا دی گئی۔ تاہم رات گئے جناح کو وائسرائے کا خط موصول ہو گیا۔ جس میں تحریری طور پر مشن نے اپنے نئے لائحہ عمل کے بارے میں آگاہ کیا تھا جو وہی تھا جس کا اُن کے ساتھ ملاقات میں ذکر کیا گیا تھا۔ 26 رجون کو جناح نے وائسرائے کو خط لکھا کہ "......کیا میں 16 رجون کے اعلان کے پیرا۔8 کی جانب آپ کی

توجہ مبذول کراسکتا ہوں جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ 16رمئی کے اعلان کردہ منصوبہ کو منظور کرنے اور 16رجون کے اعلان میں تجویز کردہ حتمی منصوبہ کو رد کر دینے سے اس اعلان میں وضع کردہ بنیادوں اور اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔'' جناح نے گزشتہ رات کو ویول کی جانب سے وصول ہونے والے خط کا بھی حوالہ دیا جس میں اس امر کا اعادہ کیا گیا تھا کہ عبوری حکومت میں ''ان عناصر کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی ہوگی جو کہ 16رمئی کی دستاویز کو منظور کرتے ہیں۔'' اس بنیاد پر انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہم چونکہ یہ شرط پوری کر چکے ہیں اس لیے ہمیں 16رجون کے اعلان کے اصولوں کے مطابق عبوری حکومت میں شامل کیا جائے۔''[54] لیکن 26رجون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے نے اپنے باہمی اجلاس میں جناح کے اس مؤقف سے اتفاق نہ کیا۔ ویول نے مشن کے ارکان پر الزام لگایا کہ آپ نے کانگرس کو پیرا۔8 سے فائدہ اٹھانے کی راہ سجھائی جو وہ طویل المیعاد منصوبہ منظور اور مجوزہ عبوری حکومت نامنظور کر کے اٹھا سکتی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بدقسمتی سے پیرا۔8 کی بھی دو توجیہات کی جا سکتی ہیں۔ اس پر پیتھک لارنس نے کہا کہ بظاہر جناح یہ آس لگائے بیٹھا ہے کہ اسے کانگرس کے بغیر حکومت میں شمولیت کی دعوت دی جائے گی۔ اس نے اسے احمقانہ رویہ قرار دیا اور کہا کہ یہ جناح کے مستقبل کے لیے بہت خطرناک ثابت ہوگا۔[55]

اس کے بعد مشن اور وائسرائے کی جانب سے اے۔ وی الیگزینڈر کو جناح کے ساتھ ملاقات کے لیے بھیجا گیا تاکہ ایک تو جناح کی دل جوئی کی جائے اور دوسرے یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ نئی صورت حال میں وہ کس حد تک تعاون کرنے پر تیار ہیں۔ اس ملاقات میں جناح نے عبوری حکومت میں شمولیت کے مطالبے کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ مشن نے اس معاملے میں مجھے نیچا کر دکھایا ہے۔ الیگزینڈر نے کہا کہ پیرا۔8 کے آخر کے الفاظ اس لیے شامل کئے گئے تھے کہ اگر کانگرس طویل المیعاد منصوبہ اور مجوزہ عبوری حکومت دونوں کو رد کر دے اور مسلم لیگ مجوزہ عبوری حکومت منظور کر لے تو مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جا سکے لیکن اب ایک مختلف صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس میں ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ نئے اقدامات تجویز کرتے ہوئے الیگزینڈر نے ایک کانگرسی مسلمان کو حکومت میں شامل کرنے پر جناح کو آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جناح نے اسے رد کرتے ہوئے کہا کہ مسلم لیگ کو ننانوے

فیصد مسلمانان ہند کی حمایت حاصل ہے۔ اگر مرکزی حکومت میں کانگرسی مسلمان کو شامل کیا گیا تو اس سے مسلم لیگ کو زک پہنچے گی اور اسی لیے کانگرس اس پر اس قدر زور دے رہی ہے۔ جناح نے مزید کہا کہ ''کوئی انگریز ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتا کہ یہ انگریزی سیاست کے لیے بالکل اجنبی حیثیت رکھتا ہے۔'' آخر میں الیگزینڈر نے دریافت کیا کہ نئی صورت حال میں جناح کس حد تک تعاون کرنے پر آمادہ ہوں گے تو اس پر جناح نے کہا کہ ''جو کچھ ہوا ہے اس پر مسلمانان ہند مضطرب ہوں گے۔ تاہم انہوں نے مزید کہا کہ اگر آپ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھ جائیں تو مسلمانان ہند سو فیصد تعاون پر بھی آمادہ ہوں گے۔ الیگزینڈر نے کہا یہ کافی نہیں ہے۔ ہمیں اس کے باوجود بھی آپ کا تعاون درکار ہے۔ جناح نے جواب دیا کہ ہم گڑبڑ پیدا نہیں کریں گے لیکن نیشنلسٹ مسلمان کے مسئلے پر کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔''[56] الیگزینڈر نے اس ملاقات کی رپورٹ مشن اور وائسرائے کے اجلاس میں دی اور کہا کہ اس جانب سے ماحول میں کچھ بہتری کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔

جناح کو حکومت بنانے کی دعوت دینے سے انکار، جناح کا الزام کہ وزارتی مشن نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا ہے

26رجون کو مشن اور وائسرائے کی جانب سے مستقبل کے لائحہ عمل کا اعلان جاری کر دیا گیا جس میں کہا گیا کہ ''اب دونوں بڑی پارٹیوں کے تعاون سے آئین سازی کے عمل کو آگے بڑھایا جائے گا۔ تاہم عبوری حکومت کے بارے میں مذاکرات کو فی الوقت التوا میں ڈال دیا گیا ہے کہ اس دوران آئین ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوں گے اور پھر جب دوبارہ یہ مذاکرات شروع ہوں گے تو ''امید کی جاتی ہے کہ دونوں بڑی پارٹیاں حکومت کی ہیئت ترکیبی پر کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی پوری کوشش کریں گی۔ عارضی طور پر وائسرائے سرکاری افراد پر مشتمل نگران حکومت بنا کر کاروبار حکومت چلائے گا۔'' 27رجون کو ویول نے جناح کے خط (26رجون) کے جواب میں انہیں سرکاری طور پر اس لائحہ عمل سے آگاہ کر دیا۔ اس پر جناح نے 27رجون کو ایک طویل بیان جاری کیا جس میں انہوں نے مارچ کے اواخر میں مشن کی آمد سے لے کر اس وقت تک گزرے تمام مراحل کا جائزہ پیش کیا اور ثابت کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ آخر

میں انہوں نے کہا کہ ''...... اگر مسلم لیگ کو دی گئی یقین دہانیوں میں کانٹ چھانٹ کی گئی یا 16رجون کے اعلان کی وہ اساس جسے مسلم لیگ قبول کر چکی ہے، میں کوئی تبدیلی یا ترمیم کی گئی تو مسلمانان ہنداسے وزارتی مشن اور وائسرائے کی جانب سے خود اپنے تحریری پیمان سے انحراف اور عہد شکنی قرار دیں گے۔ اس صورت میں برطانوی حکومت مسلمانان ہند کا اور ان لوگوں کا اعتماد کھودے گی جن سے وہ ایفائے عہد کی توقع رکھتی ہے [57]

28رجون کو ویول نے جناح کو لکھا کہ ''......آپ نے اپنے بیان میں جن یقین دہانیوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ خاص طور سے اس مخصوص عبوری حکومت کے متعلق تھیں جو دونوں بڑی پارٹیوں کے 16 رجون کے اعلان کو منظور کرنے کی صورت میں وجود میں آنا تھیں۔''[58] اسی روز جناح نے ویول کے نام اپنے خط میں لکھا کہ '' آپ 16رجون کے اعلان کے مطابق اور ہمیں کرائی گئی یقین دہانیوں کے مطابق عبوری حکومت تشکیل کرنے کے اخلاقاً پابند تھے لیکن آپ نے 26رجون کے اپنے بیان میں عبوری حکومت کو التوا میں ڈال کر بدعہدی کا مظاہرہ کیا ہے۔ میں اب بھی اپنا یہ موقف دہراتا ہوں کہ عبوری حکومت کی تشکیل کو التوا میں نہ ڈالیں اور 16رجون کے اعلان کے پیرا۔8 کے مطابق بلاتاخیر اقدام کریں۔لیکن اب چونکہ آپ نے اور مشن نے سرکاری بیان میں اس راستہ کا اعلان کر دیا ہے اس لیے اب میرا مطالبہ یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات بھی ملتوی کر دیئے جائیں۔'' انہوں نے 16رمئی اور 25رمئی کے مشن اور وائسرائے کے جاری کردہ بیانات کا حوالہ دیا جن میں کہا گیا تھا کہ ''طویل المیعاد منصوبہ اور عبوری حکومت کی تشکیل مل کر ایک کُل بناتے ہیں۔ اس لیے ایک جزو یعنی آئین ساز اسمبلی کا انتخاب عمل میں لانا اور دوسرے جزو کو التوا میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔''[59] یہ خط مشن کو دکھانے کے بعد اس کے جواب میں اسی روز ویول نے لکھا کہ ''ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ ہم نے آپ کے ساتھ بدعہدی کی ہے...... ہمارا لائحہ عمل 16رجون کے اعلان کے پیرا۔8 کے مطابق وضع کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں 25رجون کو ہم نے آپ کی مجلس عاملہ کے اجلاس سے پیشتر ہی آپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ ہم اس لائحہ عمل کو اختیار کر رہے ہیں۔ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کے انتظامات عمل میں آچکے ہیں اس لیے ان کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔''[60] چنانچہ جناح ہاتھ ملتے رہ گئے۔ کرپس اور پیتھک لارنس کے تعاون سے کانگرس نے

25رجون کو جو چال چلی تھی، کامیاب رہی۔ جناح نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود ثابت ہوئے۔ ویول اور الیگزینڈر بھی برطانوی حکومت کی اس پالیسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیٹھ رہے کہ کانگرس کو ناراض نہ کیا جائے کیونکہ اینگلو امریکی سامراج کے بین الاقوامی تقاضے اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ویول اس درجہ دل برداشتہ ہوا کہ اس نے 26رجون کو الیگزینڈر سے کہا کہ ''جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد عام حالات میں مجھے اپنے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ مجھے مسلم لیگ کے ساتھ ایک ناممکن صورتحال کا سامنا درپیش ہو گیا ہے۔ کرپس نے کبھی سیدھی بات نہیں کی۔ لیکن میں حکومت برطانیہ کو پریشانی میں بھی ڈالنا نہیں چاہتا۔'' الیگزینڈر نے کہا کہ ''نہیں ابھی تمہیں رہنا چاہیے۔''[61]

سکھوں نے کانگرس کا ساتھ دیا

اس دوران سکھوں کی مجلس عمل نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ مجوزہ عبوری حکومت میں سکھ نشست پر نامزد سردار بلدیو سنگھ عبوری حکومت میں شامل نہیں ہو گا جب کہ آئین ساز اسمبلی کا بائیکاٹ نہیں کیا جائے گا، باوجودیکہ وہ 16رمئی کے طویل المیعاد منصوبے کو رد کر چکے تھے۔ گورنر پنجاب جینکنز نے 27رجون کو بلدیو سنگھ کے ساتھ ملاقات کی جو انہی دنوں امرتسر میں سکھ مجلس عمل کے رہنماؤں سے مشورہ کر کے لوٹا تھا۔ اس ملاقات کے بعد جینکنز نے ویول کو لکھا کہ وہاں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کی گئی ہیں۔ ''تاہم سکھ تصفیہ چاہتے ہیں اور ایک کانگرسی سکھ رہنما گورمکھ سنگھ مسافر دہلی گیا ہے تاکہ کانگرس سے آئین ساز اسمبلی میں تحفظات حاصل کرنے کے بارے میں یقین دہانیاں حاصل کر سکے۔ سکھ جناح کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور 16رمئی کی مشن دستاویز میں ترامیم کے خواہاں ہیں۔ ترامیم نہ ہونے کی صورت میں وہ کانگرس کی طرف سے حمایت کی یقین دہانی کو کچھ نہ ہونے سے بہتر قرار دیتے ہیں۔'' خود جینکنز نے سکھوں کی حمایت کرتے ہوئے لکھا کہ اگر آئین ساز اسمبلی اور اس کے گروپ ب کے اندر سکھوں کو تحفظات دینے کے معاملے پر لیگ اور کانگرس کو رضامند کیا جا سکے تو موجودہ ایجی ٹیشن کا ڈنگ مارا جا سکتا ہے۔ ایجی ٹیشن کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''......تارا سنگھ نے بلدیو سنگھ کو بتایا ہے کہ وہ کانگرس کے انداز کی تحریک چلانا چاہتے ہیں جس میں وسیع پیمانے پر

گرفتاریاں پیش کرنے اور جیلوں میں بھوک ہڑتالیں شامل ہیں۔ لیکن ہماری انٹیلی جینس کی رپورٹیں اس سے کہیں زیادہ پرتشدد امکانات کی اطلاع رکھتی ہیں۔''[62]

28رجون کو بلدیو سنگھ نے ویول کے ساتھ ملاقات کی۔ بلدیو سنگھ نے بتایا کہ وہ کانگرس کے ساتھ سکھوں کے لیے گارنٹیاں حاصل کرنے کے لیے مذاکرات کر رہا ہے اور کانگرس کی جانب سے گروپ ب میں گارنٹیوں پر مبنی ایک خط مجھے بھیجا جائے گا۔ ویول نے کہا کہ کیا کانگرس کی گارنٹی کی بنیاد پر آپ جناح سے بھی اسی طرح کی گارنٹی حاصل نہیں کر سکتے۔ اس پر بلدیو سنگھ نے کہا کہ جناح زیادہ معاوضے کا طلب گار ہے کیونکہ وہ مرکز کو کمزور کرنے کے لیے سکھوں کا تعاون چاہتا ہے۔ خاص طور پر مرکز کی مالی ضروریات کی تکمیل میں وہ براہ راست ٹیکس عائد کرنے کے بجائے گروپوں سے رقوم کے حصول کے ذریعے پورا کرنے کا خواہاں ہے۔ آخر میں بلدیو سنگھ نے ویول کو یہ تاثر دیا کہ سکھ ابھی کوئی فوری اقدام کرنے کے بجائے آئین ساز اسمبلی کے لیے اپنے نمائندے منتخب کریں گے اور کانگرس کی صفوں میں شامل ہو کر مسلم لیگ کی مخالفت کریں گے۔''[63] 29رجون کو جینکنز نے ویول کے نام اپنے ایک اور مراسلے میں بلدیو سنگھ اور دوسرے اعتدال پسندوں کے علاوہ سکھوں میں موجود انتہا پسندوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق وہ اپنے مسلح دستے ترتیب دے رہے ہیں جن میں شامل ہونے والے ایک معیاری حلف نامے پر اپنے خون سے دستخط کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ سکھوں میں اصل قوت پیشہ ور کہنہ مشق ہنگامہ پرور عناصر ہیں جو جب چاہیں اپنے فرقے کے پڑھے لکھے سمجھدار طبقے کے خلاف بغاوت پر اتر آتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا ابھی ممکن نہیں ہے کہ سکھوں کا ایجی ٹیشن کیا رخ اختیار کرے گا۔[64] گویا اگرچہ ابھی حالات پر اعتدال پسندوں کو کنٹرول حاصل تھا لیکن معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل جانے کے امکانات بھی سر اٹھا رہے تھے۔

کانگرس نے مشن منصوبہ اُسکی رُوح کے مطابق کبھی تسلیم نہ کیا

کانگرس مجلس عاملہ نے اپنی 25رجون کی قرارداد میں وزارتی مشن کے طویل المیعاد منصوبے کو اپنی 24رمئی کی قرارداد میں کی گئی توجیہات کے ہمراہ منظوری دے کر دراصل جو کچھ منظور کیا تھا وہ پہلے بھی واضح تھا، لیکن 26رجون کو آزاد، نہرو، پٹیل اور راجندر پرشاد کی مشن کے

ارکان اور وائسرائے کے ساتھ ملاقات کے دوران مزید واضح ہو گیا۔ مشن نے وضاحت کی کہ ہم نے اپنے 25رمئی کے بیان میں، 24رمئی کی کانگرس کی قرارداد کے رد میں جو مؤقف اختیار کیا تھا، ہم اسے درست سمجھتے ہیں اور اس سے انحراف اختیار کرنے کے لیے دونوں پارٹیوں کی رضامندی درکار ہوگی۔ اس پر نہرو نے پوچھا کہ آپ 16رمئی کی دستاویز کے کس حصے کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ پیتھک لارنس نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی کے تین حصوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں شق کی جانب خاص اشارہ ہے۔ آزاد نے کہا کہ ''ہم نے اس سلسلے میں آپ کے 25رمئی کے وضاحتی بیان پر بھی غور کیا ہے۔ ہم نے سوچا ہے کہ ہم آئین ساز اسمبلی میں ایک خاص طریقے سے کام کریں گے۔ صریح طور پر کانگرس گروپنگ کے خلاف ہے۔ ہماری رائے میں اس سے ہندوستان کمزور ہوگا اور ہم آئین ساز اسمبلی کو اس کے خلاف فیصلہ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے دلائل و براہین سے بھی کام لیں گے اور ہمارے بس میں جو ممکن ذرائع ہیں وہ بھی استعمال کریں گے۔ ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں جو بھی جائے گا وہ کچھ نتائج حاصل کرنے کے لیے جائے گا نہ کہ اسے توڑنے کے لیے۔'' اس کے جواب میں الیگزینڈر نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی کسی صوبے کو اپنے گروپ سے علیحدگی کا اختیار آزمانے سے منع نہیں کر سکتی لیکن ایسا اسی وقت ممکن ہوگا کہ جب آئین تشکیل پا جائے گا اور نئے آئین کے مطابق ہونے والے انتخابات میں خود اس صوبے کے عوام اس پر فیصلہ دے دیں گے۔'' تاہم سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ اصل معاملہ طریق کار کے قوانین کا ہے۔ ان وضع کردہ قوانین میں یہ اختیار موجود ہے کہ کانگرس کے آئین ساز اسمبلی کے ارکان اپنا نقطۂ نظر منوانے کی پوری کوشش کر سکتے ہیں۔ آزاد نے کہا کہ ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی اپنے قوانین کے مطابق ہی کام کرے گی اور یہ کہ کوئی صوبہ اس سے علیحدگی بھی اختیار کر سکے گا۔ سٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ بلاشبہ کسی کو آئین ساز اسمبلی میں آنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن ان ارکان کی غیر حاضری کے باوجود بھی آئین سازی کا کام جاری رہے گا۔ اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ اجلاس حصوں میں بٹ کر ہو گا جب کہ آئین وضع ہو جانے کے بعد علیحدگی کا اختیار بھی ہوگا۔ اس پر نہرو نے کہا ''وزارتی مشن منصوبہ کی دستاویز میں بہت سی چیزیں کانگرس کو پسند نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان رکاوٹوں کو دور کر دیں اور ہو سکتا ہے کہ نہ کر سکیں۔''[65]

ان حالات میں کون کہہ سکتا تھا کہ کانگرس نے خلوص دل کے ساتھ وزارتی مشن منصوبہ کو منظور کیا ہے۔ وہ ہر قیمت پر گروپنگ کو سبوتاژ کرنے کے درپے تھی جسے مسلم لیگ اس منصوبے کی روح قرار دیتی تھی۔ کرپس اسمبلی میں کانگرس کو اپنا نقطۂ نظر منوانے کی پوری کوشش کا حق دیتا تھا۔ گویا اس کے نزدیک گروپنگ اس سکیم کا لازمی حصہ نہیں تھی اور کانگرس ارکان اسمبلی اسے متنازعہ قرار دے کر اپنا نقطۂ نظر کامیاب کروا سکتے تھے۔ پیتھک لارنس بھی گروپنگ کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا۔ لیکن ویول اس بارے میں پوری طرح سنجیدہ تھا۔ اس نے 27رجون کو آزاد کے نام اپنے خط میں لکھا کہ ''ہم نے کل کی ملاقات میں آپ کی توجہ اپنے 25رمئی کے بیان کی جانب مبذول کرائی تھی۔ ہم نے نمایاں کر دیا ہے کہ گروپوں میں تقسیم ہونے کے طریقۂ کار میں ترمیم کے لیے آئین ساز اسمبلی میں دونوں بڑے فرقوں کے ارکان کی اکثریت سے قرارداد منظور کرانا ہوگی جیسا کہ 16رمئی کی دستاویز کے پیرا۔19 (vii) میں مندرج ہے۔''[66]

لیکن ان تمام وضاحتوں کے باوجود ویول کو مشن کے طویل المیعاد منصوبے کی کامیابی کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے 29رجون کو وزارتی مشن کے دورے کے خاتمے پر برطانوی کابینہ کے لیے ایک نوٹ لکھا جس میں تمام تر صورت حال کا جائزہ اور مستقبل کے بارے میں اندازوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس نے لکھا کہ ''کانگرس کی عوامی تحریک کا خطرہ فی الوقت ٹل گیا ہے اور یہی ایک واضح فائدہ حاصل ہوا ہے۔'' لیکن اس نے عبوری حکومت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس سلسلے میں حالیہ ناکامی کی وجہ سے دونوں بڑی پارٹیوں کے جذبات برانگیختہ ہوئے ہیں اور مجھے امید نہیں ہے کہ مزید مذاکرات کے نتیجے میں کوئی مؤثر مخلوط حکومت وجود میں آسکے گی۔'' حالیہ مذاکرات کے بارے میں اس کی رائے تھی کہ ''ان مذاکرات نے بلاشبہ مسلم لیگ کو الگ تھلگ کر کے رکھ دیا ہے اور اس میں گہرے شکوک وشبہات نے جنم لیا ہے......اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ لیگ یہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ منصفانہ برتاؤ نہیں کیا گیا ہے۔'' چنانچہ اس نے آئین ساز اسمبلی کے بارے میں لکھا کہ ''ان حالات کے پیش نظر یہ امکان کم ہے کہ آئین ساز اسمبلی کا کام شائستگی سے چل سکے گا۔ عین ممکن ہے کہ یہ اپنے پہلے اجلاس ہی میں ناکام ہو جائے۔ تمام اہم امور پر دونوں بڑی پارٹیوں کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں۔ کانگرس گروپ بندی کے اصول کو تباہ کرنے میں کوئی

کوتاہی نہیں کرے گی اور نہ ہی مسلم لیگ گروپوں کو پاکستان کی جانب قدم سے تعبیر کرنے اور اس کی خاطر کوشش کے اپنے ارادے ظاہر کئے بغیر رہ سکے گی۔'' آگے چل کر اس نے لکھا کہ ''چنانچہ مختلف وجوہات کی بنا پر خاصے ابتدائی مرحلے پر ہی حکومت برطانیہ کو ہندوستان میں بحران کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ حکومت برطانیہ کے پاس اس ضمن میں ایک بریک ڈاؤن پالیسی موجود ہونی چاہیے اور یہ معاملہ بالائے طاق نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ آئین ساز اسمبلی کے قیام کی شکل میں کچھ نہ کچھ کامیابی بہرحال حاصل ہوئی ہے۔'' آخر میں اس نے ہندوستانی فوج اور پولیس کے بارے میں اپنے خدشات ظاہر کئے کہ اگر کانگرس نے عوامی تحریک چلائی یا فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تو ان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک خود انگریزوں کا تعلق تھا تو اس نے کہا کہ ''ہمارے پاس نہ تو وسائل ہیں اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اندر مطلوبہ وقار اور اعتماد موجود ہے۔''[67] اس نے یہ نوٹ 29 رجون کو پیتھک لارنس کے حوالے کیا۔ اسی روز وزارتی مشن واپس برطانیہ روانہ ہو گیا۔

وزارتی مشن کے 3 ماہ قیام کے دوران لیگ کانگرس تضاد میں اضافہ

وزارتی مشن کے ہندوستان میں تین ماہ کے قیام کے دوران کانگرس۔ مسلم لیگ تضاد کو جو کہ درحقیقت ہندو۔ مسلم تضاد تھا، حل کرنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں، ان کے نتیجے میں یہ تضاد حل ہونے کے بجائے مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اکثریتی ہندو فرقے کے رہنماؤں کی جانب سے پورے برصغیر پر غلبہ حاصل کرنے اور مسلم فرقے کے رہنماؤں کی اس غلبے سے محفوظ ہونے کی کوشش باقاعدہ کشمکش کی صورت میں ڈھل گئی۔ جب وزارتی مشن یہاں آیا تو دونوں بڑی جماعتیں اپنے جو مؤقف رکھتی تھیں ان میں لچک یا سخت گیری روا رکھنے میں کون کہاں تک گیا اس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ اپریل کے اوائل میں مسلم لیگ کا مؤقف جس کی کونسل کے اجلاس نے توثیق کی تھی، یہ تھا کہ برصغیر فرقہ وارانہ بنیاد پر دو آزاد و خودمختار مملکتوں میں تقسیم کیا جائے اور مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل مکمل خودمختار ملک پاکستان قائم کیا جائے۔ اسی مؤقف پر اسے 1945-46ء کے انتخابات میں تقریباً ننانوے فیصد مسلمان رائے دہندگان کی حمایت حاصل ہوئی تھی۔ کانگرس کا مؤقف جسے کانگرس مجلس عاملہ کی جانب سے اختیار کیا گیا یہ تھا کہ پورا برصغیر

انگریزوں سے آزادی حاصل کر کے ایک مضبوط مرکز کے تحت اپنی وحدت برقرار رکھے گا۔ دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور ان سے متعلق مالیات اور ریونیو کے بعض اہم شعبے مرکز کی تحویل میں رہیں گے۔ باقی ماندہ شعبے صوبوں کو تفویض کئے جائیں گے جو کہ اپنی جگہ خودمختار حیثیت کے حامل ہوں گے اسے اس مؤقف پر 46-1945ء کے انتخابات میں غیر مسلم نشستوں پر بھاری اکثریت حاصل ہوئی تھی۔

مسلم لیگ نے لچک اختیار کی یا سخت گیری؟ اس کا اندازہ ان مرحلہ وار واقعات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

1۔ جناح نے کٹا پھٹا پاکستان جو بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر مبنی تھا، لینے سے انکار کر کے 25 ؍اپریل کو گروپنگ سکیم کا جائزہ لینے پر آمادگی ظاہر کر دی جس میں ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھتے ہوئے دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے محکمے ایک مرکز میں رکھے گئے تھے، باقی ماندہ شعبے صوبوں کے پاس رہنے دیئے گئے تھے اور مسلم اکثریت اور غیر مسلم اکثریت کے صوبوں پر مشتمل دو گروپ تجویز کئے گئے تھے۔ وہ مرکز میں قانون ساز اسمبلی کے وجود کے حامی نہیں تھے، ان کی رائے میں یہ صرف صوبے اور گروپ کی سطح پر قائم ہونی چاہیے۔

2۔ اس سکیم پر مشن اور کانگرسی رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات میں وہ مرکز میں قانون ساز اسمبلی قائم کرنے پر بھی رضامند ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ پیریٹی کا اصول ملحوظ رکھا جائے گا۔

3۔ شملہ مذاکرات میں ناکامی کے بعد 16 ؍مئی کو اعلان کردہ وزارتی مشن کا طویل المیعاد منصوبہ منظور کرنے کی خاطر مسلمانان ہند کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع فراہم کیا اور اس کے لیے مہلت حاصل کی۔

4۔ 6 ؍جون کو مسلم لیگ کونسل نے وزارتی مشن کا طویل المیعاد منصوبہ منظور کرلیا، اگرچہ اس میں مسلم گروپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور اس میں مجوزہ متحدہ اسمبلی میں پیریٹی کا اصول ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ آبادی کے تناسب سے مسلمان ارکان اقلیت اور غیر مسلم ارکان بھاری اکثریت میں تھے۔ گویا متحدہ اسمبلی میں پیریٹی کے مطالبے

سے دستبرداری اختیار کر لی گئی۔

5۔ مجوزہ عبوری حکومت میں پیریٹی (یعنی5:5:2) کا اصول 13رجون کو ترک کر کے 2:6:5 کا فارمولا پیش کیا گیا تو اسے قبول کرلیا گیا۔

6۔ 16رجون کے اعلان کی مجوزہ چودہ رکنی (3:6:5) عبوری حکومت میں شمولیت کو منظور کرلیا۔

7۔ لیکن کانگرسی یا نیشنلسٹ مسلمان کی عبوری حکومت میں شمولیت کو رد کر دیا۔

کانگرس نے لچک دار رویہ اختیار کیا یا سخت گیری کو شعار بنایا؟ اس کا اندازہ بھی اسی طرح مرحلہ وار واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

1۔ مشن کے ارکان اور مسلم لیگ کے رہنماؤں کے ساتھ شملہ مذاکرات میں شریک ہوئی لیکن گروپنگ کو رد کر دیا۔ گاندھی نے کہا کہ گروپنگ سکیم پاکستان سے بھی بدتر ہے۔ مرکز کے لیے مجوزہ تین محکموں میں اور بھی کئی محکموں کے اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ آئین ساز اسمبلی کے بارے میں کہا گیا کہ یہ مکمل طور پر خودمختار ہوگی اور اگر گروپنگ وضع بھی کی گئی تو یہ اسے منظور یا مسترد کرنے کا حق رکھتی ہوگی۔

2۔ شملہ مذاکرات کی ناکامی کے بعد 16رمئی کو مشن نے طویل المیعاد منصوبہ کا اعلان کیا۔ 17رمئی کو گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن میں لکھا کہ آئین ساز اسمبلی کو اس منصوبے میں ترمیم کرنے یا اسے بالکل رد کرنے یا اس میں اصلاح کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔ 20رمئی کو آزاد نے بھی پیتھک لارنس کے نام خط میں انہی خیالات کا اعادہ کیا۔

3۔ 24رمئی کانگرس مجلس عاملہ نے قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ ''سب سے پہلے صوبے یہ فیصلہ کریں گے کہ انہوں نے مجوزہ گروپ بندی میں رہنا ہے یا نہیں'' اس کے بعد آئین سازی کا کام انجام پائے گا جس کے لیے ''آئین ساز اسمبلی بالکل خودمختار ادارہ ہوگی۔'' اسے یہ اختیار ہوگا کہ'' وہ بذات خود جب چاہے ترامیم اور تبدیلیاں کردے۔''

4۔ 26رمئی کو گاندھی کا ہریجن میں مضمون شائع ہوا کہ مشن منصوبہ ''ایک اپیل اور مشورہ ہے اس میں کچھ بھی لازم نہیں ہے'' اور سکھوں اور صوبہ سرحد کے گروپ ب میں اور

آسام کے گروپ ج میں شامل کرنے پر کڑی نکتہ چینی کی گئی اور کہا کہ ''مشن منصوبہ کی رضا کارانہ حیثیت کا تقاضا ہے کہ کوئی صوبہ کسی گروپ میں شامل ہو چاہے نہ ہو۔''

5۔ 25رمئی کو نہرو کی جانب سے مجوزہ عبوری حکومت کو ''اَنمل بے جوڑ افراد کا مجموعہ'' قرار دیا گیا اور مخلوط حکومت کے تصور کی نفی کی گئی۔

6۔ جون کے اوائل میں لیگ کونسل کی طرف سے مشن منصوبہ منظور کیا گیا تو کانگرس پریس نے عبوری حکومت میں مجوزہ پیریٹی کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا۔

7۔ 6رجون کو گھنشام داس برلا نے کہا کہ ''پیریٹی قابل قبول نہیں ہوگی۔''

8۔ 10رجون کو نہرو نے کہا کہ پیریٹی پر اگر ہم نے غور بھی کیا تو ''ہماری تنظیم ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔''

9۔ 12رجون کو کانگرس نے 15رکنی ایگزیکٹو کا فارمولا پیش کر دیا جس میں مسلم لیگ کو صرف چار نشستیں دی گئیں۔

10۔ 13رجون کو گاندھی نے سرے سے مخلوط حکومت کا امکان ہی رد کر دیا اور ویول کو لکھا کہ آپ دو میں سے ایک گھوڑے کا انتخاب کریں، دونوں گھوڑوں پر بیک وقت سواری نہیں ہوسکتی اور یہ کہ لیگ اور کانگرس کی ''بے جوڑ آمیزش مت کیجئے'' اور کرپس کو لکھا ''کبھی آپ کانگرس اور کبھی لیگ کو اور کبھی لیگ کو کبھی پھر کانگرس کو ناز و ادا دکھاتے ہیں...... اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اور اگلے روز اپنی پرارتھنا سبھا میں مخلوط حکومت کو ایک ''قریب المرگ بچے'' سے تشبیہ دی۔

11۔ 13رجون کو پیریٹی کا اصول ختم کر کے مشن اور وائسرائے نے کانگرس کو چھ نشستیں دے دیں اور 13رکنی عبوری حکومت تجویز کی گئی مگر اسے بھی رد کر دیا گیا۔

12۔ اس دوران بنگال اور آسام کے یورپی ارکان کے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کے خلاف مہم محض اس لیے چلائی گئی تا کہ گروپ ج میں گروپنگ پر ڈیڈ لاک پیدا کر کے اس سکیم کو سبوتاژ کیا جائے۔

13۔ آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے لیے امیدواروں کی طرف سے مشن منصوبے کی دستاویز کے ''پیرا۔19 کے مقاصد کی تکمیل کی خاطر ''اقرار نامہ داخل کئے جانے کی

شرط کے خلاف مہم چلائی گئی کہ اس پیرے میں گروپنگ سے متعلقہ شقیں نا قابل قبول تھیں۔ گاندھی نے کہا کہ اب ہم مشن منصوبہ کو ''چھو بھی نہیں سکتے۔''

14۔ 16رجون کو 14رکنی عبوری حکومت کا اعلان ہوا۔ باوجودیکہ کانگرس مجلس عاملہ اسے قبول کرنے پر آمادہ بھی ہوئی لیکن گاندھی نیشنلسٹ مسلمان یا کانگرسی مسلمان کو شامل کرنے کا مطالبہ لے کر کھڑا ہو گیا اور مجلس عاملہ کو رائے بدلنا پڑی۔

15۔ 19اور 20رجون کو جناح اور ویول کے مابین بعض وضاحتوں کے سلسلے میں خط وکتابت ہوئی۔ جس پر کانگرس نے اعتراض اٹھایا کہ عبوری حکومت میں لیگ کو ویٹو کا حق دیا جا رہا ہے۔

16۔ 25رجون کو مجوزہ عبوری حکومت کو رد اور طویل المیعاد مشن منصوبے کو قبول کرنے کا اعلان کر کے لیگ کے لئے حکومت میں آنے کا دروازہ بند کر دیا۔

17۔ طویل المیعاد منصوبے کو اپنی 24رمئی کی قرارداد کے ساتھ شامل کر کے منظوری دی گئی جس میں گروپنگ کو پہلے ہی متنازعہ قرار دیا جا چکا تھا۔

18۔ 26رمئی کو مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ ملاقات کا کانگرس مجلس عاملہ کے ارکان نے گروپنگ کے بارے میں اپنی مخالفت کا اعادہ کیا اور کہا کہ ''آئین ساز اسمبلی کو اس کے خلاف فیصلہ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے دلائل و براہین سے بھی کام لیں گے اور ہمارے بس میں جو ممکن ذرائع ہیں وہ بھی استعمال کریں گے۔''

یہ موازنہ اس حقیقت کا برملا اظہار کرتا ہے کہ ہندو بورژوا برصغیر کی سب سے بڑی اقلیت کو اپنے ساتھ ملا کر رکھنے کے لیے اسے رتی برابر رعایت دینے پر بھی آمادہ نہیں تھا جب کہ اس اقلیت کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے مفاہمت کی خاطر مقدور بھر تعاون کیا۔ البتہ مغلوب ومحروم ہونے پر آمادہ نہ ہوئی کہ مسلمانوں کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی خودمختاری اور ترقی کی ضمانت کے لیے اپنے علیحدہ گروپ وضع کرنا وہ کم سے کم بنیاد تھی جس پر وہ ایک متحدہ ہندوستان میں رہ سکتے تھے لیکن ہندو بورژوا کی عدم مفاہمت، چال بازی اور منافقت کے پیچھے برصغیر میں گزشتہ ایک ہزار سال پرانا ہندو مسلم تضاد کارفرما تھا جس دوران ہندوؤں نے مسلمانوں کے غلبہ واقتدار کے نیچے محرومی ومحکومی کے سینکڑوں سال اسی تضاد کے ساتھ بسر کئے

تھے۔ اب ان کا موقع تھا اور ان کا اس سے فائدہ اٹھانا ایک ناگزیر امر تھا۔ برطانوی سامراج اتنے بڑے برصغیر کو اپنے مقاصد کے لیے ڈیڑھ سو سال تک متحد و منظم رکھنے کے بعد اپنے بین الاقوامی مفادات کی خاطر بھی اسے اسی حالت میں رکھ کر یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے ہندو بورژوا کو اپنا حقیقی جانشین سمجھتا تھا۔ وزارتی مشن نے یہاں تین ماہ قیام کر کے یہی مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی اور آخر میں جو کچھ ہوا وہ بھی اس مقصد کے پیش نظر ہوا۔ لیکن اس کے نتیجے میں ہندو مسلم تضاد کے پرامن حل کے امکانات معدُوم ہو گئے۔

باب: 14

ایک اہم موڑ

حکومت برطانیہ نے مصلحت بینی سے کام لیا اور کانگرس نے وزارتی مشن منصوبے کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں: کانگرس کا بمبئی اجلاس

وزارتی مشن نے کانگرس کو راضی کر کے ہندوستان میں جس طرح اپنا مشن مکمل کیا تھا اس کا برطانوی سامراج کو فوری فائدہ یہ ہوا کہ ممکنہ ہنگامی صورت کا خطرہ ٹل گیا۔ اس سے نبٹنے کے لیے برطانیہ کو ہنگامی بنیادوں پر بین الاقوامی سطح پر فوجی نقل وحمل کے جن اقدامات کا بندوبست کرنا پڑ رہا تھا ان سے خلاصی ہوگئی۔ 5رجولائی کو وزارتی مشن کے ارکان نے برطانوی کابینہ کے اجلاس میں اطمینان بخش رپورٹ پیش کی۔ سوال اٹھایا گیا کہ دوران مذاکرات ہندوستان میں مستقبل قریب میں گڑ بڑ سے متعلق جن خطرات کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا اس کے پیش نظر بعض فوجی اقدامات اٹھائے جا رہے تھے، کیا اب ان کو جاری رکھا جائے؟ اس پر مشن نے رائے دی کہ عدم تحفظ کا وہ احساس اب موجود نہیں ہے جو ایک ماہ پیشتر تھا تاہم اگر وائسرائے مخلوط حکومت تشکیل دینے میں کامیاب نہ ہوا تو بہتری کی یہ صورت حال زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکے گی چنانچہ اس کے بعد کابینہ کی دفاعی کمیٹی کے اجلاس میں وزیراعظم ایٹلی نے خیال ظاہر کیا کہ چونکہ اب صورت حال بہتر ہوگئی ہے۔ اس لیے چیفس آف سٹاف کے اصرار پر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا۔ ایل۔ ایس۔ ٹی۔3 نامی ٹینک بردار بحری جہاز اور دوسرے بحری جنگی جہاز جن کو ہندوستان کی ہنگامی صورت حال کے پیش نظر وہاں روک لیا گیا تھا، وہاں سے واپس وطن بلائے جا سکتے ہیں اور یہ کہ مزید پانچ ڈویژن برطانوی فوج کو بطور کمک بھیجے جانے کے جو انتظامات کئے

جارہے تھے، آیا انہیں معطل کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس پر غور وخوض کے بعد دفاعی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ (ا) ایل۔ ایس۔ ٹی۔ 3 نامی دو ٹینک بردار بحری جنگی جہاز اور ''انتقام'' نامی طیارہ بردار بحری جنگی جہاز واپس برطانیہ طلب کر لئے جائیں اور (ب) چیفس آف سٹاف کو اختیار ہے کہ ہندوستان کو پانچ برطانوی ڈویژن کی کمک بھیجنے کے انتظامات کو معطل کر دیں۔ [1]

ہندو بورژوا کو یہ اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ برطانیہ اس کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا اس لیے وہ اپنی شرائط منوانے کی بہت بہتر پوزیشن میں تھا۔ چنانچہ کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کی منظوری اپنی شرائط پر دی تھی اور خود منصوبہ وضع کرنے والوں کی توجیہات کو رد کر دیا تھا۔ اس نے مشن منصوبے کو صرف وہیں تک قبول کیا تھا جہاں تک اس کے نصب العین کی تکمیل ہوتی تھی، نا قابل قبول حصے وہ ''رکاوٹیں'' تھیں جن کو دور کرنا تھا۔ اس بارے میں اگر کوئی ابہام تھا تو وہ 7-6/ جولائی کو بمبئی میں منعقد ہونے والی آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر دور ہو گیا۔ یہ اجلاس کانگرس مجلس عاملہ کی 25 / جون کی قرارداد کی توثیق کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ کانگرس کمیٹی کے انتہا پسند عناصر کی جانب سے اس قرار داد کی مخالفت کی جارہی تھی۔ 6/ جولائی کے اجلاس میں قرارداد کو توثیق کے لیے پیش کرتے ہوئے آزاد نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم آج تک یہ مطالبہ کرتے چلے آئے تھے کہ ہندوستان کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے اور اپنا آئین وضع کرنے کے لیے خود ایک آئین ساز اسمبلی تشکیل دینے کا حق دیا جائے۔ اب برطانیہ ہمیں یہ حق دینے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ہمیں برطانوی دولت مشترکہ کے اندر رہنے یا اس سے بالکل باہر نکل جانے کی آزادی بھی دی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ''وزارتی مشن منصوبہ نے ہمیشہ کے لیے تقسیم ہند کے مسئلے سے وابستہ ہر قسم کے شکوک وشبہات رفع کر دیئے ہیں۔ اس منصوبہ نے اس معاملہ میں رتی برابر بھی شبہ نہیں رہنے دیا کہ ہندوستان ایک غیر منقسم وحدت واحدہ کی حیثیت سے برقرار رہے گا جو ایک مضبوط مرکزی حکومت اور اس کے وفاقی یونٹوں پر مشتمل ہو گی۔ اب جب کہ ہمارے بڑے مطالبے وزارتی مشن نے تسلیم کر لیے تو اس امر سے آپ اتفاق کریں گے کہ مجلس عاملہ کے لیے اس منصوبے کو اس کے نقائص کی نشاندہی کرنے کے بعد قبول کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔'' ان نقائص کے بارے میں آگے چل کر اس نے کہا کہ وزارتی مشن منصوبہ میں صرف گروپنگ سے متعلق ایک نیا پہلو نمایاں ہے جس سے کانگرس نے پوری طرح اتفاق نہیں کیا ہے۔

چنانچہ مجلس عاملہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ گروپنگ کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہوگا۔ صوبے یہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے کہ وہ مخصوص گروپ میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ ہم پُراعتماد ہیں کہ گروپنگ کی شق کے بارے ہماری توجیہہ بالکل درست توجیہہ ہے۔"[2]

آزاد کی پیش کردہ قرارداد کی تائید کرتے ہوئے اس موقع پر پٹیل نے اپنی تقریر میں کہا کہ "آئین ساز اسمبلی کی سکیم میں سب سے خطرناک تجویز وہ ہے جو گروپنگ کے متعلق ہے۔ سرکاری دستاویز میں اس سے متعلقہ پیراگراف کے بارے میں ہماری توجیہہ یہ ہے کہ پہلے مرحلے ہی میں صوبوں کو یہ آزادی حاصل ہوگی کہ وہ جس مخصوص گروپ میں شامل کئے گئے ہیں ان میں رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں فیصلہ کریں۔ کسی صوبے کو اس کی مرضی کے خلاف کسی گروپ میں شامل کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا............ اس طرح ہم نے تقریباً انہی خطوط پر وضع کردہ آئین ساز اسمبلی حاصل کر لی ہے جس کا ہم کئی برس سے مطالبہ کرتے چلے آرہے تھے۔ مزید یہ کہ مجوزہ سکیم کے تحت برطانیہ سے ہندوستانیوں کو انتقال اقتدار بالکل پرامن اور پرسکون طریقے سے عمل میں آجائے گا۔ اس لیے ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ ہمیں اس سکیم کا فائدہ اٹھانا چاہیے اور ملک کو کشمکش کی راہ پر نہیں ڈالنا چاہیے۔" آگے چل کر اس نے مزید کہا کہ "......اس سکیم میں مسلم لیگ پاکستان کے جراثیم دیکھتی ہے۔ جب کہ ہم متحدہ ہندوستان دیکھتے ہیں۔ آئین ساز اسمبلی فیصلہ کرے گی کہ کون صحیح ہے۔"[3]

اس موقع پر کانگرس کے بائیں بازو کے رہنما جے پرکاش نارائن نے تقریر کرتے ہوئے قرارداد کی سخت مخالفت کی اور جناح اور برطانوی حکومت کے ساتھ مفاہمت کی راہ ترک کر کے جدوجہد کی راہ اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ لیکن ہندو بورژوا اپنے اس یقین کے ساتھ کہ برطانوی حکومت اس کی ناراضگی مول نہیں لے گی، اور یہ کہ اس موقع پر جدوجہد کی راہ اختیار کرنے سے بایاں بازو اور کمیونسٹ عنصر فائدہ اٹھا جائے گا (جیسا کہ بحریہ کے جوانوں کی ہڑتال کے موقع پر مظاہرہ ہو چکا تھا اور یہ پٹیل ہی تھا جس نے بمبئی میں اس ہڑتال کو سبوتاژ کیا تھا) پرامن انتقال اقتدار کے اس منصوبے کو ہر ممکن طریقے سے کامیاب کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اگلے روز 7رجولائی کو کانگرس کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے گاندھی نے قرارداد کی پرزور حمایت کرتے ہوئے کہا "......سکیم میں بہت سے نقائص ہیں لیکن ہم گزشتہ کئی برس سے جدوجہد

کر رہے ہیں اس لیے ہم آئین ساز اسمبلی کی سکیم سے کیوں خوفزدہ ہوں؟ اگر ہم نے دیکھا کہ یہ نقائص ناقابل علاج ہیں تو ہم بذاتہی آئین ساز اسمبلی کے خلاف جدوجہد کر سکتے ہیں......''
اس نے جے پرکاش نارائن کے مؤقف کی تردید کرتے ہوئے تشدد کے بجائے عدم تشدد کی راہ اپنانے پر زور دیا اور کہا کہ اب ''انگریزوں نے واضح کر دیا ہے کہ وہ انخلاء کے لیے تیار ہیں۔ ہمارا کام ہے کہ ہم دیکھیں کہ یہ انخلاء پرسکون اور پرامن طریقے سے ہو۔'' اس نے مزید کہا کہ ''اگر آپ نے مجوزہ آئین ساز اسمبلی کو منظور نہ کیا یا یہ اسمبلی وجود ہی میں نہ آسکی اور اس صورت میں آپ نے مجھ سے یہ کہا کہ انفرادی یا عوامی سطح پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جائے اور یہ کہ میں مرن برت رکھوں تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔'' آخر میں اس نے کہا کہ ''مجھے معلوم ہے کہ آئین ساز اسمبلی کی سکیم میں بہت سے نقائص موجود ہیں لیکن یہ ہمارا کام ہے کہ ہم ان کو دور کر دیں یا پھر اسے دفن کر دیں...... اس میں جتنے بھی نقائص ہیں انہیں دور کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ نقائص کے باوجود اس سکیم کو منظور کر لینا چاہیے۔ ایک ستیا گرہی کو کسی شے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''[4] گویا گروپنگ کا نقص جسے دور کرنے کے لیے گاندھی کے ''قانونی ذہن'' نے بہت سے علاج تجویز کئے ہوئے تھے جن کا پہلے ذکر آچکا ہے، کی ناکامی کی صورت میں وہ اس آئین ساز اسمبلی ہی کیخلاف اٹھ کھڑے ہونے اور اسے دفن کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اس کی تائید میں آزاد نے 7 ر جولائی کے اجلاس میں ایک بار پھر تقریر کرتے ہوئے کہا ''ہم کسی حالت میں اپنے بنیادی اصولوں کی قربانی نہیں دیں گے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی ناقابل تسخیر مشکل ہمارے بنیادی اصولوں کی راہ میں حائل ہوگئی تو ہم آئین ساز اسمبلی کا خاتمہ کر ڈالنے میں تامل سے کام نہیں لیں گے۔'' اس نے قرارداد کے مخالفوں سے بے خوف ہو کر آگے بڑھنے کی درخواست کرتے ہوئے کہا ''مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگی اس کے باوجود بھی ہم خوف میں مبتلا ہیں کہ ہم ملک کی تقدیر کا فیصلہ کس طرح کریں گے۔'' اس نے مزید زور دیتے ہوئے کہا کہ ''کانگرس کبھی کمزور مرکز کو برداشت نہیں کرے گی۔''[5]

قرارداد کے مخالف کانگرسی ارکان کو سب سے بڑا اعتراض مرکز کے پاس صرف تین شعبوں اور صوبوں کے تین گروپوں میں بٹ جانے پر تھا۔ کہا گیا کہ خارجہ امور کو بیرونی تجارت

سے کیسے الگ کیا جاسکتا ہے۔ بیرونی معاشی پالیسی اور زرمبادلہ بھی اس سے متعلق ہوں گے۔ اس طرح دفاع کو بہت ساری صنعتوں سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے۔ نیز مرکز کی مالیات کو گروپوں کی امداد کا محتاج نہیں بنایا جاسکتا۔ مرکز کو خود اپنی مالیات وضع کرنا ہوگی جس میں انکم ٹیکس سمیت ریونیو کی دوسری مدیں بھی شامل ہوں گی۔ کسٹمز اور محصولات بھی شامل ہوں گے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جسے کانگرس کمیٹی نے ابوالکلام آزاد کی جگہ پارٹی کا نیا صدر منتخب کیا تھا۔ آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے ان تمام اعتراضات کے ساتھ اتفاق کیا جو قرارداد کے مخالفوں نے اٹھائے تھے۔ لیکن پھر بھی قرارداد کی توثیق کی حمایت کی۔

یاد رہے کہ اپریل میں آزاد نے بطور صدر برقرار نہ رہنے کے فیصلہ کا اعلان کر کے نہرو کا نام نئے صدر کے طور پر تجویز کر دیا تھا۔ کیونکہ اُسے خبریں ملی تھیں کہ سردار پٹیل صدر بننے کی کوشش کر رہا ہے اور گاندھی کی حمایت بھی سردار پٹیل کو حاصل ہے۔ تاہم کانگرس کمیٹی کے اس اجلاس میں نہرو متفقہ طور پر صدر منتخب ہو گیا۔ اس نے اپنی اختتامی تقریر میں قرار داد کے معترضین کی تشفی کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ''...... مجھے پختہ یقین ہے کہ مستقبل میں ایک نہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ہم اپنی انقلابی آئین ساز اسمبلی قائم کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس (مجوزہ آئین ساز اسمبلی) کا فائدہ نہ اٹھائیں اور اپنے مفاد میں اس کو بروئے کار نہ لائیں۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی میں کامیاب نہ ہوئے تو ہم اسے اپنے موافق شکل دینے کے لیے جیسی حکمت عملی چاہیں گے اختیار کر لیں گے۔'' اس کے بعد اس نے مشن منصوبوں کے بارے میں واشگاف الفاظ میں کہا ''وزارتی مشن کے طویل المیعاد اور قریب المیعاد منصوبوں کی بہت باتیں کی گئی ہیں۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، یہ معاملہ کسی بھی منصوبے کو قبول کرنے کا نہیں ہے، خواہ وہ طویل المیعاد ہو یا قریب المیعاد ہو، اصل معاملہ یہ ہے کہ ہم نے آئین ساز اسمبلی کے اندر جانا منظور کیا ہے اور بس۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہم اس اسمبلی میں اس وقت تک ہی رہیں گے جب تک دیکھیں گے کہ یہ ہندوستان کے مفاد میں ہے اور جب ہمیں یہ لگا کہ ہمارا نصب العین مجروح ہو رہا ہے تو ہم باہر نکل آئیں گے اور لڑائی کی دعوت دیں گے۔ ہم کسی ایک بات کے بھی پابند نہیں ہیں۔'' سوائے اس کے کہ فی الوقت ہم نے آئین ساز اسمبلی کے اندر جانا منظور کر لیا ہے اور ایسا ہم نے اچھی اچھی تقریریں کرنے کے لیے نہیں بلکہ

اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کچھ استوار کرنے کی خاطر کیا ہے۔''[6] اس کے بعد آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اڑھائی سو مندوبین نے کانگرس مجلس عاملہ کی 25ر جون کی قرارداد دہلی کی توثیق پر ووٹنگ کی۔ 204 نے حق میں اور 51 نے مخالفت میں ووٹ دیا اور یوں کثرت رائے سے اس قرارداد کی توثیق ہوگئی جسے وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری سے تعبیر کیا جا رہا تھا۔

10ر جولائی کو نہرو نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ اسے مؤرخین بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مجوزہ آئین ساز اسمبلی کے بارے میں اس نے کہا کہ'' کانگرس نے کوئی پابندی قبول نہیں کی ہے۔'' اس نے کانگرس کے صدر (آزاد) کی مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ ہوئی خط و کتابت کا حوالہ دیا جو اس وقت تک شائع ہو چکی تھی اور کہا کہ ''اس کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کن کیفیات اور حالات میں ہم نے آئین ساز اسمبلی میں شریک ہونا منظور کیا ہے اور اس کے علاوہ ہم نے کچھ منظور نہیں کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں پہنچنے کے لیے ہم نے ایک خاص طریقۂ کار اختیار کرنا قبول کیا ہے اور یہ ہے آئین ساز اسمبلی کے لیے امیدواروں کا انتخاب۔ اس کے بعد ہم اسمبلی میں جا کر کیا کریں گے اس کا تعین کرنے میں ہم کاملاً و مطلقاً آزاد ہیں ہم کسی ایک معاملے میں بھی کسی کے ساتھ کسی قسم کے قول و قرار کے پابند نہیں ہیں۔'' اس نے کہا کہ جب کانگرس نے کہا کہ آئین ساز اسمبلی ایک خودمختار ادارہ ہوگی تو وزارتی مشن نے اس پر کم و بیش ''ہاں'' کہہ دیا تھا۔ گروپ بندی کے متعلق اس نے کہا کہ'' غالب امکان یہی ہے کہ خواہ اس معاملے کو کسی طرح بھی لیا جائے، گروپ بندی نہیں ہوگی۔ ظاہر ہے کہ گروپ الف گروپ بندی کے خلاف فیصلہ دے گا۔'' اس نے شرط بدتے ہوئے کہا کہ ''صوبہ سرحد کا گروپنگ کے خلاف فیصلہ دینے کا امکان چار اور ایک کا ہے۔ اس طرح گروپ ب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غالب امکان ہے کہ آسام بھی بنگال کے ساتھ گروپ بندی کے خلاف فیصلہ کرے گا۔ اگرچہ ابھی میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ابتدائی فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ توازن برابر کا پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حتمی طور پر وہاں کوئی گروپ بندی نہیں ہوگی کیونکہ آسام اسے کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس طرح خواہ کسی بھی نقطۂ نظر سے کیوں نہ لیا جائے، گروپ بندی کی یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔'' وزارتی مشن منصوبہ میں مرکزی حکومت

کے لیے مجوزہ محکموں کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''ظاہر ہے کہ دفاع اور مواصلات کی مدد گار صنعتیں بھی مرکز کی تحویل میں ہوں گی جب کہ ان میں اضافہ کا امکان بھی موجود ہے۔ دفاع ایک ایسا وسیع شعبہ ہے کہ اس کا دائرۂ کار اور سرگرمیاں پھیلتی ہی چلی جاتی ہیں۔ وہ سب مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گی۔ اسی طرح خارجہ پالیسی کا بیرونی تجارت سے الگ کر کے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ہر قسم کی چیز آ جاتی ہے جو اس میں دی تو نہیں گئی اس میں لائی جا سکتی ہے۔ مرکز کی مالی ضروریات کی تکمیل کے لیے اس نے کہا کہ یہ ٹیکس عائد کر کے پوری کی جائیں گی۔ اگر کسی کی رائے یہ ہے کہ صوبوں یا ریاستوں کی جانب سے چندہ یا امداد لے کر مرکز کی ضروریات پوری کی جائیں تو یہ ابلہ فریبی ہے۔ کوئی مرکزی حکومت امداد پر نہیں چلتی۔ اسے خود اپنے ٹیکس عائد کرنے پڑتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ''ابھی فہرست تو نہیں بنائی جا سکتی لیکن کسٹمز، محصولات انکم ٹیکس، بیرونی منڈیوں کے قرضے، کرنسی اور کریڈٹ سب ہی اس زمرے میں آتے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ مرکز نے نہیں کرنا تو کس نے کرنا ہے؟'' اس نے مزید کہا کہ مرکز کا دائرۂ کار خواہ کتنا ہی محدود کیوں نہ کیا جائے، اس کا پھیلاؤ ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر مرکز اپنا وجود ہی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اگرچہ بعض لوگ مرکز کی اس وسعت کی مخالفت کریں گے لیکن آئین ساز اسمبلی کو اس معاملے کا فیصلہ کرنا ہوگا۔''[7]

اس پریس کانفرنس میں نہرو نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی بلکہ نہرو کے سوانح نگار مائیکل بریشر کے مطابق ''نہرو کے اس بیان سے ابہام اور منافقت کی فضا صاف ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی تصفیے یا اتفاق رائے کا وہ پردہ بھی چاک ہو گیا جسے وزارتی مشن نے برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔''[8] نہرو کا ایک دوسرا سوانح نگار مائیکل ایڈورڈز لکھتا ہے کہ ''نہرو نے دراصل اپنے اس بیان کے ذریعے اس یقین کا اعادہ کیا تھا کہ برطانیہ جلد ہی رخصت ہو جائے گا اور پھر کانگرس مسلم لیگ کو نظر انداز کر سکے گی۔''[9] اور حقیقت بھی یہی تھی کہ گاندھی اور دوسرے کانگرسی رہنما اب تک اعلانیہ یا پوشیدہ جو کچھ کہتے آئے تھے نہرو نے اسی کا اعادہ کیا تھا اور پہلے بھی کوئی خاص ابہام نہیں تھا۔ تاہم اگر کسی خوش فہمی یا غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی تھی تو نہرو نے واشگاف الفاظ میں کانگرس کے موقف کا برملا اظہار کر کے اسے ختم کر دیا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ۔ کیا گروپنگ سکیم کی تباہی کا ذمہ دار صرف نہرو تھا؟

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بے حد ضروری ہے۔ بعض مورخوں کی وجہ سے ایک عام تاثر پایا جاتا ہے کہ کانگرس نے وزارتی مشن منصوبہ کو گروپ بندی کی سکیم سمیت منظور کر لیا ہوا تھا اور مفاہمت کی صورت پیدا ہو گئی ہوئی تھی مگر نہرو نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں 7 ر جولائی کی اختتامی تقریر اور پھر 10 ر جولائی کی پریس کانفرنس میں گروپ بندی کو رد کر کے سارا کام بگاڑ دیا۔ یہ گمراہ کن تاثر پیدا کرنے کا اصل ذمہ دار آزاد ہے اور بعض دوسرے مورخوں نے اس کے بیان کی بنیاد پر غلطی کھائی ہے۔ وہ اپنی خودنوشت میں جو اس نے ان واقعات کے دس سال بعد تحریر کی تھی، 25 ر جون کی کانگرس مجلس عاملہ کی قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''کانگرس اور مسلم لیگ کی طرف سے وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری کا واقعہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک شاندار واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ تشدد اور تصادم کی بجائے گفت وشنید اور افہام و تفہیم سے طے ہو گیا تھا اور یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ فرقہ وارانہ مشکلات قصہ پارینہ ہو گئی ہیں۔ پورے ملک میں مسرت و انبساط کا احساس پایا جاتا تھا اور سارے لوگ آزادی کے مطالبے پر متفق و متحد تھے۔ ہم نے خوشیاں منائیں لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ خوشیاں قبل از وقت تھیں اور ہمیں عنقریب تلخ مایوسیاں درپیش ہوں گی۔''[10] آگے چل کر آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں مجوزہ قرارداد کی توثیق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ''چنانچہ کانگرس مجلس عاملہ کی قرارداد پر مہر توثیق ثبت ہو گئی جس میں وزارتی مشن منصوبہ کو منظور کر لیا گیا تھا۔'' اس موقع پر وہ 7 ر جولائی کو اختتامی اجلاس سے نہرو کے خطاب کا بھی سرے سے کوئی ذکر نہیں کرتا۔ البتہ اس کے بعد 10 ر جولائی کی پریس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اب وہ افسوسناک واقعہ پیش آیا جس نے تاریخ کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔'' پریس کانفرنس کا مختصر احوال بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ ''......جواہر لال کا یہ بیان غلط تھا۔ کانگرس کو وزارتی مشن منصوبہ میں اپنی مرضی سے تبدیلی یا ترمیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ ہم نے فی الحقیقت مان لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہو گی۔ مرکز کے پاس صرف تین امور ہوں گے جب کہ بقیہ امور کا تعلق صوبائی دائرہ کار

سے ہوگا۔ ہم نے یہ بھی مان لیا تھا کہ برصغیر کو تین گروپوں ا، ب اور ج میں ترتیب دیا جائے گا۔ کانگرس دوسری پارٹیوں کی مرضی کے بغیر یک طرفہ طور پر ان معاملات میں تبدیلی نہیں کر سکتی تھی۔ مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبے کو منظور کر لیا تھا کیونکہ برطانوی حکومت اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی، یہ اس کی آخری حد تھی۔ جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ محض اس لیے اس منصوبے کے حق میں تھا کہ اس سے بہتر کسی چیز کا حصول ممکن نہیں تھا۔"[11] ہوڈسن مولانا کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "ابوالکلام آزاد ہمیشہ کی طرح اس موقع پر بھی مخلص اور نیک نیت تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ کانگرس نے وزارتی مشن کے منصوبے کی منظوری خلوص دل سے نہیں کی تھی۔"[12] لیکن اس سے آزاد کی صفائی پیش نہیں کی جا سکتی۔

25 رجون کی کانگرس مجلس عاملہ کی قرار داد جس کے مطابق کہا گیا کہ وزارتی مشن منصوبہ کو منظوری دے دی گئی تھی، اس سے پہلے کا احوال تو چھوڑیئے، کیا اس کے بعد آزاد نے گروپ بندی کی سکیم اور محدود مرکز کو تسلیم کر لیا تھا؟ اس نے اگلے ہی روز یعنی 26 رجون کو نہرو، پٹیل اور راجندر پرشاد کے ہمراہ مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ ملاقات میں کہا تھا "صریح طور پر کانگرس گروپ بندی کی تجویز کے خلاف ہے۔ ہماری رائے میں اس سے ہندوستان کمزور ہوگا اور ہم آئین ساز اسمبلی کو اس کے خلاف فیصلہ دینے پر آمادہ کرنے کے لیے دلائل و براہین سے بھی کام لیں گے اور ہمارے بس میں جو ذرائع ممکن ہیں وہ بھی استعمال کریں گے۔" اور اس کی موجودگی میں اسی ملاقات میں نہرو نے کہا تھا کہ "وزارتی مشن منصوبہ کی دستاویز میں بہت سی چیزیں کانگرس کو پسند نہیں ہیں۔" اور پھر خود آزاد نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں 6 رجولائی کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے اس میں نقائص کی نشاندھی کرنے کے بعد اسے قبول کیا ہے اور یہ کہ گروپنگ کے بارے میں کانگرس نے پوری طرح اتفاق نہیں کیا ہے...... گروپنگ کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہوگا۔" اور پھر اس کی موجودگی میں پٹیل اور گاندھی نے اپنی تقریروں میں گروپنگ کی سخت مخالفت کی اور آئین ساز اسمبلی کو دفن کرنے تک کی باتیں ہوئیں۔ اور 7 رجولائی کو دوبارہ تقریر کرتے ہوئے خود اس نے آئین ساز اسمبلی کا خاتمہ کر دینے کی دھمکی دی اور کہا کہ "کانگرس کبھی کمزور مرکز کو برداشت نہیں کرے

گی۔'' اور پھر اس کی موجودگی میں نہرو نے اپنی اختتامی تقریر میں جو کچھ کہا اس کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان حالات میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اکیلے نہرو کی پریس کانفرنس نے ''تاریخ کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔'' درحقیقت نہرو نے گاندھی اور کانگرس کی ساری قیادت (بشمول آزاد) کے خیالات کی ترجمانی کی تھی۔ یہ کہنا تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کی عقل کی توہین کے مترادف ہے کہ کسی ایک فرد واحد کے محض چند فقروں نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ وزارتی مشن کی آمد کے بعد جب سے گروپ بندی کی تجویز زیر غور آئی تھی، 10ر جولائی کی نہرو کی پریس کانفرنس تک کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں آیا تھا کہ جب گاندھی اور کانگرس کی طرف سے اس کے حق میں کلمۂ خیر کہا گیا، بلکہ اس کی شدید مخالفت اور مذمت کی جاتی رہی، اس کے بارے میں نئی نئی توجیہات پیش کر کے اس سکیم کو سبوتاژ کرنے کے منصوبے باندھے گئے۔ وزارتی مشن نے آنے کے بعد تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کیا اور پھر جناح کو ایک کٹا پھٹا خودمختار پاکستان یا ایک مرکز کے تحت گروپ بندی کی سکیم میں سے ایک کا انتخاب کرنے کو کہا تو انہوں نے مؤخرالذکر پر رضامندی ظاہر کی اور اس سکیم پر غور کے لیے شملہ مذاکرات منعقد کئے گئے۔ اس سکیم میں ایک ہندو اکثریتی صوبوں کا گروپ، ایک مسلم اکثریتی صوبوں کا گروپ اور ایک دیسی ریاستوں کا گروپ تجویز کیا گیا تھا۔ گاندھی نے کہا کہ ''گروپنگ پاکستان سے بھی بدتر ہے۔'' چنانچہ شملہ مذاکرات ناکام ہوئے۔

16ر مئی کو مشن نے طویل المیعاد منصوبہ پیش کیا جس میں آئین ساز اسمبلی کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور اسی سکیم کو بقول آزاد، کانگرس نے ''منظوری'' دے دی تھی حالانکہ اس کی مسلسل مخالفت کی گئی۔ اس کے پیش ہونے کے اگلے روز 17ر مئی کو گاندھی نے کہا کہ ''آئین ساز اسمبلی اس منصوبے میں ترمیم کرنے یا اسے رد کرنے یا اس کی اصلاح کرنے کی مجاز ہوگی۔'' نیز یہ کہ صوبوں کو آزادی ہے کہ وہ چاہیں تو گروپنگ کو سرے سے ہی رد کر دیں۔ مشن کے ساتھ ملاقات میں اس نے کہا کہ ''اس منصوبے کی حمایت کا سارا انحصار اسی نکتے پر ہے کہ آیا آئین ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں اس کے تین حصوں میں تقسیم ہونے یا نہ ہونے پر کانگرس کے ارکان سوال اٹھا سکیں گے یا نہیں؟'' اور جب کرپس نے یقین دہانی کرا دی کہ سارے منصوبے کی بنیاد رضاکارانہ ہے تو گاندھی نے کہا کہ ''باقی کام توجیہات کے ذریعے سیدھا کیا جا سکتا

ہے۔''19 مئی کو گاندھی نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں لکھا کہ ''کیا مشن کی دستاویز کو قبول کرنے والوں کو گروپنگ کی کھلے عام مخالفت کا اختیار ہوگا اور اگر ہوگا تو پھر صوبہ سرحد اور آسام کے ارکان کو آزادی ہوگی کہ وہ ان گروپوں سے باہر نکل جائیں جن میں انہیں شامل کیا گیا ہے'' اور ہوبہو یہی بات نہرو نے اپنی 10 ر جولائی کی پریس کانفرنس میں کہی۔ 20 ر مئی کو خود آزاد نے پیتھک لارنس کو لکھا کہ ''آئین ساز اسمبلی آئین سازی کے معاملے میں خود مختار ہوگی......اور جو چاہے گی فیصلہ دے گی۔'' تو اب نہرو نے کون سی نئی بات کہی تھی۔

20 ر مئی کو گاندھی نے مشن منصوبہ کو محض ''ایک اپیل اور مشورہ'' قرار دیا جس میں ''کوئی جبر نہیں تھا۔'' اور وہ اس منصوبے کی ایک ایک شق کو بار بار پڑھنے کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ ''قانونی طور پر اس میں کچھ بھی لازم نہیں ہے۔'' اور اس نے سکھوں اور صوبہ سرحد کو گروپ ب سے اور آسام کو گروپ ج سے علیحدہ کرنے کی وکالت کی تھی اور اسمبلی کے اجلاس کے آغاز ہی میں ان کے حقِ علیحدگی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جو لوگ گروپوں اور ان میں اپنی بلا اصول شمولیت سے پریشان ہیں ان سے میری درخواست ہے کہ اگر میری توجیہہ درست ہے تو پھر انہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اسی روز آزاد نے بھی اسی مضمون کا خط مشن کے نام بھیجا تھا اور 24 ر مئی کو کانگرس مجلس عاملہ نے جو قرارداد منظور کی اس میں واشگاف الفاظ میں کہا گیا تھا کہ ''سب سے پہلے متعلقہ صوبے یہ فیصلہ کریں گے کہ آیا وہ خود کو اس گروپ میں شامل رکھیں گے یا نہیں کہ جس میں انہیں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ آئین ساز اسمبلی کو ایک خود مختار ادارہ سمجھنا چاہیے جس کو آئین تشکیل دینے اور اس کو لاگو کرنے کے حتمی اختیارات حاصل ہوں گے۔'' اور اپنی اسی تشریح کی بنیاد پر کانگرس نے 25 ر جون کو مشن منصوبہ منظور کرنے کی قرارداد منظور کی تھی اور جب مشن اور وائسرائے نے اس توجیہہ کی تردید میں بیان جاری کیا تو گاندھی نے کہا کہ ''قانون بجا طور پر کسی قانون ساز کی اس منشا کو قبول نہیں کرتا جو مسودۂ قانون سے باہر ہو'' اور یہ کہ اب فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ 10 ر جون کو آزاد اور نہرو نے ویول اور ارکان مشن کے ساتھ ملاقات میں یہ مؤقف اختیار کیا کہ ''کانگرس ایک مضبوط مرکز کے لیے کام کرے گی اور گروپ سسٹم کا خاتمہ کرے گی۔''14 ر جون کو آزاد کی جانب سے وائسرائے کے نام خط میں گروپ بندی پر سخت تنقید کی گئی اور یہ تاثر دیا گیا کہ طویل المیعاد منصوبہ بھی ناقابل قبول ہے۔ اس پر

ویول نے جواب دیا کہ ''گروپنگ کو لازمی قرار نہیں دیا گیا ہے۔''

23/جون کو کانگرس مجلس عاملہ کے اجلاس میں گاندھی نے آئین ساز اسمبلی کو یہ کہہ کر قبول کرنے کی حمایت کی کہ ''اگر حالات بد سے بدتر ہو گئے تو یہ ایک باغی ادارہ بن جائے گی۔'' اس کے بعد آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے والے امیدواروں کے لیے نامزدگی فارم پر پیراگراف 19 کی پابندی کا حلف نامہ طلب کئے جانے پر طوفان کھڑا کر دیا گیا اور گاندھی نے کہا کہ ''اب تو آئین ساز اسمبلی والا منصوبہ بھی غرق ہو گیا...... ہم اسے چھو بھی نہیں سکتے'' اور اس دوران بنگال و آسام کے یورپی ارکان اسمبلی کے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کے خلاف مہم بھی اس گروپ کو سبوتاژ کرنے کے لیے چلائی گئی۔ ان سب باتوں کے بعد جب 25/جون کو مجلس عاملہ نے قرارداد منظور کی تو اس میں اپنی 24/مئی کی قرارداد میں گروپ بندی کے غیر لازمی ہونے اور آئین ساز اسمبلی کے خودمختار ادارہ ہونے کی توجیہہ کو شامل کیا گیا اور اس دوران کانگرس کے صدر آزاد کی ویول اور ارکان مشن کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں اور خط و کتابت میں اختیار کردہ گروپ بندی کے خلاف مؤقف کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ مزید اعادہ کرتے ہوئے اس قرارداد میں پھر سے کہا گیا تھا کہ ''مرکزی اختیارات کا محدود کیا جانا اور صوبوں کی گروپ بندی کا نظام پورے ڈھانچے کو کمزور کر کے رکھ دے گا اور یہ بعض صوبوں مثلاً سرحد، آسام اور سکھوں کے ساتھ ناانصافی پر مبنی ہو گا۔ مجلس عاملہ اس چیز کو نامنظور کرتی ہے'' اور پھر مجلس عاملہ کی اس قرارداد کی توثیق آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے 7/جولائی کو بمبئی میں کی جہاں تقریروں میں آزاد، پٹیل، گاندھی اور نہرو نے گروپنگ کے خلاف اور مضبوط مرکز کے حق میں دلائل دے کر اس قرارداد کی توثیق کرائی تھی۔

اس سارے پس منظر میں یہ بڑے حوصلے کی بات تھی کہ دس سال بعد اپنی خودنوشت میں آزاد نے کمال ڈھٹائی کے ساتھ لکھ دیا کہ ''ہم نے فی الحقیقت مان لیا تھا کہ مرکزی حکومت وفاقی ہو گی جس کے پاس صرف تین امور ہوں گے...... ہم نے یہ بھی مان لیا تھا کہ برصغیر کو تین گروپوں ا، ب، اور ج میں ترتیب دیا جائے گا'' اور یہ کہ جواہر لال کا 10/جولائی کی پریس کانفرنس میں ''بیان غلط تھا'' اور یہ وہ ''افسوسناک واقعہ تھا'' جس نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا تھا۔'' کیا ان حقائق کی روشنی میں ابوالکلام آزاد کو لاعلمی یا بےخبری یا سادہ لوحی کے لیے سزاوار

ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے وہ دل سے گروپنگ کی کامیابی کا خواہاں ہو کہ وہ ویول کے ساتھ اپنی ذاتی خط وکتابت میں جو وہ کانگرس کی جانب سے ''سرکاری'' خط وکتابت سے علیحدہ طور پر کیا کرتا تھا ویول کو اپنے تعاون کا پورا یقین دلایا کرتا تھا اور عبوری حکومت کے معاملے میں بھی اس نے اپنی ذاتی حیثیت میں نیشنلسٹ مسلمان کے شامل کئے جانے کے معاملے پر زور نہ دینے کی یقین دہانی کرائی تھی اس لئے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وزارتی مشن محض اس بات پر ناکامی سے دوچار ہو جائے، وہ طویل المیعاد منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا خواہاں تھا۔ لیکن ہندو بورژوا قیادت کے سامنے اس کی پیش نہ چلتی تھی۔ اسے محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت حاصل تھی۔ جناح نے اس کے بارے میں ''شوبوائے'' کے بہت سخت الفاظ استعمال کئے تھے۔ وہ ذاتی لحاظ سے اپنی شرافت اور نیک نیتی کی وجہ سے ان الفاظ کا مستحق نہیں تھا لیکن بدقسمتی سے کانگرس میں اس کی حیثیت واقعی ''شوبوائے'' کی تھی۔ گاندھی اور دوسرے سرکردہ ہندو کانگرسی لیڈر اس سے بالا بالا خود ہی فیصلے کرتے تھے اور پھر ان فیصلوں پر ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت مجلس عاملہ سے مہر تصدیق ثبت کرا لیتے تھے۔

انڈین سول سروس کے ایک سینئر رکن سی۔ ایس۔ وینکاٹچر کے مطابق ''پٹیل کے پاس ابوالکلام آزاد جیسے قوم پرست مسلمانوں کے لیے حقارت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا وہ انہیں بڑے پس وپیش کے بعد پیسے دیتا تھا اور ان کی مشکوک وفاداری پر طنز یں کیا کرتا تھا۔''[13] چنانچہ دس سال بعد جب اس نے مڑ کر ان واقعات کو دیکھا تو اسے نہرو کی 10ر جولائی کی پریس کانفرنس ایک ''افسوسناک واقعہ'' نظر آیا جس نے ''تاریخ کا رخ بدل دیا تھا۔'' لیکن اصل افسوسناک واقعہ تو یہ تھا کہ ہندو بورژوا شروع ہی سے مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ ایک جرأت مند لبرل ہندو مورخ آر۔ سی۔ موجمدار نے چار جلدوں پر مشتمل اپنی تصنیف ''تاریخ تحریک آزادی'' میں ہندو بورژوا کی اس تنگ نظری اور عاقبت نااندیشی کا جگہ جگہ پردہ چاک کیا ہے اور یہ مؤقف اختیار کیا ہے کہ اگر ہندو مسلم تضاد کی حقیقت کو تسلیم کر کے مسلمانوں کو ان کے جائز سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی حقوق دے دیئے جاتے تو برصغیر کو متحد رکھا جاسکتا تھا۔ جب اس نے یہ تاریخ لکھی تو حکومت برطانیہ نے انتقال اقتدار کی دستاویزات ابھی شائع نہیں کی تھیں۔ اس لیے آزاد کے متذکرہ بیان نے اسے بھی غلط فہمی میں

مبتلا کیا۔ تاہم اس نے پھر بھی نہرو کی 7/جولائی کی تقریر اور 10/جولائی کی پریس کانفرنس کو پچھلے تاریخی تسلسل کے ساتھ ملا کر پیش کیا اور لکھا ''بدقسمتی سے اس نازک لمحے پر جب کہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں ایک پرامن تصفیہ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض عاقبت نااندیشانہ کلمات نے سارا معاملہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ اس نے 1937ء میں جناح کی طرف سے کانگرس۔ لیگ مخلوط وزارت کی تشکیل کی پیش کش کو ٹھکرا کر ہندو مسلم سمجھوتے کے آخری امکان کو برباد کیا تھا۔ اب 1946ء میں اس کے بیانات نے ایک متحدہ اور آزاد ہندوستان کے آخری امکان کو جو پہلے ہی بعید تھا بالکل غارت کر کے رکھ دیا۔''[14] لیکن وہ صرف نہرو کو تاریخ کا رخ موڑنے کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا۔ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے کہ ''معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف نہرو بلکہ دوسرے کانگرسی رہنما بھی نمایاں طور پر یہ سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کو ملک میں کوئی اثر و رسوخ حاصل نہیں ہے۔ لیگ کے ساتھ مفاہمت کے بجائے وہ اس بات کو زیادہ سودمند اور منفعت بخش سمجھتے تھے کہ اس کے معمولی اثر و رسوخ کو بھی تباہ کر دیا جائے۔''[15]

چنانچہ جواہر لال نہرو نے پریس کانفرنس میں یہ بیان محض جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں دیا تھا۔ بلکہ اس نے اس میں گزشتہ تین ماہ کے دوران گاندھی اور دوسرے کانگرسی رہنماؤں نے گروپ بندی کے متعلق جو مؤقف اختیار کیا تھا اس کی ترجمانی کی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ کانگرس کو وزارتی مشن منصوبے میں مجوزہ گروپ بندی کی سکیم میں دس سال کے بعد پاکستان کے قیام کا امکان نظر آتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ دس سال بعد مسلم اکثریت والے دونوں گروپ اپنی ایک یا دو آزاد و خودمختار ریاستیں قائم کر لیں گے۔ مسلم لیگ کونسل اپنی 6/جون کی قرارداد میں اپنے اس عزم کا اظہار کر چکی تھی۔ کانگرس کا یہ خطرہ اس کی سیاسی کوتاہ اندیشی، تنگ دلی اور کم ظرفی پر مبنی تھا۔ ماضی میں کانگرس کا مؤقف یہ رہا تھا کہ ہندو مسلم اختلافات محض انگریزوں کے ایجاد کردہ ہیں اور مطالبہ پاکستان انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کی پیداوار ہے۔ جب انگریز یہاں سے چلے جائیں گے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہو گی۔ لیکن اب اس کی جانب سے گروپ بندی کے منصوبے کو منظور نہ کرنے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اسے انگریزوں کی دستبرداری کے بعد دس سال میں ہندو مسلم مفاہمت کی کوئی امید نہیں تھی بلکہ اسے خدشہ تھا کہ انگریزوں نے

منصوبے میں ہندوستان کی وحدت کا جو آئینی ڈھانچہ پیش کیا ہے وہ برقرار نہیں رہ سکے گا اور دس سال کے بعد پاکستان کی ایک یا دو آزاد و خود مختار ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ اگر گاندھی اور کانگرس کے دوسرے سرکردہ ہندو لیڈروں کی سیاست منافقانہ نہ ہوتی تو انہیں اپنی سیاسی دور اندیشی، وسیع القلبی اور عالی ظرفی پر بھروسہ ہونا چاہیے تھا۔ انہیں یقین ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنی حقیقت پسندانہ، دیانت دارانہ اور فراخدلانہ پالیسی کی وجہ سے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی طور پر پسماندہ مسلم اقلیت کے دل جیت لیں گے۔ ''نفرت'' کی سیاست ختم ہو جائے گی اور اس طرح ہندوستان کی وحدت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی۔

ہندوستان اور برطانیہ کے بہت سے مبصرین کی رائے یہ تھی کہ جناح نے مطالبہ پاکستان محض سیاسی سودا بازی کے لیے پیش کر رکھا تھا۔ وہ ہندوستان کے اتحاد کو پارہ پارہ نہیں کرنا چاہتے تھے وہ چاہتے صرف یہ تھے کہ آزاد ہندوستان میں ہندو اکثریت کی حکمرانی کے تحت مسلم اقلیت کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی مفادات کے تحفظ کی پختہ ضمانت دی جائے چونکہ وزارتی مشن کے منصوبے میں اُن کی مطلوبہ ضمانت موجود تھی اس لیے انہوں نے یہ منصوبہ خلوص نیت سے منظور کیا تھا۔ اگر برائے بحث یہ مان بھی لیا جائے کہ جناح کے دل و دماغ میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کے انمٹ نقوش مرتب ہو چکے تھے تو یہ بھی حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی کہ وہ بہت ضعیف العمر آدمی تھے۔ ان کی صحت بہت کمزور تھی۔ ان کا جسم محض ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے وہ مزید دس سال تک زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ غالباً ابوالکلام آزاد انہی وجوہ کی بنا پر دس سال بعد اپنی خودنوشت لکھتے ہوئے نہرو کی 10 رجولائی کی پریس کانفرنس کو ایک ''افسوسناک واقعہ'' قرار دیتا ہے جس نے ''تاریخ کا رخ بدل دیا تھا۔'' غالباً اسے پہلی مرتبہ یہ تکلیف دہ احساس ہوا تھا کہ مسلم اقلیت کے بارے میں گاندھی، نہرو اور دوسرے ہندو کانگرسی لیڈروں کی سیاست فی الحقیقت دوغلی اور منافقانہ تھی اور خود اس کی اپنی سیاست بھی حقیقت پسندانہ نہیں رہی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ خود اسے اس حقیقت کا شعور نہیں تھا کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد کی بڑی ٹھوس تاریخی وجوہ تھیں اور یہ تضاد منافقانہ سیاسی تدابیر اور جناح کو گالیاں دینے سے حل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس فرقہ وارانہ تضاد کے پرامن حل کے لیے ضروری تھا کہ مقابلتاً ترقی یافتہ ہندو اکثریت پسماندہ مسلم اقلیت کے

بارے میں ایسی مخلصانہ پالیسی اختیار کر لیتی کہ ان دونوں کے درمیان ہر قسم کا عدم توازن جلد از جلد دور ہو جاتا۔ لیکن یہ تب ہی ممکن تھا کہ پہلے اس عدم توازن کا اعتراف کیا جاتا اور ہندو۔ مسلم تضاد کی حقیقت کو تسلیم کیا جاتا۔ کانگرسی رہنما اس کے لیے ہی تیار نہیں تھے۔

نہرو جیسے کانگرسی رہنماؤں میں سب سے روشن خیال سمجھا جاتا تھا اور بقول پٹیل ''کانگرس میں صرف ایک ہی قوم پرست مسلمان تھا اور اس کا نام جواہر لال نہرو تھا۔''[16] خود ان خیالات کا حامل تھا کہ ''یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی اقلیتیں یورپ کی طرح نسلی یا قومی نوعیت کی نہیں ہیں۔ یہ مذہبی اقلیتیں ہیں اور ظاہر ہے کہ مذہبی قیود مستقل نہیں ہوتیں اور تبدیلی مذہب سے نہ تو نسلی پس منظر اور نہ ہی ثقافتی اور لسانی ورثہ تبدیل ہوتا ہے۔'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آر۔سی۔ موجمدار لکھتا ہے کہ نہرو کا ''یہ بیان قریباً مضحکہ خیز ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں مسلم فرقے کی نشوونما کی تاریخ سے ظاہر ہے...... نہرو کو مسلم لیگ کی قوتوں اور نہاں صلاحیتوں کا قطعی اندازہ نہیں تھا۔ وہ اسے اونچے طبقے کی ایک چھوٹی سی تنظیم جس پر جاگیرداروں کا غلبہ تھا، قرار دیا کرتا تھا اور اس کی رائے تھی کہ اس کا مسلم عوام الناس میں کوئی اثر و رسوخ نہیں ہے اور وہ اسے جانتے تک نہیں ہیں۔ یہاں نہرو نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا تھا جو انگریزوں نے کانگرس کی اہمیت کم کرتے ہوئے یہ کہہ کر کی تھی کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں کی تنظیم ہے اور معدودے چند افراد پر مشتمل ہے، جب گاندھی اور نہرو سمیت تمام کانگرسی رہنما یہ ڈینگ مارتے تھے کہ کانگرس ہی واحد قابل ذکر تنظیم ہے تو اس پر یہی کہا جا سکتا تھا کہ عموماً خواہش نظریے کی ماں ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ 46-1945ء میں جب نہرو نے ان خیالات کا اظہار کیا تو مسلمان ایک عرصے سے خود کو نہ صرف ایک علیحدہ فرقہ بلکہ ایک علیحدہ قوم قرار دے چکے ہوئے تھے۔ نہرو نے اس تصور ہی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ نہرو اپنی ہی وضع کردہ ایک تصوراتی دنیا میں رہتا تھا جس کا اصل حقائق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔''[17] چنانچہ ان تصورات کے ساتھ کانگرسی رہنما کس طرح مسلمانوں کو اپنے صوبوں کے الگ گروپ وضع کرنے کا اختیار دے سکتے تھے۔ کانگرس کے سرکردہ ہندو لیڈروں کے عزائم فسطائی تھے۔ وہ بورژوا جمہوریت کی آڑ میں دراصل ہندوؤں کے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کی آمریت قائم کرنا چاہتے تھے۔ جناح نے اپریل میں وزارتی مشن سے ملاقات کے دوران ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر برصغیر میں

واحد جمہوری نظام حکومت مسلط کیا گیا تو اس کا مطلب ہندو اکثریت کی آزادی اور مسلم اقلیت کی غلامی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

برطانوی حکومت کی صریح بددیانتی پر جناح کا ردِعمل

ایک عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ جناح نے محض نہرو کے 7 اور 10 رجولائی کے بیانات پر برافروختہ ہو کر مشن منصوبہ رد کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ''ڈائریکٹ ایکشن'' کی انتہا پسندانہ راہ اختیار کی جس کے نتیجے میں ''تاریخ کا رخ تبدیل ہو گیا''۔ اول تو جیسا کہ اوپر تفصیلاً واضح کر دیا گیا ہے کہ نہرو نے اپنی کسی ذاتی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا، اس نے بطور صدر کانگرس محض اس مؤقف کا واشگاف اور برملا اظہار کیا تھا جو گاندھی، پٹیل، آزاد، خود نہرو اور دوسرے کانگرسی رہنما مشن کے قیام کے دوران تواتر کے ساتھ اپنی تقریروں، تحریروں، خطوں اور ارکان مشن کے ساتھ ملاقاتوں میں پیش کرتے رہے تھے۔ اس لیے نہرو کے متذکرہ بیانات میں جناح کے لیے کوئی حیرت انگیز انکشاف نہیں ہوا تھا۔ کانگرس مجلس عاملہ نے 24 رمئی کی قرارداد ہی میں آئین ساز اسمبلی کو خود مختار ادارہ قرار دے دیا تھا اور گروپنگ کے بارے میں بھی یہ تعبیر کر دی تھی کہ صوبوں کو گروپوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ان سے علیحدگی کا اختیار ہوگا۔ اور یوں اس تعبیر سے طویل المیعاد منصوبے کی صورت مسخ کر دی تھی۔ پھر 25 رجون کی قرارداد میں اس منصوبے کی یہی مسخ شدہ صورت منظور کی گئی اور کہا گیا کہ یہ اس تعبیر کے مطابق ہے جو 25 رمئی کی گزشتہ قرارداد اور اس دوران ہونے والی خط و کتابت اور ملاقاتوں میں پیش کی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ جناح کی برافروختگی اور دل برداشتگی کا اصل سبب یہ تھا کہ وزارتی مشن اور وائسرائے نے اس معاملے میں اپنے باہمی اختلاف کے باوجود کانگرس مجلس عاملہ کی منظور کردہ مشن منصوبہ کی اسی مسخ شدہ صورت پر صاد کہہ دیا اور اسے 16 رمئی کے مجوزہ طویل المیعاد منصوبہ کی ''منظوری'' قرار دے کر لیگ کو عبوری حکومت میں شامل ہونے سے محروم کر دیا۔ حالانکہ لیگ نے 16 رمئی اور 16 رجون کے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد دونوں منصوبے بہ کمال و تمام منظور کر لیے تھے۔ ارکان مشن اور وائسرائے نے جناح کو دی ہوئی تحریری و زبانی یقین دہانیوں اور 16 رجون کے اعلان سے واضح طور پر انحراف کیا اور یوں کانگرس کی چالبازی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے بلکہ خود ارکان

مشن نے اسے چال سجھائی کہ اس طرح کھیلو، لیگ پٹ جائے گی۔ جناح کو امید تھی کہ لیبر حکومت صاف ستھرے کھیل پر یقین رکھتی ہے لیکن جب صریحاً فاؤل کھیلا گیا اور انہیں مات دے دی گئی تو سارا کھیل بگڑ گیا۔ لیبر حکومت نے اینگلو۔امریکی سامراج کے عالمی تقاضوں کے تحت برصغیر میں کانگرس کی ناراضگی مول لینا گوارا نہ کیا اور اس کے بجائے اس کی چاپلوسی اور دل جوئی کا راستہ اختیار کیا۔ گاندھی اور کانگرسی رہنماؤں کو یہ اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اپنی شرائط منوانے کی بہترین پوزیشن میں ہیں اور وہ جو تعبیر کریں گے اسے تسلیم کیا جائے گا۔

25/جون کو جناح پر یہ بھید کھلا کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ 26/جون کو مشن کے ارکان اور وائسرائے کے ساتھ اپنی ملاقات میں انہوں نے عبوری حکومت میں لیگ کی شمولیت کے بارے میں اپنا مؤقف تسلیم کرانے کے لیے بہت زور مارا لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ 27/جون کو جب وائسرائے کے خط سے انہیں صاف جواب مل گیا تو انہوں نے تفصیلی بیان جاری کر کے مشن اور وائسرائے کی عہد شکنی پر احتجاج کیا اور اسے کھلا دھوکہ قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ملتوی کیے جائیں۔ ان کا یہ مطالبہ رد کر دیا گیا۔ 29/جون کو مشن کی واپس روانگی تک انہوں نے نوک جھونک جاری رکھی لیکن کچھ نہ بنا۔ جناح اور مسلمانان ہند پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ برطانوی حکومت صاف طور پر کانگرس کی دھونس میں آ گئی ہے اور یہ صاف نظر آ گیا کہ جب تک صرف کانگرس کی دھونس قائم ہے، مسلمانان ہند کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اگر فیصلہ دھونس کی بنیاد پر ہونا ہے اور یہ دیکھا جانا ہے کہ حکومت کے لیے کون کس حد تک باعث تکلیف ہے تو پھر مسلمانان ہند کو اپنی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی خودمختاری کے حصول کی خاطر طریق کار بدلنا ہوگا۔ متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے پرامن تصفیے کے حصول کی خاطر جناح جہاں تک جا سکتے تھے پورے خلوص کے ساتھ گئے لیکن آگے چل کر معلوم ہوا کہ ایک طرف ہندو بورژوا کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں ہے اور دوسری جانب حکومت برطانیہ ہندو بورژوا کی دھونس میں آ کر مستقبل کا فیصلہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور یہ کہ اس سارے چکر میں لیگ کو بے وقوف بنایا گیا ہے تو اب لازم تھا کہ لیگ بھی اپنی حیثیت منوانے کے لیے ثابت کرے کہ وہ بھی باعث تکلیف و ہنگامہ آرائی ہو سکتی ہے۔ دراصل یہ ایک سنگ میل تھا جہاں سے برصغیر کی تاریخ نے ایک اہم موڑ کاٹا اور ہندو مسلم تضاد اپنے حل کے لیے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا۔

6رجولائی کو جناح نے وزیراعظم ایٹلی کو اس کی نشاندہی کرتے ہوئے ایک ذاتی اور خفیہ خط تحریر کیا۔ اس کے شروع میں شکوہ کیا گیا تھا کہ وزارتی مشن اور وائسرائے نے جس انداز سے مذاکرات کو انجام دیا ہے اس کے نتیجے میں ''حکومت برطانیہ کے وقار کو سخت دھچکا لگا ہے اور مسلمانان ہند کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے جن کی ایک باوقار اور پرامن تصفیے کی امیدیں خاک میں مل گئی ہیں۔ انہوں (یعنی مشن اور وائسرائے) نے خود کو کانگرس کے ہاتھ میں کھلونا بنا کر رکھ دیا جو اپنے موافق معاملات کے طے نہ ہونے کی صورت میں مستقل طور پر انہیں عدم تعاون اور سول نافرمانی کی دھونس دیتی رہی۔ شروع ہی سے اس نے اپنے ہاتھ میں پستول لے کر جارحانہ اور آمرانہ انداز اختیار کئے رکھا۔ وہ اقتدار ہتھیانے کے درپے ہیں تاکہ اس وسیع وعریض برصغیر میں آباد مسلمانوں سمیت دوسرے فرقوں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کا غلبہ مسلط کر سکیں۔ جب آپ متعلقہ خط و کتابت کو دیکھیں گے اور مشن سے حالات معلوم کریں گے تو آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے...... کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کو تعاون اور تعمیر کے جذبے سے منظوری نہیں دی ہے بلکہ اسے تباہ و برباد کرنے کے لیے ایسا کیا ہے۔ آپ پر یہ حقیقت اس توجیہہ اور تعبیر سے آشکارا ہو جائے گی جو کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کے بارے میں کی ہیں اور وہ مشن اور وائسرائے کے 16رمئی کے اعلان اور پھر 25رمئی کے مزید بیان کے بالکل برعکس ہیں (خاص طور پر صوبوں کی گروپ بندی کے بارے میں)۔ چنانچہ میں اب بھی حکومت برطانیہ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو اپنا خون بہانے پر مجبور نہیں کرے گی کہ آپ مسلمانوں کی قربانی دے کر جس طرح کانگرس کے حق میں دستبردار ہو رہے ہیں اس کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا۔ اگر انصاف اور حسن سلوک کا دامن بالکل ترک کر کے صرف زور آزمائی کی سیاست کی بنیاد پر ہی فیصلہ ہونا ہے تو پھر ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا کہ ایسی صورت میں ناگزیر طور پر جیسے حالات پیدا ہوں گے ہم بھی ان کے مقابلے کے لیے ویسے ہی حربے وضع کریں۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے نتائج انتہائی خطرناک ہوں گے اور پھر پرامن تصفیہ ناممکن ہو جائے گا۔''[18]

اسی مضمون کا خط جناح نے برطانوی پارلیمنٹ کے قائد حزب اختلاف ونسٹن چرچل کو بھی ارسال کیا۔ جناح نے اس خط میں برطانوی حکمرانوں پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی تھی کہ

ابھی اصلاح احوال کا وقت ہے جو اگر نہ کی گئی تو حالات بے حد خطرناک رخ اختیار کر جائیں گے۔ اس میں جناح نے ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی بھی ڈھکے چھپے لفظوں میں دے دی تھی۔ جناح نے اپنے اس خط کو ''سختی کے ساتھ نجی، ذاتی اور خفیہ'' قرار دیا تھا۔ وہ اپنے ممکنہ لائحہ عمل اور اس کے نتائج سے برطانوی حکمرانوں کو آگاہ کر کے اب بھی پر امن تصفیہ کی کوشش کر رہے تھے جس کی اگرچہ اب کوئی امید نہیں تھی۔

جناح نے اپنی پارٹی کے سیکرٹری جنرل لیاقت علی خان سے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کرنے کے لیے کہا۔ 9/جولائی کو لیاقت علی خان نے اعلان جاری کیا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس 28 اور 29/جولائی کو بمبئی میں منعقد ہوگا۔ اس کے مطابق کونسل کا مقصد ''ساری صورت حال کا جائزہ لینا اور تبدیل شدہ حالات میں مسلم لیگ کا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔'' ان تبدیل شدہ حالات کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے نہرو کے 7/جولائی کے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اختتامی اجلاس سے خطاب کا کوئی حوالہ نہ دیا اور کہا کہ تبدیل شدہ حالات یہ ہیں کہ (1) ''وزارتی مشن اور وائسرائے عبوری حکومت بنانے کے اپنے وعدے سے پھر گئے ہیں...... اور انہوں نے اس سلسلے میں مسلم لیگ کے ساتھ تحریری طور پر جو باضابطہ عہد و پیمان کئے تھے وہ توڑ ڈالے ہیں۔'' اور یہ کہ (2) ''کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کو مشروط طور پر اور اختلاف کا حق محفوظ رکھ کر منظوری دی ہے۔'' اور یہ کہ (3) کانگرس کی تعبیر مشن کے 25/مئی کے بیان سے بالکل الٹ ہے۔ ''خاص طور پر صوبوں کی گروپ بندی کے بارے میں جو کہ اس طویل المیعاد منصوبے میں بنیادی ستون کی حیثیت کی حامل ہے۔''[19] چنانچہ مسلم لیگ اس نئی صورتحال میں اپنا نیا لائحہ عمل وضع کرنا چاہتی تھی جس کے ذریعے حکومت کو ایفائے عہد پر مجبور کیا جا سکے اور گروپ بندی کے بارے میں وزارتی مشن کی اپنی تعبیر کو بروئے کار لانے پر زور دیا جا سکے۔

ان حالات میں نہرو کے 7 اور 10/جولائی کے بیانات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ان بیانات نے بنیادی طور پر کوئی نئی صورت حال پیدا نہیں کی تھی۔ البتہ پہلے سے موجود بے یقینی، بے اعتمادی، عدم مفاہمت اور کھچاؤ کی فضا مزید گہری ہوگئی اور وہ عمل تیز ہو گیا جس کے نتیجے میں مسلم لیگ کی قیادت نئی سمت تلاش کرنے پر مجبور ہوئی تھی اور اس طرح مسلم لیگ کو مزید اس سمت کی طرف دھکیل دیا گیا جس سے گریز کی خاطر اب بھی جناح اعلیٰ برطانوی حکمرانوں

کے ساتھ خط و کتابت کر رہے تھے۔

نہرو کی پریس کانفرنس پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے جناح نے 12 رجولائی کو حیدر آباد (دکن) میں ایک بیان میں کہا کہ ''یہ اس بنیادی ہیئت کا قطعی انکار ہے جس پر طویل المیعاد منصوبہ کی بنیاد رکھی گئی اور ان تمام بنیادی اصولوں، معاہدوں، پابندیوں اور سکیم کی منظوری دینے والی پارٹیوں کے حقوق کا بھی انکار ہے۔'' تاہم اب بھی برطانوی حکمرانوں سے خیر کی توقع رکھتے ہوئے انہوں نے کہا ''برطانوی پارلیمنٹ میں عنقریب وزارتی مشن کی رپورٹ زیر بحث آنے والی ہے۔ اس موقع پر برطانوی پارلیمنٹ اور حکومت برطانیہ کو چاہیے کہ وہ بلاشبہ اس کی وضاحت کرے اور اس تاثر کو دور کرے کہ کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے کی منظوری دے دی ہے کیونکہ وزارتی مشن اور وائسرائے کی بزدلانہ کوشش رہی ہے کہ باہر یہی تاثر دیا جائے جب کہ دوران مذاکرات وہ کانگرس کی سول نافرمانی کی مسلسل دھمکیوں سے مرعوب ہوئے اور خوف کے احساس میں مبتلا رہے جن کا اب نہرو نے اپنی کانفرنس میں پھر اعادہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ تاثر اس لیے بھی دیا ہے کہ وہ ہر قیمت پر مشن کی کامیابی کا سامان پیدا کرنے کے لیے بلا ضرورت مضطرب و پریشان تھے خواہ اس سے دوسروں کی قربانی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔ حقیقی صورت حال اور کانگرس کے عزائم کا پوری طرح علم رکھنے کے باوجود مشن نے کانگرس کے فیصلے کو ایک ایسی پارٹی کی طرف سے منظوری کا رنگ دینے کی کوشش ہے کہ جو ایک باوقار تنظیم کی حیثیت سے تعمیر و تعاون کے حقیقی جذبے سے سرشار ہو کر طویل المیعاد منصوبے کی روح و عمل کے مطابق اپنے عہد و پیمان کی پاسداری کرے گی۔''[20] گروپ بندی جو اس منصوبے کی اصل روح تھی، کانگرس کو کبھی بھی قابل قبول نہیں رہی تھی۔ اس لیے اس کی پاسداری کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نہ صرف گاندھی سے نہرو تک تمام کانگرسی رہنماؤں نے اس کا انکار کیا تھا بلکہ اب جب کہ اس منصوبے پر عملدر آمد کا وقت آیا اور صوبائی اسمبلیوں کی جانب سے آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کا آغاز ہو گیا تو کانگرسی اکثریت کے صوبوں کی وزارتوں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ نامزدگی کے ہمراہ اقرار نامے کے فارموں پر سے پیرا۔ 19 کو حذف کیا جائے کہ جس میں آئین ساز اسمبلی کے مجوزہ تین گروپوں میں تقسیم ہو جانے اور گروپوں کے آئین

وضع کرنے کی شقیں رکھی گئی تھیں۔

8رجولائی کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں لکھا ''آسام، مدراس اور بمبئی کی وزارتوں کی جانب سے اصرار کیا جارہا ہے کہ امیدواروں کے اقرار نامے کے فارموں پر سے پیرا۔19 کو حذف کر دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس آئین ساز اسمبلی کے اندر جاکر یہ قرارداد پیش کرے گی کہ یہ اسمبلی ایک خودمختار ادارہ ہے اور اسے اس کے قوانین اور ضابطوں میں ردو بدل کا اختیار حاصل ہے۔ اس ردوبدل کی زد میں وہ ضابطہ بھی آسکتا ہے جس میں بڑے فرقہ وارانہ معاملے پر دوہری اکثریت کی شق مہیا کی گئی ہے۔ وہ آئین ساز اسمبلی میں عبوری حکومت منتخب کرنے کی کوشش بھی کریں گے۔ اگر کانگرس اپنا مؤقف منوانے کے لیے اس حد تک چلی گئی تو صاف ظاہر ہے کہ آئین ساز اسمبلی فوراً ٹوٹ جائے گی اور ہماری تمام تر کوششیں رائیگاں چلی جائیں گی۔ اگر ایسا ہوا تو میرا خیال ہے کہ کانگرس عوامی تحریک چلا کر اقتدار چھیننے کی پوری کوشش کرے گی۔''[21] 8رجولائی کو تحریر کردہ ان خدشات کی تائید نہرو نے 10رجولائی کی پریس کانفرنس میں بھرپور انداز میں کر دی تھی۔ کانگرس کے غیر مصالحانہ رویئے اور منافقانہ طرزِ عمل کے پیش نظر یہ خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ وزارتی مشن کانگرس کی ''پستول'' کے سامنے جس طرح گھٹنے ٹیک چکا تھا، اس کے جاتے ہی خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئی تھیں۔ جولائی کے پہلے ہفتے میں احمد آباد، الہ آباد، علی گڑھ، بمبئی، مدورا اور ڈھاکہ میں خونریز ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ سرکاری تخمینے کے مطابق صرف احمد آباد میں 61 مارے گئے، 372 زخمی ہوئے اور 3278 گرفتار کئے گئے۔''[22] وزارتی مشن جو لیبر حکومت کی کانگرس نواز پالیسی کا نقیب تھا، ہندو مسلم تضاد میں کمی کے بجائے زیادتی کا موجب بنا اس تضاد کے حل کے لئے تاریخ ایک اہم موڑ کاٹ چکی تھی۔

برطانوی حکومت کی وضاحتیں اور کانگرس کی من مانیاں

18رجولائی کو برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں وزارتی مشن کی کارکردگی زیر بحث آئی۔ پیتھک لارنس نے دارالامراء میں اور سٹیفورڈ کرپس نے دارالعوام میں رپورٹ

پیش کی اور مشن کی واپسی کے بعد کانگرسی راہنماؤں کے بیانات سے پیدا شدہ صورت حال پر اپنا مؤقف پیش کرتے ہوئے یکساں بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ ''ہندوستان سے اپنی روانگی سے قبل ہم نے دونوں پارٹیوں کے ساتھ ملاقات کی تھی اور دونوں نے ہمیں واضح الفاظ میں یقین دلایا تھا کہ وہ اسمبلی میں اس نیت سے جائیں گی کہ یہ بخوبی اپنا کام انجام دے۔ یقیناً ان کو مکمل آزادی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنے نظریات پیش کریں کہ مستقبل کے آئین کی کیا بنیاد ہونی چاہیے اور کیا نہیں ہونی چاہیے۔ آئین ساز اسمبلی کا یہی مقصد ہے کہ مختلف نظریوں اور منصوبوں کو ملا کر ایک سمجھوتہ وضع کیا جائے اور اسی طرح ان کو اس سلسلے میں بھی اپنے خیالات پیش کرنے کا حق ہوگا کہ آئین ساز اسمبلی کو کس طریقے سے اپنا کام انجام دینا چاہیے۔ لیکن 16 رمئی کی دستاویز پر متفق ہونے کے بعد اور اس کی بنیاد پر منعقدہ آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے بعد یقیناً وہ ان شرائط سے باہر نہیں جاسکتیں کہ جن پر اتفاق ہو چکا ہے۔ یہ دوسری پارٹیوں کے لیے نامناسب ہوگا جو کہ اس اسمبلی میں شامل ہوں گی اور حکومت برطانیہ اسی تسلیم شدہ طریقۂ کار کی بنیاد پر اس آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کو تسلیم کرے گی۔''[23] لیکن یہ ویسا ہی وضاحتی بیان تھا جیسا کہ مشن نے 25 رمئی کو کانگرس مجلس عاملہ کی 24 رمئی کی قرارداد کے رد میں جاری کیا تھا اور جس کو نظر انداز کر کے کانگرس نے مشن منصوبے کی منظوری کا اعلان کیا تھا اور جس کے باوجود مشن نے کانگرس کی اس ''منظوری'' کو تسلیم کر لیا تھا۔ کانگرس بدستور من مانی کے راستے پر گامزن تھی اور مشن منصوبہ کے اس ''متفقہ طریق کار'' سے روگردانی اختیار کر رہی تھی جیسا کہ ذکر ہوا۔

آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں کانگرس کے امیدوار پیراگراف 19 کی پابندی کا اقرار نامہ دینے پر تیار نہیں تھے۔ 16 رجولائی کو آسام کی صوبائی اسمبلی نے آئین ساز اسمبلی کے لیے اپنے نمائندوں کا انتخاب کیا۔ یہاں کانگرس اکثریتی پارٹی تھی اور اسی کی حکومت قائم تھی۔ یہاں سے آئین ساز اسمبلی کے لیے مخصوص 10 نشستوں کا، جن میں سے 7 عمومی اور 3 مسلم تھیں، انتخاب عمل میں لانے کے لیے اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو کانگرس کے وزیر اعلیٰ گوپی ناتھ بردولائی نے ایک قرارداد پیش کی جسے مسلم لیگی ارکان کی پرزور مخالفت کے باوجود منظور کر لیا گیا۔ اس میں صریح طور پر گروپ بندی کو رد کر دیا گیا تھا۔ قرارداد کے مطابق ''اس اسمبلی...... کی رائے میں صوبہ آسام کا یہ پختہ دعویٰ ہے کہ اس صوبے کے آئین کی تشکیل اور اس کا فیصلہ صرف اس

صوبے کی جانب سے آئین ساز اسمبلی کے لیے منتخب کردہ نمائندے ہی کریں گے۔ یہ بات صوبہ آسام کے مفادات کے بالکل منافی ہوگی کہ صوبہ آسام اپنے آئین کا فیصلہ کرنے کے لیے برطانوی ہند کے کسی صوبے کے ساتھ کسی حصے یا حصوں یا گروپ یا گروپوں میں شامل ہو۔ اب جب کہ اس اسمبلی کی رائے میں صوبہ آسام کو شامل کر کے صوبوں کے کسی گروپ کے لیے گروپ کی سطح کا آئین وضع نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے وہ تمام صوبائی شعبے جن سے صوبہ آسام کا مفاد یا تعلق وابستہ ہے، صوبوں کے کسی گروپ کی تحویل میں نہیں دیئے جائیں گے۔ چنانچہ یہ اسمبلی اپنے دس نمائندوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ......مندرجہ ذیل طریقے کے مطابق عمل کریں۔

''۱...... یہ کہ مذکورہ نمائندے صوبہ آسام کے آئین کی تشکیل اور فیصلہ صرف اس اجلاس یا اجلاسوں میں کریں گے کہ جن میں وہ خود یعنی آسام کی قانون ساز اسمبلی کی طرف سے منتخب کردہ آئین ساز اسمبلی کے ارکان بذاتہی شریک ہوں گے۔

''۲۔ یہ کہ مذکورہ نمائندے صوبہ آسام کے آئین کا فیصلہ کرنے کی خاطر صوبوں کے کسی گروپ کے اجلاس یا اجلاسوں میں شرکت نہیں کریں گے۔

''۳۔ یہ کہ مذکورہ نمائندے ہر اس کوشش کی مزاحمت کریں گے جس میں کسی گروپ آئین کی تشکیل میں ایسے امور کو لایا جائے گا کہ جن سے صوبہ آسام کا مفاد یا تعلق وابستہ ہے یا ایسے ہی کچھ امور صوبوں کا کوئی گروپ محض اکثریت کی بنا پر طے کرنے کی کوشس کرے گا اور

''۴۔ یہ کہ مذکورہ نمائندے آئین سے وابستہ معاملات کے لیے مرکز کا آئین وضع کرنے کی خاطر آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں حصہ لیں گے۔''[24]

اس قرارداد کی منظوری کے بعد آئین ساز اسمبلی کے ''مذکورہ نمائندوں'' کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور یوں یہ نمائندے اپنے صوبے کے قانون کے مطابق گروپ بندی سے متعلق کسی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کے پابند ہو گئے۔ اس قرارداد میں صاف طور پر بنگال کے ساتھ گروپ بندی کے تمام راستوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ آسام کے نمائندوں کے بائیکاٹ کی صورت میں بنگال کے نمائندے کثرت رائے سے بھی گروپ کا آئین تشکیل نہیں دے سکتے تھے۔

آسام اسمبلی کے اس فیصلے کا ایک محرک تو گروپنگ کے خلاف کانگرس کی طے شدہ پالیسی تھی لیکن اس کا ایک اور محرک مقامی بھی تھا۔ آسام کی وادی قدرتی وسائل کی نعمتوں سے مالا مال تھی۔ معدنی تیل اور چائے کے باغات یہاں کی دولت تھے۔ یہاں کی آبادی کم تھی جب کہ ہمسایہ صوبہ بنگال کثرت آبادی کے بوجھ تلے بری طرح دبا ہوا تھا اور قدرتی طور پر بنگالیوں بالخصوص مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی آسام کی جانب نقل مکانی کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا۔ آسام کے ہندو اور مقامی قبائل کا بنگالیوں کے ساتھ تضاد پہلے ہی موجود تھا۔ ان حالات میں آسام والوں کو یہ اندیشہ تھا کہ بنگال کے ساتھ گروپ بننے کی صورت میں بنگالی پوری طرح ان کے علاقے پر غلبہ مسلط کر لیں گے اور آسام میں غیر آسامیوں (بنگالیوں) کی اکثریت آباد ہو جائے گی۔ ان کے وسائل سے غیر فائدہ اٹھائیں گے اور وہ پسماندہ اور محروم رہیں گے۔ یہ تضاد کانگرس کے کام آیا جو گروپنگ کو پہلے ہی سبوتاژ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھی۔ متذکرہ قرارداد کے ذریعے صوبہ آسام نے وزارتی مشن منصوبہ کے پیرا۔19 میں دیئے گئے ''تسلیم شدہ طریق کار'' کی صریح خلاف ورزی کا ارتکاب کیا تھا۔لیکن اس پر برطانوی حکومت کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا بلکہ اس صوبے کے منتخب کردہ دس ارکان کی آئین ساز اسمبلی میں رکنیت کو قبول کیا گیا۔ نہرو نے وزیراعظم آسام بردولائی کے نام اپنے ایک خفیہ خط میں لکھا کہ گروپ میں شمولیت کے خلاف آپ کا فیصلہ بالکل درست اور موزوں ہے۔ البتہ صوبوں کے ارکان کسی سیکشن (حصے) کی صورت میں اجلاس کر سکتے ہیں۔''[25]

ادھر بنگال اسمبلی میں بھی گروپ بندی کو سبوتاژ کرنے کا سامان مہیا کیا جا چکا تھا۔ یاد رہے کہ 25رجون کو جب کہ ابھی کانگرس اور لیگ کی ہار جیت سامنے نہیں آئی تھی، بنگال اسمبلی کے یورپی ارکان نے برطانوی حکام کی ہدایت پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے لیے کسی یورپی نمائندے کو نہ تو نامزد کریں گے اور نہ ہی اسے ووٹ دیں گے۔ لیکن ووٹنگ میں حصہ لینے کا حق ضرور استعمال کریں گے۔ لیکن اس دوران وزارتی مشن کے تعاون سے کانگرس نے لیگ کو سیاسی چالبازی میں مات دے دی۔ چنانچہ 5رجولائی کو بنگال کے یورپی ارکان اسمبلی نے ووٹنگ میں حصہ لینے سے بھی دستبرداری کا اعلان کر دیا[26] اور اس طرح آئین ساز

اسمبلی میں اپنے حصے کی پانچ نشستیں پورے طور پر کانگرس کی جھولی میں ڈال دیں کہ عمومی نشستوں کا انتخاب اب صرف کانگرس یا اس کے حامی ارکان نے ہی عمل میں لانا تھا۔ آسام کے یورپی ارکان نے بھی نہ ووٹنگ میں حصہ لیا اور نہ ہی اپنا کوئی نمائندہ نامزد کیا اور وہاں اپنے حصے کی ایک نشست کانگرس کو دے دی۔ اس طرح بنگال اور آسام پر مشتمل گروپ ج کے اندر گروپ بندی کی سکیم کے حق اور مخالفت میں تقریباً برابر کا توازن پیدا ہو گیا۔

بنگال اور آسام کے یورپی ارکان کا متذکرہ فیصلہ ظاہر ہے کہ برطانوی حکمرانوں کی مشاورت سے عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ وزارتی مشن منصوبہ پر عمل درآمد شروع ہوا تو اس کے ابتدائی مرحلے ہی میں اس کی ناکامی کا بیج بویا جا چکا تھا۔ کانگرس من مانے طریقے سے اس پر عمل درآمد کر رہی تھی اور برطانوی حکمران بعض معاملوں میں اس کی حمایت کر رہے تھے اور بعض معاملوں میں درگزر سے کام لے کر بالواسطہ طور پر اس سے تعاون کر رہے تھے۔ ان کے بین الاقوامی تقاضے کانگرس کو ناراض کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کانگرس اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پورے برصغیر پر بلاشرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتی تھی اور خود کو کسی منصوبے یا معاہدے کا پابند نہیں سمجھتی تھی۔

عبوری حکومت کی تشکیل کی از سرِ نو کوشش۔ کانگرس کی شرائط کے سامنے برطانوی حکومت کا جھکاؤ۔ ویول کے اختلافات

عبوری حکومت کی تشکیل کے معاملے میں بھی حکومت برطانیہ کانگرس کی ہٹ دھرمی کے سامنے جھکتی چلی جا رہی تھی اور اس کے منطقی نتیجہ کے طور پر مسلم لیگ کی حیثیت اور اہمیت نظر انداز ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں پیتھک لارنس نے برطانوی کابینہ کے لیے ایک یادداشت تیار کی جس میں سفارش کی گئی کہ کانگرس کو عبوری حکومت میں اپنی مخصوص نشستوں میں سے ایک پر مسلمان کی تقرری کا اختیار دے دیا جائے یا علیحدہ سے ایک نیشنلسٹ مسلمان کی نشست مخصوص کی جائے جس پر وائسرائے اپنی جانب سے ذاکر حسین کو مقرر کر دے اور جناح کو صاف طور پر یہ بتا دیا جائے کہ عبوری حکومت کے تمام مسلمان ارکان مسلم لیگ سے نہیں لیے جا سکتے۔ اس

میں یہ بھی کہا گیا کہ کانگرس کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ وہ اس نکتے پر زیادہ زور نہ دے۔ اس طرح وائسرائے جناح اور نہرو کے ساتھ ملاقاتیں کر کے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کرے۔ بصورت دیگر 16 رجون کے اعلان کی طرح ہمیں پھر سے ایک عبوری حکومت کا اعلان کرنا ہوگا جس میں غیر لیگی نیشنلسٹ مسلمان کو شامل کیا گیا ہو۔ اس بنا پر کافی امکان ہے کہ جناح اس کو رد کر دیں گے۔ اس صورت میں کانگرس کو حکومت بنانے کا اختیار دینے کے بہت سے مضمرات کا جائزہ لیا گیا اور اس میں پنہاں خطرات کی بھی نشان دہی کی گئی۔ اس شبے کا بھی اظہار کیا گیا کہ کیا کانگرس 16 رمئی کے مشن منصوبے پر ''ہماری منشا کے مطابق عمل کرے گی یا نہیں اور آیا وہ آئین ساز اسمبلی کا گروپوں کی صورت میں اجلاس ہونے بھی دے گی یا نہیں۔ مشن کی واپسی کے بعد کانگرسی رہنماؤں کے بیانات اس سلسلے میں حوصلہ افزا نہیں ہیں۔'' چنانچہ اس نے تجویز کیا کہ اگر عبوری حکومت کے سلسلے میں دونوں پارٹیاں متفق نہ ہو سکیں تو اسی صورت میں آئین ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس تک کہ جس میں طریقۂ کار کے معاملات طے ہونے ہیں، عبوری حکومت کی تشکیل کو ملتوی کر دیا جائے۔ پیتھک لارنس کی اس یادداشت کے علاوہ انڈین سول سروس کے ایک اعلیٰ برطانوی افسر پینڈرل مون کا نوٹ بھی زیر غور آیا۔ اس نے تجویز کیا تھا کہ مجوزہ عبوری حکومت میں دونوں بڑی پارٹیوں کے لیے صرف کوٹہ مخصوص کر دیا جائے، اس پر تقرری کا کام وہ خود انجام دیں اور اس معاملے میں مکمل طور پر آزاد ہوں۔ ایک کو دوسرے کے کوٹے میں تقرر پانے والوں پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس نے کانگرس کے لیے 6 مسلم کے لیے 5 اور اکالی سکھوں کے لیے ایک نشست مخصوص کی اور 14 رکنی ایگزیکٹو کا مجوزہ فارمولا برقرار رکھتے ہوئے کہا کہ اقلیتوں کی دو نشستوں پر وائسرائے دونوں بڑی پارٹیوں کے مشورے سے خود تقرری کرے۔ اس میں واضح طور پر کانگرس کے کوٹے میں نیشنلسٹ مسلمان کے تقرر کی گنجائش پیدا کر دی گئی تھی اور اس پر مسلم لیگ کے اعتراض کے حق کو ختم کر دیا گیا تھا۔ مون نے اپنے نوٹ میں مزید لکھا کہ ''اگر کسی وجہ سے کہ جس میں دونوں بڑی پارٹیوں کے عدم تعاون کا امکان بھی شامل ہے، مجوزہ انداز سے مخلوط حکومت تشکیل دینا ناممکن ہو جائے تو پھر سب سے بڑی واحد جماعت کی حیثیت سے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی جائے لیکن اس کے بارے میں اپنی نیت کو افشاء نہ ہونے دیا جائے ممکن ہو تو صرف آخری لمحات میں

جناح کو اس کی اطلاع دے دی جائے۔'' تاہم مون نے اپنی بھرپور توقع ظاہر کی کہ اس مجوزہ فارمولے کو دونوں پارٹیاں قبول کر لیں گی۔ اس نے آخر میں لکھا کہ ''......حال میں اگر ہم کانگرس کا اس کے کوٹے میں نیشنلسٹ مسلم کے تقرر کا حق تسلیم کر لیتے تو مسلم لیگ تعاون سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ محض اتنی سی بات پر کہ اونچی ذات کے ہندو کی نشست پر مسلمان مقرر کیا جا رہا تھا، وہ ویرانے کا رخ اختیار نہیں کر سکتی تھی۔'' کیونکہ اس کی رائے تھی کہ ''لیگ نسبتاً کمزور ہے اور لڑائی مار کٹائی سے مانوس نہیں ہے۔ اس لیے اگر اس نے لڑنا ہی ہے تو کسی ٹھوس بنیاد پر لڑے گی، اس فضول بنیاد پر نہیں لڑے گی۔'' سٹیفورڈ کرپس نے مون کے نوٹ پر لکھا کہ ''...... یہ ایک اچھی لائن ہے اور درست ثابت ہو سکتی ہے۔'' اس پر پیتھک لارنس نے لکھا کہ آخر میں مون نے جو تجویز کیا ہے ہم اختیار کر سکتے تھے اگر 20ر جون کو وائسرائے نے جناح کو یقین دہانیوں پر مبنی خط نہ لکھا ہوتا جس کی میں نے اس وقت بھی مخالفت کی تھی۔''[27]

چنانچہ مسلم لیگ کی ہنگامہ آرائی کے معاملے میں کمزوری اور اس معاملے میں کانگرس کی قوت، ایک ایسا تاثر تھا جو برطانوی حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا تھا۔ وزارتی مشن کے دو اہم وزیروں نے مون کے ساتھ اتفاق کیا اور 18ر جولائی کو برطانوی کابینہ نے انہی خطوط پر فیصلہ دیا۔ وزیر اعظم ایٹلی نے وائسرائے کے لیے تجویز کیا کہ وہ 14 رکنی ایگزیکٹو کی تشکیل ان خطوط پر کرے کہ 6 نشستیں کانگرس نامزد کرے، 5 مسلم لیگ نامزد کرے اور اقلیتوں کی 3 نشستیں وائسرائے خود نامزد کرے۔ مزید یہ واضح کر دے کہ ''حکومت برطانیہ کی رائے میں جناح کے اس دعوے کی وجہ سے کہ مسلمانوں کو نامزد کرنے کا اختیار صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے، عبوری حکومت کی تشکیل کو روبہ عمل لانے سے نہیں روکا جا سکتا۔''[28] کابینہ نے وزیر اعظم کی اس تجویز کی منظوری دے دی اور پیتھک لارنس نے اس مضمون کا تار وائسرائے کو ارسال کر دیا۔ اس میں کہا گیا کہ دونوں پارٹیوں کے سربراہوں یعنی نہرو اور جناح کو مذکورہ فارمولا سے آگاہ کر دیا جائے اور ان سے اپنے کوٹے کی مخصوص نشستوں کے لیے نام طلب کئے جائیں۔ اس نے مزید واضح کیا کہ ''اگر جناح اس بنیاد پر یہ پیش کش رد کر دے کہ کانگرس نے مسلمان کو شامل کیا ہے تو پھر بلاشبہ آپ بھی ہمارے ساتھ اتفاق کریں گے کہ آخری حربے کے طور پر ہمیں مسلم لیگ کے بغیر ہی ہر ممکن طور پر نمائندہ عبوری حکومت تشکیل دینا ہو گی......اگر مسلم لیگ عبوری

حکومت سے باہر رہے تو پھر ہماری رائے یہ ہے کہ مسلم لیگ کے کوٹے کی نشستوں پر بعض دوسرے مسلمانوں کو مقرر کر دیا جائے۔"[29] نہ تو کابینہ کے اجلاس میں اور نہ ہی اس مراسلے میں کہیں یہ ذکر آیا کہ اگر کانگرس نے اس تجویز کو رد کر دیا تو کیا لائحہ عمل ہوگا۔ گویا یہ طے بات تھی کہ کانگرس کو بہر صورت عبوری حکومت میں شامل کیا جائے گا خواہ مسلم لیگ شامل ہو یا نہ ہو۔

چنانچہ 22رجولائی کو ویول نے نہرو اور جناح کو ایک ہی مضمون کے خطوط ارسال کئے اور ان کو خفیہ رکھنے کی درخواست کی۔ فارمولے کی وضاحت کی گئی کہ کانگرس اپنی 6 نشستوں پر اور مسلم لیگ اپنی 5 نشستوں پر خود نامزدگی کرے گی۔ اقلیتوں کی 3 نشستوں پر جن میں سے ایک سکھوں کے لیے مخصوص ہے، وائسرائے خود نامزدگی کرے گا۔ مزید یہ کہ "نہ کانگرس اور نہ مسلم لیگ کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ دوسری پارٹی کے نامزد کردہ افراد پر کوئی اعتراض کرے......" آگے چل کر یہ بھی کہا گیا کہ "میں خیر مقدم کروں گا اگر کانگرس آزادانہ طور پر یہ قول و قرار دینے کی پیش کش کرے کہ بڑے فرقہ وارانہ مسائل دونوں پارٹیوں کی باہمی رضامندی سے طے کئے جائیں گے۔ اگرچہ میری یہ رائے بالکل نہیں ہے کہ اسے ضروری ہی باقاعدہ شرط قرار دیا جائے کہ دراصل کوئی بھی مخلوط حکومت اس کے علاوہ کسی اور بنیاد پر چل ہی نہیں سکتی۔"[30] گویا 20رجون کو ویول نے جناح کو جو یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ بڑے فرقہ وارانہ مسائل دونوں پارٹیوں کی باہمی رضا مندی سے طے پائیں اب ایک ضروری امر نہیں رہ گیا تھا، اسے کانگرس کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ اگر وہ آزادانہ طور پر اس کی پیش کش کرے تو اس کا "خیر مقدم" کیا جائے گا۔

اب باوجودیکہ عبوری حکومت کے بارے میں کانگرس کے ان بیشتر اعتراضات کا ازالہ کر دیا گیا تھا جو اس نے 16رجون کے اعلان میں مجوزہ عبوری حکومت کو رد کرتے وقت اٹھائے تھے، نہرو نے 23رجولائی کو ویول کے نام اپنے جوابی خط میں اس نئی پیش کش کو بھی رد کر دیا۔ اب جواز یہ بنایا گیا کہ عبوری حکومت کو زیادہ سے زیادہ بااختیار بنایا جائے۔ نہرو نے لکھا "......کل ہند ہڑتالیں جو آج کل جاری ہیں اس بات کی علامت ہیں کہ ملک میں شدید تناؤ موجود ہے اور بے شمار مسائل جمع ہو گئے ہیں جن کے حل عرصے سے التوا میں پڑے ہیں۔ صرف ایک مضبوط حکومت جو اپنے مقاصد میں واضح ہو، اس صورت حال سے نمٹ سکتی ہے۔

ایسی حکومت آپ کے مجوزہ طریقے سے تشکیل نہیں پا سکتی۔'' اس نے مزید لکھا کہ ''آپ کو یاد ہے کہ ہم ہمیشہ سے عبوری حکومت کی آزادیٔ عمل پر زور دیتے چلے آئے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کلی طور پر خودمختار ہو اور گورنر جنرل محض آئینی سربراہ کی حیثیت سے کام کرے۔'' آگے چل کر اس نے لکھا کہ اگر یہ ''آزادیٔ عمل'' تسلیم کر لی جائے ''تو پھر گورنر جنرل کے لیے یہ مناسب نہ ہو گا کہ وہ اقلیتوں کے نمائندوں کا خود انتخاب کرے جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں تجویز کیا ہے۔'' مزید یہ کہ ''عارضی عبوری حکومت کی حیثیت اور اختیارات کے بارے میں پہلے واشگاف الفاظ میں فیصلہ ہونا چاہیے۔'' اور آخر میں یہ کہا کہ ''کانگرس والے چاہتے ہیں کہ پہلے سیاسی آزادی کا معاملہ طے ہو تو پھر ہی کسی حکومت میں شامل ہوا جا سکتا ہے۔'' ان تمام وجوہات کی بناء پر میں آپ کی مجوزہ حکومت کی تشکیل میں تعاون سے قاصر ہوں۔''[31] اس جواب پر ویول بہت برہم ہوا۔اس نے اپنے روزنامچے میں لکھا۔''اسے کانگرس کی جانب سے عملاً ایک الٹی میٹم سمجھنا چاہیے، یہ تقریباً اعلان جنگ ہے۔حکومت میں وائسرائے کی حیثیت محض صفر کی سی ہو، وہ محض برائے نام سربراہ ہو، اسے اقلیتی نمائندوں کے تقرر میں بھی رائے دینے کا حق نہ ہو۔وغیرہ وغیرہ۔''[32]

ویول نے نہرو کے خط کا متن پیتھک لارنس کو ارسال کرنے کے بعد 24 رجولائی کو اس کے بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کرتے ہوئے پیتھک لارنس کو لکھا ''نہرو کے خط سے اور دوسری اطلاعات سے جو مجھے حاصل ہوئی ہیں، پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بمبئی میں انہوں نے اپنے اجلاس میں قطعی اور جارحانہ لائحہ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔معلوم ہوتا ہے وہ پوری طرح قائل ہو چکے ہیں کہ حکومت برطانیہ ان کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی اور وہ جو بھی مطالبہ کریں گے وہ اس کے سامنے جھک جائے گی۔'' آگے چل کر اس نے 29 رجولائی کو نہرو کے سامنے اپنی آمدہ ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ بالکل واضح ہو گیا ہے کہ کانگرس عبوری حکومت میں سوائے اس صورت کے شامل نہیں ہو گی کہ اقتدار مطلق اس کے حوالے کر دیا جائے اور گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات منسوخ کر دیئے جائیں تو میں بھی صاف صاف لفظوں میں اس پر اپنا مؤقف واضح کر دوں گا۔ میں اسے کہوں گا کہ حکومت برطانیہ اہل ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے کا پختہ ارادہ رکھتی ہے۔ وہ ایک متحدہ

ہندوستان چاہتی ہے۔لیکن وہ کانگرس کو پورے ہندوستان کی نمائندہ تسلیم نہیں کرتی اورصرف کانگرس کواقتدارمنتقل کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ عبوری حکومت کا کام کاج چلانے میں ایسی تبدیلیوں پرغور کرنے کے لیے البتہ آمادہ ہےجس کا مطالبہ دونوں پارٹیاں کریں گی لیکن حکومت برطانیہ کانگرس کے یک طرفہ مطالبات کوتسلیم نہیں کرے گی۔'' اس نے مزید لکھا کہ''اس امر کی شہادتیں مل رہی ہیں کہ کانگرس آئین ساز اسمبلی کوخود مختار ادارہ قرار دینے کا اعلان کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور پھر وہ اس میں سے حکومت منتخب کر کے جس پر کہ کانگرس کا غلبہ ہوگا اسے مجھ پر مسلط کرنے کی کوشش کرے گی...... اگرنہرو نے آئین ساز اسمبلی کا حوالہ دیاتو میں اسے صاف طور پر بتادوں گا کہ......حکومت برطانیہ کسی ایسے آئین کوتسلیم نہیں کرے گی جسے آئین ساز اسمبلی16رمئی کی دستاویز پرعمل درآمد کر کے وضع نہیں کرے گی۔ اس بارے میں قطعی طور پر پارلیمنٹ میں اعلان کیا جا چکا ہے۔''اورآخر میں اس نے لکھا کہ''جیسا کہ نہرو کے خط سے تقریباً واضح ہو ہی چکا ہے، کانگرس نے حکومت برطانیہ کوچیلنج کرنے اور ہندوستان کی واحد مؤثر طاقت بننے کا فیصلہ کرلیا ہےتو پھرحکومت برطانیہ کوبھی یہ ابھی سوچنا ہوگا کہ آیا اس نے اقتدار سے دستبردار ہونا ہے یانہیں۔ مجھے اس بارے میں ذرا سا بھی شک وشبہ نہیں ہے کہ ہمیں ضرورت پڑنے پراس چیلنج کوقبول کرلینا چاہیے۔ہم اخلاقی طور پر پابند ہیں کہ ہم مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کوکانگرس کے بلاروک ٹوک غلبے کے حوالےنہیں کریں گے اور یہ خود ہمارے مفاد میں بھی ہوگا کہ ہم اس طرح مسکینی کے ساتھ دستبردار نہ ہوں۔''[33] ویول کے ان تاثرات میں نہرو کے خط کے علاوہ جن ''دوسری اطلاعات'' کودخل تھا ان کا عندیہ اس کے 22رجولائی کے روزنامچے سے بھی ملتا ہے۔جس میں وہ لکھتا ہے۔''سمتھ، ڈی۔آئی۔بی (ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو) نے امن عامہ کے متعلق بڑی مایوس کن پیش گوئی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ملک سنگین نوعیت کی گڑبڑ کے لئے بالکل تیار ہو چکا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کانگرس آئین ساز اسمبلی کواقتدار کا تختہ الٹنے کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کرے گی اور آئین ساز اسمبلی کوخود مختار ادارہ قرار دے کر متوازی حکومت قائم کر لے گی۔''[34]

یہ خدشات بے بنیادنہیں تھے کیونکہ پارلیمنٹ میں وزارتی مشن کے ارکان کے وضاحتی بیانات کے باوجود 23رجولائی کونہرو نے دہلی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے

اپنے مؤقف کا اعادہ کیا اور کہا کہ ''ہم آئین ساز اسمبلی کی یا تو اصلاح کر دیں گے یا اس کا خاتمہ کر دیں گے۔'' جب بعض اخبارات نے اسے نہرو کی جذباتیت قرار دیا تو اس نے وضاحت میں بیان دیا کہ میں نے سوچ سمجھ کر اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ بیان دیا ہے اور واضح کیا کہ ہم اسی لائن پر چلیں گے اور ضروری ہوا تو آئین ساز اسمبلی کو توڑ ڈالیں گے۔''[35]
تاہم ویول نے ان تمام خدشات وخطرات اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان سے نمٹنے کے بارے میں جو خط پیتھک لارنس کو لکھا اسے پیتھک لارنس نے وزیراعظم ایٹلی اور وزارتی مشن کے دوسرے ارکان کو دکھایا اور اس پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد 26 / جولائی کو ویول کو جواب دیا ''...... ہندوستان کی پارٹیوں کا مسلسل یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ قبل از وقت ہی اپنے متوقع نتائج کے حصول کی خاطر سودے بازی کی ایک پوزیشن اختیار کر لیتی ہیں اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ نہرو کے خط کو اس مفروضے کی بنیاد پر لینا انتہائی مہلک ثابت ہوسکتا ہے کہ یہ ایک حتمی چیلنج ہے اور یہ کہ کانگرس کے ساتھ براہ راست ٹکراؤ کا اندیشہ ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اسی طرح کی ایک اور کوشش ہے جیسی کہ وہ مشن کے مذاکرات کے دوران کرتے رہے ہیں تاکہ حکومت برطانیہ سے مزید کچھ رعایتیں ہتھیالی جائیں۔'' نہرو کے بمبئی کے بیانات کے بارے میں پیتھک لارنس نے لکھا کہ وہ کانگرس کے بائیں بازو کے عناصر کی تسلی کے لیے دیئے گئے تھے۔ ہماری رائے میں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کانگرس اس قدر انتہا پسندی کا مظاہرہ کرے گی۔'' چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگست کے اواخر تک جب کہ آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوگا، کانگرس کے ساتھ کوئی ایسا اختلاف پیدا نہ کیا جائے کہ جس سے ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو۔'' چنانچہ اس نے ویول کو ہدایت کی کہ ''ہمارے نزدیک یہ نہایت اہم ہے کہ 29 / جولائی کو نہرو کے ساتھ ملاقات میں کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہونے دی جائے کہ کانگرس کے ساتھ بالکل ہی بگاڑ پیدا ہو جائے یا یہ کہ وہ 8 / اگست کو ہونے والے مجلس عاملہ کے اجلاس میں اس ملاقات کی ایسی رپورٹ دے کہ بگاڑ کا امکان پیدا ہو جائے۔'' ویول نے اپنے متذکرہ مراسلے میں آئین ساز اسمبلی کے بارے میں وزارتی مشن کے ارکان کی جانب سے پارلیمنٹ میں دیئے گئے بیانات کے حوالے سے نہرو پر اپنے مؤقف کی ثابت قدمی ظاہر کرنے کا ذکر کیا تھا۔ پیتھک لارنس نے ویول کو ایسا کرنے سے منع کیا اور اپنے پارلیمنٹ کے بیان کے بارے میں لکھا کہ ''یہ بیان ہمیں

کسی ایسے آئین کو قبول کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا کہ جو کسی مختلف طریقۂ کار کو اختیار کر کے وضع کیا گیا ہو یا تو حالات کے تقاضے کے تحت اور یا یہ کہ بڑی پارٹیوں کے باہمی سمجھوتے کے تحت کوئی اور طریقۂ کار طے پا گیا ہو۔ اس لیے آپ ہمارے بیان کا نہرو کے ساتھ اس قدر قطعی انداز میں ذکر نہ کریں جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔''[36]

یہ تھیں لیبر حکومت کی جمہوری اور پارلیمانی اقدار کہ جنہیں اینگلو امریکی سامراجی مفادات کی خاطر بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا کہ ان کی خاطر کانگرس کو ہر قیمت پر راضی رکھنا ضروری تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ان ''آنریبل'' وزیروں نے جو بیان جاری کیا اور اس سے پہلے کابینہ اور شاہ برطانیہ کی منظوری سے ہندوستان میں 16رمئی کو جو دستاویز جاری کی، وائسرائے سے کہا گیا کہ اس سے پھر جانے میں کوئی عار نہیں۔ ویول نے اپنے روزنامچے میں پیتھک لارنس کے اس جوابی مراسلے کو ''فرمان ممانعت'' قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ''وہ بری طرح اس خوف کا شکار معلوم ہوتے ہیں کہ کہیں میں نہرو سے کوئی غیر مصالحانہ بات نہ کہہ دوں۔''[37]
ویول نے اس کے جواب میں 28رجولائی کو پیتھک لارنس کو لکھا کہ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سے بڑھ کر میں کانگرس کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے کا نہ تو ارادہ اور نہ خواہش رکھتا ہوں، بشرطیکہ اس سے درگزر ممکن ہو...... کانگرس والے یہ باور کروا رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیں یہاں سے بھاگنے پر مجبور کیا ہے، ہمیں فوری طور پر یہ تاثر زائل کرنا چاہیے۔'' اس نے اس سلسلے میں حکومت برطانیہ سے دو امور پر یقین دہانی چاہی (ا) یہ کہ ''عبوری حکومت کو اختیار دینے کے معاملے میں ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے جس حد تک میں 30رمئی کو آزاد کے نام خط میں دے چکا ہوں۔'' (ب) آئین ساز اسمبلی کے بارے میں آپ کے خط کے مندرجات ''میرے لئے پریشان کن ہیں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ حکومت برطانیہ آئین ساز اسمبلی کے تیار کردہ کسی ایسے آئین کو قبول کر لے گی جسے 16رمئی کی دستاویز کے بیان کردہ طریق کار سے ہٹ کر بنایا جائے گا۔''[38] لیکن اس مسئلے پر ویول اور لیبر حکومت کے درمیان اختلاف رائے دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ کانگرس کی ہٹ دھرمی کے سامنے لیبر حکومت اس کی دل جوئی اور چاپلوسی کو شعار بنائے ہوئے تھی جب کہ ویول پختہ روی کی راہ پر چلنا چاہتا تھا۔

یہ اختلاف بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی ظاہر ہو رہا تھا۔ گاندھی چاہتا تھا کہ ٹاٹا

گروپ کے نمائندہ سدھیر گھوش کو برطانیہ بھیجا جائے اور اسے وہاں برطانوی حکومت کی طرف سے مراعات دی جائیں تاکہ وہ وہاں کی رائے عامہ کو کانگرس کے حق میں ہموار کر سکے۔ پیتھک لارنس نے ہندوستان سے روانگی کے وقت ویول سے الوداعی ملاقات کے دوران یہ سفارش کی تھی کہ سدھیر گھوش کو برطانیہ بھجوانے کے خصوصی انتظامات کرائے جائیں۔ اس پر ویول نے جواب دیا تھا کہ ''مجھے کانگرس کے ایجنٹ کو مراعات دینے میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی اور یہ کہ سدھیر گھوش گھاس میں سانپ ہے۔''[39] اس کے بعد 3/جولائی کو گاندھی نے وزیراعظم ایٹلی کے نام ایک خط میں سدھیر گھوش کی سفارش کرتے ہوئے لکھا کہ ''وہ برطانیہ عظمیٰ اور ہندوستان کے مابین ایک بااعتماد اور پختہ پل ہے۔ وہ دونوں کے ساتھ گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ اس نے وسیع پیمانے پر برطانوی رابطے استوار کئے ہیں۔ اس نے اپنی خوشی سے آپ کے مشن کے ہاتھوں میں آلۂ کار بننا پسند کیا تھا اور اب انہی کے اصرار پر وہ برطانیہ جا رہا ہے۔''[40] یاد رہے یہ سدھیر گھوش ہی تھا جس کے ذریعے کرپس اور پیتھک لارنس نے گاندھی اور پٹیل کو خفیہ طور پر یقین دہانیاں کرائی تھیں کہ اگر کانگرس طویل المیعاد منصوبہ کو منظوری دینے اور عبوری حکومت کو رد کرنے کا اعلان کر دے تو عبوری حکومت کا سارا قصہ تمام کر دیا جائے گا اور پھر کانگرس نے 25/جون کی قرارداد پاس کی اور موعودہ نتائج حاصل کئے۔ 17/جولائی کو پیتھک لارنس نے ایک بار پھر ویول کو تار دیا کہ سدھیر گھوش کے ٹاٹا کے نمائندے کی حیثیت سے برطانیہ کے دورے کے لیے ہوائی سفر کا خصوصی ترجیح کے تحت بندوبست کیا جائے کیونکہ حکومت برطانیہ سمجھتی ہے۔ کہ ''مسٹر گھوش کا دورہ اس کردار کے پیش نظر جو اس نے وزارتی مشن کے سلسلے میں انجام دیا تھا، سیاسی طور پر بڑا سودمند ثابت ہوگا۔'' 18/جولائی کو ویول نے جواب دیا کہ میں اس کے لیے ترجیحی سفر کا بندوبست تو کر دوں گا لیکن یہ ''میرے مشورے اور خواہش کے خلاف ہوگا۔''

اس نے لکھا کہ یہ میرے اور دوسری پارٹیوں دونوں کے لئے ایک ناجائز بات ہوگی کہ ''گاندھی اور کانگرس کے اس ذاتی ایلچی کو خصوصی مراعات دی جائیں کیونکہ وہ ''سیاسی طور پر سودمند'' ثابت ہوگا۔'' اور 19/جولائی کے مراسلے میں ویول نے پیتھک لارنس کو لکھا کہ ''مجھے افسوس ہے کہ آپ نے سدھیر گھوش کے لیے خصوصی ہوائی سفر کے بندوبست کے لیے اصرار کیا

ہے۔ مجھے یہ بات سخت ناگوار گزری ہے اور اس کی وجوہات سے میں آپ کو آگاہ کر چکا ہوں۔ میری رائے میں یہ نجی "رابطے" اصولاً غلط ہیں اور عملاً ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"[41] بلکہ "یہ بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"[42]

اسی طرح کا ایک اختلاف اس وقت رونما ہوا جب کانگرس کی جانب سے یہ اصرار کیا جانے لگا کہ وائسرائے صرف سول سروس کے افسروں کی رائے پر چلتا ہے۔ اس لیے مورس گوائر (Maurice Gwyer) نامی برطانوی ماہر قانون کو جو ہندوستان کا چیف جسٹس (1937 تا 1943ء) اور دہلی یونیورسٹی کا وائس چانسلر (1938 تا 1950ء) رہا، ویول کا سیاسی مشیر مقرر کر دیا جائے۔ ویول اسے انتہا درجے کی کانگرس نوازی اور اپنی توہین سمجھتا تھا۔ چنانچہ 24/جون کو پیتھک لارنس نے ویول کے ساتھ ملاقات میں جب یہ تجویز رکھی تھی تو ویول نے کہا تھا "مشن کی آمد سے بہت پہلے سے میں اپنی صوابدید پر اعتماد کر کے کام چلا رہا ہوں اور اگر حکومت برطانیہ یا وزیراعظم مجھے تبدیل کر کے کسی اور کو لانا چاہتے ہیں جو زیادہ سیاسی تجربہ رکھتا ہو تو مجھے کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔"[43] 22/جولائی کو وزیراعظم ایٹلی نے ویول کے نام اسی مقصد کے لیے ایک خط لکھا جس میں پہلے تو ہندوستان کے سیاسی و آئینی مسائل کی پیچیدگی کے حوالے سے ایک نقشہ کھینچا اور ثابت کیا کہ جس قسم کی صورت حال ویول کو درپیش ہے کبھی کسی وائسرائے کو درپیش نہیں ہوئی۔ اس کے بعد کہا گیا کہ "سیاست کی اپنی تکنیک ہوتی ہے جو صرف عمل سے حاصل ہوتی ہے درسی کتب سے نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ ہم نے آپ کو ان معاملات میں کوئی تجربہ کار شخص مہیا نہ کر کے ایک نامناسب صورت حال سے دوچار کر دیا ہے۔ آپ سپاہی ہیں جو سیاسی مشیروں کے بغیر اسی طرح ہے جیسے وزیراعظم کو فوجی امور میں چیفس آف سٹاف کے بغیر چھوڑ دیا جائے۔ آنے والے مشکل مہینوں میں آپ کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کو آپ کے ساتھ منسلک کیا جانا چاہیے جو ان معاملات میں اچھی طرح ماہر ہو اور آپ کے اور سیاست دانوں کے درمیان بیچولیے کا کام کر سکے...... وہ وطن (برطانیہ) سے ہو یا ایسا ہو جو وطن میں اور ہندوستان میں حکومت کا کام کاج چلانے کے متعلق اچھی طرح علم رکھتا ہو۔ اس سلسلے میں مورس گوائر کا نام میرے ذہن میں آتا ہے جو کہ دونوں معیاروں پر پورا اترتا ہے۔"[44] اس پر ویول نے اپنے روزنامچے میں لکھا کہ وزیراعظم کو "یقیناً یہ بتایا گیا ہے کہ مجھے

انڈین سول سروس کے حکام کے مشورے کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہے۔ اس لیے میری سیاسی بصیرت ناقص ہے یعنی پوری طرح کانگرس نواز نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری بصیرت حکومت برطانیہ کی نسبت زیادہ بہتر ہے اور میں یہ بات صاف کہہ دوں گا اور اسے بتا دوں گا کہ اگر حکومت برطانیہ کو پسند نہیں تو اس کا فرض ہے کہ وہ کوئی اور وائسرائے ڈھونڈ لے، میں برائے نام سربراہ کی حیثیت قبول نہیں کروں گا‘‘[45] اور پھر ویول نے یکم اگست کو اس کا جواب دیتے ہوئے ایٹلی کو لکھا کہ ’’مجھے 1919ء سے مشرق وسطیٰ، مصر، فلسطین اور عراق میں فوجی کے ساتھ ساتھ سیاسی تجربہ بھی حاصل ہوا ہے اور گزشتہ پانچ برس سے میں ہندوستان کی حکومت میں ہوں اور یہاں کی سیاست اور سیاست دانوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس لیے مجھے سیاست دانوں کے ساتھ معاملات کے لیے کسی بیچولیے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں براہ راست رابطے کو ترجیح دیتا ہوں۔‘‘ اس نے بلا تکلف ہو کر لکھا کہ ’’سابقہ وزارتی مشن کے یہاں بہت سے غیر سرکاری مشیر اور بالواسطہ رابطے موجود تھے۔‘‘ یعنی یہ کہ اس کے باوجود بھی مشن ناکام رہا۔ آخر میں ویول نے لکھا کہ ’’......اگر آپ اور حکومت برطانیہ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کی سربراہی سپاہی کے بجائے سیاست دان کے سپرد ہونی چاہیے اور آپ شاہ برطانیہ سے کسی کی سفارش کرنا چاہتے ہیں تو میں بلا اعتراض آپ کا فیصلہ قبول کرلوں گا۔‘‘[46] کانگرس کو بلا شرکت غیرے اقتدار منتقل کرنے کے سوال پر ویول اور لیبر حکومت کے مابین اختلافات کی یہ خلیج وسیع اور گہری ہوتی گئی یہاں تک کہ چند ماہ بعد ویول کی برطرفی پر منتج ہوئی اور لیبر حکومت اور کانگرس کی جیت ہوئی جیسا کہ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوگا۔

مسلم لیگ نے حکومت برطانیہ سے مایوس اور کانگرس کی رعونت سے برافروختہ ہو کر وزارتی مشن منصوبہ رد کر دیا۔ ڈائریکٹ ایکشن

کانگرس کی ہٹ دھرمی اور رعونت اور حکومت برطانیہ کی کانگرس نوازی کے اس پس منظر میں مسلم لیگ کونسل کا تاریخی اجلاس 27رجولائی 1946ء کو بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس دوران جناح کو وزیراعظم ایٹلی کے نام بھیجے گئے اپنے خفیہ اور ذاتی خط کا جواب بھی 22رجولائی کو موصول ہو گیا تھا جس میں وزیراعظم موصوف نے لکھا تھا کہ ’’جہاں تک 16رمئی کی دستاویز کا

تعلق ہے تو کانگرس نے جن شرائط پر اسے منظوری دی ہے وہ یقیناً کچھ تشنہ ہیں لیکن میں یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ نے بھی تو اپنی 6 رجون کی قرار داد میں بعض باتوں پر اختلاف کا حق محفوظ رکھا ہوا ہے۔ یہ صرف آئین ساز اسمبلی کی کاروائی سے ہی معلوم ہو سکے گا کہ ہر دو پارٹیوں نے اختلاف کے لیے اپنے جو حقوق محفوظ کر رکھے ہیں ان کے ہوتے ہوئے کوئی ایسا آئین وضع ہو سکے گا کہ جو دونوں پارٹیوں کی امنگوں پر پورا اترتا ہو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کے پرامن اور روشن مستقبل کے لیے موجودہ اختلافات کو دلائل اور مفاہمت کے ذریعے طے کرنا ہو گا۔ یہی تو آئین ساز اسمبلی کا کام ہے......''[47] گویا ایٹلی نے نہرو اور کانگرسی رہنماؤں کے اس مؤقف کی تائید کر دی تھی کہ ابھی کچھ طے نہیں ہے، جو کچھ ہونا ہے وہ آئین ساز اسمبلی کے اندر جا کر ہونا ہے اور یہ کہ جہاں تک 16 رمئی کے وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کا تعلق ہے تو دونوں پارٹیاں ایک ہی سطح پر ہیں۔

ایٹلی کے اس خط کے بعد جناح کو حکومت برطانیہ سے خیر کی کوئی توقع نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ انہوں نے مسلم لیگ کونسل کے افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''گزشتہ ساڑھے تین ماہ کے آئینی مذاکرات کے دوران اور اس کے بعد جو کچھ ہوا ہے اس کے نتیجے میں مجھے پوری طرح یقین ہو گیا ہے کہ مسلم لیگ کے پاس اس کے سوا اب کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا کہ وہ اپنے زور بازو پر انحصار کرے اور حصول پاکستان کے نصب العین کی پابند ہو جائے۔'' انہوں نے کہا کہ مسلم لیگ نے دیانت داری کے ساتھ آبرومندانہ سمجھوتے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور یہاں تک کہ منت سماجت سے بھی کام لیا لیکن کانگرس نے جواب میں کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ مشن کے بارے میں انہوں نے کہا ''وزارتی مشن کانگرس کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ دراصل اس نے خود اپنی چال چلی ہے۔'' اور یہ کہ ''تمام مذاکرات کے دوران وزارتی مشن اور وائسرائے مسلسل کانگرس کی دہشت اور دھمکیوں کے اثر میں رہے۔'' اور پھر ''وہ اپنے قول سے پھر گئے اور اپنے 16 رجون کے اعلان میں دیئے گئے منصوبے سے دست کش ہو گئے۔'' طویل المیعاد منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے جناح نے کہا کہ کانگرس نے اسے کبھی بھی منظور نہیں کیا۔ لیکن ''وزارتی مشن نے جس طرح ایک ڈوبتا ہوا آدمی تنکے کا سہارا لیتا ہے اسی طرح کانگرس کی اس مشروط منظوری کو حقیقی منظوری قرار دے دیا۔ انہوں نے نہ صرف اس ملک میں یہ تاثر دینے کی

کوشش کی بلکہ دارالعوام اور دارالامرا میں بحث کے دوران سر سٹیفورڈ کرپس اور لارڈ پیتھک لارنس نے یہی تاثر دیا کہ کانگرس نے طویل المیعاد منصوبہ منظور کر لیا ہے۔'' جناح نے پیتھک لارنس کے دارالامرا کے بیان ''ہندوستان کی پارٹیاں تسلیم شدہ شرائط سے باہر نہیں جا سکیں گی۔'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''اس پرفریب جملے کے علاوہ ایسی صورت حال کے سدباب کے لیے کچھ نہیں کہا گیا کہ جس میں کانگرس جسے آئین ساز اسمبلی میں بھیمانہ اکثریت حاصل ہے، کوئی ایسا فیصلہ کر ڈالے جو اسمبلی کے دائرہ اختیار سے باہر ہو اور یہ اسمبلی اس کی اہل نہ ہو۔ مشن ایسی صورت حال سے واقف تھا۔ یہ واضح ہو چکا تھا کہ کانگرس نے اختلاف کا حق محفوظ رکھ کر اور سکیم کی بعض بنیادی شقوں پر اپنی تعبیر کی بنیاد پر منظوری دی تھی......بحث سے پیشتر برطانوی حکومت ان تمام تفصیلات سے آگاہ ہو چکی تھی، لیکن پھر بھی لارڈ پیتھک لارنس نے خود کو امید کے اس پرفریب بیان تک محدود رکھا۔'' جناح نے اپنی تقریر میں کانگرسی رہنماؤں بالخصوص نہرو کے بمبئی اور دہلی کے بیانات کا حوالہ دیا اور کہا کہ ان کے بعد بھی پیتھک لارنس کا یہ کہنا کہ مجھے اعتماد اور امید ہے کہ ہندوستانی لوگ ٹھیک کام کریں گے، انتہائی پرفریب رجائیت ہے۔'' جناح نے کہا کہ ''ہم ہر دلیل آزما چکے ہیں۔ اب کسی سے امداد یا اعانت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کوئی ٹریبونل نہیں جہاں ہم جا سکیں۔ مسلم قوم ہی واحد ٹریبونل ہے۔'' جناح نے اس سازش کا راز بھی فاش کیا جو 24 رجون کی رات اور 25 رجون کی صبح کو پیتھک لارنس اور کرپس نے گاندھی اور پٹیل کے ساتھ مل کر کی جس کے نتیجے میں 16 رجون کی مجوزہ عبوری حکومت کا منصوبہ ناکام ہوا۔ عبوری حکومت میں نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت کے مسئلے پر پیتھک لارنس نے دارالامراء میں بیان دیا تھا کہ مسلم تقریروں پر جناح کی اجارہ داری کا دعوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے جناح نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''میں کوئی تاجر نہیں ہوں، میں تیل کے لیے رعایتیں نہیں مانگ رہا ہوں اور نہ ہی بنیئے کی طرح سودے بازی کر رہا ہوں۔ وزیر ہند کا اس زبان میں بات کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیا مسلمان بکاؤ مال ہیں؟'' جناح نے کہا کہ اگر کانگرس اپنے قومی کردار کی اتنی ہی دعویدار ہے تو وہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقوں پر توجہ کیوں نہیں دیتی۔ 6 کروڑ ہریجن صدیوں سے معاشرتی و معاشی جبر میں رہ رہے ہیں۔ گاندھی نے جو کہ ان کی سرپرستی کا دعویدار بنتا ہے، ان کی بہبود کے لیے کیا کیا ہے؟ اچھوت اب مظاہرے کر

رہے ہیں اور جیلوں میں جارہے ہیں تو یہ انتہائی اقدام اٹھانے پر وہ اسی لیے مجبور ہوئے ہیں کہ وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ مشن نے کانگرس کی دیوی کو خوش کرنے کے لیے ہریجنوں کے ساتھ بھی دھوکہ کیا ہے۔ جناح نے گاندھی کے اس دعوے کو غلط ثابت کیا کہ کانگرس ہندوستان کے سارے عوام کی سرپرست (ٹرسٹی) ہے۔ ''ہمیں گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں ایک سرپرست کا خاصا تجربہ ہو چکا ہے۔ اب ہم کانگرس کو اپنا سرپرست نہیں بنانا چاہتے۔ اب ہم خود بالغ ہو چکے ہیں۔'' جناح نے آخر میں ان تمام حقائق کے پیش نظر کہا کہ ''اب ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے عوام کے مسئلے کا حل صرف پاکستان ہے۔''[48]

مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس تین روز جاری رہا۔ برصغیر کے طول وعرض سے آئے ہوئے مندوبین نے وزارتی مشن کی بدعہدی اور کانگرس کی ہٹ دھرمی کے خلاف پر جوش تقریریں کیں۔ ان میں سے بیشتر کا مؤقف تھا کہ ہم نے مطالبہ پاکستان کو بالائے طاق رکھ کر وزارتی مشن منصوبہ منظور کر کے غلطی کی اور بعض کا مؤقف تھا کہ ہم نے ایسا کر کے اعلیٰ تدبر اور فراست کا ثبوت دیا تھا۔ تاہم اس بات پر کم وبیش سب ہی کا اتفاق تھا کہ اب ہمیں وزارتی مشن منصوبہ ترک کر کے حصول پاکستان کی جدوجہد کرنی چاہیے اور اس کے لیے راست اقدام اٹھانا چاہیے۔ چنانچہ 29/جولائی کو کونسل نے دو قراردادیں منظور کیں۔ پہلی قرارداد میں 6/جون سے لے کر جب کہ کونسل نے مشن منصوبہ منظور کرنے کی قرارداد پاس کی تھی، اب تک کے تمام واقعات کا اعادہ کیا گیا تھا کہ کس طرح مسلم لیگ نے طویل المیعاد اور قریب المیعاد دونوں منصوبوں کو منظور کرنے کے بعد جس حد تک اس کے لیے ممکن تھا کانگرس اور وزارتی مشن کے ساتھ ہر مرحلے پر تعاون کیا اور کس طرح اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی تھی۔ نہرو اور کانگرس کے صریح بیانات کہ ''انہوں نے صرف آئین ساز اسمبلی میں شرکت کو منظور کیا ہے اور کچھ منظور نہیں کیا ہے'، کے باوجود برطانوی پارلیمنٹ میں اس قسم کی کوئی ضمانت مہیا نہیں کی گئی کہ جو کانگرس کو اسمبلی کے طے شدہ دائرہ کار سے باہر جانے سے روک سکے۔ گویا دونوں پارٹیوں میں بہ کمال وتمام صرف مسلم لیگ ہی واحد جماعت ہے جس نے 16 اور 25/مئی کے مجوزہ منصوبے کو منظور کیا۔ چنانچہ قرارداد کے آخر میں کہا گیا کہ کانگرس کے متذکرہ رویے کے ساتھ ساتھ ''برطانوی حکومت کی طرف سے کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں اور

دوسرے کمزور طبقوں کے مفادات کی قربانی دینے کی جو پالیسی اختیار کی گئی اور جس طرح اس نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو دیئے گئے زبانی وتحریری قول وقرار اور عہد و پیمان توڑے ہیں، اس کے بعد اب کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ ان حالات میں آئین ساز ادارے میں مسلمانوں کا شریک ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کونسل وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کو جو 6/جون 1946ء کو وزیر ہند کو ارسال کی گئی تھی، واپس لینے کا اعلان کرتی ہے۔''[49]

دوسری قرارداد میں کہا گیا کہ

''اب جب کہ کانگرس کی ہٹ دھرمی اور برطانوی حکومت کی مسلمانوں کے ساتھ بد عہدی کی وجہ سے وزارتی مشن منصوبہ کو رد کر دیا گیا ہے اور اب جب کہ مسلمانان ہند کی جانب سے ہندوستان کے مسئلے کے پرامن حل کے لیے تصفیے اور آئینی حل کے حصول کی تمام تر کوششیں رائیگاں ثابت ہو چکی ہیں:

''اب جب کہ کانگرس برطانیہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پورے ہندوستان پر اونچی ذات کا ہندو راج نافذ کرنا چاہتی ہے:

''اب جب کہ حالیہ واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان کے معاملات میں انصاف اور حسن سلوک کے بجائے زور آزمائی کی سیاست ہی فیصلہ کن حربہ ہے:

''اور اب جب کہ اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ مسلمانان ہند ایک مکمل آزاد و خود مختار پاکستان کے فوری قیام سے کم کسی شے کو قبول نہیں کریں گے اور ہر اس آئین ساز ادارے یا آئین خواہ طویل المیعاد خواہ قلیل المیعاد اور مرکز میں ہر قسم کی عبوری حکومت کے قیام کی ہر کوشش کے خلاف مزاحمت کریں گے جو مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر وجود میں لائی جائے گی:

''چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل پورے یقین کے ساتھ سمجھتی ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلمان قوم کو اپنے جائز حقوق کے لیے، اپنے وقار کی سربلندی کے لیے، برطانیہ کی غلامی سے آزادی اور متوقع اونچی ذات کے ہندو غلبہ سے نجات کے لیے پاکستان کے قیام کی خاطر ڈائریکٹ ایکشن کا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔'' مزید یہ کہ ''برطانوی رویئے کے خلاف احتجاج کرنے اور شدید نفرت ظاہر کرنے کے لیے یہ کونسل اعلان کرتی ہے کہ تمام مسلمان اس پرائی حکومت کے عطا کردہ تمام خطابات کو آج سے واپس کر دیں گے۔''[50] اس کے بعد اجلاس

میں موجود تمام خطاب یافتہ ارکان نے سٹیج پر آ کر خطابات واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔

اختتامی تقریر میں جناح نے کہا "ہم نے آج ایک تاریخی فیصلہ کیا ہے۔ مسلم لیگ کی زندگی کی پوری تاریخ میں ہم نے سوائے آئینی طریقوں اور آئینی مذاکرات کے اور کوئی راستہ اختیار نہیں کیا۔ آج ہم یہ فیصلہ کرنے پر اس چال کی وجہ سے مجبور ہوئے ہیں جو کانگرس اور برطانیہ نے مل کر چلی ہے۔ ہم پر دو محاذوں کی طرف سے حملہ کیا گیا ہے۔ برطانوی محاذ اور ہندو محاذ۔ آج سے ہم آئین اور آئینی ذرائع کو خیر باد کہتے ہیں۔ تکلیف دہ مذاکرات کے دوران مستقلاً دونوں فریق کہ جن کے ساتھ معاملات طے کئے جا رہے تھے، ہمارے اوپر پستول تانے رہے۔ ایک کے پاس اختیار اور مشین گنوں کا پستول تھا تو دوسرے کے پاس عدم تعاون اور سول نافرمانی کی عوامی تحریک کا پستول تھا، اس صورت حال کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اب ہمارے ہاتھ میں بھی پستول ہے۔"[51] مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے کونسل کی ہدایت کے مطابق ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کے لیے 16 راگست کی تاریخ مقرر کی۔ پروگرام یہ تھا کہ اس دن جلسے کر کے مسلم لیگ کی کونسل کی قرارداد کی وضاحت کی جائے گی۔

قدرتی طور پر مسلم لیگ کے اس فیصلے سے برصغیر کی صورتحال میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ ویول کا ذاتی تاثر وزارتی مشن اور کانگرس پر تنقید اور اپنے پچھتاوے اور خود تنقیدی سے ملا جلا تھا جو اس نے اپنے 29 رجولائی کے روزنامچے میں قلمبند کیا۔ "چنانچہ مسلم لیگ تو نکل گئی۔ مشن کی مہربانی کہ جو یہاں قیام کے دوران کانگرس کی جیب میں پڑا رہا۔ کرپس کی بددیانتی میری حماقت اور کمزوری کہ میں نے اس بددیانتی کی پہلے نشاندہی نہ کی اور اس پر ثابت قدم نہ رہا اور نہرو کی غیر ذمہ داری کہ اس نے مشن کے جانے کے بعد بیانات دیئے۔ مجھے پیراگراف 8 (اعلان 16 رجون) کے بارے میں احساس جرم نہیں ہے کہ اس پر ہمیشہ میری رائے رہی کہ ہماری تعبیر صحیح تھی۔ لیکن مجھے یہ احساس جرم ضرور ہے کہ میں کرپس کی چالوں کی تہہ تک نہ پہنچا اور میں نے کانگرس کی طرف سے 16 رمئی کی دستاویز کی غیر مخلصانہ منظوری، اور کرپس اور پیتھک لارنس کی جانب سے کانگرس کو اس نوعیت کی منظوری کی شہ دینے کی بددیانتی میں ان کے ساتھ فریق بننے سے انکار نہ کیا۔ تمام مذاکرات میں یہ ایک اہم نکتہ رہا کہ جس پر الیگزینڈر نے میری حمایت سے انکار کیا اور میں نے بھی بے بسی کے ساتھ گھٹنے ٹیک دیئے"[52] اور 29 رجولائی

کو گورنر سرحد کے نام ایک خط میں اس نے لکھا ''یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوئی کہ مسلم لیگ نے یہ قرار دادیں منظور کی ہیں اور میرا خیال ہے سب سے زیادہ نہرو کی اشتعال انگیز تقریروں نے ان کو یہ اقدام اٹھانے پر مجبور کیا ہے......کانگرسی رہنماؤں میں فراخدلی کا فقدان دیکھ کر اس ملک کے مستقبل کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں جس کی رہبری اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے رہنما کر رہے ہیں۔''[53]

نہرو نے اس ذہنیت کا مظاہرہ ایک بار پھر 30/جولائی کو ویول کے ساتھ پہلے سے طے شدہ ایک ملاقات کے دوران کیا۔ ویول نے اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ کونسل کا یہ شدید ردعمل کانگرسی رہنماؤں اور بالخصوص نہرو کے اشتعال انگریز بیانات کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس لیے ویول نے کہا کہ اب کانگرس کو چاہیے کہ وہ تدبر اور فراست کا مظاہرہ کرے اور مسلم لیگ کو یقین دہانیاں کروا کر اسے آئین ساز اسمبلی میں لانے کی کوشش کرے۔ اس پر نہرو نے کہا کہ ''میں اتفاق کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کا آئین ساز اسمبلی میں شامل نہ ہونا افسوسناک امر ہوگا لیکن سمجھ نہیں آتا کہ ہم انہیں کس قسم کی یقین دہانیاں کرائیں۔ ہم انہیں پاکستان کی یقین دہانی تو کروانے سے رہے۔'' اس پر ویول نے کہا کہ لیگ کو کانگرس سے سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ کانگرسی رہنماؤں کے بیانات غمازی کر رہے ہیں کہ وہ گروپ بندی کے نظام کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں جس کی بنیاد پر مسلم لیگ نے آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کو منظور کیا تھا۔ ویول نے ان اعتراضات کا خاص طور پر ذکر کیا جو کانگرس نے 16/مئی کے وزارتی مشن منصوبہ کی منظوری کے ساتھ اٹھائے ہیں۔ اس پر نہرو نے کہا کہ اعتراضات تو مسلم لیگ نے بھی اٹھائے تھے۔ ویول نے کہا کہ ان اعتراضات کی نوعیت طویل المیعاد تھی اور وہ کئی سال بعد پاکستان کے امکان سے متعلق تھے۔ لیکن کانگرس کے اعتراضات قریب المیعاد اور فوری نوعیت کے ہیں۔ اس پر نہرو نے 16/مئی کے مشن منصوبے کی بہت سی شقوں اور جملوں کی قانونی توجیہات پیش کیں جو پہلے بھی کئی بار کی جا چکی تھیں۔ ویول نے جواب میں کہا کہ ''میں نہ تو وکیل ہوں اور نہ سیاست دان بلکہ ایک صاف سیدھا آدمی ہوں اور جانتا ہوں کہ اس دستاویز کو وضع کرنے والوں کی منشاء کیا ہے۔ اس کی زبردستی مختلف تعبیریں نکالنے کی کوشش محض تاویل تراشی معلوم ہوتی ہے۔'' نہرو بدستور اڑا رہا کہ

دستاویز کے بعض نکات ایسے ہیں جو توجیہہ طلب ہیں اور ان پر فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جائے گا اور ہم اس سلسلے میں محض اپنی کثرت رائے کو بروئے کار نہیں لائیں گے۔[54] ویول نے اس گفتگو پر مبنی نوٹ پیتھک لارنس کو ارسال کر دیا۔

یکم اگست کو پٹیل نے بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگ کونسل کے فیصلے پر اپنا ردعمل ظاہر کیا اور کہا ''مسلم لیگ کی طرف سے ڈائریکٹ ایکشن کی دھمکی اگر واقعی ہے تو پھر یہ انگریزوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ کانگرس کے خلاف ہے کیونکہ انگریز تو واضح کر چکے ہیں کہ وہ اب ہندوستان میں قیام کرنا نہیں چاہتے ہیں اس لیے یہ دھمکی آمیز اقدام صرف کانگرس کے خلاف ہی ہوسکتا ہے۔'' اس نے جناح پر کڑی تنقید کی اور کہا کہ کانگرس ''نہ تو ماضی میں کبھی دھمکیوں سے مرعوب ہوئی ہے اور نہ کبھی آئندہ ہوگی۔'' اس نے مطالبہ پاکستان کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ لیگ وزارتی مشن کو اس کے بارے میں قائل کرنے میں ناکام رہی اور جب مشن نے اسے نامنظور کر دیا تو لیگ نے اس فیصلے کو تسلیم کر لیا۔ ''اب گڑے مردے کو اکھاڑنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔'' اور یہ کہ ''اگر جناح مسئلے کے حل میں سنجیدہ ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ دھمکیوں اور الزام تراشیوں کا راستہ ترک کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ یہ مسلمانوں کے بھی مفاد میں ہوگا کہ وہ لڑائی جھگڑا چھوڑ کر تعاون کا تعمیری راستہ اختیار کریں۔'' لیکن اسی تقریر کے دوران اس نے کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومت کے قیام کو قطعی طور پر خارج از امکان قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''ان کے مقاصد ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں......ان کے مابین مخلوط حکومت کے قیام کی ہر کوشش ناکامی پر منتج ہوگی......جناح اس میں آ کر ہند (انڈیا) کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کرنا چاہتا ہے جب کہ کانگرس اس میں آ کر متحدہ وفاقی ہند کے لیے کام کرنا چاہتی ہے۔ یہ پارٹیاں کس طرح یکجا ہوسکتی ہیں؟ ان کا مقصد ہی مشترکہ نہیں ہے۔''[55] گویا پٹیل نے ایک جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی بات کی اور دوسری جانب اشتراک عمل کو خارج از امکان قرار دیا۔

متحدہ ہند کے دائرے میں اشتراک عمل کی واحد صورت گروپ بندی کے منصوبے پر عمل درآمد میں مضمر تھی لیکن کانگرس واشگاف الفاظ میں اس کو رد کر چکی تھی اور مسلسل اپنی توجیہات پر زور دے رہی تھی۔ اس منافقانہ رویے کے ساتھ دوستی کس طرح ممکن تھی؟ یکم

اگست کو نہرو نے الہ آباد یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے مسلم لیگ کونسل کے فیصلے پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا کہ آئین ساز اسمبلی مکمل طور پر خودمختار ادارہ ہوگی۔ اس میں کیا زیر بحث آئے گا اور کیا فیصلہ ہوگا، اس پر برطانوی حکومت کو مداخلت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ وزارتی مشن اس کی ''خودمختاری'' کو تسلیم کر چکا ہے سوائے دو امور کے جن میں انڈیا اور برطانیہ کے مابین میثاق اور اقلیتوں کے مسائل شامل ہیں۔ ''اگر برطانوی حکومت اس میثاق کی شرائط کے بارے میں یہ کہ اقلیتی مسئلہ کس طرح حل کیا جائے اس بارے میں کسی شق کو مسلط کرنے پر اصرار کرے گی تو کانگرس اسے تسلیم نہیں کرے گی۔ اس سے اسمبلی کی خودمختارانہ حیثیت ختم ہوکر رہ جائے گی۔''[56]

5 /اگست کو جناح نے بمبئی میں ایک انٹرویو کے دوران پٹیل کی متذکرہ تقریر پر سخت ردعمل ظاہر کیا اور کہا کہ کانگرس کا مقصد اونچی ذات کے ہندوؤں کا ایک مضبوط مرکز کے تحت پورے ہندوستان پر غلبہ قائم کرنا ہے جس کے صوبوں کو صرف میونسپلٹی یا دیہی کونسل جتنے اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس نے پٹیل کے متضاد رویے کی بھی مذمت کی کہ ایک طرف تو قرار دیا جارہا ہے کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان کوئی مشترکہ بنیاد ہی موجود نہیں ہے اور دوسری طرف اکٹھے بیٹھ کر مسائل حل کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلم لیگ دس کروڑ مسلمانوں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کا راج تسلیم کرلے۔[57]

امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت

مسلم لیگ کونسل کے فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کی سنگینی کے پیش نظر برطانوی حکومت اور وائسرائے نے فوری طور پر کانگرس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش تیز کردی۔ 31 /جولائی کو برطانوی کابینہ کی ہند اور برما کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ فیصلہ کیا گیا کہ مسلم لیگ کے انکار کے باوجود آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جائے گا۔ جہاں تک عبوری حکومت کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں فیصلہ کیا گیا کہ جناح سے ایک اور مرتبہ پوچھ لیا جائے کہ آیا وہ اس کی تشکیل میں تعاون پر آمادہ ہے یا نہیں، اگر وہ آمادہ نہ ہو تو پھر مسلم لیگ کے بغیر ہی کانگرس کو شامل کرکے عبوری حکومت وضع کی جائے اور وائسرائے کو چاہیے کہ پنڈت نہرو سے

ملاقات کر کے اس تجویز کو آخری شکل دے۔[58] ادھر 31 رجولائی ہی کو وائسرائے نے وزیر ہند کے نام اپنے مراسلے میں لکھا کہ ''لیگ کی قرارداد کے نتیجے میں شہروں میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہو گیا ہے جو پہلے ہی کافی سنگین تھی۔ علاوہ ازیں وسیع پیمانے پر مزدوروں میں بے چینی پائی جاتی ہے اور عمومی صورت حال بالکل غیر تسلی بخش ہے۔ ان حالات میں عوامی حمایت کی حامل مرکزی حکومت کی اشد ضرورت ہے۔ اگر کانگرس یہ ذمہ داری لے گی تو اسے احساس ہو گا کہ شر پسند عناصر کو سختی سے کنٹرول کرنا کس قدر ضروری ہے چنانچہ وہ کمیونسٹوں کو بھی زیر کرے گی اور اپنے بائیں بازو کو بھی قابو میں رکھنے کی کوشش کرے گی......'' اس کی رائے تھی کہ مسلم لیگ کی نشستوں کو خالی رکھا جائے اور انہیں غیر لیگی مسلمانوں سے پُر نہ کیا جائے۔ سکھوں کی نشست بھی خالی رکھی جائے۔ مسلم لیگ کی تحریک کے بارے میں اس نے لکھا کہ جناح کے پاس اس مقصد کے لیے کوئی ریڈی میڈ تنظیم موجود نہیں ہے۔ البتہ اس کے چند رفقاء عوامی تحریک چلانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اگر کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین کوئی سمجھوتہ نہ ہوا تو پھر یہ جہاد کی سنگین صورت بن جائے گی اور یہ کہ فلسطین ☆ کے بارے میں اعلان بڑے غلط موقع پر ہو رہا ہے۔''[59] چنانچہ برصغیر کی امن عامہ کی صورت حال میں اگرچہ لیگ کی تحریک مسائل پیدا کر سکتی تھی تاہم زیادہ سنگین معاملہ کیمونسٹوں اور مزدوروں کی بے چینی کا تھا۔ اس لیے کانگرس کو اقتدار میں شامل کرنا بے حد ضروری ہو گیا تھا جو کیمونسٹوں، مزدوروں، بائیں بازو اور لیگ سب سے نمٹنے میں حکومت کی مدد و معاون ثابت ہو سکتی تھی۔

31 رجولائی کو پیتھک لارنس نے ویول کو لکھا کہ جناح سے فوری ملاقات کر کے اس کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش بہرصورت کرنی چاہیے۔ ادھر 31 رجولائی کو جناح نے ویول کے 22 رجولائی کے خط کے جواب میں ویول کو لکھ دیا کہ آپ نے عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے جونئی پیش رفت کی ہے اس میں کانگرس کی چاپلوسی اور بنیادی طور پر اس کی خواہشات کی تکمیل

☆ یاد رہے کہ اسی روز (31 رجولائی) برطانوی پارلیمنٹ میں اینگلو امریکی کمیٹی آف انکوائری برائے فلسطین کی رپورٹ پر مبنی اعلان جاری کیا تھا جس میں فلسطین کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ان میں ایک یہودی صوبہ اور ایک عرب صوبہ تھا۔ علاوہ ازیں اس اعلان میں ایک لاکھ یورپی یہودیوں کو فلسطین میں داخلے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ ٹرانسفر آف پاور۔ ص 55 (نوٹ)۔ جلد 8 مسلم لیگ مجلس عاملہ نے اس اعلان کے خلاف بڑی سخت قرارداد منظور کی۔ ٹرانسفر آف پاور۔ ص 195۔ جلد 8

کے لیے واضح طور پر طے شدہ اصولوں سے اس قدر انحراف کیا گیا ہے کہ یہ مسلم لیگ کو قابل قبول نہیں ہے۔ یاد رہے کہ اس سے پیشتر نہرو نے عبوری حکومت کے لیے زیادہ سے زیادہ خودمختاری کے مطالبہ کو بنیاد بنا کر مخلوط حکومت کی اس تجویز کو پہلے ہی رد کر دیا تھا۔ یکم اگست کو ویول نے پیتھک لارنس کو لکھ دیا کہ ان حالات میں جناح کے ساتھ ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ ''اگر جناح کو ملاقات کی دعوت دی گئی تو سمجھا جائے گا کہ ہم اس کی دھمکی سے بوکھلا گئے ہیں اور اس سے جناح کو تقویت حاصل ہوگی اور اس کی ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوگا......میری رائے میں فی الوقت جناح کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔''[60]

ادھر یکم اگست کو وزیراعظم ایٹلی کے زیر صدارت برطانوی کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں وزیر ہند پیتھک لارنس کی اس یادداشت پر غور کیا گیا جس میں مسلم لیگ کونسل کے حالیہ فیصلے سے پیدا شدہ صورتحال کے پیش نظر ہند و برما کمیٹی کے فیصلے کے مطابق تجویز کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ کے بغیر بھی آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونا چاہیے اور عبوری حکومت تشکیل دی جانی چاہیے۔ اس پر پیتھک لارنس نے مزید رائے یہ دی تھی کہ ''ہمیں اس حقیقت کو پوشیدہ نہیں رکھنا چاہیے کہ اگر مسلمانوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا تو ہم لازمی طور پر اس گڑبڑ کو دبانے کے لیے کانگرسی اکثریت کی حکومت کی بھرپور امداد کریں گے۔'' کابینہ نے ساری صورتحال پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ تعاون پر آمادہ نہ ہو تو صرف کانگرس پر مشتمل عبوری حکومت وضع کر دی جائے۔[61] 2/اگست کو پیتھک لارنس نے ویول کو کابینہ کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ آپ نہرو کے ساتھ اب یہ طے کریں کہ عبوری حکومت میں آیا مسلم لیگ کی نشستوں کو خالی رکھا جائے۔ اگر کانگرس اس پر اتفاق نہ کرے تو ہمیں مزید سوچنا ہوگا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی ہم ہندوستان میں تھے تو کمانڈر انچیف اور تمام صوبائی گورنروں سمیت ہم سب کی رائے تھی کہ بیک وقت کانگرس اور مسلم لیگ کی مخالفت کا سامنا کر کے گزارہ نہیں ہوسکتا۔[62] گویا وہ عبوری حکومت کی تمام مسلم لیگی نشستیں بھی کانگرس کو دینے پر آمادہ نظر آتا تھا جب کہ ویول انہیں خالی رکھنا چاہتا تھا۔

بہرصورت ویول نے عبوری حکومت میں کانگرس کی شمولیت کے لیے کانگرس کے بااثر

حلقوں کے ساتھ روابط استوار کئے اور متوقع ردعمل کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے ایک باوثوق رابطے کے ذریعے پٹیل اور نہرو کا تاثر حاصل کیا۔ اس بارے میں 5 ر اگست کو پیتھک لارنس کو اطلاع دیتے ہوئے ویول نے لکھا کہ ''پٹیل نے مخبر کو بتایا کہ اگر کانگرس کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی گئی تو وہ اسے قبول کرنے پر زور دے گا۔ اس کی رائے ہے کہ نہرو ذمہ داری لینے پر محض جذباتی طور پر معترض ہے اور ایک جانب مسلم لیگ سے اور دوسری جانب کانگرسی سوشلسٹوں سے خائف ہے۔ تاہم پٹیل پوری طرح قائل ہے کہ کانگرس کو حکومت میں شامل ہونا چاہیے تاکہ مزدوروں کی بے چینی کے نتیجے میں ملک میں جو انتشار پھیل رہا ہے اس کا سدباب کیا جا سکے۔ اگر کانگرس مجلس عاملہ نے اس کی رائے کے ساتھ اتفاق نہ کیا تو وہ اس سے استعفیٰ دینے پر بھی تیار ہو گا۔ وہ اس پر اصرار کرے گا کہ کانگرس کو عبوری حکومت کی حیثیت و اختیار کے معاملے پر بھی تعطل پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی رائے میں آزاد کے نام وائسرائے کے 30 رمئی کے خط میں مہیا کردہ بنیاد کو قبول کر لینا چاہیے۔''[63] یاد رہے کہ 23 رجولائی کو نہرو نے عبوری حکومت کی 22 رجولائی کی تجویز کو مجلس عاملہ کے ارکان کی رائے سے اس بنیاد پر رد کر دیا تھا کہ آزاد کے نام 30 رمئی کے متذکرہ خط میں دیئے گئے عبوری حکومت کے اختیارات قابل قبول نہیں تھے، وہ وائسرائے کو محض علامتی سربراہ رکھنے اور عبوری حکومت کو خودمختار بنانے کے خواہاں تھے۔ لیکن اب چونکہ مخلوط حکومت کا قصہ ختم ہو گیا تھا، لیگ راہ سے ہٹ گئی تھی اور بلاشرکت غیرے اقتدار حاصل ہو رہا تھا۔ اس لیے عبوری حکومت کی خودمختاری کا مطالبہ، جو دراصل بہانہ تھا مخلوط حکومت نہ بنانے کا، اب غیر ضروری قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ ویول نے کانگرس کے اندرون خانے کا حال معلوم کر لینے کے بعد 6 ر اگست کو بطور صدر کانگرس نہرو کو خط ارسال کیا جس میں عبوری حکومت کی تشکیل کے بارے میں اس سے تجاویز طلب کیں جو ایک طرح حکومت وضع کرنے کی ابتدائی دعوت تھی۔ اس خط کی نقل گاندھی کو بھی ارسال کی گئی۔ اس میں ویول نے واضح طور پر بیان کر دیا تھا کہ ''اس کی بنیاد انہی یقین دہانیوں پر ہو گی جو 30 رمئی کو آزاد کے نام خط میں کرائی جا چکی ہیں۔''[64] 8 رگست کو واردھا میں کانگرس مجلس عاملہ نے اس دعوت پر غور کرنا تھا۔ 7 ر اگست کو گاندھی نے ویول کو ایک مختصر خط میں یقین دلاتے ہوئے لکھا

کہ ''آپ مجھ پر اعتماد کیجئے کہ میں جو بہترین سمجھوں گا کروں گا۔''[65] گاندھی نے حسب معمول سیدھی بات تونہیں کی تھی لیکن اس جواب میں اس کی رضامندی صاف پنہاں تھی۔

ملک گیر ہڑتالوں کا سلسلہ اور کمیونزم کی داخلی وخارجی لہر کے مقابلے کے لیے کانگرس اور برطانوی حکمرانوں کا اتحاد

6/اگست کونہرو کو دعوت نامہ بھیجنے کے بعد ویول نے پیتھک لارنس کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں کانگرس کے حکومت بنانے کی افادیت کے پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا گیا تھا۔ اس نے لکھا کہ ہماری نظر مسلم لیگ کے حالیہ اقدام پر مسلمانوں کے ردعمل اور کانگرس کو دی جانے والی حالیہ دعوت پر ان کے ممکنہ ردعمل پر ہی نہیں رہنی چاہیے بلکہ کانگرسی سوشلسٹوں اور جے پرکاش نارائن وغیرہ پر بھی نظر مرکوز رہنی چاہیے۔ ''اگر کانگرس عبوری حکومت میں شامل ہوگئی تو وہ اس قدر طاقتور تومحسوس کرے گی کہ جے پرکاش نارائن سے نمٹ سکے جب کہ یہ توقع بھی کی جاسکتی ہے کہ اس صورت میں جے پرکاش نارائن خود ہی اپنا لب ولہجہ تبدیل کرلے گا۔ اگرچہ مجھے اس کا یقین نہیں ہے مگر میرے خیال میں یہ قوی امکان موجود ہے کہ کانگرس کو بہت جلد کمیونسٹوں کے خلاف اقدام اٹھانے کا فیصلہ کرنا پڑے گا ورنہ تو مزدوروں کی (گڑبڑ کی) صورت حال بہت زیادہ بگڑ جائے گی''[66] اور 6/اگست ہی کو پیتھک لارنس نے بھی ویول کے نام مراسلے میں ہڑتالوں کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''مجھے پوری امید ہے کہ نہرو اس سلسلے میں اپنا اعتدال پسندانہ اثر ورسوخ بروئے کار لائے گا۔''[67]

برطانوی لیبر حکومت نے آئین سازی کے معاملے سے لے کر عبوری حکومت کی تشکیل کے معاملے تک مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگرس کو راضی بہ رضا رکھنے اور اقتدار میں شریک کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ ان حالات کا جائزہ لینے سے سمجھ میں آجاتا ہے جن سے برصغیر اس وقت دوچار تھا۔ ان میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے ساتھ ساتھ معاشی زبوں حالی، صنعتی بدامنی اور انتظامیہ کی ابتری ایسے مسائل تھے کہ ہمہ وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں کمیونسٹ فائدہ نہ اٹھا جائیں جس کا برطانوی حکومت کے نزدیک قوی امکان کانگرس کو ناراض کرنے میں اور جس سے بچنے کا قوی

امکان کانگرس کو راضی رکھنے میں پنہاں تھا۔ عالمی جنگ میں برطانوی سامراج کا دیوالیہ نکل جانے کے بعد اور یہ طے ہو جانے کے بعد کہ اب برصغیر سے آب و دانہ اُٹھ گیا ہے، برطانوی افسر شاہی بددل ہو چکی تھی اور امن عامہ کی صورت حال پر دن بدن اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی تھی۔ انہیں ہمہ وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح اپنے اہل وعیال کو خیر و عافیت کے ساتھ لے کر یہاں سے نکل جائیں۔ عوام الناس اپنے حالات سے خواہ فرقہ وارانہ، خواہ معاشی خواہ معاشرتی، اس قدر تنگ تھے کہ وہ نڈر اور بے خوف ہو گئے تھے۔

12 رجولائی کو وائسرائے نے شمالی ہند کے گورنروں کی کانفرنس میں اس صورت حال کا جائزہ لیا۔ بہار کے گورنر کا کہنا تھا کہ ''اگر کوئی عوامی تحریک چلی تو اس کے صوبے میں بالکل بھٹہ بیٹھ جائے گا۔ کسی کو چودہ سالہ قید یا سزائے موت کا بھی خوف نہیں رہا کیونکہ یہ معلوم ہے کہ وزارت بنتے ہی وہ رہا کر دیا جائے گا۔ مجسٹریٹ، پولیس، اور حکومت کے دوسرے امدادی ادارے خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہیں کیونکہ برطانوی اقتدار جلد ہی رخصت ہونے والا ہے۔ اس لیے ان سے کسی عوامی تحریک کے خلاف سختی سے نمٹنے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کی رائے تھی کہ اگر عوامی تحریک چلی تو مارشل لاء لگانا پڑے گا اور فوج بھی محدود سے علاقے میں امن عامہ قائم کر سکے گی۔'' اس نے بہار میں حال میں ہونے والی پولیس کی ہڑتال کا بھی ذکر کیا اور بتایا کہ ہندوستانی پولیس افسروں کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ ''بدامنی کی صورت میں حالات یہاں تک بگڑ سکتے ہیں کہ وہاں سے یورپیوں کا انخلاء مشکل ہو جائے گا۔'' پنجاب کے گورنر کا کہنا تھا کہ ''اس کے صوبے کا سب سے بڑا مسئلہ فرقہ وارانہ ہے اور وہاں کانگرس مضبوط نہیں ہے۔ پنجاب کے مسلمان پاکستان حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سکھ اور ہندو اپنے لیے اس سے کہیں زیادہ تحفظات مانگ رہے ہیں جتنے کہ کانگرس مطالبہ کر رہی ہے۔ زیادہ گڑبڑ کا اندیشہ سکھوں کی طرف سے ہے اور کانگرس بھی ان کا ساتھ دے گی۔'' اس نے بہار کے گورنر کے ساتھ اتفاق کیا کہ سخت گیر رویہ اختیار کیا جائے۔ یو پی کے گورنر کا کہنا تھا کہ ریلوے کی ہڑتال عوامی تحریک کا روپ دھار سکتی ہے۔ تاہم اس وقت تک اسے اپنے صوبے کی پولیس پر بھروسہ تھا جس کا پچاس فیصد مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ سی پی کے گورنر کی رائے تھی کہ اس کے صوبے کو چھ ماہ تک بہرصورت قابو میں رکھا جاسکتا تھا۔ اس کے پاس تین گورکھا بٹالین موجود تھیں جن کے

ذریعے اسے امید تھی کہ امن عامہ برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ ویول نے کہا کہ گورکھوں کو استعمال کرنے کے معاملے میں بھی محتاط ہونا پڑے گا کیونکہ نیپالی حکومت ہندوؤں کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہے گی۔ تمام گورنروں کا اس مفروضے پر اتفاق تھا کہ ''حکومت برطانیہ اب کسی عوامی تحریک کو نہیں کچلے گی۔''[68]

12رجولائی کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں گورنروں کی کانفرنس کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''اس بات پر سب کا اتفاق تھا کہ سروسز کو حقیقی تحفظ مہیا کرنے کے لیے کانگرس کے ساتھ پاسداری کا کوئی معاہدہ(Gentleman's Agreement) کرنا ہوگا''[69] اور 15رجولائی کو پیتھک لارنس نے جواب میں ویول کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے لکھا کہ سروسز کو ''حقیقی تحفظ صرف کانگرس کے ساتھ پاسداری کے معاہدے کے ذریعے ہی مہیا کیا جا سکتا ہے اور آپ اس سلسلے میں پوری کوشش کریں۔''[70] عام گڑبڑ کی حالت میں انگریز خاندانوں کو کس حد تک نشانہ بنایا جا سکتا تھا اس بارے میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف کلاڈ آکن لیک کا خیال تھا کہ ''اگرچہ بہت سے ہنگامہ پرور اور شرپسند کھلے عام بندوق تشدد اور قتل و غارت کا پرچار کرتے پھر رہے ہیں لیکن اس وقت میرا اندازہ ہے کہ نہ تو پارٹیوں کے سربراہوں کی جانب سے اور نہ عوام کی طرف سے ان کو حمایت حاصل ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔تاہم......وسیع پیمانے پر گڑبڑ کی صورت میں جو کہ ہڑتالوں یا قحط سالی یا فرقہ وارانہ ٹکراؤ کے نتیجے میں بھڑک سکتی ہے، اس میں یہ امکان بھی ہو سکتا ہے کہ یہ یورپی مخالف رنگ اختیار کر لے۔ بشرطیکہ ہنگامہ پرور خود موقع پر موجود رہیں تا کہ ایک مرتبہ یہ رنگ پکڑ لے۔'' اس کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے انڈیا آفس کے پرنسپل آفیسر جنرل موسلے مین نے لکھا کہ ''......بلوے اور ہنگامے دبانا خواہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو یہ ایسی صورت اختیار نہیں کریں گے کہ انگریز عورتوں اور بچوں کے خون کی ندیاں بہہ جائیں۔''[71] ان کو پارٹیوں کے اعتدال پسند رہنماؤں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ انتہا پسندی کا فروغ خود ان کے مفاد میں بھی نہیں تھا۔

ایسے ہی موقع کے لیے گاندھی کا عدم تشدد درکار ہوتا تھا کہ یہ ہندو بورژوا اور برطانوی سامراج دونوں کے لیے سودمند تھا۔ چنانچہ وزارتی مشن کی آمد کے بعد سے گاندھی نے عدم

تعاون اور سول نافرمانی کے خلاف مؤقف اختیار کر لیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرنے کی تلقین شروع کر دی تھی۔ مشن کے ساتھ شملہ مذاکرات میں شرکت کے لیے گیا تو اس نے کہا کہ ”میں تو برطانوی عوام اور وزارتی مشن کے خیر خواہ اور دوست کی حیثیت سے صلاح مشورہ دینے کی غرض سے شرکت کر رہا ہوں، کانگرس کا نقطۂ نظر مولانا آزاد، یا نہرو پیش کریں گے۔“[72] بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے موقع پر بھی اس نے سول نافرمانی اور عدم تعاون کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ”یہ کہنا غلط ہے کہ انگریز جو کام بھی کرتے ہیں غلط کرتے ہیں۔ انگریز ضروری نہیں کہ برے ہوں۔ ہر قوم کی طرح انگریزوں میں بھی اچھے اور برے لوگ پائے جاتے ہیں۔“[73] جولائی کے وسط میں اس نے ہریجن میں اس بات پر زور دیا اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ان ارکان پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہ جو آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کی شرکت کی مخالفت کر رہے تھے کہا کہ ”ہر بری شے کو انگریزوں سے منسوب کرنا سخت حماقت ہوگی اور اس بے عقلی کے نظریہ کا سوائے اس کے اور کوئی فائدہ نہیں کہ یہ بیرونی غلبے کو طول دینے کا سبب بن سکتا ہے۔ انگریزوں نے بہرحال جانا ہے۔ وہ ایک باضابطہ طریقے سے جانا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ وزارتی مشن کی سرکاری دستاویز سے ظاہر ہو چکا ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ ہندوستان کو اس کی تقدیر کے حال پر چھوڑ کر چلے جائیں گے یہ فرض کر کے کہ ہندوستان عدم تشدد کا راستہ ترک کر چکا ہے اور پھر یقیناً مسلح قوتوں کی بھی مداخلت ہوگی۔ اگر آئین ساز اسمبلی ناکام ہوگئی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوگی کہ انگریز ظالم ہیں بلکہ اس لیے ہوگی کہ ہم ہندوستانی یا تو بیوقوف ہیں یا ظالم ہیں یا دونوں ہیں۔“[74] لیکن گاندھی کی ان تمام اپیلوں کے باوجود ہڑتالوں اور ہنگاموں کا سلسلہ چل نکلا تھا جن میں کمیونسٹ اور بائیں بازو کے لوگ سرگرم تھے۔

انہی دنوں محکمہ ڈاک و تار کے ملازمین نے ملک گیر ہڑتال کی جو کامیابی کے ساتھ مسلسل کئی روز جاری رہی۔ اس کے بارے میں 31 رجولائی کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں لکھا کہ کلکتہ جیسے بڑے مراکز میں ذمہ دار ٹریڈ یونین لیڈروں کے ہاتھ سے کنٹرول نکل کر کمیونسٹ عناصر کے ہاتھ میں چلا گیا ہے جو ہر اس طرح کے موقع سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔“[75] ریلوے ملازمین ہڑتال کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ کلکتہ بندرگاہ کے ملازم پہلے ہی ہڑتال پر تھے۔ 2 راگست کو وی۔ پی۔ مینن نے ویول کے نام ایک نوٹ

میں کانگرس کو حکومت بنانے کی سفارش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ہڑتالیں معمول بنتی جارہی ہیں اور ان کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے ماضی کی طرح اب یہ صنعتی مزدوروں تک محدود نہیں رہیں گی۔''[76] اسی روز ویول نے اپنے روزنامچے میں لکھا ''مینن خود بھی کمیونزم کو ہندوستان کے لیے حقیقی خطرہ تصور کرتا ہے۔''[77]

27رجولائی کو گورنر یو پی کی طرف سے وائسرائے کے نام ارسال کردہ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ اس کے سیکرٹریٹ کے عملہ میں بے چینی بڑھ رہی ہے اور پمفلٹ تقسیم کئے جارہے ہیں جن میں ''انتہائی اقدام'' اٹھانے کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ اس کے علاوہ الہ آباد کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی ایک رپورٹ کا حوالہ بھی دیا گیا تھا کہ کمیونسٹ پولیس کی صفوں میں بھی شامل ہوگئے ہیں۔ چنانچہ گورنر یو پی کا کہنا تھا کہ ''اس وقت ہڑتالوں کا جو بخار پھیلا ہوا ہے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ پولیس اس سے متاثر نہیں ہوگی۔ ان حالات میں اس کا کہنا تھا کہ مستقل مزاج اور فرض شناس افسروں میں تشویش بڑھ رہی ہے اور اس قدر تشویش ان میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔'' اپنی رپورٹ کے آخر میں اس نے لکھا کہ ''موجودہ صورت حال میں ایک نہیں بہت سارے انقلابات کا مواد جمع ہو چکا ہے۔''[78] 7راگست کو یو پی کے گورنر نے اپنے ایک اور مراسلے میں وائسرائے کو یورپی افسروں کی مضطرب کیفیت سے آگاہ کیا۔ اس نے لکھا کہ ''یورپی افسروں کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں......ان کا لوگوں کے ساتھ قریبی رابطہ ہے جس سے انہیں ان امڈتے ہوئے خطرات کا اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے جو انہیں ہر طرف سے گھیرے میں لے لیں گے۔ ان میں سے بہت سے دور دراز چھوٹے اضلاع میں تعینات ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ انتظامیہ کا دیوالیہ ہوتے ہی خود ان کا زندہ بچنا محال ہوگا۔ ان میں سے کئی کے بیوی بچے ہیں اور ان کو معلوم نہیں کہ ان کی پناہ کا کیا انتظام کیا گیا ہے جب کہ وہ بدستور تعینات رکھے جائیں گے۔'' اس نے اوسط درجے کے یورپی افسروں کی معاشی بدحالی کا ذکر کیا اور لکھا کہ یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ ''انگلینڈ واپس جا کر کوئی کام ڈھونڈا جائے تاکہ کنبے کو سنبھالا جاسکے۔'' مسلم لیگ کونسل کے فیصلے کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''یہاں مسلمانوں کے رویے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں انگریز اب اپنی اہمیت کھو چکے ہیں اس لیے مسلمانوں کے پاس موقع ہے کہ وہ کانگرس کے ان الزامات سے خود کو بری کر

لیں کہ وہ انگریزوں کے ٹوڈی (پٹھو) ہیں اور نواب یا خان بہادر یا اسی قسم کے خطابات یافتہ ہیں۔ دراصل معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص ہمارے خلاف ہو چکا ہے۔''[79]

8/اگست کو وائسرائے نے یو پی اور مسلم اکثریتی صوبوں بنگال، پنجاب، سرحد اور سندھ کے گورنروں کے ساتھ مسلم لیگ کے ''ڈائریکٹ ایکشن ڈے'' کی اپیل سے پیدا صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے اجلاس منعقد کیا۔ گورنر بنگال نے بتایا کہ مشرقی بنگال کی صورت حال سب سے زیادہ خراب ہوگی۔ وہاں کے مسلمان لڑنے مرنے پر تیار بیٹھے ہیں اگرچہ ان پر یہ واضح نہیں ہے کہ انہوں نے کس کے خلاف لڑنا ہے۔ مشرقی بنگال میں دوسو کے قریب انگریز تعینات ہیں۔ اس نے بھی اس امر کی تصدیق کی کہ یورپی افسر جلد واپس وطن جانے کا رجحان رکھتے ہیں اور ان میں سے بیشتر یکم جنوری 1947ء کو چلے جانا چاہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ڈائریکٹ ایکشن کی صورت میں مشرقی بنگال میں ایک ہفتے کے اندر خوراک کا بحران پیدا ہو جائے گا۔ یو پی کے گورنر نے بتایا کہ اس صوبے میں اگرچہ مسلمانوں کی تعداد 14 فیصد ہے لیکن وہ زیادہ تر شہروں میں آباد ہیں اور وہیں سے فرقہ وارانہ گڑبڑ کا آغاز ہوگا۔ اس کی رائے تھی کہ انگریزوں پر حملے نہیں کئے جائیں گے، مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین سیدھی لڑائی ہوگی۔ پنجاب کے گورنر کا کہنا تھا کہ وہاں لیگ غیر منظم ہے اور اس کے رہنما جیل جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تاہم زیادہ تر اندیشہ سکھوں کی جانب سے تھا۔ سندھ کے گورنر نے بتایا کہ تمام تر یورپی کراچی میں مقیم ہیں جہاں وہ محفوظ ہیں۔ بڑے شہروں میں آباد ہندوؤں کا بھی تحفظ کیا جا سکے گا۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے نائب کمانڈر انچیف جنرل آرتھر سمتھ نے بھی شرکت کی اور کہا کہ گڑبڑ فرقہ وارانہ نوعیت کی ہوگی اور انگریز دشمن نہیں ہوگی۔ ماسوائے مشرقی بنگال کے لیگ کی تنظیمی حالت اچھی نہیں ہے۔ پنجاب، بنگال اور یو پی کے گورنروں کی متفقہ رائے تھی کہ پولیس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جے پرکاش نارائن اور بائیں بازو کے عناصر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے گورنر پنجاب نے بتایا کہ اس نے حال میں پنجاب میں اشتعال انگیز بیانات دیئے ہیں اور لوگوں کو انگریز افسروں کو قتل کرنے پر اکسایا ہے۔ وائسرائے ویول نے رائے دی کہ اگر کانگرس مرکز میں حکومت میں شامل ہوگئی تو سخت اقدام اٹھایا جا سکے گا۔''[80] اس اجلاس سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طور پر حالات پر انگریزوں کی گرفت بالکل ڈھیلی پڑ چکی تھی اور وہ بخیرو

عافیت اور جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کانگرس زیادہ معاون نظر آتی تھی۔ 13 راگست کو سی۔ پی کے گورنر نے وائسرائے کے نام مراسلے میں لکھا کہ ''مجھ پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ انگریز سول افسر جس قدر جلد یہاں سے نکل جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔''[81] 13 راگست کو ویول نے پیتھک لارنس کو ہڑتالوں کی صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا کہ اگرچہ ڈاک وتار کے ملازمین کام پر واپس آ گئے ہیں لیکن ہڑتالوں کا خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ گورنمنٹ محکموں کے کارکنوں کی جانب سے ہڑتال کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں۔ کانگرس کے تعاون سے جو عبوری حکومت تشکیل دی جا رہی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''عبوری حکومت لیبر کو مؤثر طور پر کنٹرول کرنے میں یقینا کامیاب ہو جائے گی، لیکن اس کے لیے اسے کمیونسٹوں اور کانگرسی بائیں بازو کے ایجی ٹیشن کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا ہو گا۔''[82] جب کہ اس سلسلے میں ویول اور پیتھک لارنس دونوں پہلے سے اس امید کا اظہار کر چکے تھے کہ نہرو اپنی اعتدال پسندی کو بروئے کار لا کر صورت حال پر قابو پا لے گا۔

انگریزوں کو داخلی طور پر ہی نہیں بلکہ خارجی طور پر بھی کمیونزم کا خطرہ نظر آتا تھا۔ ہندوستان کے انتقال اقتدار کے سلسلے میں چیفس آف سٹاف کمیٹی (انڈیا) نے ایک رپورٹ برطانوی کابینہ کے لیے تیار کی۔ ویول نے 13 رجولائی کو اپنے خط کے ہمراہ یہ رپورٹ پیتھک لارنس کو ارسال کی۔ ویول نے اس سلسلے میں دو باتوں کو بنیادی شرائط قرار دیا۔

''(الف) اقتدار باضابطہ طریقے سے ایک متحدہ اور دوست ہندوستان کو منتقل کیا جائے۔

(ب) ایک تسلی بخش دفاعی معاہدہ کیا جائے۔''

اس نے لکھا کہ ''سارے معاملے کا عقدہ انہی دو نکات میں مضمر ہے۔ اگر ہندوستان افراتفری کا شکار ہو گیا تو برطانیہ کے ہاتھ سے تجارت، فوجی اہمیت کے فائدے اور وقار سب کچھ جاتا رہے گا اور عالمی امن کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ برطانوی نقطۂ نگاہ سے اس کا بدترین نتیجہ اس صورت میں نکلے گا کہ جب ہندوستان یا تو ایک ذمہ دار حکومت کے فقدان کی وجہ سے یا کمیونسٹ انقلاب کے ذریعے یا سوچے سمجھے فیصلے کے مطابق روس کے کنٹرول میں چلا جائے گا۔ اس طرح برطانیہ اپنی حیثیت بھی گنوا دے گا اور ہندوستان کو بھی کچھ نہیں دے گا۔'' ساتھ منسلک رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ''اگرچہ ہندوستان اپنی صلاحیت کے اعتبار سے طاقتور

ہے لیکن اس وقت یہ باہمی طور پر بٹا ہوا ہے اور اگر انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر بالکل نکل گئے اور یہ معاملہ یہاں کی پارٹیوں کے لیڈروں پر چھوڑ دیا کہ وہ خود اپنی نجات کا فیصلہ کریں تو اس طرح ہم اس ملک کو روس کے لیے کھلا چھوڑ دیں گے......فطرت خلا کو گوارا نہیں کرتی۔ اس لیے انگریزوں کے یہاں سے نکلنے کے بعد روسیوں کے یہاں در آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔''
اس رپورٹ اور ساتھ منسلک ویول کے خط میں ہندوستان کے ساتھ وابستہ برطانیہ کے فوجی، معاشی اور سیاسی مفادات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ فوجی اعتبار سے جن چیزوں کو اہم قرار دیا گیا تھا ان میں یہاں کی افرادی قوت تھی کہ یہاں کی بیس لاکھ فوج کے بغیر جنگ لڑنا ناممکن تھا۔ ہندوستان کی وسائل سے پر فوجی کیمپ کی حیثیت تھی، ہندوستان اور سیلون کے بحری اڈے تھے جو ایران اور خلیج فارس سے تیل کی سپلائی کو تحفظ مہیا کرتے تھے جو کہ برطانیہ اور دولت مشترکہ کے لیے بے حد ضروری تھا اور بحر ہند پر کنٹرول کرتے تھے جو ملایا، برما، نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے ساتھ آمدورفت کے لیے بے حد ضروری تھا۔ اس خطرے کی نشان دہی کی گئی کہ ہندوستان پر روسی غلبے کی صورت میں خلیج فارس اور شمالی بحر ہند اور ممکن ہے سیلون بھی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ علاوہ ازیں ہندوستان دولت مشترکہ کے مابین ایک اہم فضائی رابطہ مہیا کرتا ہے۔ معاشی اعتبار سے ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کی سب سے زیادہ تجارت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی صنعتوں بالخصوص چائے اور پٹ سن کی صنعت میں خود انگریز شریک ہیں۔ ہندوستانی درآمد کنندگان مال خریدنے کے لیے برطانوی مارکیٹ ہی کو سب سے اچھا سمجھتے ہیں ہندوستان میں خوشحالی بڑھنے کے ساتھ یہاں صارفین کی مصنوعات کی مانگ بڑھے گی جن کا بڑا حصہ برطانیہ کو مل سکتا ہے برطانوی تکنیکی مہارت کی بھی یہاں بڑی قدر و منزلت ہے۔'' چنانچہ اس رپورٹ اور ویول کے خط میں ان تمام پہلوؤں کے پیش نظر ایک مستحکم اور متحدہ ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنے کی سفارش کی گئی۔[83] اس پر تبصرہ کرتے ہوئے 13 راگست کو نائب وزیر ہند ڈیوڈ مونٹیتھ نے لکھا کہ ''ہر شخص جانتا ہے کہ اگر ہندوستان غیر مستحکم ہو گیا یا غیر مستحکم اور مخالف دونوں ہو گیا تو دولت مشترکہ کے ڈھانچے میں یہ ایک اہم ترین ستون کی حیثیت سے نیچے آن گرے گا اور ایک مسلسل دردسر بن جائے گا۔''[84] چنانچہ ان حالات میں جن سے داخلی اور خارجی طور پر ہندوستان گزر رہا تھا، برطانوی حکومت کے لیے کانگرس کو راضی بہ رضا رکھنا بے حد ضروری تھا۔

جناح کی اعتدال پسندی سے حکومت برطانیہ خائف نہ تھی

اس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی بغاوت کو وہ کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ وہ اسے تنظیمی لحاظ سے کمزور سمجھتے تھے جو کہ حقیقت تھی۔ چنانچہ وہ اس سے کسی ایسی پرتشدد تحریک کی توقع نہیں رکھتے تھے کہ جس پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ خود جناح نے یکم اگست کو ایک پریس کانفرنس میں یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم فوری طور پر غیر آئینی ذرائع اختیار نہیں کریں گے اور یہ تاثر دیا تھا کہ اب بھی مذاکرات کی گنجائش ہے۔''[85] 30 رجولائی کو ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے کولن ریڈ نے بھی جناح کے ساتھ انٹرویو میں یہ تاثر لیا تھا کہ جناح خود تو کانگرس کے ساتھ کبھی رابطہ قائم نہیں کریں گے۔ البتہ اگر کانگرس یا حکومت نے ان کے ساتھ رسائی کی کوشش کی تو انہیں اعتراض نہ ہوگا۔[86] 3 راگست کو ریڈ نے ویول کے ساتھ ملاقات میں جناح کے ساتھ متذکرہ انٹرویو کی بنیاد پر اسے آگاہ کیا کہ ''جناح تصفیہ چاہتا ہے اور اس نے یہ تاثر لیا ہے کہ جناح پاکستان پر یقین نہیں رکھتا۔''[87] چنانچہ ویول نے 4 راگست کو نگران ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس کے دوران کہا کہ ''مجھے جو اطلاعات ملی ہیں ان سے میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ مطالبہ پاکستان کو محض ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے تا کہ بہتر شرائط پر سودا ہو سکے۔ اس کی رائے تھی کہ جناح آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر اور عبوری حکومت میں شمولیت پر بھی آمادہ ہو جائے گا بشرطیکہ اسے یہ یقین دہانی کرا دی جائے کہ گروپنگ پر صحیح طریقے سے عمل ہوگا۔''[88]
4 راگست کو گورنر بمبئی کے ویول کے نام مراسلے میں اگر چہ اس خدشہ کا اظہار کیا گیا تھا کہ یہ صحیح ہے کہ مسلم لیگ نے تحریک چلانے کے لیے کوئی خاص تیاری نہیں کی ہے۔ لیکن جناح حالات کو بگڑنے کی اجازت دیں گے تا کہ حصول پاکستان کی راہ ہموار کر سکیں لیکن ساتھ اس نے لکھا تھا کہ ''ممکن ہے جناح کے اقدام کے بارے میں میں بھی مبالغہ سے کام لے رہا ہوں اور اس کا مقصد محض کانگرس پر آئین ساز اسمبلی میں گروپنگ کو یقینی بنانے کے لیے دباؤ ڈالنا ہی ہو۔''[89]
7 راگست کو لیاقت علی خان نے ممبر داخلہ سر آرتھر واگ کے ساتھ ملاقات میں کہا تھا ''انگریزوں اور مسلمانوں کا خون بہایا جانا ایک قابل افسوس بات ہوگی لیکن یہ رس رس کر مرنے سے بہتر ہو گا۔ جناح بوڑھا آدمی ہے اور جیل جانے سے غالباً نفرت کرتا ہے۔ مجھے اور میری بیوی کو بھی

زندگی کی آسائشات پسند ہیں۔لیکن ان حالات میں ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا ہے۔"[90] گویا مسلمانوں نے انتہائی مجبوری کی حالت میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کی راہ اختیار کی تھی ورنہ وہ وزارتی مشن منصوبے کی مجوزہ گروپنگ پر مطمئن تھے بشرطیکہ اس پر جائز طریقے سے عمل درآمد ہوتا۔ چنانچہ لیگ کے پاس ڈائریکٹ ایکشن کا کوئی منظم منصوبہ نہیں تھا۔ اس لیے 13/اگست کو ہندوستان کے کمانڈر انچیف نے لندن میں چیفس آف سٹاف کمیٹی کے اجلاس میں یہ یقین دہانی کرائی کہ "اگرچہ ہندوستان کی عمومی صورت حال غیر یقینی ہے اور اس میں سنگین خطرات بھی پنہاں ہیں لیکن یہ اب اس سے کہیں بہتر ہے جتنی چند ہفتے پیشتر خراب تھی اور مسلم لیگ کے تعاون کی صورت میں اس میں مزید بہتری پیدا ہوسکتی تھی۔ اگر افواج وفادار ہیں جن میں ابھی بے چینی کے کوئی آثار نہیں ہیں تو میں کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔"[91] یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اب جب کہ مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن ڈے قریب آرہا تھا، صورت حال پہلے سے خراب ہونے کے بجائے بہتر کیوں نظر آرہی تھی؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ہفتے پہلے کانگرس بغاوت پر مائل تھی اور اس کے رہنما اشتعال انگریزی پر اترے ہوئے تھے، اب کانگرس عبوری حکومت میں شامل ہورہی تھی اور صرف مسلم لیگ کا خطرہ تھا جس کے تعاون سے صورت حال میں "مزید بہتری" تو پیدا ہوسکتی تھی لیکن اس کے بغیر بھی صورت حال "پچھلے ہفتوں کی نسبت بہتر" ہوگئی تھی برطانوی حکومت نے کانگرس کو راضی بہ رضا رکھ کر یہ "بہتری" کی صورت حال پیدا کی تھی۔ ہندوستان کے داخلی و خارجی حالات کے پیش نظر برطانوی حکومت کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔

کانگرس کا اجلاس واردھا۔ گروپنگ سکیم کے خلاف مؤقف کی توثیق اور حکومت میں شمولیت پر رضامندی

اس داخلی اور خارجی پس منظر میں 8/اگست کو واردھا میں کانگرس مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے اختتام پر 10/اگست کو منظور کی گئی قرارداد کے آغاز میں "محکومی سے مکمل آزادی کی جانب" بڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ "......اب جب کہ وسیع اور پیچیدہ سیاسی اور معاشی مسائل کا سامنا کرنا ہے اور انہیں حل کرنا ہے، ہندوستان کے عوام اور ان کے

نمائندوں کے مابین بہت زیادہ تعاون درکار ہوگا تا کہ یہ تبدیلی کا عمل پرسکون طریقے سے اور تمام متعلقین کے مفاد میں مکمل ہو سکے۔'' برطانوی حکومت کا تیر بالکل نشانے پر بیٹھا تھا۔ یہی کانگرس جسے امن وامان کے لیے خطرہ سمجھا جا رہا تھا، اب بلا شرکت غیرے حکومت بنانے کی دعوت ملنے کے بعد امن وسکون کی چیمپئن بن گئی تھی۔ مسلم لیگ نے وزارتی مشن منصوبہ کو رد کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے عذر گناہ کرنے کی کوشش کی گئی جو بدتر از گناہ ثابت ہوئی۔ اس بارے میں قرارداد میں کہا گیا ''مجلس عاملہ نے مسلم لیگ کے ان اعتراضات کو نوٹ کیا ہے جن میں کہا گیا ہے کہ کانگرس نے 16 رمئی کی دستاویز میں دی گئی تجاویز کو مشروط طور پر قبول کیا ہے۔ مجلس عاملہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اگر چہ ہم نے اس دستاویز کی تمام تجاویز کو منظور نہیں کیا ہے۔ لیکن سکیم کو مکمل طور پر قبول کیا ہے۔ ہم نے اس کی تعبیر اس لیے کی ہے تا کہ دستاویز میں دیئے گئے اصولوں کے مطابق اس میں موجودہ تضاد کو رفع کیا جا سکے اور فروگذاشتوں کو دور کیا جا سکے۔ ہماری رائے میں صوبائی خودمختاری اس کی بنیادی شق ہے اور ہر صوبے کو گروپ کی تشکیل یا اس میں شمولیت کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ تعبیر کا فیصلہ بھی دستاویز میں وضع کردہ طریقہ کار کے مطابق کیا جائے گا اور کانگرس اپنے نمائندوں کو اسی مطابقت سے عمل کرنے کا مشورہ دے گی۔'' چنانچہ یہاں اسی تعبیر کا اعادہ کیا گیا تھا جو 24 رمئی اور پھر 25 رجون اور پھر 7 رجولائی کی قراردادوں میں اختیار کی گئی تھی اور اسی کے مطابق 16 رمئی کی دستاویز کو نام نہاد منظوری دی گئی تھی۔ بلکہ متذکرہ قرار داد میں تو بالکل واضح کر دیا تھا کہ ''ہم نے اس دستاویز کی تمام تجاویز کو منظور نہیں کیا ہے۔'' آئین ساز اسمبلی میں اپنی جس تعبیر کے مطابق وہ اپنے ارکان کو عمل کرنے کا مشورہ دے رہی تھی وہ بھی گروپنگ کے خاتمے کے لیے تھی کہ تعبیر کا فیصلہ وضع کردہ طریقۂ کار کے مطابق فیڈرل کورٹ کی مشاورت سے عمل میں لایا جانا مقصود تھا۔ جب کہ فیڈرل کورٹ کے فیصلے کی حیثیت بھی محض مشاورتی تھی۔ اختیار اعلیٰ اسمبلی کو حاصل تھا۔ چنانچہ اس کے متعلق بھی اپنے پچھلے مؤقف کا اعادہ کرتے ہوئے اس قرارداد میں کہا گیا کہ ''مجلس عاملہ آئین ساز اسمبلی کی خود مختارانہ حیثیت کو بہت اہم قرار دیتی ہے یعنی یہ کہ اس کو کسی بیرونی طاقت یا اتھارٹی کی مداخلت کے بغیر اپنا کاروبار چلانے اور ہندوستان کا آئین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ تاہم اسمبلی

اپنا کاروبار چلانے میں اس کی اندرونی حدود و قیود کی پابند ہوگی جو کہ اس کے کام کا جزو لاینفک ہیں اور مزید یہ کہ آزاد ہندوستان کا آئین وضع کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کرے گی اور اس کی خاطر تمام جائز مطالبات اور مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ اور آزادی مہیا کرے گی۔'' آخر میں اس عزم کا اعادہ کیا گیا کہ ہم مجلس عاملہ کی 25ر جون کی قرارداد اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی 7ر جولائی کی قرارداد پر ثابت قدم ہیں اور اس کے مطابق آئین ساز اسمبلی میں شریک ہوں گے اور اس کا کاروبار چلائیں گے۔''[92]

اس قرارداد سے ایک بار پھر یہ عیاں ہو گیا تھا کہ کانگرس نے وزارتی مشن منصوبہ میں سے صرف آئین ساز اسمبلی کو اور وہ بھی اس کی آزاد و خودمختار حیثیت میں قبول کیا تھا۔ جہاں تک گروپنگ کا تعلق تھا تو اس کی کوئی لازمی حیثیت نہیں تھی، اس کی تعبیر کے مطابق جو کہ منصوبہ وضع کرنے والوں کی اپنی تعبیر کے خلاف تھی، صوبوں کو شروع ہی میں گروپ سے نکلنے یا اس میں شامل نہ ہونے کا اختیار حاصل تھا جسے وہ صوبائی خودمختاری کے نام پر اسے منصوبے کی بنیادی شق قرار دیتی تھی۔ آسام اسمبلی اسی تعبیر کے مطابق گروپنگ کے خلاف قرارداد منظور کر چکی تھی۔ سرحد سے بھی اسی قسم کا اقدام کرایا جا سکتا تھا۔ تعبیر پر اختلاف کا قضیہ فیڈرل کورٹ تک جاتا اور وہاں سے جو بھی فیصلہ ہوتا اسے منظور یا رد کرنے کا آئین ساز اسمبلی کو حق حاصل تھا کہ اس کے اختیار اعلیٰ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا گویا باالفاظ دیگر اسمبلی میں موجود ہندوؤں کو حاصل ''ظالمانہ اکثریت'' کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کانگرس نے مسلم لیگ کونسل کی قراردادوں کا کوئی اثر قبول نہیں کیا تھا اور بدستور ہٹ دھرمی اور رعونت پر قائم رہی تھی۔ جس کا مظاہرہ وہ 24ر مئی، 25ر جون اور 7ر جولائی کی قراردادوں اور اپنے رہنماؤں کے بیانات کی صورت میں کرتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن ابوالکلام آزاد جو کانگرس کی تمام قراردادوں میں اور خود اپنے سمیت تمام کانگرسی رہنماؤں کی تقریروں میں گروپنگ کے خلاف مسلسل اختیار کئے گئے مؤقف سے قطع نظر کر کے نہرو کی 10ر جولائی کی پریس کانفرنس کو سارے قضیے کی بنیاد قرار دیتا ہے، مسلم لیگ کونسل کی قراردادوں سے پیدا شدہ صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''میں اس نئی صورتحال پر بے انتہا پریشان ہوا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ وہ سکیم جس کی خاطر میں نے اتنی محنت کی تھی خود ہمارے اقدام کی وجہ سے تباہ ہو رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ نئی صورت

حال پر غور کرنے کے لیے مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہونا چاہیے...... (اجلاس میں) میں نے یہ واضح کیا کہ اگر ہم اس صورتحال سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں واضح کر دینا چاہیے کہ کانگرس کا نقطۂ نظر وہی ہے جس کا اظہار آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد میں کیا گیا ہے اور کوئی فرد خواہ وہ کانگرس کا صدر ہی کیوں نہ ہو اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔ مجلس عاملہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی صورتحال سے دو چار تھی۔ ایک جانب کانگرس کے صدر کے وقار کا سوال تھا تو دوسری طرف وہ تصفیہ خطرے میں تھا جسے اتنی مشکل سے حاصل کیا گیا تھا۔ صدر کے بیان کی تردید سے تنظیم کمزور ہوتی تھی جب کہ وزارتی مشن منصوبہ ترک کر دینے سے ملک تباہ ہوتا تھا۔ بالآخر ایک قرارداد وضع کی گئی جس میں (نہرو کی) پریس کانفرنس کا کوئی تذکرہ نہ کیا گیا اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے فیصلے کا اعادہ کر دیا گیا۔''[93]

آزاد، جو بقول جناح، کانگرس کا ''شو بوائے'' تھا، یا تو کانگرس مجلس عاملہ کی 24 اور 25 رجون کی قراردادوں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی قرارداد اور متذکرہ قرارداد (8 راگست) کے مفہوم سے ناآشنا تھا یا کانگرسی رہنما اسے اپنے ارادوں سے بے خبر رکھتے تھے، یا دس سال بعد یہ حالات لکھتے وقت واقعات کی پوری تفصیل اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی یا اسے کوئی مصلحت درپیش تھی یا پھر وہ انتہائی بد دیانت تھا کہ اس قسم کی باتیں لکھ گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قراردادیں جن میں وزارتی مشن منصوبہ جس سے آزاد کی مراد گروپنگ سے تھی، پر عملدرآمد کے حق میں تھیں؟ کانگرس اور گاندھی نے اسمبلی میں جا کر اپنی تعبیر کے مطابق گروپنگ کو سبوتاژ کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا ان قراردادوں میں قانون دانی کے طریقے سے بیان کیا گیا تھا۔ نہرو نے عام فہم انداز میں اس کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ مجلس عاملہ کی 10 راگست کی متذکرہ قرارداد میں اور نہرو کی 10 رجولائی کی پریس کانفرنس میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں تھا۔

12 راگست کو جناح نے اس قرارداد پر ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا ''یہ ہمیں کوئی راہ نہیں دکھاتی۔ اس میں کانگرس کے اسی مؤقف کو دہرایا گیا ہے جس پر وہ شروع سے قائم ہے، صرف لفاظی اور زبان دانی کا انداز مختلف ہے۔'' اس کے بعد قرارداد کے مختلف حصوں کا تجزیہ کرنے کے بعد آخر میں جناح نے کہا ''چنانچہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ کانگرس کی طرف سے ذرہ بھر تبدیلی ظاہر نہیں کی گئی سوائے اس چونکا دینے والے جملے کے کہ انہوں نے سکیم کو مکمل طور

پر قبول کیا ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد اس قرارداد میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس جملے کی تردید ہو جاتی ہے۔ انہوں نے گروپنگ کی مخالفت کا اعادہ کیا ہے اور ایک بار پھر آئین ساز اسمبلی کی خودمختار حیثیت پر زور دیا ہے جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ 16 رمئی کی دستاویز میں دی گئی کسی بات کے پابند نہیں ہیں اور ہر مسئلے کا فیصلہ اکثریت کے ساتھ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں...... میرا خیال ہے کہ صورتحال وہی ہے جیسے پہلے تھی اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں تھے۔''[94] آزاد کے مطابق ''جناح نے یہ دلیل بھی دی کہ اگر کانگرس اتنی مرتبہ بدل سکتی ہے جب کہ ابھی انگریز یہاں موجود ہیں اور ابھی اقتدار اس کے ہاتھ نہیں آیا ہے تو اقلیتوں کے پاس کیا یقین دہانی ہے کہ انگریز ایک مرتبہ یہاں سے چلے گئے تو کانگرس پھر نہیں بدلے گی اور وہ حیثیت اختیار نہیں کرے گی جو نہرو نے اپنے بیان میں کی تھی۔''[95] چنانچہ واردھا میں کانگرس مجلس عاملہ کی 10 راگست کی منظور کردہ قرارداد کے نتیجے میں کانگرس اور لیگ کے مابین تضاد کی خلیج کم ہونے کے بجائے مزید گہری اور وسیع ہوگئی۔

واردھا میں کانگرس مجلس عاملہ کے اجلاس کا اصل حاصل عبوری حکومت میں شمولیت کی دعوت کو منظور کرنا تھا۔ چنانچہ 10 راگست کو نہرو نے ویول کی 6 راگست کی دعوت کے جواب میں لکھا 'میں نے یہ ذمہ داری اٹھانے کے لیے اپنے رفقاء کا مشورہ قبول کر لیا ہے اور اب میں اس حیثیت میں ہوں کہ حکومت وضع کرنے کے بارے میں اپنی تجاویز آپ کے سامنے رکھ سکوں۔'' آگے چل کر طریقۂ کار کے بارے میں تجویز کیا گیا تھا کہ ہماری رائے میں بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ آپ ایک پبلک اعلان کر دیں کہ آپ نے کانگرس کے صدر کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی ہے اور اس نے یہ منظور کر لی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہ ممکن ہو سکے گا کہ ہم مسلم لیگ سے رسائی استوار کریں اور اسے تعاون کی دعوت دیں۔ ہم اس کے تعاون کا خیر مقدم کریں گے لیکن اگر اس نے انکار کر دیا تو پھر ہم اس کے بغیر ہی آگے بڑھ جائیں گے۔''[96] اس کے بعد ویول نے 11 راگست کو مجوزہ اعلان کا متن واردھا ارسال کر کے وہاں نہرو سے اس کی منظوری حاصل کی اور 12 راگست کو اسے جاری کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''وائسرائے نے حکومت برطانیہ کی منظوری کے بعد کانگرس کے صدر کو عبوری حکومت کی فوری

تشکیل کے لیے تجاویز پیش کرنے کی دعوت دی ہے اور کانگرس کے صدر نے اس دعوت کو منظور کرلیا ہے۔ عنقریب جواہر لال نہرو نئی دہلی آ کر ان تجاویز پر وائسرائے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرے گا۔" 13 / اگست کو نہرو نے واردھا سے جواب دیا کہ مجھے 14 / اگست تک یہاں ٹھہرنا ہے اور پھر دو ایک روز کے لیے بمبئی جانا ہے۔ اس لیے میں "جلد از جلد بھی ہوا تو 16 / اگست ورنہ بہتر طور پر 17 / اگست کو آپ کے ساتھ ملاقات کروں گا۔"[97] مقصد یہ تھا کہ 16 / اگست کو مسلم لیگ کا ڈائریکٹ ایکشن ڈے گزر جائے تو وہ حکومت تشکیل کرے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ 16 / اگست کے بارے میں کانگرس کے اپنے بھی کچھ عزائم اور منصوبے تھے جن کی تکمیل حکومت کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد شاید معیوب معلوم ہوتی۔

ویول کے ایماء پر نہرو۔ جناح ملاقات، نیشنلسٹ مسلمان کی شمولیت پر مفاہمت کی کوشش ناکام

ادھر 8 / اگست کو ویول نے جناح کو خفیہ اور ذاتی خط کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے کانگرس کو دعوت دے دی گئی ہے اور اس سلسلے میں کانگرس جناح کے ساتھ رابطہ استوار کرے گی۔[98] اس کا جناح نے ویول کو کوئی جواب نہ دیا۔ جب 12 / اگست کا سرکاری اعلان جاری ہوا تو 14 / اگست کے روزنامہ ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا "جس لمحے مسلمانوں کی رضا اور تعاون کے بغیر ایک ہندو حکومت وجود میں آ گئی تو گویا مسلمانوں کے خلاف حملے کا پہلا وار کر دیا گیا۔ یہ اشارہ ہے مسلمانوں کے لیے کہ وہ کچھ کر دکھائیں یا مر جائیں۔ اب یہ ناگزیر ہے۔" 13 / اگست کو نہرو نے واردھا سے جناح کو بمبئی خط ارسال کیا اور انہیں مخلوط عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ساتھ ہی اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کیا کہ 15 / اگست کی صبح کو بمبئی پہنچوں گا اور 17 / اگست کی صبح کو دہلی چلا جاؤں گا۔ ان دونوں میں سے کسی جگہ بھی آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ جناح نے 15 / اگست کی صبح کو بمبئی میں ہی اس کا جواب بھیجا کہ "مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے اور وائسرائے کے بیچ کیا معاملات طے ہوئے ہیں اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ آپ دونوں کے مابین کیا معاہدہ ہوا ہے۔ اس

لیے یہ دعوت قبول نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ہندو مسلم مسئلے کے تصفیے کی خاطر جو کہ تعطل کا شکار ہے، بات چیت ہو سکتی ہے۔'' جس کے لیے انہوں نے اسی روز شام کو ملاقات کی دعوت دے دی۔ اسی روز دوپہر کو نہرو نے جناح کو جواب بھیجا کہ ''میرے اور وائسرائے کے بیچ کوئی ایسے معاملات طے نہیں ہوئے ہیں کہ جو شائع کردہ اعلان سے مختلف ہوں۔'' اس نے جناح سے اپنے فیصلے پر نظرثانی کے لیے درخواست کی۔''[99]

اسی روز شام کو دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کی جو تفصیل نہرو نے ویول کو 17/اگست کو بتائی اس کے مطابق نہرو نے جناح کو یقین دہانی کرائی کہ آئین ساز اسمبلی میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ دونوں پارٹیوں کی اکثریت کے بغیر طے نہیں کیا جائے گا، یہ کہ متنازعہ مسائل پر فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جائے گا اور یہ کہ کانگرس گروپنگ کی مخالف ہے اور مرکز کے تحت صوبوں کی خودمختاری کی قائل ہے تاہم ان صوبوں کی گروپنگ کی مخالفت نہیں کی جائے گی جو خود اس کے خواہاں ہوں گے۔ عبوری حکومت کے سلسلے میں نہرو نے جناح کو مجوزہ 14 میں سے پانچ نشستوں کی پیش کش کی اور کہا کہ ان پر لیگ کی جانب سے جو نام بھی دیئے جائیں گے انہیں قبول کر لیا جائے گا۔ اس پر جناح نے استفسار کیا کہ کیا کانگرس اپنی جانب سے کسی نیشنلسٹ مسلمان کو بھی حکومت میں شامل کرے گی۔ نہرو نے کہا کہ کانگرس اپنے کوٹے میں اس کا تقرر کرے گی جس پر جناح کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ جناح نے یہ صورت قبول نہ کی۔ اقلیتوں کے لیے مخصوص 3 نشستوں کے بارے میں بھی نہرو نے کہا کہ یہ بھی ہم تجویز کریں گے۔ بات چیت کافی دیر جاری رہی اور بغیر کسی تصفیے کے انجام پذیر ہوئی۔[100] صاف ظاہر ہے کہ گروپنگ کی صریح مخالفت اور عبوری حکومت میں غیر لیگی نیشنلسٹ مسلم کی شمولیت ایسے معاملات تھے کہ جناح کو کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم جناح 15/اگست یعنی ڈائریکٹ ایکشن ڈے سے ایک روز قبل تک تصفیے پر آمادہ تھے بشرطیکہ کانگرس متذکرہ معاملات پر ہٹ دھرمی کا رویہ برقرار رکھنے کے بجائے گنجائش کی کوئی صورت پیدا کرتی اور کچھ فراخدلی کا مظاہرہ کرتی۔ لیکن ہندو بورژوا مسلمانوں کو کسی صورت کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ برصغیر کے ہندو مسلم تضاد کے پر امن حل کے امکانات معدوم ہوتے جا رہے تھے، ناگزیر طور پر پرتشدد حل کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔

مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے موقع پر سکھوں کی صورتحال

اس اہم موڑ پر سکھوں کی صورت حال یہ تھی کہ وہ وزارتی مشن کے طویل المیعاد اور قریب المیعاد دونوں منصوبوں کو رد کر چکے تھے مگر اگلے لائحہ عمل کے بارے میں انتشار اور گومگو کی کیفیت سے دوچار تھے۔ وزارتی مشن کے جانے کے بعد ان کے حالات کا مختصر خلاصہ یہ تھا کہ جولائی کے پہلے ہفتے میں بلد یو سنگھ نے وزیراعظم ایٹلی کو خط لکھا جس میں اس سے درخواست کی گئی کہ وہ ذاتی طور پر مداخلت کر کے مشن کی جانب سے سکھوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا ازالہ کرے۔ اس نے شکایت کی کہ ایک طرف تو مشن نے مطالبہ پاکستان رد کرتے ہوئے اس دلیل کو تسلیم کیا ہے کہ اس میں غیر مسلم بالخصوص سکھوں پر مشتمل علاقوں پر مسلمان اکثریت کا غلبہ قائم ہو جائے گا اور یہ ناانصافی ہو گی مگر ساتھ ہی گروپ سسٹم میں انہوں نے سکھوں پر مسلمانوں کے فرقہ وارانہ غلبے کو مسلط کر دیا ہے۔ اس میں نہ تو سکھ علاقوں کو علیحدگی اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے ثقافتی، معاشرتی اور یہاں تک کہ مذہبی حقوق کے تحفظ کا کوئی بندوبست کیا گیا ہے جب کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس قسم کی بنیاد فراہم کی گئی ہے۔ اس منصوبے میں یہ شق رکھی گئی ہے کہ آئین ساز اسمبلی میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ دونوں فرقوں کی رضامندی کے بغیر طے نہیں پائے گا۔ سکھ جو کہ ہندوستان کے تین بڑے فرقوں میں سے ایک ہیں، انہیں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ ان کے لیے بھی ایسی ہی شق شامل کی جانی چاہیے۔[101]
3/جولائی کو جینکنز نے ویول کے نام اپنے خط میں سکھوں کی سفارش کرتے ہوئے لکھا کہ اگر دونوں بڑی پارٹیوں کے مابین کوئی تصفیہ ہو بھی جائے تو ''پنجاب میں سکھ اس کی راہ میں سنگین رکاوٹ کھڑی کر سکتے ہیں اور یہ کہ پنجاب کی لیگ کے نزدیک بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اگر جناح اور نہرو سکھوں کے لیے بعض تحفظات پر رضامند ہو جائیں تو حالات بہت بہتر ہو جائیں گے۔'' اس نے مزید لکھا کہ ''اگر بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر سکھوں کی دلجوئی کی جا سکے تو اس سے پنجاب میں فرقہ وارانہ تعلقات بہت بہتر ہو جائیں گے۔ مسلم لیگ کے لیے پنجاب میں حالات آسان ہو جائیں گے۔''[102]

4/جولائی کو بلد یو سنگھ نے جینکنز کے ساتھ ملاقات کی اور پھر بلد یو سنگھ کی سفارش پر

جینکنز نے ایک اور سکھ رہنما گیانی کرتار سنگھ کے ساتھ ملاقات کی۔ گیانی نے مطالبہ کیا کہ جس طرح مسلم لیگ نے کل ہند سطح پر اپنے لیے تحفظات کا مطالبہ کیا تھا جو کہ تسلیم کر لیا گیا ہے، اسی طرح سکھوں کو پنجاب میں تحفظات فراہم کئے جائیں اور اس سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ میں وزارتی مشن کی رپورٹ پر آمدہ بحث کے دوران بیان جاری کیا جائے جس میں سکھوں کے ''سیاسی، معاشی اور فوجی حقوق'' کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ جینکنز نے کہا کہ کانگرس پہلے ہی آئین ساز اسمبلی کی خودمختاری پر اصرار کر رہی ہے اس لیے حکومت برطانیہ آئین ساز اسمبلی سے متعلق منصوبے میں اب کوئی مداخلت نہیں کرے گی اور ایسا بیان جاری نہیں کرے گی۔ چنانچہ گیانی نے مطالبہ کیا کہ وائسرائے کو چاہیے کہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات مکمل ہونے کے بعد ہندوستان کی رائے عامہ کے رہنماؤں کو بلا کر ان سے گروپ ب میں سکھوں کو تحفظ مہیا کرنے کے لیے باہمی رضامندی حاصل کرے۔ جینکنز کا کہنا تھا کہ پنجاب میں کوئی بھی مستحکم حکومت بغیر سکھوں کے تعاون کے وجود میں نہیں آسکے گی اور یہ کہ اگر سکھ ذرا تحمل سے کام لیں تو مسلم لیگ بھی اور ہندو بھی دونوں آ کر سکھوں کی خوشامد کریں گے۔ گویا سکھ دونوں پارٹیوں کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھے لیکن جیسا کہ وزارتی مشن کی دستاویز سے بھی ظاہر ہوا کہ انگریز سکھوں کے مسئلے کو مطالبہ پاکستان کے خلاف اور جناح کی طرف سے مرکز کو کمزور رکھنے کے مطالبہ کے خلاف بطور لیور استعمال کرتے تھے اور یہ کوشش کامیاب بھی رہی کہ جناح نے منقسم پنجاب پر مبنی کٹا پھٹا پاکستان قبول کرنے کے بجائے متحدہ پنجاب پر مبنی گروپنگ سکیم کو منظور کر لیا۔ چنانچہ انگریز چاہتے تھے کہ سکھوں کا وزن کانگرس کے پلڑے میں ڈالا جائے تاکہ مسلم لیگ کو ایک مضبوط مرکز کے ماتحت لانے پر مجبور کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے دو انگریز اعلیٰ افسر سکھوں میں رابطے کا کام کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک میجر شارٹ تھا جو وزارتی مشن کے دوران کرپس کا معاون رہا تھا اور دوسرا پینڈرل مون جو امرتسر میں ڈپٹی کمشنر رہ چکا تھا۔ جینکنز کے ساتھ ملاقات کے دوران گیانی کرتار سنگھ نے بتایا کہ ''شروع میں جناح سکھوں کے ساتھ تصفیہ کرنے کے لیے شدت سے خواہش مند تھا لیکن مون اور شارٹ نے مجھے مشورہ دیا کہ اس سلسلے میں ہم کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ اب معلوم نہیں جناح ہمارے بارے میں کیا رویہ رکھتا ہوگا۔ لیکن عام سکھوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ وہ ان سے بھاری قیمت ادا کرنے کا مطالبہ کرے

گا۔ جناح کا مقصد پاکستان ہے اور بلا شبہ وہ سکھوں کو اچھی خاصی رعایتیں دینے پر آمادہ ہوگا بشرطیکہ سکھ دائمی مسلم غلبے کو قبول کر لیں۔"[103] چنانچہ سکھ مسلم تضاد اپنی جگہ موجود تھا اور اس کی ٹھوس تاریخی وجوہ بھی موجود تھیں لیکن جناح کا "سکھوں کے ساتھ تصفیے کے لیے شدت سے خواہش مند ہونا" اور "سکھوں کو اچھی خاصی رعایتیں دینے پر آمادہ" ہونا اس تضاد کو حل کرنے میں اگر مددگار ثابت ہو بھی سکتا تھا تو انگریزوں نے خود اس کا موقع نہ دیا اور ان کو لیگ سے قریب ہونے کے بجائے کانگرس سے قریب ہونے کی ترغیب دی۔

وزارتی مشن منصوبہ میں جو تحفظات اور رعایتیں مسلمانوں کو دی گئی تھیں وہی سکھ اپنے لیے مانگتے تھے اور اس کے لیے وہ انگریز، کانگرس اور مسلم لیگ تینوں کی جانب دیکھتے تھے۔ مسلم لیگ کے قریب آنے میں سکھ مسلم تضاد کے علاوہ خود انگریز رکاوٹ بن گئے اور اس تضاد کو حل ہونے کا موقع نہ دیا۔ خود انگریزوں کی طرف سے ان کے مطالبات کی تکمیل کا جہاں تک تعلق تھا تو ان کو بتا دیا گیا تھا کہ برطانوی حکومت نہ تو وزارتی مشن منصوبے میں اب کوئی ترمیم کر سکتی ہے اور نہ ہی آئین ساز اسمبلی کو اس ضمن میں کوئی تجویز دے سکتی ہے کیونکہ کانگرس آئین ساز اسمبلی کی خود مختاری پر حرف نہیں آنے دینا چاہتی۔ اگرچہ ہندو۔ سکھ تضاد بھی موجود تھا اور اس کی ٹھوس تاریخی وجوہ بھی موجود تھیں، سکھوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی اکثریتی جماعت کانگرس کے ساتھ معاملات طے کریں۔ کانگرس کو مسلم لیگ کے خلاف سکھوں کے تعاون کی ضرورت تھی کہ وہ گروپ ب کو سبوتاژ کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے تھے۔ چنانچہ وزارتی مشن کے کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر واپس چلے جانے کے بعد سردار پٹیل نے سکھوں کے متحدہ محاذ عمل کے سربراہ نرنجن سنگھ گل کو خط بھیجا جس میں کانگرس کی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ سکھوں نے مطالبہ کیا کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس میں سکھوں کی حمایت میں قرارداد منظور کی جائے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس (منعقدہ 6۔ 7/جولائی) میں یہ قرارداد تو منظور نہ کی گئی البتہ اس کے دوران 6/جولائی کو اپنی تقریر میں سردار پٹیل نے سکھوں کی پرزور حمایت کی۔ اس نے کہا وزارتی مشن منصوبہ میں سکھ فرقے کے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی ہے اور سکھوں سے پوچھے بغیر انہیں ہاتھ پاؤں سے باندھ کر گروپ ب کے اندر پھینک دیا گیا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ سکھوں کو وہی تحفظات اور فرقہ وارانہ ویٹو کیوں نہیں

دیا گیا جو مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔سکھ بہادر لوگ ہیں اور ان کے جائز مطالبے کو نظر انداز کرنا دانشمندی نہ ہوگی۔"[104] ادھر 7رجولائی کو امرتسر کے قریب واقع سلطان ونڈ کے مقام پر ایک بہت بڑے دیوان کا انعقاد کیا گیا جو کئی روز جاری رہا۔اس میں اعتدال پسند رہنما ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ شریک نہ ہوئے۔اس میں سابق آزاد ہند فوج سے تعلق رکھنے والے "جنرل" موہن سنگھ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی جو اس سے پہلے سکھ سیاست میں سرگرم نہیں ہوا تھا۔[105]

9رجولائی کو تمام پارٹیوں کے نمائندہ سکھوں پر مشتمل پنتھک پرتی ندھی بورڈ (مختصراً پنتھک بورڈ) کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آئین ساز اسمبلی میں شرکت یا بائیکاٹ کا مسئلہ زیر غور تھا۔☆ اکالیوں نے مکمل بائیکاٹ کا مطالبہ کیا۔کانگرسی سکھوں کو ہائی کمان کی جانب سے ہدایت کی گئی تھی کہ (ا) ان نامزدگیوں کی حمایت کریں جو پنتھ کو مجموعی طور پر قابل قبول ہوں (ب) اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر خود اپنے آدمیوں کو نامزد کر دیں۔لیکن 10رجولائی کو بڑی گرما گرم بحث کے بعد بورڈ نے بائیکاٹ کے حق میں فیصلہ کر لیا۔بلدیو سنگھ کا خیال تھا کہ کانگرسی سکھ اپنی ہائی کمان کی ہدایات کو ٹھیک سے سمجھ نہ پائے تھے۔تاہم 10رجولائی کی شام کو بلدیو سنگھ نے پٹیل کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور کانگرس ہائی کمان کی رائے معلوم کی۔پنتھک بورڈ میں کانگرسی سکھوں کا رہنما پرتاپ سنگھ کیرون تھا جسے سکھوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انہی دنوں کانگرس مجلس عاملہ میں بھی شامل کر لیا گیا تھا۔پٹیل کی رائے معلوم کرنے کے بعد بلدیو سنگھ نے پرتاب سنگھ کیرون کے ساتھ ملاقات کی اور اسے مشورہ دیا کہ چار کانگرسی سکھوں کو آئین ساز اسمبلی کی رکنیت کے لیے نامزد کر دیا جائے۔اسے معلوم تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو اکالی بھی اپنے نمائندے نامزد کر دیں گے۔چنانچہ یہی ہوا اور سکھوں کی جانب سے کل آٹھ امیدوار نامزد ہو گئے۔

14رجولائی کو پنتھک بورڈ کا ایک اور اجلاس منعقد ہوا جس میں پرتاب سنگھ پر نہ صرف اکالیوں کی طرف سے سخت تنقید ہوئی بلکہ ان کانگرسی سکھوں نے بھی اس پر سخت تنقید کی جو اس کے کانگرس مجلس عاملہ کا رکن منتخب ہونے پر اس سے حسد محسوس کر رہے تھے۔اس موقع پر بھیم سین سچر نے ٹیلی فون پر نہرو سے رابطہ قائم کیا۔سچر کے بقول نہرو نے اسے کہا کہ سکھ جو مناسب

☆ آئین ساز اسمبلی میں سکھوں کے لیے چار نشستیں مخصوص کی گئی تھیں جن کا انتخاب پنجاب اسمبلی کے سکھ ارکان نے کرنا تھا۔

سمجھیں فیصلہ کرلیں اور یہ پیغام پرتاب سنگھ کو دے دیا گیا۔ چنانچہ پنتھک بورڈ نے بائیکاٹ کا اپنا پہلا فیصلہ برقرار رکھا اور سکھوں کی آٹھ کی آٹھ نامزدگیاں واپس لے لی گئیں۔ بعد ازاں نہرو کو جب صورت حال کا علم ہوا تو وہ بہت سیخ پا ہوا کہ اس نے تو یہ کہا تھا کہ کانگرس کا مؤقف ذہن میں رکھتے ہوئے کانگرسی سکھ جو بہتر سمجھتے ہیں وہ کریں۔ بہرصورت اب نہرو نے کانگرسی سکھوں سے ضمنی انتخاب کی بنیاد پر دوبارہ کاغذات نامزدگی جمع کرائیں۔ پٹیل نے بھی بیان دیا کہ سکھوں کو آئین ساز اسمبلی کے اندر آکر اپنا کیس لڑنا چاہیے۔ بلدیو سنگھ نے گورنر پنجاب سے ضمنی انتخاب کے سلسلے میں ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ کانگرس کے امیدواروں کی نامزدگی کی صورت میں اکالی پھر سے وہی اقدام دہرائیں گے اور اپنے امیدواروں کو نامزد کر دیں گے۔ آئین ساز اسمبلی میں سکھوں کی نامزدگی کے بارے میں متذکرہ سارا قضیہ بلدیو سنگھ نے جینکنز کو اور اس نے ویول کو اپنے 18 رجولائی کے مراسلے میں بیان کیا۔[106] جس سے ظاہر ہوا کہ اکالیوں اور کانگرس کے مابین ابھی سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوسکی تھی۔ لیکن اب ایک اور مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ آئین ساز اسمبلی کے ضمنی انتخاب کے سلسلے میں کوئی واضح طور پر قانون موجود نہیں تھا اور اس سلسلے میں وائسرائے کو حکومت برطانیہ کا مشورہ درکار تھا۔ چنانچہ فی الوقت یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ 19 رجولائی کو پنجاب اسمبلی میں آئین ساز اسمبلی کے لیے سوائے سکھوں کے باقی تمام ارکان کا انتخاب مکمل ہو گیا۔

18 رجولائی کو سٹیفورڈ کرپس نے دارالعوام میں وزارتی مشن منصوبہ پر بحث کے دوران تقریر میں سکھوں کے مسئلے کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ مسئلہ اس لیے پیدا نہیں ہوا کہ ہم نے سکھوں کی اہمیت کا کم اندازہ لگایا تھا بلکہ یہ صورت حال ناگزیر جغرافیائی حقائق نے پیدا کر دی ہے۔ سکھ ویسا ہی برتاؤ چاہتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگرچہ سکھوں کی تعداد 55 لاکھ ہے جب کہ مسلمانوں کی تعداد 9 کروڑ ہے اور پھر یہ کہ سکھ جغرافیائی اعتبار سے اس طور پر واقع نہیں ہیں کہ کوئی علاقہ ان کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہو۔ تاہم میں اس امکان کو خارج قرار نہیں دیتا کہ ایسا علاقہ وضع کیا جاسکتا ہے کہ جس میں وہ اکثریت میں ہوں۔'' لیکن وزارتی مشن اس سلسلے میں کچھ کرنے سے معذور رہا ہے۔'' کرپس نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سکھوں کے جداگانہ اور اہم فرقے کی اہمیت کا پوری طرح احساس کرتے ہوئے ہم نے آئین ساز اسمبلی میں ان کے لیے علیحدہ نشستیں مخصوص کر دی ہیں جن کی تعداد کا قلیل ہونا آبادی کے تناسب کی وجہ سے ناگزیر تھا البتہ اقلیتوں کی مشاورتی کمیٹی

جو کہ مشن منصوبے میں شامل تھی، اس میں ان کو پوری نمائندگی دے کر ان کے مسئلے کا کچھ سدباب کیا جاسکے گا۔''[107] گویا کرپس نے واضح کر دیا تھا کہ وزارتی مشن منصوبہ میں سکھوں کو جو کچھ دیا جاسکتا تھا وہ دے دیا گیا ہے، مشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

جولائی کے آخری ہفتے میں وزیراعظم ایٹلی کی جانب سے بلدیو سنگھ کو اپنے خط کا جواب مل گیا جس میں بلدیو سنگھ نے سکھوں کے لیے ویسے ہی تحفظات کا مطالبہ کیا تھا جو مسلمانوں کو 16رمئی کی دستاویز میں دیئے گئے تھے۔ جواب میں ایٹلی نے لکھا ''میں نے اس مسئلے کا ذاتی طور پر بغور جائزہ لیا ہے اور میں پوری طرح واضح ہوں کہ 16رمئی کی دستاویز جسے حکومت برطانیہ کی مکمل منظوری حاصل ہے، فی الوقت اس کے اندر کوئی ایسی ترمیم ممکن نہیں ہے جیسی کہ سکھ چاہتے ہیں۔ البتہ وائسرائے اس معاملے پر کانگرس اور مسلم لیگ کے صدور کے ساتھ بات چیت کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ تاہم یہ افسوس ناک ہے کہ اس دوران سکھ فرقے نے آئین ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے منتخب نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے...... بہرصورت میں امید کرتا ہوں کہ سکھ فرقہ آئین سازی کے عمل میں تعاون کرنے کا فیصلہ کرے گا۔ یقیناً یہ غلطی ہوگی کہ اگر سکھ فرقے نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا محض پہلے سے یہ فرض کر کے کہ ان کی ووٹ کی قوت کو انہی کے لازمی مفادات کے خلاف استعمال کیا جائے گا اور ان کی فطری خواہشات کو رد کر دیا جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ آئین ساز اسمبلی اپنے مسائل کا مختلف جذبے کے ساتھ سامنا کرے گی۔''[108] یہ کم و بیش ویسا ہی جواب تھا جیسا انہی دنوں ایٹلی نے جناح کو بھی ارسال کیا تھا کہ اب جو کچھ حاصل کرنا ہے وہ آئین ساز اسمبلی سے حاصل کریں، حکومت برطانیہ مزید کچھ دینے سے قاصر ہے۔ گویا اسمبلی کی اکثریتی پارٹی کانگرس پر دارومدار ہے کہ وہ مختلف جذبے کے ساتھ'' آپ پر کوئی مہربانی کر دے اور آپ کو کچھ دے دے۔ ''جناح نے برطانوی حکومت کے اس طرز عمل کے خلاف باغی ہوکر ڈائریکٹ ایکشن کی راہ اختیار کی۔ لیکن سکھ بوجوہ کانگرس کا دست نگر بننے پر مجبور ہوگئے۔

29رجولائی کو مسلم لیگ کی کونسل کی قراردادوں کے نتیجے میں جو صورت حال پیدا ہوئی تھی اس میں سکھوں کے رجحان کا ذکر کرتے ہوئے 3راگست کو جینکنز نے ویول کے نام مراسلے میں لکھا'' ...... مسلم لیگ کی قراردادوں کا اثر یہ ہوا ہے کہ سکھ کانگرس کے ساتھ تعلقات میں

قریب تر ہو گئے ہیں۔ ہماری انٹیلی جنس کی رپورٹوں کے مطابق جب نہرو کشمیر جاتے ہوئے لاہور سے گزرا تو اس نے پرتاب سکھ کیرون کو سخت برا بھلا کہا اور اتنا ہی برا بھلا بھیم سین سچر کو بھی کہا۔ وہ واضح طور پر آئین ساز اسمبلی کی چار سکھ نشستوں کے پر کئے جانے کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور نیشنلسٹ سکھوں، اعتدال پسند اکالیوں اور خود بلدیو سنگھ کی بھی یہی رائے ہے۔ بلدیو سنگھ کے مطابق اب تو انتہا پسند بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صورتحال بدل گئی ہے۔ تاہم ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پائے ہیں کہ اب کیا کرنا ہے۔ گیانی کرتار سنگھ، نرنجن سنگھ گل، اودھم سنگھ ناگو کے اور بعض دوسرے سکھ رہنماؤں پر مشتمل ایک وفد واردھا جا رہا ہے تا کہ کانگرس ہائی کمان سے صورت حال پر تبادلۂ خیال کر سکے اور سکھوں کے متعلق کانگرس کے رویے کے بارے میں یقین دہانیاں حاصل کر سکے۔"[109]

اور پھر واردھا میں کانگرس مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس میں 9 راگست کو یہ قرارداد منظور کی "مجلس عاملہ کو انتہائی افسوس کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ سکھوں نے آئین ساز اسمبلی کے انتخاب میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجلس عاملہ کو سکھوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا احساس ہے اور ہم نے وزارتی مشن کی اس جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ تاہم ہماری یہ پختہ رائے ہے کہ سکھ اپنے نصب العین اور ملکی آزادی کے نصب العین سے بہتر طور پر عہدہ برا ہو سکیں گے اگر وہ آئین ساز اسمبلی سے باہر رہنے کے بجائے اس میں شرکت اختیار کریں۔ چنانچہ مجلس عاملہ سکھوں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں اور آئین ساز اسمبلی میں شرکت پر رضامندی کا اظہار کریں۔ مجلس عاملہ سکھوں کو یقین دہانی کراتی ہے کہ کانگرس ان کی جائز شکایات کو رفع کرنے اور پنجاب میں ان کے جائز حقوق کی حفاظت کے لیے مناسب تحفظات فراہم کرنے میں ان کی ہر ممکن مدد کرے گی۔"[110] 13 راگست کو ویول نے پیتھک لارنس کے نام مراسلے میں اطلاع دی کہ کانگرسی سکھ بہرصورت آئین ساز اسمبلی میں شرکت کے خواہاں ہیں۔"[111] اس دوران حکومت برطانیہ کی جانب سے وائسرائے اور گورنر پنجاب کو سکھ نشستوں کے ضمنی انتخاب کروانے کا اختیار دیا جا چکا تھا۔

ان حالات میں 14 راگست کو پنتھک پرتی ندھی بورڈ نے امرتسر میں اپنے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی جس میں سٹیفورڈ کرپس کی جانب سے دارالعوام میں اور وائسرائے کی

جانب سے ممتاز سکھ رہنماؤں کے نام اپنے خطوط میں سکھوں سے آئین ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کے فیصلے کو واپس لینے کے لیے کی گئی درخواستوں کا ذکر کرنے کے بعد کانگرس مجلس عاملہ کی 9/اگست کی متذکرہ قرارداد کا حوالہ دیا گیا اور کہا گیا کہ ''اس کے ساتھ 1929ء کی لاہور کانگرس کی اس قرارداد کو بھی شامل کیا جائے جس میں کہا گیا تھا کہ مستقبل کے آئین میں فرقہ وارانہ مسئلے کے کسی ایسے حل کو قبول نہیں کیا جائے گا جو سکھوں کے اطمینان پر پورا نہیں اترتا ہو گا اور اس کے ہمراہ ان ممتاز کانگرسی رہنماؤں کے بیانات کو بھی شامل کیا جائے جن میں کہا گیا ہے کہ سکھوں کو بھی وہی تحفظات فراہم کئے جائیں گے جو وزارتی مشن منصوبہ کے پیراگراف 15 اور 19 میں دونوں بڑے فرقوں کو مہیا کئے گئے ہیں۔'' اس اجلاس میں 16/مئی کو وزارتی مشن منصوبہ کو اپنے اعتراضات سمیت منظوری دے دی گئی اور آئین ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کے فیصلے کو واپس لے لیا گیا اور پنجاب اسمبلی کے سکھ ارکان کو مشورہ دیا گیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے لیے اپنے نمائندوں کا انتخاب عمل میں لائیں۔[112] چنانچہ سکھوں نے حکومت برطانیہ کی جانب سے مسلسل بے اعتنائی اور اس میں پنہاں اس واضح اشارے کو دیکھ کر کہ انگریز اب کانگرس کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں اور کانگرس کو ہندوستان کا کارمختار سمجھتے ہیں، کانگرسی رہنماؤں کی پرفریب یقین دہانیوں کا اعتبار کر کے کانگرس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب کہ ادھر مسلم لیگ ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

حوالہ جات

باب 1: دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ اور طاقت کا نیا توازن

1- *The Times*, August 10, 1945.

2- *Ibid.*, August 17, 1945.

3- *Economist*, September, 29, 1961.

4- William, Worbey, *Vietnam The Truth*, London,1965, pp.25-26.

5- D. F., Fleming, *The Cold War And Its Origins*, New York, 1961, Vol.1, p. 307.

6- *The New York Times*, August 17, 1945.

7- *The Times*, August 21, 1945.

8- *The New York Times,* August 23, 1945.

9- *Ibid.*, August 30, 1945.

10- *Ibid.*, September 4, 1945.

11- Arthur M. Schelsinger Jr., General Editor, *The Dynamics of World Power- A Documentary History of U.S. Foreign Policy* 1945-1973, Vol. 2, pp. 166-169.

12- *The New York Times*, September 30, 1945.

13- *Ibid*. September 23, 1945.

14- *Ibid.*

15- *The Times*, September 22, 1945.

16- *The New York Times*, September 24, 1945.

17- (i) *The New York Times*, September 27, 1945

(ii) *The Times*, September 27, 1945.

18- *The New York Times,* October 1, 1945.

19- *The Times*, September 10, 1945.

20- *The New York Times*, September 15, 1945.

21- *The Times*, September 17, 1945.

22- (i) *The Times*, September 19, 1945.

(ii)*The New York Times*, October 11, 1945.

23- *The New York Times*, September 24, 1945.

24- (i) *The Times*, September 24, 1945.

(ii)*The New York Times*, October 2 and 3, 1945.

25- *The New York Times*, October 4, 6 and 7, 1945.

26- *Ibid.*, October 12, 1945.

27- *The New York Times*, October 8 and 9, 1945.

28- *The Times*, October 8, 1945.

29- *The New York Times*, October 10, 1945.

30- *The Dynamics of World Power*, *op.cit.,* Vol.2, pp.169-173

31- *The Times,* November 8, 1945.

32- *The Dynamics of World Power*., *op. cit.,* Vol.2, pp176-177.

33- *The New York Times*, November 19, 1945.

34- *The Times*, November 19, 1945.

35- *The New York Times*, November 23, 1945.

36- *Ibid.* November 28 , 29 and December, 5, 1945.

37- Fleming, *op. cit.* Vol.1, p. 335.

38- *The New York Times*, December 10, 1945.

39- Fleming, *op. cit*., Vol.1, p. 339.

40- *The New York Times*, December 2, 1945.

41- *The Times,* January 22, 1946.

42- (i) *The Times*, January 25, 1946.

(ii)*The New York Times*, February 22, 1946.

43- *The Times*, February 7, 1946.

44- *The New York Times*, February 4, 1946.

45- *The Times*, February 8, 1946.

46- *The Dynamics of World Power., op. cit.,* Vol.2, p. 194

47- The Times, February 11, 1946.

48- *The Dynamics of World Power., op. cit.,* Vol.2, pp. 210-217.

49- *The New York Times*, March 14, 1946.

50- *Ibid.* October 23, 1945.

51- (i) *The New York Times*, February 24, May 6 and 19, June 6, 1946.

(ii) *The Times*, November 27,1945, February 25, 1946.

52- *The Times*, March 7 and 16, 1946.

53- *The New York Times*, March 24, 1946.

54- *Ibid.* April 26, 1946.

55- *The Times,* September 25, 1946.

56- Mao tse Tung, *Selected Works of Mao tse Tung,* Vol. IV, Peking, 1963, p.100.

57- *The Dynamics of World Power*, *op.cit.,* Vol.2, pp. 268-304.

58- (i) *New York Times*, January 18, February 11, 1947

(ii) *The Times,* January 20, February 11, 1947.

59- *The Times*, February 4, 1947.

60- *The Dynamics of World Power*, *op.cit.,* Vol.2, pp. 304-309.

61- *Ibid*. pp 309-313.

62- Fleming, *op.cit.,* 446-447.

63- A. Z. Minfred, *A Short History of the World,* Vol-2, Moscow, 1974, p. 372.

64- Rijni Palme Dutt, *The Crisis of Britain and the British Empire,* London, 1957, p.132.

65- *The New York Times*, March 14, 1947.

باب 2 : برطانوی سامراج کا دیوالیہ، عالمگیر سلطنت سے اس کی پسپائی

1- (i) *Economist,* July 7, 1944.

(ii) *The New York Times*, September 10, 11 and 21, 1945.

2- (i) *The New York Times*, August 18 and 22, September 30, October 3, 12 and 14, December 1, 1945.

(ii) *The Times,* August 21, November 3, 16 and 22, December 7, 1945

3- *The Times*, January 24, February 4, 6, 8, 15 and 18, March 11 and 14, October 17, November 6, 1946.

4- Larry Collins and Dominique Lapierre, *Freedom At Midnight.* London 1975, pp. 3-5.

5- Gunnar Myrdal, *Asian Drama*, London, 1969, Vol.1, p.133.

6- D. G. E. Hall, *A History of South East Asia*, London, 1964, p.784.

باب 3 : ایشیاء میں سامراج سے آزادی کی لہر اور قوم پرست مسلّح تحریکیں

1- *The New York Times*, January 1, 1946.

2- Worbey, *op. cit.*, p. 25.

3- Hall, *op. cit.*, p. 803.

4- Penderal Moon, *Divide And Quit*, London, 1964. p.42.

5- Fleming, *op. cit*., Vol. 2, p. 663.

6- *Transfer Of Power 1942-47*, op. cit, Vol. 6, London, 1976, p. 306.

7- *Ibid*., p. 360.

8- *Ibid*., pp. 555, 828.

9- Fleming, *op. cit.*, Vol. 2, p. 664.

10- Guy Wint and Peter Collove Corracy, *Middle East Crisis*, London, 1957, p. 19.

11- *The Times*, December 15, 1943.

12- Dutt, R. Palme, op. cit., p. 235.

13- *The New York Times*, September 30, 1945.

14- *The Times*, November 3, 9, 14 and 15, 1945.

15- *The New York Times*, March 30, 1946.

16- Fleming, op. cit., Vol. 1, p. 341

باب 4 : ہندو مسلم تضاد اور اس کے بارے میں انگریزوں، کانگرس اور مسلم لیگ کا رویّہ

1- Moon, *op. cit.*, p. 42.

2- Wavell, Lord, *Wavell: The Viceroy's Journal,* London-Karachi, 1974, p.10, 470.

3- *The Eastern Times*, Lahore, February 19, 1944.

4- محمد یامین خان، سر۔ نامہءاعمال۔جلد دوم۔لاہور۔1970ء ۔ ص 930

5- Wavell, *op. cit.*, p. 57.

6- *Ibid.* p. 88.

7- *Ibid.*, p. 89.

8- *Ibid.*, pp. 94-99

9- *Transfer Of Power 1942-1947*, op. cit., 1974, Vol. 5, pp. 281-82.

10- *Ibid.*, pp. 299-300.

11- *Ibid.*, pp. 317-18.

12- *Ibid.*, pp. 308-9.

13- *Ibid.*, pp. 345-46.

14- Wavell, *op. cit.*, p.121.

15- *Ibid.*, p. 155.

16- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p.174.

17- Abulkalam Azad, *India Wins Freedom*, Calcutta, 1964, pp. 110, 116

18- Wavell, *op. cit.,* p.155.

19- Jameel ud-Din Ahmed, *Historic Documents of Muslim Freedom Movement,* Lahore, 1970. pp. 489-91

20- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 5-26.

21- Wavell, *op. cit.*, p. 18.

22- *Ibid.*, p. 78.

23- *Ibid.,* p. 79.

24- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.6, p. 29.

25- *Ibid.,* p. 37.

26- *Ibid.,* pp. 53-54.

27- Wavell, *op. cit.,* p. 161.

28- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.6, pp. 42-43.

29- *Ibid.,* p.59.

30- *Ibid.,* p.79

31- *Ibid.,* pp. 71-72.

32- *Ibid.,* pp.119-120.

33- *Ibid.,* pp. 113-118.

34- *Ibid.,* pp. 148-151.

35- Wavell, op. cit., pp. 165-166.

36- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 173-178.

37- Wavell, *op. cit.*, p.168.

38- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 208-209.

39- Wavell, *op. cit.*, p. 169.

40- *Ibid.*, pp. 169-170.

41- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 256-258.

42- *Ibid.*, pp. 270-271.

43- *Ibid.,* pp. 229-230.

44- Azad, *op.cit.,* p. 119.

45- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 155-157.

46- Jagdesh Saren Sharma, *India's Struggle For Freedom - Select Documents And Sources,* Vol. 1, Delhi, 1962, pp. 632-633.

47- Azad, *op. cit.*, p. 120.

48- V.P Menon, The Transfer of Powr in India, Princeton, News Jersey, 1957.

49 ۔انقلاب، 28ستمبر،1945.

50- *The Times*, September 27, 28 & 29, October 1, 1945.

51- *Ibid.*, October 12, 1045.

52- (i) *The Times*, August 24, 1945.

(ii) *The New York Times*, August 24, 1945.

(iii) انقلاب، 2/ستمبر، 1945

53۔ انقلاب، 14/اکتوبر، 1945

54۔ ایضاً۔6/اکتوبر، 1945

55۔ ایضاً۔12/نومبر، 1945

56۔ ایضاً۔10/اگست، 1945

57۔ ایضاً۔ 22/اکتوبر، 1945

باب 5 : آزاد ہند فوج کا مقدمہ

1- R. C. Mojamdar, *History Of The Freedom Movement In India,* Vol. IV, Lahore, 1979., pp. 7488-749.

2- (i) Wavell, op. cit., p 188.

(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 546.

3- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p.507.

4- *Ibid.*, pp. 488-489.

5- *Ibid.,* p. 543.

6- (i) Wavell, op. cit., p 185.

(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 438, 509.

7- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 595.

8- *Ibid.,* p. 396.

9- *Ibid.,* p. 440

10- *Ibid.,* pp. 501-503.

11- *Ibid.,* p. 524.

12- *Ibid.,* p. 560.

13- *Ibid.,* p. 561.

14- *Ibid.,* pp. 588-591, 596, 599.

15- *Ibid.,* p. 477.

16- *Ibid.,* p. 597.

17- *Ibid.,* pp. 597-598

18- *Ibid.,* p. 613.

19- *Ibid.,* p. 602.

20- *Ibid.,* p. 633

21- *Ibid.,* p. 642.

22- *Ibid.,* p. 656.

23- Azad, *op. cit.*, p. 134.

24- Wavell, *op. cit.*, p. 223

باب6 : انتخابی مہم کا بنیادی سوال، منقسم یا متحدہ ہند ؟

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 318-319.

2- *Ibid.,* pp.242-247.

3- Wavell, *op. cit.*, p.178.

4- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 377.

5- *Ibid.,* pp.401-402.

6- *Ibid.,* pp. 413-414.

7- *Ibid.,* p. 424.

8- *Ibid.,* p. 422.

9- *Ibid.,* p. 466.

10- *Ibid.,* p. 509.

11- *Ibid.,* p. 521.

12- *Ibid.,* p. 526.

13- *Ibid.,* pp. 568-569.

14- *Ibid.,* pp.607-609.

15- *Ibid.,* p. 614.

16- *Ibid.,* p. 622.

17- (i) Wavell, *op. cit.*, p. 192.

(ii) انقلاب، 12ر ستمبر، 1945.

18- Wavell, *op. cit.*, p. 193.

19- *The Statesman*, December 12, 1945.

20- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 650-651.

21- *Ibid.,* pp. 700-701.

22- *Ibid.,* p. 688.

23- *Ibid.,* p. 703.

باب 7 : عام انتخابات میں تقسیم کے مسئلے پر برصغیر کے عوام کا فیصلہ

1۔ فیروز خان نون۔ چشم دید۔ لاہور۔ 1974ء۔ ص ص 274-275, 285

2- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 660.

3- *Ibid.,* pp. 708-709, 749.

4- *Ibid.,* p. 727.

5- Wavell, *op. cit.*, pp. 206-207.

6- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 731-732.

7- *Ibid.,* pp.947-950.

8- *Ibid.,* pp.771-775.

9- *Ibid.,* pp. 789-790.

10- *Ibid.,* p. 754.

11- *Ibid.,* pp. 801-804.

12- *Ibid.,* p. 855.

13- *Ibid.,* p. 849.

14- *Ibid.,* p. 842.

15- *Ibid.,* p. 829.

16- *Ibid.,* p. 868.

17- *Ibid.,* p. 807.

18- *Ibid.,* p. 875.

19- *Ibid.,* pp.912-913.

20- *Ibid.,* pp.964-965.

21- *Ibid.,* pp. 951 -963.

22- *Ibid.,* pp. 978 - 983.

باب 8 : بحریہ کے ہندوستانی عملے کی بغاوت

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 941.

2- (i) *The Times*, January 25, 27, February 1, 1946.

(ii) *The New York Times*, January 25, 27, 30, 1946.

3- *The Times*, February 1, 1946.

4- *Ibid.* February 20, 1946.

5- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 1080-1083.

6- *Ibid.* pp. 1071-1072.

7- Mohammad Ayub Khan, *Friends Not Masters*, Karachi, 1967, p .22.

8- Russel Brines, *The Indo Pakistani Conflict*, London, 1968, p.40

9- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 1055.

10- *Ibid.*, p.1234.

11- *The Times*, February 28, 1946.

12- Wavell, *op. cit.*, p. 210.

13- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp.969, 1009.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 211.

14- Menon., *op. cit.*, p. 229

15- *The Civil and Military Gazette*, February 24, 1946.

16- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 1081-1084.

17- *The Civil and Military Gazette*, February 28, 1946.

18- Azad, *op. cit.*, pp. 130-131.

19- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 1116.

20- Ian Stephens, *Pakistan*, London, 1964, pp. 113-115.

21- A. C. Bannerji, D. R. Bose, The Cabinet Mission In India, Calcutta, 1946, p. 3.

22- Menon., *op. cit.,* p. 234.

23- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, p. 1051-1052.

24- *The Eastern Times*, February 21, 1946.

25- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 6, pp. 1058-1060.

26- *Ibid.* pp. 1094 - 1096.

27- *Ibid.* pp. 1153 - 1154.

28- *Ibid.* pp. 1162 - 1163.

29- *Ibid.* p. 1102.

30- *Ibid.* p. 1128.

31- *Ibid.* pp. 1166 - 1173.

32- *Ibid.* p. 1177.

33- *Ibid.* pp. 1181 - 1183.

34- Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 10, 18-19.

35- Menon, *op. cit.*, pp.234 - 235.

باب 9 : حالات کا جائزہ اور ابتدائی پیشکش

1- *Transfer Of Power op. cit.,* Vol. 7, p. 2.

2- *Ibid., op. cit.*, pp. 6 - 13.

3- Wavell, *op. cit.*, p. 230.

4- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 39 - 41.

5- *Ibid.* pp. 20-21.

6- *Ibid.* pp. 59 - 60.

7- *Ibid.* pp. 65 - 68.

8- *Ibid.* pp. 68 - 71.

9- *Ibid.* p. 104.

10- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 110-113.

(ii) Azad, *op. cit.*, pp. 143 - 145.

11- Azad, *op. cit.*, pp. 142 - 143.

12- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 116 - 118.

(ii) Menon., *op. cit.,* pp. 239 - 240.

13- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 118 - 124.

(ii) Menon.,*op. cit.,* pp. 240 - 242.

14- Mojamdar., *op. cit., Vol. 4,* pp. 756 - 757.

15- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 138 - 143.

16- Khushwant Singh, *A History Of The Sikhs,* Delhi, 1981, Vol-II, p 259.

17- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.174 - 180.

18- *Ibid.* pp. 180 - 181.

19- *Ibid.* pp. 196 - 201.

20- *Ibid.* p. 221.

21- *Ibid.* pp. 260 - 261.

22- *Ibid.* p. 266.

23- *Ibid.* pp. 149 - 151.

24- *Ibid.* pp. 160 - 161.

25- Wavell, *op. cit.*, p. 241.

26- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 264.

27- Sharifuddin Pirzadah,Syed, *Foundations Of Pakistan*, Karachi, 1970, Vol II, p. 521.

28- *Ibid.* p. 523.

29- Abdul Haq, Moulvi Dr., *The Standard English - Urdu Dictionary,* Karachi, 1981, p. 1301.

30- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 286 - 287.

31- *Ibid.* pp.281-285.

32- Wavell, *op. cit.*, p. 215.

33- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 316 - 317, 323.

34- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 330, 342.
(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 252.

35- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 342.
(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 254.
(iii) Menon., *op. cit.*, pp. 253 - 254.

36- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 282.

37- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 345 - 346.
(ii) Menon , *op. cit.*, p. 254.

38- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 353.

39- Azad, *op. cit.*, p. 147.

باب 10 : شملہ مذاکرات 1946ء

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 425-428.

2- *Ibid.* pp. 433 - 434.

3- Azad, *op. cit.*, p. 147.

4- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.436-438, 440-442.

5- Wavell, *op. cit.*, pp. 259 - 260.

6- *Ibid.* p. 216.

7- *Ibid.* p. 261.

8- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 462-463.

9- *Ibid.* pp. 465 -466.

10- *Ibid.* p. 466.

11- *Ibid.* pp. 464- 465.

12- *Ibid.* pp. 469 - 471.

13- *Ibid.* pp. 475 - 476.

14- *Ibid.* pp. 476 - 478.

15- Azad, *op. cit.*, p. 142.

16- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.479 -480.

17- *Ibid.* pp. 502 - 504, 507.

18- *Ibid.* pp. 508 - 511.

19- *Ibid.* pp. 341 - 342.

20- *Ibid.* p. 446.

21- *Ibid.* p. 483.

22- *Ibid.* pp. 400 - 401.

23- *Ibid.* pp. 484 - 485.

24- *Ibid.* pp. 406 -407.

25- *Transfer Of Power op. cit.,* Vol. 12, pp. 800 - 806.

باب 11 : وزارتی مشن منصوبہ

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 583 - 585.

2- *Ibid.* pp. 586 - 591.

3- M. Aslam Qureshi, *Anglo - Pakistan Relations,* Lahore, 1976, pp. 26 - 27.

4- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 592 - 593.

5- *Ibid.* pp. 611 - 612.

6- *Ibid.* p. 619.

7- *Ibid.* pp. 628 - 629.

8- Ishtiaq Hussain Qureshi, *The Struggle For Pakistan,* Karachi, 1974, p. 259.

9- (i) Jameel-ud-Din Ahmed, *op. cit.*, p. 514.
(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 669.

10- Choudhary Mohammad Ali, *The Emergence Of Pakistan*, Lahore, 1973, p. 59.

11- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 614.

12- *Ibid.* p. 616.

13- Piarey Lal, *Mahatma Gandhi - The Last Phase*, Ahmadabad, 1965, Book 1, Vol.1, p. 204.

14- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, pp. 616 - 617.

15- Wavell, *op. cit.*, p. 236.

16- *Ibid.* p. 239.

17- *Ibid.* p. 240

18- *Ibid.* p. 248.

19- *Ibid.* p. 257.

20- *Ibid.* p. 267.

21- Piarey Lal, *op. cit.*, Vol.1, Book I, pp. 172 - 173.

22- *Ibid.* p. 173.

23- *Ibid.*

24- *Ibid.*

25- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, p. 622.

26- Wavell, *op. cit.*, pp. 273 - 274.

27- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, p. 629.

28- *Ibid.* p. 631.

29- Wavell, *op. cit.*, p. 274.

30- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, p. 637.

31- (i) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp.171 - 175.
(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, pp. 646 - 648.

32- Piarey Lal, *op. cit.*, Vol.1, Book I, p. 228.

33- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, p. 650.

34- *Ibid.* p. 659.

35- (i) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp.163 - 168.
(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, pp. 679 -681.

36- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol.7, pp. 688 - 689.

37- Piarey Lal, *op. cit.*, Vol.1, Book I, p. 207.

38- Tara Chand, Dr., *History Of The Freedom Movement In India,* Lahore, Vol. IV, p. 471.

39- Mojamdar, *op. cit.*, p. 767.

40- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 645.

(ii) Moon, *op. cit.*, p. 49.

41- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 645.

42- Moon, *op. cit.*, p. 50.

43- *Ibid.*

44- Khushwant Singh, *op. cit.*, Vol. 2 p. 261. (Note Vol. 2)

45- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 710 - 713.

46- *Ibid.* pp. 724 - 725.

47- *Ibid.* pp. 821 - 822.

48- *Ibid.* pp. 827 - 829.

49- *Ibid.* p. 956.

50- *Ibid.* p. 655.

51- *Ibid.* pp. 677 - 678.

52- *Ibid.* pp. 731 - 737, 787 - 795.

53- *Ibid.* pp. 812 - 819.

54- *Ibid.* pp. 889 - 892.

55- *Ibid.* pp. 900 - 907.

56- *Ibid.* pp. 926 - 929.

57- Fleming, *op. cit.*, Vol. 1, p. 358

58- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 930 - 936.

59- *Ibid.* p. 817.

باب 12 : مشن منصوبہ۔مسلم لیگ کی منظوری،
عبوری حکومت۔کانگرس کی منظوری

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.684 - 687.

2- *Ibid.* pp. 761 - 762.

3- *Ibid.* p. 763.

4- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 783 - 785.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 286.

5- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 799.

(ii) Jameel-ud-Din Ahmed, *op. cit.*, pp. 518 - 519.

6- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.819 - 820.

7- Bannerji and Bose, *op. cit.*, p. 188.

8- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.837 - 838.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp.189 - 192.

9- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.359 - 360.

10- *Ibid.* pp.403 - 404.

11- *Ibid.* p. 455.

12- Wavell, *op. cit.*, p. 261

13- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 541.

(ii) Wavell, *op. cit.*, pp. 267 - 268.

14- Wavell, *op. cit.*, pp. 268 - 269.

15- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 694.

16- *Ibid.* p. 691.

17- Azad, *op. cit.*, p. 150.

18- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 709.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, p.182.

19- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p.705

20- *Ibid.* p. 738.

21- Wavell, *op. cit.*, p. 287.

22- Menon, *op. cit.*, p. 273.

23- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 824 - 826.

24- Wavell, *op. cit.*, p. 288.

25- *Ibid.*

26- *Ibid.*

27- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 839.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 288.

28- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 840 - 842.

29- *Ibid.* p. 843.

30- *Ibid.* p. 852.

31- *Ibid.* p. 844.

32- *Ibid.* pp. 853 - 856.

33- *Ibid.* p. 857.

34- Wavell, *op. cit.*, p. 287.

35- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 862 - 863.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 289.

36- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.865 - 878.

(ii) Piarey Lal, *op. cit.*, p. 214.

37- Wavell, *op. cit.*, p. 290.

38- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 866 - 867.

39- *Ibid.* p. 876.

40- Wavell, *op. cit.*, p. 290

41- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 214

42- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 878.

43- *Ibid.* p. 886.

44- Menon, *op. cit.*, p. 274.

45- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 886 - 887.

46- *Ibid.* pp. 884 - 885.

47- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 826.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 288.

48- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 910.

(ii) Piarey Lal, *op. cit.*, pp.214 - 215.

49- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 215.

50- *Ibid.*

51- *Ibid.* p.216.

52- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 887.

53- *Ibid.* pp. 912 - 913.

54- *Ibid.* p. 917.

55- Wavell, *op. cit.*, p. 292.

56- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 939 - 941.

57- *Ibid.* pp. 949 - 950.

58- *Ibid.*

59- *Ibid.* p. 676.

60- *Ibid.*

61- *Ibid.* p. 944.

62- *Ibid.* p. 949.

باب 13 : مشن منصوبہ، کانگرس نے منظور کیا یا نا منظور؟

1- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 955.

2- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 218.

3- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 922.

4- *Ibid.* pp. 950 - 952.

5- *Ibid.* p. 953.

6- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 219.

7- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 956 - 957.

8- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 219.

9- Wavell, *op. cit.*, p. 294.

10- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 972 - 973.

11- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 972 - 973.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 297.

12- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 220.

13- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 971

14- *Ibid.* p. 972.

15- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 222.

16- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 987.

17- *Ibid.* pp. 985 - 986.

18- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 222.

19- *Ibid.*

20- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 990 - 991.

21- *Ibid.* pp. 1007 - 1008.

22- *Ibid.* pp. 994 - 997.

23- Wavell, *op. cit.*, p. 299.

24- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 222.

25- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 976 - 977.

26- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 989.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 222 - 224.

27- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 221.

28- *Ibid.* p. 223.

29- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 224.

30- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p. 1005.

31- *Ibid.* p. 1004.

32- *Ibid.* p. 1010.

33- *Ibid.* pp.1012 - 1018.

34- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 223.

35- *Ibid.* p. 224.

36- *Ibid.* pp. 224 -225.

37- *Ibid.* pp. 225 -226.

38- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1023 - 1024.

39- Wavell, *op. cit.*, p. 302.

40- *Ibid.*

41- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.1025 -1026.

(ii) Piarey Lal, *op. cit.*, p. 226.

42- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp.1026 -1027.

43- Wavell, *op. cit.*, p. 303.

44- (i) Piarey Lal, *op. cit.*, p. 227.

(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1029 - 1030.

45- Piarey Lal, *op. cit.*, pp. 227 - 228.

46- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1036 - 1038.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 252 - 255.

47- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1032 - 1036.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 245 - 252.

48- Wavell, *op. cit.*, p. 305.

49- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1031 - 1032, 1038 - 1040

50- *Ibid.* pp. 1042 - 1043.

51- *Ibid.* pp. 1044 -1045.

52- Wavell, *op. cit.*, p. 306.

53- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, p.1049.

54- *Ibid.* pp. 1057 - 1058.

55- *Ibid.* p. 1053.

56- *Ibid.* pp. 1060 - 1062.

57- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1069 - 1073.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 272 - 275.

58- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1076 .

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 270.

59- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1077.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 270 - 271.

60- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1078.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.*, pp. 271.

61- Wavell, *op. cit.*, p. 307.

62- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 7, pp. 1065 - 1066.

63- *Ibid.* pp. 1075 - 1076.

64- *Ibid.* pp. 1083 - 1084.

65- *Ibid.* pp. 1050 - 1051.

66- *Ibid.* p. 1067.

67- *Ibid.* pp. 1084 - 1087.

باب 14 : ایک اہم موڑ

1- *Transfer Of Power 1942-1947,* London, 1979, Vol. 8, pp.12 -15

2- Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 297 - 299.

3- *Ibid.* pp. 297 - 299.

4- (i) Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 303 - 306.

(ii) Piarey Lal, *op. cit.*, p. 233.

5- Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 306 - 309.

6- *Ibid.* pp. 310 - 313.

7- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 25 - 28.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 314 - 320.

8- Michael Brecher, *Nehru : A Political Biography*, Oxford, 1959, pp. 316 - 317.

9- Michael Edwards, *Nehru : A Political Biography*, London, 1973, p. 173.

10- Azad, *op. cit.,* p. 151.

11- *Ibid.* p. 155.

12- H. V. Hodson, *The Great Divide,* Karachi, 1969, p. 159.

13- C. H. Phillips & Mary Doreen Wainright, *The Partition Of India*, London, 1970, p. 475.

14- Mojamdar, *op. cit.,* pp. 769 - 770.

15- *Ibid.* p. 565.

16- Brecher, *op. cit.*, p. 392.

17- Mojamdar, *op. cit.*, pp. 563 - 564.

18- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 106 - 107.

19- *Ibid.* p. 27

20- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 67.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 322 - 325.

21- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 18 - 19.

22- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 19.

(ii) Piarey Lal, *op. cit.*, p. 241.

23- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 73 -74.

(ii) Bannerji and Bose, *op. cit.,* pp. 331, 348.

24- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 76 - 78.

25- *Ibid.* p. 173.

26- *Ibid.* p. 11

27- *Ibid.* pp.35 - 37.

28- *Ibid.* p. 79.

29- *Ibid.* p. 83.

30- *Ibid.* pp. 98 - 99.

31- *Ibid.* pp. 112 - 113.

32- Wavell, *op. cit.*, p. 322.

33- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 114 - 115.

34- Wavell, *op. cit.*, p. 321.

35- Pirzadah, *op. cit.*, p. 546.

36- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 123 - 125.

37- Wavell, *op. cit.*, pp. 323 - 324.

38- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 126 - 127.

39- Wavell, *op. cit.*, pp. 309.

40- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 4.

41- *Ibid.* p. 90.

42- Wavell, *op. cit.*, p. 321.

43- *Ibid.* p. 302.

44- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 99 - 101.

45- Wavell, *op. cit.*, p. 324.

46- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 166 -168.

47- *Ibid.* pp. 110 - 111.

48- Pirzadah, *op. cit.*, pp. 544 - 549.

49- *Ibid.* pp. 554 - 556.

50- *Ibid.* pp. 557 - 558.

51- *Ibid.* p. 560.

52- Wavell, *op. cit.*, p. 324.

53- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 139.

54- *Ibid.* pp. 144 - 145.

55- Sharma, *op. cit.*, Vol.1, pp.714 - 717.

56- *Ibid.* pp. 717 - 718.

57- *Ibid.* pp. 718 - 722.

58- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 150

59- *Ibid.* pp. 154 - 155.

60- *Ibid.* pp. 168 - 169.

61- *Ibid.* pp. 164 - 165, 169 - 170.

62- *Ibid.* pp. 176 - 177.

63- *Ibid.* pp. 190 - 191.

64- *Ibid.* p. 188.

65- *Ibid.* p. 200.

66- *Ibid.* pp. 194.

67- *Ibid.* pp. 196.

68- *Ibid.*

69- *Ibid.* pp. 46.

70- *Ibid.* pp. 66.

71- *Ibid.* pp. 74 - 75.

72- Piarey Lal, *op. cit.*, p. 195.

73- *Ibid.* pp. 233

74- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 66.

75- *Ibid.* pp. 159

76- *Ibid.* pp. 181.

77- Wavell, *op. cit.*, p. 327.

78- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 161 - 162.

79- *Ibid.* pp. 201 - 202

80- *Ibid.* pp. 204 - 210.

81- *Ibid.* p. 216.

82- *Ibid.* p. 228.

83- *Ibid.* pp. 50 - 57.

84- *Ibid.* p. 224.

85- *Ibid.* p. 176.

86- *Ibid.* p. 174.

87- Wavell, *op. cit.*, p. 328.

88- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 184.

89- *Ibid.* p. 189.

90- *Ibid.* p. 199.

91- *Ibid.* pp. 226 - 227.

92- (i) Sharma, *op. cit.*, Vol. 1, pp. 723 - 724.

(ii) Azad, *op. cit.*, pp. 156 - 157.

(iii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 217.

93- Azad, *op. cit.*, p. 156.

94- (i) Sharma, *op. cit.*, Vol. 1, pp. 726 - 728.

(ii) Menon, *op. cit.*, pp. 292 - 293.

95- Azad, *op. cit.*, pp. 157 - 158.

96- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 218.

97- *Ibid.* p. 225.

98- *Ibid.* p. 203.

99- *Ibid.* pp. 238 - 239.

100- (i) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 248 -249.

(ii) Wavell, *op. cit.*, p. 334.

(iii) Menon, *op. cit.*, p. 294.

101- (i) Menon, *op. cit.*, pp. 290 - 291.

(ii) *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 116 -117.

102- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 2.

103- *Ibid.* pp. 6 - 9.

104- Bannerji and Bose, *op. cit.*, p. 299.

105- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 59.

106- *Ibid.* pp. 65, 80 - 81.

107- Bannerji and Bose, *op. cit.*, p. 337.

108- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, pp. 116 - 117.

109- *Ibid.* p. 180.

110- Sharma, *op. cit.*, Vol.1, p.723.

111- *Transfer Of Power, op. cit.*, Vol. 8, p. 228.

112- *Ibid.* p. 94.

113- (i) Sharma, *op. cit.*, Vol.1, pp. 728 - 729.

(ii) Khushwant Singh, *op. cit.*, p. 263 (note).

کتابیات

کتب (انگریزی)

1- Abdul-Haq, Moulvi, Dr., *The Standard English - Urdu Dictionary,* Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu, Karachi, 1981.

2- Ahmed, Jameel ud-Din , *Historic Documents of Muslim Freedom Movement,* Publishers United, Lahore,1970.

3- Azad, Abulkalam, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Calcutta, 1964.

4- Bannerji, A. C. and Bose, D. R. , *The Cabinet Mission In India*, A. Mukher Jee & Co., Calcutta, 1946.

5- Brecher, Michael, *Nehru: A Political Biography*, Oxford, 1959.

6- Brines, Russel, *The Indo Pakistani Conflict*, Pall Mall Press, London, 1968.

7- Collins, Larry, and Lapierre, Dominique , *Freedom At Midnight.* Collins, St James Palace, London 1975.

8- Dutt, Rijni Palme, *The Crisis of Britain and the British Empire,* Lawrence and Wishart Ltd., London, 1957.

9- Edwards, Michael, *Nehru : A Political Biography*, Penguin Books, London, 1973.

10- Fleming, D. F., *The Cold War And Its Origins*, Doubleday And Co. Inc., Garden City, New York, 1961.

11- Guy Wint and Peter Collove Corracy, *Middle East Crisis*, Penguin Books, London, 1957.

12- Hall, D. G. E., *A History of South East Asia*, Macmillan And Co. Ltd., London, 1964.

13- Hodson, H. V., *The Great Divide,* Hutchinson of London,1969.

14- Khan, Mohammad Ayub , *Friends Not Masters*, Oxford University Press, Karachi, 1967.

15- Khushwant Singh, *A History Of The Sikhs,* Oxford University Press, Delhi, 1981.

16- Mao-tse Tung, *Selected Works of Maotse Tung,* Foreign Languages Press, Peking, 1963.

17- Menon, V. P, *The Transfer of Power in India*, Princeton, New Jersey, 1957.

18- Minfred, A. Z., *A Short History of the World,* Progress Publishers, Moscow, 1974.

19- Mohammad Ali, Choudhary, *The Emergence Of Pakistan*, University Of Punjab Lahore, 1973.

20- Mojamdar, R. C., *History Of The Freedom Movement In India,* Book Traders, Lahore, 1979.

21- Moon, Penderal, *Divide And Quit*, London, Chatto And Windus, 1964.

22- Myrdal, Gunnar, *Asian Drama*, London, 1969.

23- Phillips, C. H., and Wainright, Mary Doreen, *The Partition Of India*, London, 1970.

24- Piarey Lal, *Mahatma Gandhi - The Last Phase*, Nava Jivan Publishing House, Ahmadabad, 1965.

25- Qureshi, Ishtiaq Hussain, *The Struggle For Pakistan,* University Of Karachi, Karachi, 1974.

26- Qureshi, M. Aslam, *Anglo - Pakistan Relations,* Research Society Of Pakistan, Punjab University, Lahore, 1976.

27- Schelsinger , Arthur M., Jr., General Editor, *The Dynamics of World Power- A Documentary History of U.S. Foreign Policy 1945-1973*, Chelsa House Publishers in association with McGraw Hill Book Company, New York, 1973.

28- Sharifuddin Prizada Syed, Foundations of Pakistan, Karachi, 1970.

29- Sharma, Jagdesh Saren , *India's Struggle For Freedom - Select Documents And Sources,* Chand And Company, Delhi, 1962.

30- Stephens, Ian , *Pakistan*, Penguin Books, London, 1964.

31- Tara Chand, Dr., *History Of The Freedom Movement In India,* Book Traders, Lahore.

32- Wavell, Lord, *Wavell: The Viceroy's Journal,* Edited by Penderal Moon, Oxford University Press, London-Karachi, 1974.

33- Worbey, William, *Vietnam The Truth*, London,1965

کتب (اردو)

1۔فیروز خان نون۔ چشم دید۔ فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور۔1974
2۔محمد یامین خان،سر۔ نامہءاعمال۔ آئینہ ادب۔ لاہور ۔ 1970ء

اخبارات وجرائد(انگریزی)

1- *Economist*, London (files from 1944 to1947).

2- *The Civil And Military Gazette,* Lahore (files from 1946 to 1947).

3- *The Eastern Times*, Lahore (files from 1944 to1947).

4- *The New York Times*, New York (files from 1945 to1947).

5- *The Statesman*, 1945.

6- *The Times,* London (files from 1945 to 1947).

اخبارات وجرائد(اردو)

1۔انقلاب۔لاہور (فائلیں 1945 تا 1947) .

دستاویزات، سرکاری ریکارڈ

1- *Foundations Of Pakistan*, (2 Vols.), Edited by Pirzadah, Sharifuddin, Syed, National Publishing House, Karachi, 1970.

2- *Transfer Of Power 1942-1947*, (12 Vols), Editor-in-Chief: Nicholas Mansergh, Editor: Penderal Moon, Her Majesty's Stationary Office, London,
Vol. 5, 1974,
Vol. 6, 1976,
Vol. 7, 1977,
Vol. 8, 1979

آ

ب

د

ڈ

ذ

ر

ز

س

ن

و

ہ

☆☆☆